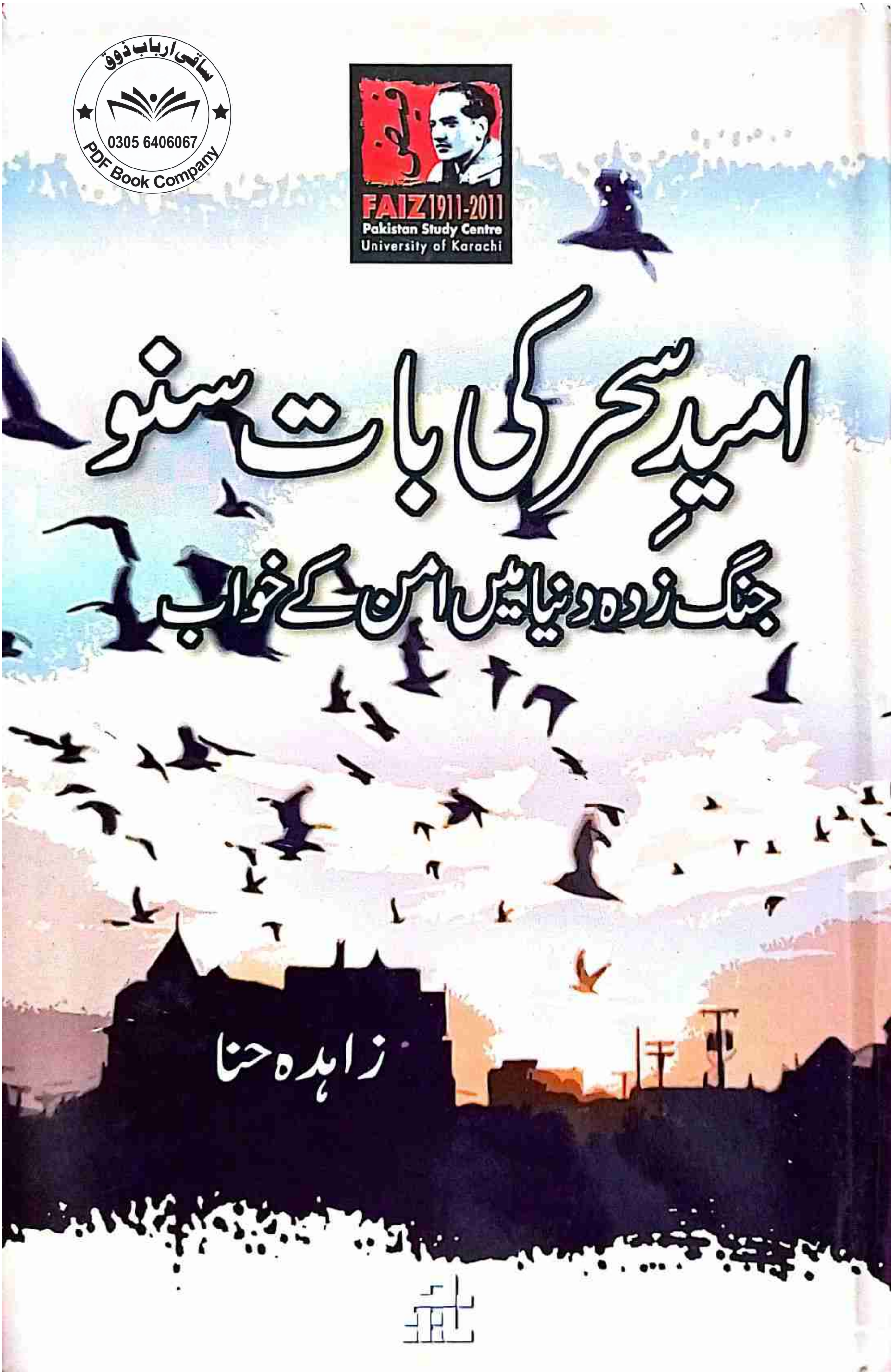


امیدِ سحر کی بات سنو

جنگ زدہ دنیا میں امن کے خواب

زاہدہ حنا

کچھ کتاب کے بارے میں

زیرِ نظر کتاب میں شامل مضامین اور کوئی ۷۰ کے قریب کالم جنگ اور امن کے موضوعات کو مختلف النوع زاویوں سے زیرِ بحث لاتے ہیں۔ ادب اور امن کے درمیان کیا تعلق ہے، امن کی ثقافت کیا ہوتی ہے، سماج میں نزاع اور جنگی جنون کیونکر جگہ بنا پاتا ہے، عورت جنگ سے کیوں سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے، جنگ بازی کے فروغ سے عالمی طاقتوں کی ہوس گیری کا کیا تعلق ہے، امریکا دنیا پر بالادستی کیوں قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے نظری مسائل اِن کالموں میں گہرے مطالعوں کی صورت میں زیرِ بحث آئے ہیں۔ پھر دنیا میں جہاں جہاں جنگ کا بازار گرم کیا گیا اور جہاں جہاں نسلِ انسانی کو تہہِ تیغ کرنے کے نسخے آزمائے گئے اُن خطوں پر بھی زاہدہ حنا نے بڑے پُر اثر کالم تحریر کئے ہیں۔ چنانچہ جاپان جہاں ہیروشیما اور ناگا ساکی جیسی زندہ انسانی بستیاں لمحوں میں خاک میں تبدیل کر دی گئیں، فلسطین جہاں تشدد صبح وشام کشتوں کے پشتے لگاتا ہے، عراق جس کی ثقافت منگولوں سے لے کر آج کے امریکا تک سب ہی نے تاراج کی، یہ سب خطے اِن کالموں میں اپنے درخشاں ماضی اور پھر اپنے حال کی تباہی و بربادی کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ زاہدہ حنا کا قلم اُس وقت اور بھی زیادہ تاثیر لکھنے لگتا ہے جب برصغیر اُن کا موضوعِ سخن بنتا ہے۔

اُمیدِ سحر کی بات سنو

جنگ زدہ دنیا میں امن کے خواب

(مضامین اور کالم)

زاہدہ حنا

پاکستان اسٹڈی سینٹر
جامعہ کراچی

اُمیدِ سحر کی بات سنو

جنگ زدہ دنیا میں امن کے خواب

(مضامین اور کالم)

زاہدہ حنا

(مصنفہ کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں)

اشاعتِ اوّل ——— مارچ ۲۰۱۱ء
سرِ ورق ——— ابڑو
ناشر ——— ڈاکٹر سید جعفر احمد، ڈائریکٹر،
پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی
طابع ——— ماس پرنٹرز، کراچی
قیمت ——— ۴۰۰ روپے
عالمی سلسلہ شمار ——— (ISBN) 978-969-8791-25-4

ملنے کا پتہ
ایڈمنسٹریٹیو آفیسر، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی
پوسٹ بکس نمبر۔ ۸۴۵۰، کراچی۔ ۷۵۲۷۰
ای۔میل: pscuok@yahoo.com

انتساب

عزیزی شاہد حنائی کے نام

اُمیدِ سحر کی بات سنو

فیض احمد فیض

جگر دریدہ ہوں چاکِ جگر کی بات سنو
الم رسیدہ ہوں دامانِ تر کی بات سنو
زباں بُریدہ ہو زخمِ گلو سے حرف کرو
شکستہ پا ہوں ملالِ سفر کی بات سنو
مسافرِ رہِ صحرائے ظلمتِ شب سے
اب التفاتِ نگارِ سحر کی بات سنو
سحر کی بات، امیدِ سحر کی بات سنو

ترتیب

سر آغاز

فیض احمد فیض کی مشہور نظم 'امیدِ سحر کی بات سنو' سے مستعار اِس کتاب کا نام بجائے خود اِس کے مندرجات اور اُن میں پوشیدہ پیغام کی بہت اچھی ترجمانی کرتا ہے۔ زاہدہ حنا صاحبہ کی اِس کتاب میں شامل سب تحریریں جنگ اور امن کی آویزش کے تناظر میں لکھی گئی ہیں۔ یہ آویزش زمانۂ قدیم سے آج تک جاری ہے۔ شاید ہی صدیوں کے انسانی تاریخ کے سفر میں کچھ ایسے وقفے آئے ہوں جب روئے زمین پر جنگ وجدل کا بازار گرم نہ ہوا ہو اور شائستگی نے انسانی بستیوں پر راج کیا ہو۔ انسان ترقی کرتے کرتے آج اُس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ جہاں ستاروں کی گذرگاہوں سے زمین کی اتھاہ گہرائیوں تک کوئی چیز اُس کے احاطۂ خیال اور دست ہنر طراز سے دور نہیں رہی۔ انسان نے اوجِ ثریا تک کا سفر باوجود ازل سے جاری اُس کش مکش کے طے کیا ہے جس کا خراج لاکھوں جانوں کی صورت میں ادا کیا گیا اور انسان کی کتنی ہی صلاحیتیں تحفظِ ذات اور اپنے اپنے معاشروں کے دفاع میں صرف ہوئیں۔ سوچا جا سکتا ہے کہ اگر جنگوں اور قتل وغارت گری کے بے کنار و بے حساب واقعات راہ میں حائل نہ ہوتے تو انسان کی ترقی کا آج کیا عالم ہوتا۔ لیکن اِس کو کیا کہیئے کہ ہر عہد میں انسانوں ہی کی ایک معتد بہ تعداد امن کی اہمیت کو سمجھنے سے معذور رہی اور اُس نے نہ صرف جنگوں کو اپنے لئے باعثِ شرف سمجھا بلکہ اِن کو بہادری اور حب الوطنی کی علامت گردانتے ہوئے اِن کے فروغ کے لئے راہ بھی ہموار کی۔

جنگ اور امن کے درمیان تضاد کو ذرا اور پھیلا کر دیکھیں تو یہ بنیادی طور پر تشدّد اور امن کا تضاد نظر آتا ہے۔ چنانچہ جنگوں کے درمیان تو شاید چھوٹے موٹے وقفے آسکتے ہیں لیکن تشدّد ایک مسلسل عمل کے طور پر ابتدائے آفرینش سے آج تک انسانی معاشروں کو گھائل کر رہا ہے۔ چنانچہ

امن کی بات کرتے وقت اِس امر کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اِس کے قیام کے لئے صرف جنگوں کا ہی خاتمہ ضروری نہیں ہے بلکہ تشدّد کی تمام شکلوں اور اُن کے اسباب سے نجات حاصل کرنا بھی ناگزیر ہے۔ کہنے کی حد تک یہ بات بہت آسان ہے لیکن ظاہر ہے کہ ماضی کی تاریخ اور حال کے احوال پر نظر ڈالیں تو یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کب انسان تخریب اور تشدّد کے اسباب وعوامل سے نجات حاصل کر پائے گا۔ البتہ امن کی منزل کتنی ہی دور کیوں نہ ہو، امیدِ سحر کی بات کی جانی چاہیئے، کیونکہ ایک تو اِس سے اچھے اور برے، خیر اور شر اور راستی اور بے راہ روی کا فرق واضح ہوتا رہتا ہے اور دوسرے یہ کہ امن کی منزل سامنے نہ ہو تو انسان اِس کی سمت سفر بھی نہیں کر سکتا۔ یہ منزل انسان کے پیشِ نظر نہ ہو تو اُس کے پاس سوائے ہتھیار ڈالنے کے اور چارہ بھی کیا رہ جاتا ہے۔

یہ اِسی امید کا سفر ہے جس نے انسان کو زندہ رکھا ہے، اُس کے حوصلوں کو بڑھاوا دیا ہے اور اُس کی تخلیقی جبلتوں کو مہمیز کیا ہے۔ چنانچہ آج اکیسویں صدی میں رہتے ہوئے اگر پیچھے مڑ کر دیکھا جائے تو ہم کو صرف قتل وغارت گری، بستیوں کی تاراجی، بارود کی بُو، جسموں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے، جلی ہوئی لاشیں، بیواؤں کی آہیں اور یتیموں کے آنسو ہی نظر نہیں آتے بلکہ اِس تباہی و بربادی کے بین بین امن کی خواہشوں، کاوشوں اور تحریکوں کا بھی ایک سیلِ رواں نظر نواز ہوتا ہے۔ یہ کاوشیں اور تحریکیں ہر عہد اور زمانے کے انسان کے پیشِ نظر رہیں۔ چنانچہ اگر بیسویں صدی نے دو عالمی جنگیں دیکھیں تو یہی امن کی تحریک کے عالمی سطح پر فروغ کی صدی بھی ثابت ہوئی اور اب جب کہ دنیا کی جنگ پسند ریاستیں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہیں، امن کی عالمگیر صدائیں بھی چہار دانگِ عالم کو متاثر کر رہی ہیں۔ دنیا کا کوئی خطہ اور کوئی ملک ایسا نہیں جہاں امن وآشتی کے لئے جدوجہد کرنے والے لوگ متحرک نہ ہوں۔ یہ لوگ اپنے گردوپیش میں امن کے لئے رائے عامہ استوار کرنے کی خاطر کوشاں ہوتے ہیں تو اِن کو جنگ پسند حلقوں کی طرف سے رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اکثر وبیشتر ریاستوں اور حکومتوں اور اُن کے لے پالک حلقوں کے تازیانے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اِس سب کے باوجود آج دنیا میں امن کے لئے جتنی رائے عامہ ہموار ہو چکی ہے اتنی پہلے کبھی نہیں تھی آج جنگ سے نفرت، جذبوں کے دائرے سے نکل کر حقیقی اور قابلِ عمل مشوروں اور اقدامات کے دائرے میں داخل ہو چکی ہے۔ ہم آج اُس عہد میں رہ رہے ہیں جہاں گولہ وبارود کی گھن گرج کے ساتھ ساتھ

امیدِ سحر کی بات بھی کی جارہی ہے اور یہ بات سنی بھی جارہی ہے۔

جنگ آزما اور امن پسند قوتوں کی باہمی کشمکش کے تناظر میں انسان کے مستقبل کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہے کہ امن کا مقدمہ پرزور طور پر لڑا جائے۔ اِس کے لئے عقل واستدال، تاریخ، سماجیات اور سائنس کے علم سب سے مدد لی جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ آج کی عالمی اور بین المملکی سیاست کو بھی تجزیئے کا موضوع بنایا جائے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ وہ کون سی قوتیں ہیں جو ملک گیری کے ذریعے اپنے مفادات کو حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ عالمی سطح پر اِس وقت گلوبلائزیشن کا دور دورہ ہے جو بیک وقت ایک معاشی، سیاسی، سماجی وثقافتی رجحان ہے۔ اِس رجحان کے تحت نہ صرف سرمایہ پرانی حد بندیوں کو توڑ کر دنیا کے مختلف خطوں کو ایک بڑے بازاری رشتے میں جوڑ رہا ہے، ریاستوں کی خودمختاری تحلیل ہوتی جاتی ہے، اور ترقی یافتہ ذرائع مواصلات نے مختلف معاشروں کے درمیان راہداریاں قائم کر دی ہیں۔ اِسی ماحول میں اسلحے اور تباہیوں کے دیگر سامان نے بھی فروغ پایا ہے اور صنعتِ جنگ گری (War industry) بین الاقوامی سیاست کا ایک اہم فریق اور عامل بن گئی ہے۔ عالمی نقشے سے ہٹ کر جنوبی ایشیا کی سطح پر دیکھیں تو حالات یہاں بھی دگرگوں نظر آتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان جو تقسیم ہند کے وقت کی ذہنی فضا سے ۶۳ سال بعد بھی باہر نہیں نکل سکے، اب بھی ایک بدلی ہوئی دنیا میں اِس دنیا کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے بجائے پرانی عداوتوں کے گرداب ہی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دونوں ملکوں کے مابین کم از کم تین باقاعدہ جنگیں ہو چکی ہیں۔ معاندانہ تعلقات دونوں کو اپنے حقیقی مسائل کی طرف متوجہ ہونے سے روکتے رہتے ہیں۔ دونوں کے درمیان رسمی بات چیت کا ایک دور چلتا ہے اور پھر لمبی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ گو کہ دونوں ملک ماضی میں پانی کی تقسیم کے مسئلے، رن آف کچھ کے علاقے پر موجود تنازعے اور ایسے ہی بعض دوسرے اختلافات کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں اور دونوں کے درمیان اعتمادسازی کے بہت سے معاہدے، سمجھوتے اور اقدامات (Confidence-building measures) بھی موجود ہیں۔ تاہم دونوں کے درمیان معاندانہ تعلقات کی مضبوط گرہیں کسی صورت کھلنے نہیں پا رہیں۔ جنوبی ایشیا جو دنیا کے غریب ترین خطوں میں شامل ہے اپنی بیشتر توانائیاں اور وسائل جنگ کی تیاری کے لئے مختص کرتا ہے۔ ماضی کی جنگوں سے ہندوستان اور پاکستان دونوں کو اگر کچھ حاصل نہیں ہوا تو مستقبل کی

جنگیں یا اُن کے لئے کی جانے والی تیاریاں انہیں کیا دے سکیں گی۔

اِس کتاب میں جنگ اور امن کے موضوعات اپنی تہہ در تہہ جہتوں کے ساتھ زیرِ بحث آئے ہیں۔ یہ کتاب زاہدہ حنا صاحبہ کے مضامین اور کالموں پر مشتمل ہے۔ایک دانشور، ناول وافسانہ نگار، کالم نگار اور مترجم کی حیثیت سے زاہدہ حنا پاکستان اور پاکستان سے باہر علمی وادبی حلقوں، نیز اردو کے اخبار بینوں میں اپنا مناسب تعارف رکھتی ہیں۔دسمبر ۱۹۶۲ء میں اُن کا پہلا مضمون 'یونان دورِ جدید کا پیشرو' کراچی سے نکلنے والے ماہنامہ 'انشا' میں شائع ہوا۔ یہ مضمون سنجیدہ موضوعات سے زاہدہ حنا کی رغبت کا آئینہ دار تھا اور اس سے اُن راستوں کی بھی نشاندہی ہوتی تھی جن پر اُن کو آئندہ اپنے علمی وادبی سفر میں گامزن ہونا تھا۔ گذشتہ تقریباً ۳۸ برسوں میں ان کا یہ سفر ان کو مختلف اصناف کی تجربہ گاہوں میں لے جاتا رہا ہے۔اب تک ان کے بیسیوں افسانے شائع ہو چکے ہیں جو تین مجموعوں 'قیدی سانس لیتا ہے'، 'راہ میں اجل ہے' اور 'تتلیاں ڈھونڈنے والی' میں یکجا ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ان تینوں مجموعوں کے اب تک کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔یہی نہیں بلکہ ان تینوں کے ہندوستانی ایڈیشن بھی چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔اب ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ 'رقصِ بسمل ہے' کے نام سے زیرِ اشاعت ہے۔زاہدہ حنا کا ایک ناول 'نہ جنوں رہا نہ پری رہی' پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی شائع ہوا اور اب اس کا انگریزی ترجمہ All Passion Spent کے نام سے چھپ رہا ہے۔اس ناول کا سندھی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور جلد ہی یہ بھی منظرِ عام پر آ جائے گا۔

زاہدہ حنا صاحبہ کے مضامین کے بھی دو مجموعے 'ضمیر کی آواز' اور 'عورت: زندگی کا زنداں' شائع ہو چکے ہیں۔ان کے علاوہ اُن کا ایک طویل تحقیقی مضمون 'پاکستانی عورت: آزمائش کی نصف صدی' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مضمون ۲۰۰۲ء میں ارتقا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز کے تحت سالانہ 'حمزہ واحد یادگاری لیکچر' کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ مذکورہ بالا مجموعوں میں سے 'ضمیر کی آواز' کی تحریریں امن کے موضوع پر ہونے کے وجہ سے موجودہ کتاب میں بھی شامل کر لی گئی ہیں۔زاہدہ حنا کی زیرِ طبع کتابوں میں 'قرۃ العین حیدر: تحریروں کے آئینے میں' بھی شامل ہے — واضح رہے کہ زاہدہ حنا، قرۃ العین حیدر کے فن کی بہت قدر دان ہیں۔یہی نہیں بلکہ دونوں میں ایک قدرِ مشترک بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ دونوں تخلیق کار فکشن کی تخلیق میں تاریخ وتہذیب کی تحقیق سے

گہرائی پیدا کرتی ہیں۔

زاہدہ حنا کی کالم نگاری بھی کئی عشروں پر پھیلی ہوئی ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۷ء میں روزنامہ 'مشرق' سے کالم نگاری کے سفر کا آغاز کیا۔ 'مشرق' میں اُن کے کالم ۱۹۶۷ء میں چھپے اور یہ سلسلہ ایک سال چلا۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے روزنامہ جنگ میں 'نرم گرم' کے عنوان سے کالم لکھنا شروع کیا۔ جون ۲۰۰۶ء میں یہ کالم روزنامہ 'ایکسپریس' میں منتقل ہوگیا۔ تب سے وہ باقاعدگی سے ہر ہفتے دو کالم 'ایکسپریس' میں لکھتی ہیں۔ اِس کے علاوہ سعودی عرب کے اخبار 'اردو نیوز' اور ہندوستان کے 'بھاسکر' میں بھی ان کے کالم چھپتے ہیں۔ سندھی روزنامہ 'عبرت' میں بھی ان کا ہفتہ وار کالم کئی سال سے شائع ہو رہا ہے۔

زاہدہ حنا نے اپنی تحریروں میں معاشرتی مسائل، سماجی رجحانات اور سیاسی اُتار چڑھاؤ کا جس انداز میں احاطہ کیا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی نبض شناس بھی ہیں اور اُن کی تحریریں معاشرے کی عکاس اور اِس کی ناقد بھی ہیں۔ اُن کی کالم نگاری کو اب بیس، بائیس سال ہو رہے ہیں۔ اِن کالموں میں بے شمار موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ انہی کالموں میں سے امن کے موضوع پر لکھے گئے کالم منتخب کر کے زیرِ نظر کتاب میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کالم اپنی وقعت اور اہمیت خود اپنی زبان سے بیان کریں گے اور قارئین یقیناً اِن کے مطالعے کے بعد اِن کی حقیقی قدر و قیمت سے واقف ہوسکیں گے۔ یہاں میں صرف اِن کے بارے میں اپنی طالبعلمانہ معروضات بہت اختصار کے ساتھ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ میری دانست میں زاہدہ حنا صاحبہ کی اصل طاقت تاریخ اور کلاسیکی ادب کا اُن کا مطالعہ ہے۔ اِس مطالعے نے اُن کو ایک ایسی بصیرت سے ہم کنار کیا ہے جو اُن کو اپنے زمانے کے خدوخال اور اِس میں جاری کش مکشِ حیات کی حرکیات کو سمجھنے کی معتد بہ اہلیت فراہم کر دیتا ہے۔ اِس بصیرت کے ہم رکاب اُن کا تخلیقی ہنر ہے جو برسہا برس سے مختلف افسانوں اور ایک ناول سے ہوتا ہوا اب صیقل ہو چکا ہے۔ اُن کے سماجی شعور اور تخلیقی اُپج دونوں کا امتزاج اُن کے کالموں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اِن کالموں میں نظر کی وسعت اور گہرائی بھی ہے اور طرزِ تحریر کی جاذبیت بھی۔

زاہدہ حنا اپنی بات کو آگے بڑھانے کے لئے صرف ادبی پیرائے اور ضمیر کے حوالے تک محدود نہیں رہتیں بلکہ وہ منطقی استدلال اور اعداد و شمار کے استعمال سے اپنے بیانیے کو مستحکم بھی بناتی

ہیں۔اُن کے کالم بظاہر اخباروں میں چھپنے والے کالم ہی ہیں جو بالعموم عجلت میں اور ایک مقررہ وقت سے پہلے لکھے جانے کے پابند ہوتے ہیں مگر اِن کالموں میں بھی مستقل نوعیت کے مباحث اور دیرپا تجزیے اُن کی منفرد شناخت قائم کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں شامل کوئی ۷۰ کے قریب کالم جنگ اور امن کے موضوعات کو مختلف النوع زاویوں سے زیرِ بحث لاتے ہیں۔ادب اور امن کے درمیان کیا تعلق ہے، امن کی ثقافت کیا ہوتی ہے، سماج میں نزاع اور جنگی جنون کیونکر جگہ بنا پاتا ہے، عورت جنگ سے کیوں سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے، جنگ بازی کے فروغ سے عالمی طاقتوں کی ہوس گیری کا کیا تعلق ہے، امریکا دنیا پر بالادستی کیوں قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے نظری مسائل اِن کالموں میں گہرے مطالعوں کی صورت میں زیرِ بحث آئے ہیں۔ پھر دنیا میں جہاں جہاں جنگ کا بازار گرم کیا گیا اور جہاں جہاں نسلِ انسانی کو تہہِ تیغ کرنے کے نسخے آزمائے گئے اُن خطوں پر بھی زاہدہ حنا نے بڑے پُر اثر کالم تحریر کئے ہیں۔ چنانچہ جاپان جہاں ہیروشیما اور ناگا سا کی جیسی زندہ انسانی بستیاں لمحوں میں خاک میں تبدیل کر دی گئیں، فلسطین جہاں تشدّد صبح و شام کشتوں کے پشتے لگاتا ہے، عراق جس کی ثقافت منگولوں سے لے کر آج کے امریکا تک سب ہی نے تاراج کی، یہ سب خطے اِن کالموں میں اپنے درخشاں ماضی اور پھر اپنے حال کی تباہی و بربادی کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ زاہدہ حنا کا قلم اُس وقت اور بھی زیادہ تاثیر لکھنے لگتا ہے جب برصغیر اُن کا موضوعِ سخن بنتا ہے۔ وہ اِس خطے کی تہذیب کی پروردہ ہیں اور اِس سے اُن کا جذباتی تعلق بہت واضح ہے۔ انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کی آویزش کو ایک عام شہری اور ایک تخلیق کار دونوں حیثیتوں میں برتا ہے۔ وہ اِس آویزش سے خود بھی متاثر ہوئی ہیں اور انہوں نے اِس خطّے کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے اِس آویزش سے متاثر ہونے کا جائزہ بھی لیا ہے۔ سو اُن کے بہت سے کالم اِسی موضوع کا احاطہ کرتے ہیں اور وہ دلائل سے یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان اگر باہمی مذاکرات اور افہام و تفہیم کے ذریعے اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں تو وہ اپنے شہریوں کے لیے ایک مستحسن مستقبل کی ضمانت فراہم کر سکتے ہیں۔

زاہدہ حنا کے اِن کالموں کو شائع کرنے کا پاکستان اسٹڈی سینٹر کا مقصد ایک تو یہی ہے کہ ہم امن کے امکانات کو تحقیق کا موضوع بنانا چاہتے ہیں اور جبکہ دنیا میں بہت سے ادارے دفاعی امور

اور جنگی تیاریوں کو مہمیز کرنے کے لئے کوشاں ہیں، ضرورت اِس بات کی ہے کہ ایسے ادارے بھی سامنے آئیں جو امن کے فروغ اور اُس کی تعلیم کا بیڑہ اٹھائیں۔ دنیا کی بہت سی جامعات میں اب امن کے مطالعے اور اُس پر تحقیق کے لئے تحقیقی ادارے قائم کئے جاتے ہیں اور Peace Studies ایک باقاعدہ مضمون کے طور پر منضبط ہو چکا ہے۔ یہ مضمون پاکستان اسٹڈی سینٹر کے بھی پیشِ نظر ہے اور ہماری کوشش ہے کہ اِس مضمون کی تشکیل کچھ اِس طور کی جائے کہ ہمارے ملک کی تاریخ، ثقافت، ادبیات اور لوک ورثہ میں جو امن کی روایات پائی جاتی ہے اُن کو اُجاگر کر کے باقاعدہ نصابی شکل دی جائے۔ یہی نہیں بلکہ تاریخ، سیاست اور بین الاقوامی امور کے زاویوں سے بھی امن کے موضوع کا احاطہ کیا جائے اور اِس حاصلِ مطالعہ کو بھی نصاب میں متشکل کیا جائے۔ زیرِ نظر کتاب اس سمت میں ایک ابتدائی کاوش ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مستقبل میں ہم امن کے حوالے سے اور خاص طور سے پاکستان کے داخلی اور خارجی تناظر میں امن کے آئیڈیلز کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تصنیف و تالیف کی کوشش جاری رکھیں گے۔ ہماری دانست میں یہ امن پرُ وَرادب اور تحقیقات آج پاکستان کی اہم علمی ضرورت ہیں۔

آخر میں مَیں زاہدہ حنا صاحبہ کا شکریہ ادا کروں گا جنہوں نے پاکستان اسٹڈی سینٹر کو اِن کالموں کی اشاعت کی اجازت دی۔ اِن کالموں کی تلاش، اِن کی پروف خوانی اور اِن کو طباعت کے مرحلے تک پہنچانے کی ذمہ داری صائمہ حیات نے پوری کی ہے جو ہمارے سینٹر کے ساتھ ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔ میں اُن کی محنت کا بھی اعتراف کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ کتاب طالبعلموں، امن کے لئے متحرک اداروں اور افراد اور عام قارئین کے حلقوں میں قبولیت حاصل کرے گی۔

ڈاکٹر سید جعفر احمد

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی
یکم دسمبر ۲۰۱۰ء

ورق تری یاد کے

زیرِنظر کتاب میں شامل تحریروں کے بنیادی موضوعات امنِ عالم، نیوکلیائی ہتھیاروں کی مخالفت اور جنگی جنون کی مزاحمت کا احاطہ کرتے ہیں۔ تحریروں کے اس مجموعے کا نام فیض صاحب کے ایک مصرعے سے مستعار ہے اور ڈاکٹر جعفر احمد اسے کراچی یونیورسٹی کے پاکستان اسٹڈی سینٹر سے شائع کررہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فیض صاحب کی شاعری اور زندگی کا سروکار ہمیشہ امن سے اور انسانوں سے رہا۔ سو کیوں نہ اس کتاب کو سینٹر کی طرف سے شائع ہونے والی سلسلۂ فیض صدی کی کتابوں میں شامل کرلیا جائے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ فرمائش بھی کی کہ اس کا آغاز ذکرِ فیض سے ہو۔

فیض صاحب کے بارے میں سوچتی ہوں تو اخروٹ کی لکڑی سے بنا ہوا جہازی سائز کا ایک صندوق یاد آتا ہے جو ہمارے گھر میں تھا۔ جانے کن ہنرمند انگلیوں نے اخروٹ کی لکڑی کو چھیل کر اور اپنی آنکھوں کا تیل جلا کر کتنے دنوں میں اس پر اتنے سبک گل بوٹے اور پیچیدہ نقش و نگار بنائے تھے۔ اس میں پیتل کے کنڈے لگے ہوئے تھے اور پیتل ہی کا ایک خوبصورت قفل اس میں پڑا رہتا تھا۔ اس صندوق میں خاندانی کاغذات اور قیمتی اشیاء سینت سنبھال کر رکھی جاتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی ہی کھلتا تھا لیکن جب بھی کھلتا میری کوشش یہی ہوتی کہ صندوق کے آس پاس رہوں اور اس میں سے نکلنے والے، زرد پڑ جانے والے کاغذات اور ۲۰ء، ۳۰ء اور ۴۰ء کی دہائی میں بزرگوں کے نام ان دعوت ناموں کو دیکھ سکوں جو صاحب بہادروں کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔ ان میں لنکن انز کی چند ڈگریاں بھی تھیں جن سے قدیم رشتے اور یادیں وابستہ تھیں۔ وہ طلسماتی صندوق جب بھی کھلا میں نے ہر کاغذ کو ہاتھوں میں تھام کر غور سے پڑھا، پھر بھی احساس

کچھ یہی رہا کہ انہیں دیکھ کر بھی نہیں دیکھ پائی اور چھو کر بھی وہ چیزیں کچھ آشنا، کچھ اجنبی رہیں۔

فیض صاحب کو جب پہلی مرتبہ دیکھا اور سنا تو بے اختیار اپنے گھر کا وہ صندوق یاد آیا۔ ویسے ہی ٹھوس، گہرے، ویسے ہی شاندار اور پُراسرار، ویسے ہی کم کم کھلنے والے۔

اس وقت خود اپنی وہ عمر تھی جب ہر مشہور شخص کے گرد ایک طلسمی ہالہ نظر آتا ہے اور اس کی ہر ادا پر نبض تھم تھم جاتی ہے۔ یوں بھی اس زمانے میں ٹی وی نہیں آیا تھا۔ ریڈیو چند گھروں میں ہوتا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر ناپید تھا اور سماج ابھی اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا کہ اداکاروں، کھلاڑیوں اور صداکاروں کو محترم ترین جانے۔ میرے محبوب لوگوں کی فہرست عالموں، شاعروں اور ادیبوں تک محدود تھی۔ مصوروں میں سے زین العابدین اور صادقین تھے جن کا دل پر رعب داب تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب راولپنڈی سازش کیس کب کا نمٹ چکا تھا لیکن اس کے تذکرے باقی تھے۔ فیض صاحب کے ایامِ اسیری کا کلام 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' قبولِ عام حاصل کر رہے تھے اور لوگ انقلاب کی جمالیات سے آشنا ہو رہے تھے۔

جولیس روزنبرگ اور ایتھل روزنبرگ کی موت پر فیض کے مصرعے، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے ...... دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے ...... سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے ...... تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی ...... تیری زلفوں کی مستی برستی رہی ...... تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی ...... دلوں کو گرماتے تھے۔ سزائے موت کے بھیانک پن اور اس کی تاریکی کے مفہوم سے آشنائی پہلی مرتبہ اسی نظم سے ہوئی۔

ان دنوں بحثوں اور گفتگوؤں میں 'پارٹی'، 'انڈر گراؤنڈ'، 'انقلاب' اور 'کمیونسٹ' جیسے الفاظ بار بار سننے میں آتے تھے۔ لفظ 'کمیونسٹ' میں وہ پراسراریت، رومانیت اور انقلاب آفرینی تھی کہ کسی کا کمیونسٹ ہونا بہت عظیم الشان بات لگتی تھی۔ فیض صاحب شاعر تھے، جیل ہو آئے تھے، اس پر سے کمیونسٹ کہے جاتے تھے اس لیے ان کی شخصیت اور زیادہ خواب پرور ہو گئی تھی۔ وہ جب بیگم آمنہ مجید کے پی ای سی ایچ ایس گرلز کالج کے کُل پاکستان مشاعرے میں آئے تو میں اپنے والد اور اپنی دوستوں کے ساتھ ان کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو سن رہی تھی اور اس خیال سے سرشار تھی کہ میں فیض صاحب کو سن رہی ہوں۔ وہ نرم اور مدھم لہجے میں شعر سنا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ان کے شعر جی کو لگ رہے تھے۔ ان کی باتیں سمجھ میں آ رہی

تھیں۔اس کے باوجود محسوس یہی ہورہا تھا کہ وہ پاس ہوکر بھی دور ہیں۔ان کے مصرعے دل میں اتر رہے تھے لیکن ان کے لفظوں میں درد کی جو سمائی تھی وہ پورم پور دل تک نہیں پہنچ رہی تھی۔درد کے قلزم کی شناوری تیرہ برس کی عمر میں یوں بھی ممکن نہیں ہوتی۔

اس پہلی نیاز مندی کے بعدان کے نیاز بار بار حاصل ہوئے۔کبھی سوسائٹی والے گھر میں، کبھی کسی شعری نشست میں اور کبھی کسی محفلِ شب تاب میں۔ بیروت لٹا،اس کے لشکری اجنبی دیاروں میں بکھیر دیے گئے تو کچھ قافلے اپنے اپنے گھروں کو لوٹے۔ان میں فیض تھے۔وہ کراچی آئے تو روشن علی بھیم جی کے گھر پر فیض صاحب کے اعزاز میں ایک محفل سجی۔وہ بھی کیا رات تھی کہ محفل میں دو شمعیں روشن تھیں۔فیض تھے اوران کے دوست اور ہم عصر سبطِ حسن تھے۔اس رات فیض صاحب نے بیروت پر کئی نظمیں سنائیں'دار کی رسیوں کے گلوبند گردن میں پہنے ہوئے...... گانے والے ہر اک روز گاتے رہے...... پائلیں بیڑیوں کی بجاتے ہوئے...... ناچنے والے دھومیں مچاتے رہے'اور'بیروت نگارِ بزم جہاں...... ہر ویراں گھر، ہر ایک کھنڈر......ہم پایۂ قصرِ دارا ہے...... ہر غازی رشکِ سکندر...... ہر دختر ہمسرِ لیلیٰ ہے...... یہ شہر ازل سے قائم ہے...... یہ شہر ابد تک دائم ہے...... بیروت نگارِ بزم جہاں...... بیروت بدیلِ باغ جناں'اور'ہم جیتیں گے......حقا ہم اک دن جیتیں گے...... بالآخر اک دن جیتیں گے......کیا خوف زیلغارِ اعدا...... ہے سینہ سپر ہر غازی کا......کیا خوف زیورشِ جیشِ قضا'

فیض صاحب کے کردار کی صلابت دشمنوں سے بھی خراج لیتی رہی ہے۔ان کا جو پیمان وفا امن کے ساتھ تھا اس کی اس سے بڑی مثال بھلا اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس زمانے میں جب بیروت میں موت کا بسیرا تھا اوراس شہر کے جدی پشتی باشندے اسے چھوڑنے میں عافیت سمجھتے تھے،فیض صاحب بیروت میں بیٹھے رہے اور'کربلائے بیروت' کے لیے نغمے لکھتے رہے:

بیروت نگارِ بزم جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں
بچوں کی ہنستی آنکھوں کے
جو آئینے چکنا چور ہوئے
اب ان کے ستاروں کی لَو سے

اس شہر کی راتیں روشن ہیں
اور رَخشاں ہے ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں

خاک و خون میں ڈوبے ہوئے اس شہر کی تباہ شدہ عمارت میں بیٹھ کر، فلسطین کی تحریک آزادی کے علمی اور ادبی جریدے 'LOTUS' کی ادارت کرتے رہے اور امن کے خواب دیکھتے رہے۔

'امن' سے ان کی وابستگی محض زبانی جمع خرچ نہیں تھی۔ وہ 'امن' کو پوری دنیا کے لیے ایک ہمہ جہت معاملہ سمجھتے تھے۔ ماسکو میں جب انہیں 'لینن امن انعام' دیا گیا تو انہوں نے اس موقع پر ایک تقریر کی تھی، یہ تقریر جو اردو میں کی گئی اس کا سطر بہ سطر ترجمہ روس کی مختلف زبانوں اور انگریزی میں اسی وقت کیا جا رہا تھا تا کہ تقریب میں شریک مندوبین اسے بہ خوبی سمجھ سکیں۔ 'امن' کے بارے میں فیض صاحب نے بات کرتے ہوئے کہا تھا:

'یوں تو ذہنی طور سے مجنون اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سب ہی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور سب ہی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری۔ اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوشمند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیے۔'

آج جب ہم امن کی بات کرتے ہیں اور محض گفت و شنید کے بعد ہماری امن محفلیں برخاست ہو جاتی ہیں، تو ہمیں امن کے موضوع پر فیض کی اس تقریر کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ یہ بات ہمارے سوچنے کی ہے کہ کیا صرف لفظ 'امن' کا ورد کرنے سے، اس موضوع پر سیمینار کا اہتمام کرنے یا مظاہرہ کرنے سے ہم کسی بھی خطے میں کیا واقعی امن قائم کر سکتے ہیں؟ امن کا مسئلہ کیا

انصاف، مساوات، آزادی اور اجتماعی خوشحالی سے جڑا ہوا نہیں ہے؟ کیا ہم کسی بھی خطے کے ناراض لوگوں کو انصاف فراہم کیے بغیر، مساوی مواقع اور مناسب روزگار فراہم کیے بغیر، ان کی عزتِ نفس اور تحریر و تقریر کی آزادی کی بات کیے بغیر امن کی بات کر سکتے ہیں؟

اس سوال کا جواب یقیناً 'نہیں' میں ہے اور شاید اسی لیے ان دنوں امن کی بات کرنے والے اپنے اپنے گھروں کو ناکام لوٹتے ہیں! فیض صاحب خواب دیکھنے اور دکھانے والوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو متحرک تھا اور کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔ فیض صاحب کی انسان دوستی، انصاف پسندی اور امن پروری انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ وہ ماسکو جانے والے تھے اور وہاں جانے سے پہلے افروایشیائی ادیبوں کی تنظیم کا مسئلہ نمٹا دینا چاہتے تھے۔ لاہور سے وہ تمام جید ادیبوں سے باتیں کر کے آئے تھے۔ کراچی میں ان کے عاشق، ان کے محبّ مرزا ظفر الحسن کے گھر پر سبطِ حسن، ہاجرہ مسرور، شوکت صدیقی، حسن عابدی، جونؔ ایلیا اور دوسرے ترقی پسند ادیب جمع ہوئے۔ تنظیمی ڈھانچے پر باتیں ہوئیں۔ فیض صاحب، سبطے بھائی سے اصرار کر رہے تھے کہ کراچی میں انجمن کے قیام کی ذمہ داری وہ سنبھالیں اور سبطے بھائی یہ ذمہ داری شوکت صدیقی کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ شاعروں کی تنظیمی صلاحیت کی میں کوئی خاص قائل نہیں ہوں لیکن اس شام مجھے اندازہ ہوا کہ فیض صاحب ان معاملات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور کیوں نہ رکھتے ایک عرصے تک وہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں سے وابستہ رہے تھے۔

فیض صاحب سے آخری ملاقات عجب طور ہوئی۔ سردیوں کی شام تھی۔ سات بجے کے لگ بھگ کچھ لکھتے لکھتے ایک کتاب کے حوالے کی فوری ضرورت پڑی۔ مجھے یاد تھا کہ وہ کتاب غالب لائبریری میں ہے۔ لائبریری کے بند ہونے کا وقت قریب تھا اور علاقے میں کرفیو لگنے کا وقت بھی ہو چلا تھا۔ غالب لائبریری ناظم آباد میں ہے اور ناظم آباد شہر کے ان علاقوں میں سے ایک ہے جو عموماً فساد زدہ رہتے ہیں۔ ایسے کڑے وقت میں ندیم اختر نے حسبِ عادت مشکل کشائی کی اور آندھی اور طوفان کی طرح گاڑی اڑا کر مجھے غالب لائبریری لے گئے۔

میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچی تو دروازے کے سامنے ہی بڑی میز کے گرد پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر فیض صاحب بیٹھے تھے۔ ساتھ میں شان الحق حقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مشفق خواجہ، ڈاکٹر معین الدین عقیل اور کچھ اور لوگ بھی تھے۔ غالب لائبریری کے روح

انصاف، مساوات، آزادی اور اجتماعی خوشحالی سے جڑا ہوا نہیں ہے؟ کیا ہم کسی بھی خطے کے ناراض لوگوں کو انصاف فراہم کیے بغیر، مساوی مواقع اور مناسب روزگار فراہم کیے بغیر، ان کی عزتِ نفس اور تحریر وتقریر کی آزادی کی بات کیے بغیر امن کی بات کر سکتے ہیں؟

اس سوال کا جواب یقیناً 'نہیں' میں ہے اور شاید اسی لیے ان دنوں امن کی بات کرنے والے اپنے اپنے گھروں کو ناکام لوٹتے ہیں! فیض صاحب خواب دیکھنے اور دکھانے والوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو متحرک تھا اور کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔ فیض صاحب کی انسان دوستی، انصاف پسندی اور امن پروری انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ وہ ماسکو جانے والے تھے اور وہاں جانے سے پہلے افروایشیائی ادیبوں کی تنظیم کا مسئلہ نمٹا دینا چاہتے تھے۔ لاہور سے وہ تمام جید ادیبوں سے باتیں کر کے آئے تھے۔ کراچی میں ان کے عاشق، ان کے محبّ مرزا ظفر الحسن کے گھر پر سبطِ حسن، ہاجرہ مسرور، شوکت صدیقی، حسن عابدی، جونؔ ایلیا اور دوسرے ترقی پسند ادیب جمع ہوئے۔ تنظیمی ڈھانچے پر باتیں ہوئیں۔ فیض صاحب، سبطے بھائی سے اصرار کر رہے تھے کہ کراچی میں انجمن کے قیام کی ذمہ داری وہ سنبھالیں اور سبطے بھائی یہ ذمہ داری شوکت صدیقی کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ شاعروں کی تنظیمی صلاحیت کی میں کوئی خاص قائل نہیں ہوں لیکن اس شام مجھے اندازہ ہوا کہ فیض صاحب ان معاملات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور کیوں نہ رکھتے ایک عرصے تک وہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں سے وابستہ رہے تھے۔

فیض صاحب سے آخری ملاقات عجب طور ہوئی۔ سردیوں کی شام تھی۔ سات بجے کے لگ بھگ کچھ لکھتے لکھتے ایک کتاب کے حوالے کی فوری ضرورت پڑی۔ مجھے یاد تھا کہ وہ کتاب غالب لائبریری میں ہے۔ لائبریری کے بند ہونے کا وقت قریب تھا اور علاقے میں کرفیو لگنے کا وقت بھی ہو چلا تھا۔ غالب لائبریری ناظم آباد میں ہے اور ناظم آباد شہر کے ان علاقوں میں سے ایک ہے جو عموماً فساد زدہ رہتے ہیں۔ ایسے کڑے وقت میں ندیم اختر نے حسب عادت مشکل کشائی کی اور آندھی اور طوفان کی طرح گاڑی اڑا کر مجھے غالب لائبریری لے گئے۔

میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچی تو دروازے کے سامنے ہی بڑی میز کے گرد پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر فیض صاحب بیٹھے تھے۔ ساتھ میں شان الحق حقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مشفق خواجہ، ڈاکٹر معین الدین عقیل اور کچھ اور لوگ بھی تھے۔ غالب لائبریری کے روح

رواں اور فیض صاحب کے عاشق مرزا ظفر الحسن راہیٔ ملکِ عدم ہو چکے تھے اور میٹنگ ان کی رخصت سے پیدا ہونے والے مسائل کو سلجھانے اور غالب لائبریری کو مناسب طور پر چلاتے رہنے کے لیے ہو رہی تھی۔

فیض صاحب کو دیکھتے ہی مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس مرتبہ فیض صاحب کو شہر میں آئے ہوئے دو ڈھائی ہفتے گزر چکے تھے لیکن میں ابھی تک ان کی مزاج پُرسی کو نہیں گئی تھی۔ میں نے انہیں اور سب کو آداب کیا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے، گلے لگایا، پیشانی چومی۔ ملاقات نہ کرنے کی شکایت کی پھر کہنے لگے 'ہم کل جا رہے ہیں۔ اب اگلے مہینے آئیں گے۔ تمہارے لیے ایک تحفہ خیال میں ہے۔ آنے پر دیں گے۔'

میں نے گھبراہٹ میں جانے ان سے کیا کہا۔ تحفہ دینے کے وعدے کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ ان سے رخصت ہو کر جس کتاب کی تلاش میں آئی تھی اسے ڈھونڈنے میں لگ گئی اور وہ چلے گئے۔ اس لمحے میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ انہیں آخری بار دیکھا ہے۔

ایک مہینے بعد جس دن انہیں دوپہر کی فلائٹ سے کراچی آنا تھا اسی روز ان کی سناؤنی آئی اور انہی کی زبان میں یوں محسوس ہوا 'جیسے پھول مرجھا گئے ہیں سارے...... تھمتے نہیں ہیں آسماں کے آنسو...... شمعیں بے نور ہو گئی ہیں...... آئینے چُور ہو گئے ہیں۔'

وہ رات جو ان کے غیر موجود ہونے کے بعد آئی' اس رات میں نے سوچا کہ فیض صاحب کو اگر ان کے بدن سے الگ کر دیا جاتا اور پھر انہیں کسی شیشے میں محفوظ کر لیا جاتا تو بے بدن فیض صاحب اس شیشے میں کیسے لگتے؟ کس طرح نظر آتے؟ مجھے یقین ہے کہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو وہ شیشہ قوسِ قزح کے تمام رنگوں، جگنوؤں کی چمک، خوشبوؤں کے غبار اور سات سُروں کی پھوار سے بھر جاتا۔

فیض صاحب نے ابتدا سے انتہا تک، زندگی اسی خواہش میں گزار دی کہ وہ تمام انسانوں کا ہاتھ تھام کر اس طلمسی دروازے میں سے گزر جائیں جو امن و سلامتی کی اور انصاف و برابری کی راج دھانی میں کھلتا ہے اور جہاں 'امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت۔ دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ۔ شاعر کا قلم اور مصور کا موئے قلم۔'

وہ اس طلسمی دروازے کو جانے والا راستہ جانتے تو تھے لیکن اپنی زندگی میں وہ اپنے لوگوں کو زرد پتوں کے بَن سے نکال کر اس طلسمی دروازے کے اندر نہ لے سکے جس کا انہیں بے پایاں قلق اور بے حساب ملال تھا لیکن ان کے دل میں امید کا دیا اسی طرح روشن رہا 'جب ظلم وستم کے کوہِ گراں۔ روئی کی طرح اڑ جائیں گے...... ہم محکوموں کے پاؤں تلے جب دھرتی دھڑ دھڑ، دھڑ کے گی......اور اہلِ حَکم کے سر اوپر...... جب بجلی کڑ کڑ، کڑ کے گی...... جب ارضِ خدا کے کعبے سے......سب بت اٹھوائے جائیں گے......ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم مسند پہ بٹھائے جائیں گے۔'

فیض صاحب کی رخصت کی اذیت پر جب صبح وشام کی راکھ جمی تو مجھے ان کے اس وعدے کا خیال آیا جو انہوں نے مجھ سے آخری ملاقات میں کیا تھا۔ دل میں ایک کھٹک سی رہی کہ جانے فیض صاحب کی 'تمہارے لیے ایک تحفہ خیال میں ہے' سے کیا مراد تھی۔

ان کی موت کے مہینے یا شاید ڈیڑھ مہینے بعد ایک روز اچانک نصیر ترابی کا فون آیا۔ اس فون سے مجھے اندازہ ہوا کہ فیض صاحب وعدے کے کتنے کھرے تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے لیے کون سا تحفہ ان کے خیال میں تھا۔ نصیر نے بتایا کہ ختم ہونے سے ایک روز پہلے میری کہانی 'بود و نبود کا آشوب' کا انگریزی ترجمہ 'The Torture of to be or Not to be' کے عنوان سے 'Lotus' کے لیے مکمل کیا تھا۔ یہ ان کے قلم سے نکلنے والی آخری تحریر تھی۔ ایلس فیض کو اس کا ڈرافٹ ٹائپ کے لیے دیا تھا لیکن موت نے ٹائپ شدہ مسودہ دیکھنے کی مہلت نہ دی۔

یہ سب کچھ جان کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فیض صاحب نے غالب لائبریری کی چھت کے نیچے میری پیشانی چوم کر جب 'تحفے' کا وعدہ کیا تھا تو دراصل بزبانِ خامشی انہوں نے مجھ سے ایک وعدہ بھی لیا تھا۔ اپنا قبلہ درست رکھنے اور مظلوموں کے قبیلے سے جڑے ہوئے رہنے کا وعدہ، قلم سے رشتہ استوار رکھنے اور انسانوں کے لیے لکھتے رہنے کا وعدہ۔

میرے لیے یہ اتنا بڑا اعزاز، اتنا بڑا انعام تھا کہ اسے یاد کرتے ہوئے اس وقت بھی میرا قلم گلوگیر ہے۔

یادوں کے نقشیں صندوق میں فیض صاحب سے وابستہ بہت سی یادیں محفوظ ہیں اور اب جبکہ وہ چلے گئے ہیں، اتنے قریب لگتے ہیں جیسے کہیں گئے نہ ہوں، سامنے آ بیٹھے ہوں۔ ان کو یاد کرتے ہوئے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ جب جسم و جاں سے روح کی ریشمی کرہت کا آخری ٹانکا

ٹوٹ کر الگ ہو رہا ہوگا تو کیا اپنی آنکھوں سے انہوں نے اس شہِ شمشاد قداں، خسرو شیریں دہناں کو اپنے آپ پر جھکتے ہوئے دیکھا ہوگا جس کی موت پر انہوں نے بلک کر کہا تھا 'دور جا کر قریب ہو جتنے...... ہم سے کب تم قریب تھے اتنے...... اب نہ آؤ گے تم نہ جاؤ گے...... وصل و ہجراں بہم ہوئے کتنے' جی یہی چاہتا ہے کہ اس آخری لمحے میں ان کے قاتل، انکے دلدار، ان کے مسیحا کا الیوژن ان کے پاس رہا ہو اور بند لبوں سے اور ٹھہرتے ہوئے دل کی دھڑکنوں سے انہوں نے اس الیوژن کو یاد دلایا ہو، 'بالیں پہ کہیں رات ڈھل رہی ہے یا شمع پگھل رہی ہے...... پہلو میں کوئی چیز جل رہی ہے، تم ہو کہ مری جاں نکل رہی ہے' اور پھر اس الیوژن کا ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے سو گئے ہوں۔ تھک کر یونہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی...... سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا۔

زاہدہ حنا

کراچی
۱۵/نومبر ۲۰۱۰ء

ضمیر کی آواز

ہماری دنیا ۱۶ر جولائی ۱۹۴۵ء کو ہونے والے پہلے کامیاب ایٹمی تجربے کے بعد 'ایٹمی دور' میں داخل ہوئی اور اس کے صرف بیس دن بعد ۶ راگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشیما پر دنیا کا پہلا ایٹم بم گرادیا گیا۔

ہیروشیما اور ناگاساکی کے ذبیحے کے فوراً بعد ملکوں اور قوموں میں مہلک ترین ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کی دوڑ لگ گئی۔ ان ہی دنوں برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس نئی اور نظریاتی مملکت کے وجود میں آنے کے فوراً بعد اعلیٰ سِول اور فوجی حکام نے ہتھیاروں کے حصول کے لیے گوئٹے کے فاؤسٹ کی طرح پاکستان کی روح مغربی طاقتوں کے ہاتھ فروخت کردی۔ امریکا سے پاکستان کی سول اور فوجی نوکرشاہی کا عقدِ زفاف ہو چکا تھا، الفت کے دن تھے اور وصلت کی راتیں۔ جنگی جنون اور ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کے خلاف ساری دنیا کے ادیب اور دانشور اپنے شدید ردِعمل کا اظہار کر رہے تھے لیکن پاکستان میں تخلیقی سطح پر احتجاج کی یہ آواز بہت مدھم تھی۔ امن اور انسانی حقوق کی بات کرنے والے 'غدار' کہلاتے اور سماج میں انہیں 'عفریت' کے طور پر پیش کیا جاتا۔ حکومت پاکستان نے انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی عائد کر دی تھی اور بہت سے ادیب قید و بند کی صعوبتوں سے خوفزدہ ہو کر ان موضوعات پر لکھنے سے کنارہ کرنے میں عافیت محسوس کر رہے تھے۔ وہ ادیب اور شاعر جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر لکھ رہے تھے ان کی تحریروں کی اشاعت ایک مسئلہ تھی۔

یہی وہ زمانہ ہے جب پاکستان کی مقتی اور خاکی انتظامیہ نے بغداد پیکٹ، سیٹو اور سینٹو جیسے معاہدوں کے ذریعہ ملک کو امریکا کی طفیلی ریاست بنادیا۔ 'کمیونزم کی یلغار' کے آگے بند باندھنے کے لیے بہت سے ادیب، دانشور اور صحافی پیش منظر پر نمودار ہوئے، ادب جو اپنی بنیاد میں سیکولر

ہوتا ہے، اسے بھی 'اسلامی' اور 'پاکستانی' کا نام دیا گیا۔ فوج جو ۱۹۵۲ء سے پس پردہ رہ کر ملکی معاملات میں دخیل تھی، اکتوبر ۱۹۵۸ء میں براہ راست اقتدار پر قابض ہوگئی۔ ملک کی ترقی پسند قوتیں روز بہ روز کمزور تر ہوتی گئیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ نے ہندوستان کی صورت میں پاکستان کی خاکی اور مفتی نوکر شاہی کو ایک 'ازلی اور ابدی دشمن' فراہم کر دیا۔ اسلحے کے ڈھیر لگتے گئے، جنگی جنون کو 'حب الوطن' اور ملک کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے نام پر بڑھایا گیا۔ مشرقی پاکستان کے جمہوری حقوق غصب کیے گئے، ۱۹۷۰ء میں ہونے والے انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے کی بجائے وہاں کی عوامی جدوجہد کو طاقت کے ذریعہ کچلا گیا۔ ۱۹۷۱ء کے سانحے کے بعد ہندوستان دشمنی کو مزید فروغ ہوا۔ ۱۹۷۴ء میں مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں ہندوستان نے پہلا ایٹمی دھماکہ کیا۔ پاکستان میں 'جوابی کارروائی' کے لیے شور مچ گیا۔ یوں بھی ۱۹۶۶ء سے پاکستان کی مقتدر اشرافیہ اپنا فیصلہ ایٹم بم بنانے کے حق میں دے چکی تھی، چنانچہ مسز اندرا گاندھی کے اس اقدام نے پاکستان کی مقتدر اشرافیہ کے ہاتھ مضبوط کیے۔ ہندوستان نے ۱۱ رمئی ۱۹۹۸ء کو ایٹمی طاقت بننے کا اعلان کیا تو پاکستان میں یہ کہنے والے دانشوروں اور ادیبوں کا کال تھا کہ اگر ہندوستان کی رجعت پسند حکومت نے ایک غلط فیصلہ کیا ہے تو ہم اس کی پیروی کیوں کریں؟ کیا عوام اور کیا خواص، سب ہی 'ساتویں ایٹمی طاقت' بن بیٹھنے کے لیے بیتاب تھے۔ چنانچہ ۲۸ رمئی ۱۹۹۸ء کو پاکستان کی طرف سے ایٹمی طاقت بن جانے کے اعلان کے ساتھ ہی ملک میں ایک عظیم الشان جشن منایا گیا جو ہفتوں جاری رہا۔

برصغیر میں اس ایٹمی عفریت کی پیدائش سے پہلے مئی کے مہینے کو میں برصغیر کے ایک قوم پرست شہری کے طور پر دیکھتی تھی۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ......

☆ یہ ۲۲ مئی ۱۴۹۸ء کا دن تھا جب واسکوڈے گاما نے اپنے ملاحوں اور جہازیوں کے ساتھ برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھا اور ہندوستان پر نوآبادیاتی تسلط کے بیج بوئے گئے۔

☆ یہ ۴ مئی ۱۷۸۸ء کی تاریخ تھی جب ہندوستان میں برطانوی استعمار کو زچ کر دینے اور اس کے خلاف جی جان سے لڑنے والے قوم پرست ٹیپو نے میدان جنگ میں اپنی زندگی ہار دی اور اس کے ساتھ ہی انگریزوں کو ہندوستان پر راج کرنے کی چھٹی مل گئی۔

☆ یہ ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کی رات تھی جب برطانوی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لیے میرٹھ

کے شہر میں وہ شعلہ لپکا جو ہندوستان کے طول وعرض میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا، جسے انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ میں آج بھی 'غدر' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور ہم جسے 'جنگ آزادی' کا نام دیتے ہیں۔

۱۰رمئی ۱۹۹۸ء کے بعد میرے لیے اس مہینے کی معنویت یکسر بدل گئی کیونکہ یہ ۱۱رمئی ۱۹۹۸ء کی دوپہر تھی جب ہندوستان کی انتہاپسند سیاسی جماعت بی۔ جے۔ پی کی اقلیتی حکومت کے معتدل، نرم مزاج، شائستہ اور شاعر وزیراعظم نے برصغیر میں ایٹمی اسلحہ کی اس دوڑ کا آغاز کردیا جو...... میرے منہ میں خاک...... اس خوبصورت اور خیال انگیز خطے کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتی ہے اور پھر ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو پاکستان بھی ایٹمی اسلحے کی اس دوڑ میں شامل ہوگیا۔

یہ درست ہے کہ ۱۹۷۴ء میں مسز گاندھی اور ۱۹۹۸ء میں اٹل بہاری واجپائی نے 'ایٹمی پہل کاری' سے کام لیا اور پاکستان کو اس میدان میں اپنے 'جوہر' دکھانے کا موقع دیا۔ اس کے باوجود ہمیں یہ حقائق بھی فراموش نہیں کرنے چاہئیں کہ یہ ایوب کابینہ میں شامل ایندھن، بجلی اور قدرتی وسائل کے جواں سال اور دانشور وزیر ذوالفقار علی بھٹو تھے جنہوں نے ۱۹۶۶ء میں کہا تھا کہ اگر ہندوستان نے ایٹم بم بنایا تو پاکستان بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں رہے گا۔ انہوں نے کہا تھا......'اگر پاکستانیوں کو گھاس کھانی پڑی تب بھی ہم (ایٹم) بم بنائیں گے۔' ان کا یہ جملہ پاکستان میں آج تک دہرایا جاتا ہے۔ پاکستان نے اپنی اسی پالیسی کے تحت ۱۹۶۸ء میں این۔ پی۔ ٹی (Non-Proliferation Treaty) پر دستخط کرنے سے انکار کردیا تھا اور اپنا نیوکلیئر آپشن کھلا رکھا تھا۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۶۹ء میں ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کا جواز یوں دیا تھا کہ...... 'ہمارے عہد کی تمام جنگیں مکمل جنگیں ہو چکی ہیں۔ ہمیں یہ فرض کرنا چاہیے کہ پاکستان پر اگر کوئی جنگ مسلط کی گئی تو وہ ایک مکمل جنگ (نیست ونابود کردینے والی) میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اگر ہم نے اس کے لیے کم تیاری کی تو وہ خطرناک ہوگی۔ ہمیں اپنے منصوبے میں نیوکلیائی مزاحمت کو بھی شامل کرنا ہوگا۔' انہوں نے ۱۹۷۲ء میں صدرِ پاکستان کی حیثیت سے ملتان میں ایک خفیہ اجلاس کی صدارت کی تھی جس میں پاکستان کے نیوکلیئر سائنسدان، اعلیٰ فوجی اور سول حکام موجود تھے۔ ان لوگوں کے سامنے انہوں نے ایٹم بم تیار کرنے کے اپنے منصوبے کو بیان کیا تھا۔

اب یہ بحث بیکار ہے کہ برصغیر میں ایٹمی جن کو بوتل سے باہر لانے کی زیادہ ذمہ داری کس

کی ہے؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس ایٹمی دوڑ میں فاقہ زدہ ہندوستان اور پاکستان، دونوں ہی ہانپتے کانپتے، گرتے پڑتے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں جبکہ دونوں طرف کے لوگوں کے لیے ۱۱ مئی ۱۹۹۸ء سے پہلے ایٹمی آگ اور نیوکلیائی رات ان سے ہزاروں میل کے فاصلے پر تھی۔ یہ یورپ اور امریکا کا، روس یا چین کا مسئلہ اور معاملہ تھا۔ ہم پاکستان میں رہتے ہوں یا ہندوستان میں، چین و آرام سے سوتے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ اگر دونوں ملکوں میں جنگ ہوئی بھی تو سترہ دن یا بارہ دن کی ٹھائیں ٹھائیں کے بعد دونوں طرف سناٹا ہوگا۔ یہ سمجھتے تھے کہ جنگ ہوئی تو رات کے اندھیرے میں اینٹی ایئر کرافٹ گن کی چھوڑی ہوئی آتش بازی دیکھیں گے اور دن کی روشنی میں کراچی یا دِلّی، لاہور یا امرتسر کے آسمان پر دونوں طرف کے طیاروں کی ڈاگ فائیٹ نظر آئے گی۔ جنگ کے خوف کے باوجود اس کا یقین رہتا تھا کہ گولے گرے بھی تو ہم ضرور بچ جائیں گے، ایک دیوار گر گئی تو نئی دیوار اُٹھالیں گے اور یہ یقین کیوں نہ ہوتا کہ اُمید پر دُنیا قائم ہے۔

لیکن اٹل بہاری واجپائی اور لال کرشن ایڈوانی کو تمام ہندوستانی اور پاکستانی 'دعائیں' دیں گے کہ انہوں نے صلح کی باتوں کو بزدِلی اور جنگجویانہ نعروں کو بہادری سمجھتے ہوئے برصغیر میں نیوکلیائی اسلحے کی دوڑ کا وہ سلسلہ شروع کیا جس کا خاتمہ نہ جانے کب اور کیسے ہوگا۔ شاید بات ہم سب کے خاتمے پر ختم ہو۔

۱۱ مئی ۱۹۹۸ء کے بعد برصغیر میں رہنے والا ہر فرد اپنی آخری سانس تک اس عذاب میں مبتلا رہا کرے گا کہ دنیا کے ہولناک ترین ہتھیار اس کے خطے کے اسلحہ خانوں کی زینت بن چکے۔ یہ عفریت جواب تک نیوکلیائی لیبارٹریوں میں منجمد تھے، پیدا ہو چکے، سانس لے رہے ہیں اور ان کی زہریلی پھنکاریں کلکتہ سے کراچی تک اور لاہور سے دلی تک سب کو صاف سنائی دے رہی ہیں اور ان کی تپش سب ہی محسوس کر رہے ہیں۔ برصغیر جس میں ان نئے ہتھیاروں نے جنم لیا ہے، اس کے دونوں ملکوں کے درمیان ایک سنگین علاقائی تنازعہ موجود ہے۔ اس تنازعہ کے سبب برصغیر میں نصف صدی کے دوران کئی جنگیں ہو چکیں، پاکستان کا ایک حصہ آخری جنگ کے نتیجے میں بنگلہ دیش بن چکا ہے۔ آج بھی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سرحدی جھڑپیں روز کا معمول ہیں، ان جھڑپوں کا نتیجہ دونوں طرف کے بے گناہ شہریوں کی ہلاکت ہوتا ہے جو اِدھر یا اُدھر کی آوارہ گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کی افواج ہمہ وقت ایک دوسرے کے

خلاف صف آرا ہیں اور ان کے درمیان کسی بھی لمحے کوئی ایسا واقعہ ہو سکتا ہے جو بھر پور جنگ میں بدل جائے، ایک ایسی جنگ میں جواب محض روایتی ہتھیاروں سے نہیں لڑی جائے گی۔

ایک ایسے جنگ زدہ خطے میں دونوں ملکوں کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی بعض خوش فہموں کے خیال میں 'طاقت کا توازن' قائم کرتی ہے جبکہ درحقیقت یہ 'دہشت کا توازن' ہے جو دونوں ملکوں کے درمیان قائم ہو گیا ہے۔ اس صورت حال کا منطقی نتیجہ اب یہی نکلے گا کہ دہشت کے اس توازن میں اضافہ ہوتا رہے گا، غریب کے منہ کا نوالہ چھنتا رہے گا اور نیوکلیائی اسلحے کی طاقت و تعداد میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہے گی۔

جنگ کی اور جنگی جنونیوں کی بات کرتے ہوئے مجھے سوئٹزرلینڈ کا ایک شہری جین جیکوئس بیبل یاد آیا۔ بیسویں صدی کے آخری برسوں میں ایک روز اسے خیال آیا کہ ذرا حساب تو لگایا جائے کہ انسان ساڑھے تین ہزار قبل مسیح سے اب تک، یعنی گزشتہ ساڑھے پانچ ہزار برس کے دوران کل کتنے دنوں حالت امن میں رہا ہے۔ مہینوں اور برسوں کی ریاضت کے بعد تاریخ کی کتابوں، اور مختلف زمانوں میں لڑی جانے والی لڑائیوں کے روزنامچوں، یادداشتوں، اخباروں اور رسالوں کو کھنگال کر، پھر جمع تفریق کے مرحلوں سے گزر کر جیکوئس بیبل اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان کی معلوم تاریخ کے ساڑھے پانچ ہزار برسوں کے دوران، صرف ۲۹۲ برس ایسے گزرے ہیں جب دنیا میں کوئی قوم کسی قوم سے، کوئی قبیلہ کسی قبیلے سے اور کوئی ریاست کسی ریاست سے برسر پیکار نہیں تھی۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچنا کچھ مشکل نہیں کہ جنگ حکمرانوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس لیے کہ ان کا اور ان کے وابستگان کا فائدہ اسی میں ہے کہ فوجیں پھلتی پھولتی رہیں، ہتھیاروں کی صنعت ترقی کرتی رہے، ایٹم بم کے بعد ہائیڈروجن بم اور اس سے بھی ہلاکت خیز ہتھیار وجود میں آتے رہیں اور نسل انسانی جنگ کے جہنم کا ایندھن بنی رہے۔ میں اس وقت ترقی یافتہ دنیا میں لگے ہوئے اسلحے کے انبار کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ میرا مسئلہ تو یہ ہے کہ برصغیر میں انتہا پسند حکمران طبقوں کو یہ حق نہیں ملنا چاہیے کہ وہ برصغیر کو نیوکلیائی ہتھیاروں کا ایندھن بنا دیں اور ہماری تاریخ و تہذیب یوں ملیامیٹ ہو جائے جیسے وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ سوا ارب انسان جیسے پیدا ہی اس لیے ہوئے تھے کہ برصغیر کے جنگی جنونیوں کا نوالہ بن جائیں۔

مئی ۱۹۹۸ء کا مہینہ اب برصغیر کے جنگی جنونیوں کی جیت کا ایک 'تاریخی باب' بن چکا ہے۔

یہ وہ دن تھے جب ہندوستان اور پاکستان کے حکمرانوں کو یاد نہیں رہا تھا کہ وہ دنیا کے غریب ترین عوام پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ ان کی مملکتوں میں ۴۰ر کروڑ افراد روزانہ بھوکے سوتے ہیں۔ مزدور بچوں کی کل تعداد ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے، ۲۶ کروڑ انسان طبی سہولتوں اور ۸۳ کروڑ افراد صفائی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ یہاں کے ۵۰ کروڑ انسان غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں اور ان دونوں ملکوں کی دیہاتی عورتیں، اپنے مویشیوں سے کم قیمت میں بیچی اور خریدی جاتی ہیں۔ ان تمام باتوں کو بھلا کر برصغیر کے مقتدرین نے اس خطے کے لوگوں کی مشکلات کم کرنے کی بجائے یہاں نیوکلیائی جہنم بھڑکانے کا اہتمام کیا اور اس کے لیے دونوں طرف سے کھربوں روپے خرچ کیے گئے۔ کوئی بھی باشعور انسان یہ کیسے مان سکتا ہے کہ نیوکلیائی جن کو آزاد کرتے ہوئے برصغیر کے حکمران طبقات ان حقائق سے آگاہ نہیں تھے۔

درج بالا بدترین محرومیوں کے باوجود جنوبی ایشیا دنیا کا سب سے بڑا فوجی خطہ ہے اور ہندوستان اور پاکستان دنیا کی بڑی افواج رکھتے ہیں۔ یہ دونوں ملک جدید ترین اسلحے کی خریداری پر سعودی عرب سے دگنی رقم خرچ کرتے ہیں۔ یہ دنیا کے وہ دو ملک ہیں جنہوں نے سرد جنگ کے خاتمے کے بعد بھی اپنے فوجی اخراجات میں بھاری اضافہ کیا ہے۔ دنیا میں فوجی اخراجات ۵ء۱۴ر فیصد اور پاکستان ۷ فیصد دفاع پر خرچ کرتا ہے، ہندوستان کا فی کس دفاعی خرچ ۱۰ ر ڈالر جبکہ پاکستان کا ۲۶ ڈالر ہے۔

ہندوستان کے پانچ نیوکلیائی دھماکوں نے ساری دُنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ بھی ایک ایسے زمانے میں جب دُنیا میں سرد جنگ کا خاتمہ ہو چکا ہو، تخفیف اسلحہ کی بات کی جارہی ہو، اس پر اصرار کیا جارہا ہو کہ انسانی وسائل کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی ضرورت ہے، کسی ملک کا نیوکلیائی ہتھیار بنانے پر کمر باندھ لینا بہت سے سوالات اُٹھاتا ہے۔ میرے خیال میں ان سوالات کا سب سے اہم حوالہ ہندوستان کی سماجی صورتحال ہے۔

اس نقطہ نظر سے معاملہ کا جائزہ لیں تو ہندوستان اس وقت دنیا کی سب سے بڑی ناخواندہ آبادی کا ملک ہے۔ زیریں صحارائی افریقہ کے پورے براعظم میں جتنے ناخواندہ افراد ہیں، اس سے ڈھائی گنا زیادہ افراد ہندوستان میں ہیں۔ کروڑوں کو پینے کے لیے صاف پانی نہیں ملتا اور ۷۰ فیصد آبادی کو صفائی کی بنیادی سہولتیں نہیں میسّر ہیں۔ دنیا بھر کے کوئی ایک تہائی انتہائی غریب

افراد ہندوستان میں بستے ہیں اور سب سے زیادہ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے ۲۴ فیصد غریب، انتہائی غربت کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ان کی یومیہ آمدنی ایک ڈالر سے بھی کم ہے اور ان میں سے دو تہائی لوگ اس قدر زیادہ غریب ہیں کہ وہ تعلیم اور صحت کی ان کم سے کم سہولتوں سے بھی محروم ہیں جو انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہیں۔انسانی ترقی کے اشاریے کے لحاظ سے ۱۷۴ ملکوں میں ہندوستان کا نمبر ۱۳۵ رواں ہے۔

ہندوستان میں انسانی محرومیوں کا سب سے بڑا نشانہ عورتیں اور بچے ہیں۔اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں......

☆ پانچ سال سے کم عمر ۲۶ ملین بچے ناقص غذائیت کا شکار ہیں۔
☆ ۱۶ رسال سے کم عمر بچوں میں ایک تہائی کو مجبوراً محنت مزدوری کرنا پڑتی ہے۔
☆ ۱۵ رسے ۴۹ کے درمیان عمر کی ۸۸ فیصد حاملہ عورتیں قلت خون کے مرض میں مبتلا ہیں۔
☆ بالغ عورتوں کی دو تہائی تعداد ناخواندہ ہے۔

ہندوستان میں بیروزگاری ایک سنگین مسئلہ بنتی جارہی ہے۔اگرچہ بیروزگاروں کے صحیح اعداد و شمار کا اندازہ لگانا مشکل ہے تاہم تقریباً ۷ رملین افراد کا ہر سال لیبر فورس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور وہ زیادہ تر تعلیم یافتہ یا ہنر مند ہیں۔لیکن معاشی ترقی اس رفتار سے نہیں ہو رہی کہ ضرورت کے مطابق ذرائع روزگار میں اضافہ ہو سکے۔ چنانچہ بیروزگاری میں اضافہ ہونا ایک لازمی امر ہے۔ ۱۹۹۶ء کی انسانی وسائل کی ترقی کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں ۸۰ کی دہائی سے روزگار میں ۲ فیصد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں لیبر فورس ۳ فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ ہونے کے باوجود بیروزگاری اور نیم بیروزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ملازمتوں کے مواقع کی فراہمی معاشی ترقی کو انسانی زندگیوں سے مربوط کرنے والی اہم ترین حکمت عملی ہے۔ ہندوستان اور متعدد دوسرے ترقی پذیر ممالک میں بیروزگاری جس رفتار سے بڑھ رہی ہے، اس نے آبادی کی اکثریت کو شدت سے غیر مطمئن کر رکھا ہے۔

یہ ایک غریب اور پس ماندہ سماج کی تصویر ہے جو اعداد و شمار کی روشنی میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ایک طرف ہندوستان کا یہ رُخ ہے، دوسری طرف یہی ہندوستان گزشتہ ۵۰ برسوں سے

۶ فیصد سالانہ کے حساب سے اپنے دفاعی اخراجات میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے۔ تین سال پہلے تک ہندوستان کے پاس ۳۴۰۰ جنگی ٹینک، ۷۷۰ لڑاکا ہوائی جہاز، ۲ طیارہ بردار جنگی جہاز، ۱۵/آب دوزیں، تارپیڈو کو تباہ کرنے والے ۵ جہاز موجود تھے۔ وہ ایک طیارہ بردار جہاز، ۴ نئی آب دوزیں اور متعدد دیگر نہایت مہلک اور بے پناہ قیمتی جنگی جہاز اور دوسرے ہتھیار خریدنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا، اور گزشتہ برس یعنی ۱۹۹۹ء--۲۰۰۰ء کے ہندوستانی بجٹ میں 'ملکی سلامتی' کے نام پر دفاعی اخراجات میں پہلے کی نسبت ۵۱/ارب روپے کا اضافہ کیا گیا ہے جس سے ہندوستان کے دفاعی بجٹ کی مجموعی مالیت ۴ کھرب ۱۲/ارب روپے ہوگئی ہے۔

ہندوستان سے شائع ہونے والے رسالے 'انڈین سوشل انسٹی ٹیوٹ بلیٹن' نے جون ۱۹۹۸ء میں اپنا اداریہ اسی موضوع پر تحریر کیا ہے اور یہ سوال اُٹھایا ہے کہ......

> ہمیں پوکھران دھماکوں کی کیا واقعی ضرورت تھی؟ یہ سوال ہندوستان کے کئی سنجیدہ شہری پوچھ چکے ہیں اور انہیں ابھی تک اس کا تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ یہ سچ ہے کہ ایٹمی دھماکوں کا قومی جوش و جذبے کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ ذرائع ابلاغ، سرکاری افسر، تاجر، کاروباری اور متوسط طبقے نے سڑکوں پر نکل کر جشن منایا۔ ہندوستان کی برسر اقتدار جماعت کا کہنا تھا کہ ۱۱/مئی کو قومی یوم فخر کے طور پر منانا چاہیے۔ جنہوں نے ایٹمی دھماکوں کی مخالفت کی یا کسی بھی سطح پر مختلف رائے کا اظہار کیا انہیں 'قوم دشمن' اور 'وطن دشمن' ٹھہرایا گیا۔ ایٹمی دھماکوں کو ہندوستان کی جدید تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیا گیا۔
>
> ایٹمی ہتھیار بڑے پیمانے پر انسانی تباہی کے ہتھیار ہیں۔ ان سے کرۂ عرض پر انسانی زندگی کی بقا خطرے میں پڑسکتی ہے۔ اس تباہی کا سب سے پہلا شکار معصوم شہری ہوتے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے دلخراش سانحوں سے ہم سب ہی واقف ہیں۔ یہ بم ان ایٹمی ہتھیاروں سے طاقت میں کہیں کم تھے جو اس وقت ہمارے پاس ہیں۔ لیکن پھر بھی ان بموں نے دو لاکھ انسانوں کو ہلاک کر ڈالا اور جغرافیائی اور ماحولیاتی

اعتبار سے نا قابل تلافی نقصان پہنچایا۔

بھارت کے ایک جریدے 'آؤٹ لک' نے اپنی ۲۵ مئی ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں اندازہ لگایا تھا کہ......

'اگر دہلی پر بم گرے تو ۹۰ لاکھ انسان ہلاک ہو جائیں گے جبکہ بمبئی میں مرنے والوں کی تعداد ۸۹ لاکھ ہوگی۔ زیر زمین پانی اور دریاؤں پر اثرات تباہ کن ہوں گے۔ زمین کو بھی شدید نقصان پہنچے گا۔ کیا کوئی بھی ملک اتنی عظیم تباہی پھیلانے والے ہتھیار رکھنے کا جواز فراہم کرسکتا ہے؟'

ہمارا ملک ایک بہت غریب ملک ہے۔ یہاں بھوک، ناخواندگی، پینے کے صاف پانی اور روزگار کی کمی ہے۔ ہمارے پانچ سال کی عمر تک کے ۶۰ لاکھ بچے ناقص غذائیت کا شکار ہیں۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہماری ۴۸ فیصد آبادی اَن پڑھ ہے۔ ہمیں تو ابھی بہت سی منزلیں سر کرنا ہیں۔ اسکول بنانے ہیں، ہمارے بچوں کو رہنے کے لیے گھر درکار ہیں۔ بھوک پیاس کا خاتمہ کرنا ہے اور بنیادی اقتصادی ڈھانچہ تعمیر کرنا ہے تا کہ ملک ترقی کر سکے۔ ایٹمی ہتھیار بہت مہنگے ہیں۔ ان کی تیاری کے لیے بہت رقم درکار ہے جس کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے۔ پھر ان ہتھیاروں کا کیا فائدہ؟ جب بھی کوئی ملک ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری، حصول یا تجربات کی راہ پر قدم رکھتا ہے تو وہ دراصل انسانی تباہی کے راستے پر چل نکلتا ہے۔ کیا یہ راستہ درست ہے؟ یہ سوال ہم سب سے جواب کا طلبگار ہے۔

ادھر پاکستان ہے جو ہر وقت بھیک کا پیالہ لیے ہوئے بین الاقوامی ایجنسیوں کے سامنے کھڑا رہتا ہے جبکہ ایک اندازے کے مطابق اس نے گذشتہ بیس برس میں صرف اپنے نیوکلیائی ہتھیاروں سے متعلق تجربات اور تیاری پر چھ کھرب روپوں سے زیادہ خرچ کیے ہیں۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس وقت سندھ کے قحط زدہ علاقوں میں ٹی۔ بی کے لاکھوں مریضوں کے علاج کے لیے صرف ۲۵ کروڑ روپوں کی ضرورت ہے جو ہماری دیالو دھنوان حکومت پاکستان فراہم نہیں کر سکی ہے، اور کرے بھی تو کیسے؟ فوجی اخراجات سے 'دفاع وطن' کی ضروریات سے کچھ بچے تو سہی۔

پاکستان کا دفاعی بجٹ ہمیشہ ایک سربستہ راز رہا ہے۔ اس کے چند نکات جو ہمارے علم میں ہیں، ان کے مطابق ۱۹۹۶ء میں ۱۱/ارب روپے پنشنوں پر خرچ ہوئے، ۱۹۹۷ء میں یہ رقم بڑھ کر ۱۴/ارب روپے ہوگئی تھی اور ۲۰۰۰ء۔۲۰۰۱ء کے بجٹ میں پنشن اور تنخواہوں کی مد میں یہ رقم بڑھ کر ۲۶، ارب ہوگئی ہے اسے بھی دفاعی بجٹ سے نکال کر شہریوں کے اخراجات میں دکھایا گیا ہے۔ صرف اس لیے کہ یہ کہا جاسکے کہ ہم نے دفاعی اخراجات میں کمی کر دی ہے جبکہ حقیقتاً ان اخراجات میں اضافہ کیا گیا ہے۔ پاکستان ۱۹۴۹ء۔۱۹۵۰ء میں اپنی جی۔ڈی۔ پی کا ۲ء۳/فیصد دفاع پر خرچ کرتا تھا۔ ۱۹۹۶ء۔۱۹۹۷ء میں یہ بڑھ کر ۷/فیصد ہو گیا اور ۱۹۹۷ء۔۱۹۹۸ء میں یہ خرچ ۹ء۷ فیصد تک جا پہنچا۔ پاکستانی فوج کا خرچ، جسے ریٹائرڈ جنرل حمید گل دنیا کی سب سے بڑی جہادی تنظیم کہتے ہیں، ۱۹۷۶ء میں ایک ارب بارہ کڑوڑ روپے خرچ کرتی تھی۔ ۱۹۹۶ء۔۱۹۹۷ء میں یہ رقم ایک کھرب روپے ہوگئی، یعنی ۲۰ برس میں صرف ۱۱۵/فیصد کا اضافہ ہوا اور اس سال جب وزیر خزانہ اعداد وشمار کا ہیر پھیر دکھاتے ہوئے دفاعی بجٹ میں کمی کا اعلان کر رہے تھے، عین اُسی وقت بجٹ دستاویزات میں دفاع کے شعبے میں پچھلے سال کی نسبت ۱۵/ارب روپے کا اضافہ دکھایا گیا تھا اور اگر شہری اخراجات میں ڈالی جانے والی رقم بھی شامل کر لی جائے تو دفاعی بجٹ ایک کھرب ۵۹/ارب ۵۸ کروڑ تک جا پہنچتا ہے۔

پاکستان کی موجودہ فوجی حکومت کے ایک وزیر، قلمدان وزارت سنبھالنے سے پہلے بے پناہ دفاعی اخراجات کے نکتہ چینیوں میں سے تھے، انہوں نے حلف یافتہ ہونے سے پہلے یہ لکھا تھا کہ فوج بہت سے ایسے اخراجات بھی کرتی ہے جو دفاعی بجٹ کے لیے مخصوص ہونے والی رقم سے سوا ہے۔ انہوں نے یہ لکھا تھا کہ ہمیں یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ پاکستان پر ۳۶ یا ۳۸/ارب ڈالر کے جو قرضے ہیں، ان کا کتنا حصہ فوج پر خرچ ہوا ہے۔ فوج کی مختلف خفیہ ایجنسیوں پر ۴/ارب روپے، سول آرمڈ فورسز پر ۲/ارب ۷۰ کروڑ روپے، پاکستان رینجرز پر ایک ارب اسّی کروڑ روپے، فرنٹیئر کانسٹبلری پر ۷۰ کروڑ روپے اور وزارت دفاع پر ایک ارب ۵۰ کروڑ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ یہ رقم دفاعی بجٹ سے سوا ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام گھاس کھاتے ہیں اور اسلحہ خانوں میں رکھے ہوئے ہلاکت خیز ہتھیار صبح وشام چمکائے جاتے ہیں اور ان کی ہلاکت خیزی ہمارے حکمرانوں کی رعونت

میں اضافہ کرتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پی۔سی۔او کے حلف یافتہ اور عدلیہ سے سند یافتہ ہمارے موجودہ وزیر کا دفاعی بجٹ کے بارے میں اب کیا نقطہ نظر ہے؟

اندرونی اور بیرونی قرضہ جات کی قسطوں کی ادائیگی، دفاعی اخراجات اور افسر شاہی کی تنخواہوں کے بعد ۱۳ کروڑ عوام کے لیے بجٹ میں جو پانچ فیصد رقم بچتی ہے، اس سے ہمارے 'عدل پرور' اور 'خوف خدا' میں مبتلا حکمران، مولانا الطاف حسین حالی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے پل اور چاہ بنواتے ہیں، مسجد و تالاب بنواتے ہیں، ان کے بھائی بھتیجے اس پر کمیشن بھی کھاتے ہیں۔ بیواؤں، یتیموں اور مساکین کی دادرسی کرتے ہیں۔ کہیں قحط پڑ جائے تو لال آٹے کی تھیلیاں تقسیم کرتے ہوئے ان کی تصویریں چھپتی ہیں۔ جن علاقوں میں ۴۵ ڈگری سینٹی گریڈ کی گرمی میں عورتیں چند گھونٹ پانی کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہیں اور ناکام و نامراد آتی ہیں، وہاں ہمدردی کے لیے جانے والے ہمارے یہ مقتدرین منرل واٹر پیتے ہیں۔ مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہیں اور ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کو آتے ہیں۔ اگر ہم اپنے حکمرانوں کے یہ آنسو ذخیرہ کر لیں تو یقیناً چاغی سے تھر تک فصلیں لہلہائیں گی، اور ۱۹۴۷ء سے اب تک دکھائے جانے والے سبز خوابوں کے باغات کی ہمسری کریں گی۔

ہندوستان اور پاکستان کے جنگجو عناصر نے اپنے عوام کو غربت، بیروزگاری، جہالت اور بیماریوں کی جس دلدل میں دھکیل دیا ہے، ان سے کچھ کہنا فضول ہے۔ اس لیے کہ ان کا روزگار ہی جنگی جنون کو ہوا دینے سے وابستہ ہے۔ یہ ذمہ داری برصغیر کے دانشوروں کی ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے امن اور جنگ کے درمیان فرق کو واضح کریں، عوام کو بتائیں کہ اگر دفاعی اخراجات کم ہو جائیں، اگر نیوکلیائی تجربات اور ہتھیاروں کو شب برآت کی آتش بازی اور دیوالی کا چراغ نہ سمجھا جائے تو ان کی زندگیاں کس قدر بدل سکتی ہیں، ان کے دکھ کتنے کم ہو سکتے ہیں۔

پاکستان میں ایٹمی دھماکوں کے اعلان کے ساتھ ہی عوام نے جس طرح جشن منایا اس کی عینی شاہد ایک جاپانی خاتون ڈاکٹر ماریکو کیٹانو بھی تھیں۔ ڈاکٹر کیٹانو نے اوساکا یونیورسٹی سے مذاہب عالم پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے، ہندوستان اور پھر پاکستان نے دھماکے کیے تو ان دنوں وہ پاکستان کے تاریخی شہر لاہور میں تھیں۔ جاپان پر امریکا کے ایٹمی حملے کی وہ خود اور ان کا خاندان شکار ہوا تھا۔ ان کے لیے ہندوستان اور پاکستان کے یہ ایٹمی دھماکے اور اس پر عوام کا جشن

منانا، قابل فہم نہیں تھا۔ اس حوالے سے انہوں نے پاکستانی عوام کے نام ایک کھلا خط لکھا جو یہاں بعض اخبارات میں شائع ہوا۔ انہوں نے لکھا......

'ایٹمی دھماکوں کی خبر سن کر پاکستانیوں کو سڑکوں پر بے اختیار ناچتے، مٹھائیاں بانٹتے اور 'جشن' مناتے دیکھ کر مجھے شدید ذہنی اذیت ہوئی۔ خوشی سے تمتماتے ہوئے یہ چہرے بے خبری اور لاعلمی کی علامت تھے۔ انہوں نے ایٹمی ہتھیاروں کی تباہی کو دیکھنا تو دور کی بات ہے، شاید اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔'

میں نے ایٹم بم کے اثرات دیکھے ہیں۔ انہیں اپنے بدن پر محسوس کیا ہے۔ ناگاساکی پر اترنے والی قیامت کا شکار ہونے والی عورتوں میں سے ایک میری نانی بھی تھیں۔ مجھے اپنے مسخ شدہ چہرے پر اپنی نانی اور ان جیسی سینکڑوں عورتوں کے زخموں کی جلن محسوس ہوتی ہے۔ میری ایک آنکھ بصارت سے محروم ہے اور میرا بایاں ہاتھ مردہ ہے۔ میں نے اسی مسخ شدہ بدن کے ساتھ جنم لیا۔ انسانیت نے مجھے ورثے میں یہی کچھ دیا۔ میری ماں بھی معذور تھی کیونکہ اسے ناگاساکی میں ایٹمی تابکاری کا شکار ہونے والی عورت نے جنم دیا تھا۔ یہ سب کچھ اسی ایٹمی 'معجزے' کی مہربانی ہے جس پر آپ جشن منا رہے ہیں اور اسے اپنی 'سلامتی کا سرچشمہ' کہہ رہے ہیں۔'

کوئی بھی صحیح الدماغ شخص یہ کیسے مان سکتا ہے کہ ایٹم بم قومی سلامتی کی ضمانت دے سکتا ہے۔ یا کسی ٹک ٹک کرتے ہوئے ٹائم بم کو سینے سے لگائے بیٹھے رہنا سلامتی اور تحفظ کی علامت ہے؟ (چرنوبل کے لوگ اس کا درست جواب دے سکتے ہیں) کیا ہر لحہ ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑے رہنے کا مطلب ملکی تحفظ ہے؟

ایٹمی دھماکے کر کے پاکستانیوں نے اپنی تاریخ کی بدترین غلطی کی ہے۔ خدا نہ کرے انہیں کبھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ میں نے پاکستان

میں بچوں کو روٹی کے چند ٹکڑوں کی خاطر بھیک مانگتے دیکھا ہے، عورتوں کو گود میں بلکتے ہوئے بچے اُٹھائے ہوئے خیرات مانگتے دیکھا ہے، بیمار بوڑھوں کو سسکتے دیکھا ہے۔ حکومت نے ان غریب، لاچار اور بے بس لوگوں کے دکھوں کا مداوا کرنے کی بجائے انہیں مزید غربت میں دھکیل دیا ہے۔ اس ایٹمی دوڑ کے لیے جو رقم درکار ہوگی اس کے بعد تعلیم اور صحت کے لیے کیا باقی بچے گا؟ ایٹم بم سے بھوکے بچوں کا پیٹ تو نہیں بھرا جا سکتا۔

مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کے دوران میں نے اسلام کا مطالعہ بھی کیا۔ اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے۔ آج کی دنیا عملی طور پر انسان کی اس حیثیت کو تسلیم نہیں کرتی۔ ہم نے اس عظیم سبق کو بھلا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے چہرے پر تہذیب کے چاہے کتنے ہی نقاب اوڑھ لیں، ہمارے اندر کا وحشی آج بھی پہلے کی طرح ہی زندہ اور توانا ہے۔ اس کرۂ ارض پر انسان ہی واحد مخلوق ہے جو اپنی نسل کو ختم کرنے کے لیے مسلسل خطرناک ہتھیار بنا رہی ہے۔ جوں جوں اس کے پاس ہتھیار بڑھتے جاتے ہیں، اس کی وحشت اور انانیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ شاید اسے اپنے جیسے انسانوں کو ہلاک کر کے تسکین ملتی ہے۔

ہمارے لیے ماضی کو فراموش کر دینا کس قدر آسان ہے۔ نئی نسل اپنے اجداد کی غلطیوں سے سبق سیکھنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ نازیوں نے یہودیوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا، اس سے یہودیوں نے کچھ نہیں سیکھا اور وہی سلوک فلسطینیوں کے ساتھ شروع کر دیا۔ آج بوسنیا میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو قیامت ٹوٹی اس سے دنیا نے کچھ نہیں سیکھا کیونکہ آج بھی ایٹمی دھماکے کیے جا رہے ہیں۔ البتہ جاپان نے ایک سبق ضرور سیکھا۔ اُس نے ایٹمی دوڑ میں حصہ لینے سے

انکار کر دیا۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ جاپان نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ ہم نے ایٹمی تابکاری کی ہولنا کی دیکھی ہے۔ برداشت کی ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور ہمسایوں کو جھلتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہمارے گھر ریت کی مانند بکھر گئے۔ کسی پاکستانی یا ہندوستانی شہری نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے اندھے بچوں کو نہیں دیکھا۔ وہاں آج بھی معذور بچے جنم لیتے ہیں۔ یہ معصوم جانیں کس جرم کی سزا کاٹ رہی ہیں؟ وحشت اور بربریت کی اس طاقت پر آپ جشن منا رہے ہیں؟

میری دعا ہے کہ ایسا وقت کبھی نہ آئے کہ کوئی پاکستانی یا ہندوستانی اپنے نومولود بچے کو پہلی مرتبہ گود میں اُٹھائے اور دیکھے کہ جہاں اس کی آنکھیں ہونی چاہئے تھیں وہاں صرف دو سراخ ہیں۔ خدا نہ کرے کہ آپ کے بچے بے نور آنکھوں، مردہ ہاتھوں اور مسخ چہروں کے ساتھ اس دنیا میں آئیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر ماریکو کیٹانو کے اس دل ہلا دینے والے خط کا 'پاکستانی دفاع کے ذمہ دار' افراد میں سے کسی ایک کے دل پر بھی کوئی اثر ہوا یا نہیں، لیکن میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ ایٹمی اسلحے کا حصول ہندوستان اور پاکستان کے مقتدرین کا خواب رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان نے جب ایٹمی آتش بازی میں حصہ نہیں لیا تھا تب بھی اس کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ پاکستان کے سابق وزیر خزانہ اور معروف دانشور ڈاکٹر محبوب الحق نے اپریل ۱۹۹۶ء میں 'ٹائمز آف انڈیا' کی اشاعت میں اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا......

ہندوستان اور پاکستان اپنے عوام کی اندوہناک غربت سے بے نیاز ہر سال اپنے دفاعی اخراجات پر بیس ارب ڈالر لٹا رہے ہیں۔ سعودی عرب، پاکستان اور ہندوستان سے ۲۵ گنا زیادہ امیر ملک ہے مگر سعودی عرب ہر سال ان دونوں کنگال ملکوں سے آدھی رقم دفاع پر خرچ کرتا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں فوجیوں کی تعداد ڈاکٹروں سے ۶ گنا زیادہ

ہے۔حال ہی میں پاکستان نے ۱۲ء۱ارب ڈالرخرچ کر کے فرانس سے دو آبدوزیں خریدی ہیں۔ادھر ہندوستان میزائلوں کی تنصیب پر بے تحاشہ روپیہ خرچ کر رہا ہے جبکہ کروڑوں ہندوستانی غربت کے باعث فٹ پاتھوں پر رات بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں جنگی ساز وسامان کی خریداری اور فوج پر بے تحاشہ وسائل ضائع کرنے کے بعد بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے بھیک کا تقاضہ کرتی ہیں اور اس ضمن میں قرضہ حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے ذلت آمیز اور نقصان دہ معاہدے کرنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔اسلام آباد اور نئی دہلی میں مسلسل تصادم اور محاذ آرائی پر اُٹھنے والے معاشی اخراجات اس قدر زیادہ ہیں کہ دونوں ممالک کے ہوش ٹھکانے آجانے چاہئیں۔مگر دونوں ممالک کے پالیسی ساز حکام اور رہنما اس حقیقت سے غافل نظر آتے ہیں جو ساری دنیا پر عیاں ہو چکی ہے۔یعنی قومی سلامتی کا سب سے اہم حصہ متعلقہ ملک میں بسنے والے انسانوں کی سلامتی ہوتا ہے۔معاشی خوشحالی ہی ملک اور قوم کو یکجا رکھ سکتی ہے اور عوام کا بلند معیارِ زندگی ہی ملکی استحکام کی ضمانت دے سکتا ہے۔

کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ جنوبی ایشیا میں جنگ روکنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ دونوں ممالک کے مابین باہمی دہشت اور خوف کا توازن موجود ہو۔لیکن اس توازن کی بھی آخر کوئی حد تو مقرر کرنا ہوگی۔اگر غریب عوام فٹ پاتھوں پر راتیں بسر کر رہے ہوں تو وزراء کو جدید ترین جہاز اور توپیں خریدنے کا حق نہیں پہنچتا۔عام شہریوں کے بچے اسکول کی ٹوٹی پھوٹی عمارتوں میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں اور سرکاری افسران ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں دندناتے پھر رہے ہیں۔کوئی قوم ہتھیاروں کے جس قدر چاہے انبار لگا لے، اگر اس کے عام شہریوں کی

غربت ختم نہیں ہوتی تو ایسی قوم ہمیشہ کمزور رہے گی۔

عالمی بینک نے حال میں 'دُنیا کی دولت' کے عنوان سے ایک رپورٹ تیار کی ہے جس میں دنیا کے ۱۹۰رممالک کی معاشی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں قومی دولت کا صرف ۱۶رفیصد حصہ مشینری، سڑکوں اور تعمیرات میں پایا جاتا ہے۔ معدنیات، جنگلات اور دوسرے قدرتی ذرائع سے ۲۰رفیصد دولت حاصل ہوتی ہے جبکہ کسی قوم کا ۶۴فیصد سرمایہ اس کے افراد ہوتے ہیں۔ ہم جنوبی ایشیا کے رہنے والے ہتھیار کے انبار لگا رہے ہیں لیکن عوام کی بھلائی اور بہتر مستقبل کو بھول جاتے ہیں۔

میں سوچتی ہوں کہ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ برصغیر میں رہنے والے وہ لوگ جو غربت، جہالت، بھوک اور بیماری کا شکار ہیں وہ یہ جانیں کہ:

☆ ایک ٹینک کی قیمت ۴۰لاکھ ڈالر ہے، صرف ایک ٹینک نہ خریدا جائے تو ۴۰لاکھ بچوں کو مہلک بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے لگائے جاسکتے ہیں۔

☆ ایک ۵۔۲۰۰۰ میراج طیارے کی قیمت ۹۰ملین ڈالر ہے، اگر صرف ایک طیارہ نہ خریدا جائے تو اس کی رقم سے ۳۰ملین بچوں کو پرائمری تعلیم دینا ممکن ہے۔

☆ وہ جدید آبدوز جس کی قیمت ۳۰۰ملین ڈالر ہے، وہ چھ کروڑ انسانوں کو پینے کے صاف پانی کی فراہمی سے محروم کر رہی ہے۔

پاکستان نے فرانس سے جو تین آگوسٹا آبدوزیں خریدی ہیں، اگر وہ خریدی نہ جاتیں اور ان پر خرچ ہونے والی رقم پاکستانیوں میں خرچ ہوتی تو:

☆ ایک کروڑ ستر لاکھ پاکستانی بچے پرائمری تعلیم حاصل کرسکتے تھے۔

☆ اور چھ کروڑ ستر لاکھ لوگوں کو پینے کا صاف پانی مہیا ہوسکتا تھا۔

ماحولیات کے کئی ماہرین کا کہنا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے جو علاقے اس وقت بدترین خشک سالی کی لپیٹ میں ہیں، وہی ہیں جہاں ہندوستان اور پاکستان نے اپنے نیوکلیائی دھماکے کیے تھے۔ ان دھماکوں نے ایک وسیع وعریض علاقے میں فطرت کے ماحولیاتی توازن

کو درہم برہم کر دیا ہے۔ صحرائے تھر سے ملے ہوئے راجستھان کے علاقے پوکھران میں ہندوستان نے ایٹمی دھماکے کیے تھے اور پاکستان نے بلوچستان میں چاغی کو ان تجربات کے لیے منتخب کیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پاکستان میں بلوچستان اور تھر، ہندوستان میں پوکھران اور اس سے متصل علاقوں میں ۱۹۹۸ء، ۱۹۹۹ء، اور اب ۲۰۰۰ء کے جون تک پانی کی بوند نہیں برسی ہے۔ کنویں خشک ہو چکے ہیں، صدیوں پُرانی زیرِ زمین نہریں سوکھی پڑی ہیں۔ وہ پانی جو ۸۰ فٹ کی گہرائی میں ملتا تھا، اب ۸۰۰/اور ہزار فٹ کی گہرائی میں نہیں ملتا۔ صرف بلوچستان میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ مویشی ہلاک ہو چکے ہیں، پوکھران (ہندوستان) اور صحرائے تھر (پاکستان) میں لاتعداد مویشی چارہ اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے ختم ہو چکے ہیں۔ ان قحط زدہ علاقوں سے لوگوں کے قافلے پانی اور کھانے کی تلاش میں ان علاقوں کا رخ کر رہے ہیں جہاں یہ نعمتیں دستیاب ہیں۔ میں ہندوستان سے مہینہ بھر پہلے لوٹی ہوں...... وہاں راجستھان کے بعض شہروں اور ان علاقوں سے گزری ہوں جہاں خشک سالی نے قحط سالی کی صورت پیدا کر دی ہے۔ ان علاقوں میں یہ نعرے سنے ہیں کہ......

بم پھوڑا پوکھران میں...... سوکھا پڑا راجستھان میں

اس طور غم و غصے کا اظہار کرنے والے بھی وہی لوگ ہیں جو ۱۱/مئی ۱۹۹۸ء کو اپنے وزیرِاعظم کے اس اعلان کے بعد رقص کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے تھے کہ ہندوستان دُنیا کی چھٹی نیوکلیائی طاقت بن گیا ہے۔ پاکستان میں بعض حلقے اب یہ سوال کرنے کی ہمت کرنے لگے ہیں کہ وہ ہلاکت خیز ہتھیار جسے استعمال نہ کرنے کی یقین دہانی پہلے پاکستان کے منتخب وزیرِاعظم میاں نواز شریف کراتے تھے اور اب یہ فریضہ پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے سنبھال لیا ہے، تو پھر اس کی تیاری پر بیس برس کے دوران ایک اندازے کے مطابق لگ بھگ چھ کھرب روپے یا اس سے زیادہ رقم کیوں خرچ کی گئی۔ کیا یہ پاکستان کے غریب، مفلس، بیمار اور ناخواندہ عوام کا حق نہ تھا کہ یہ رقم انہیں بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے پر صرف کی جائے؟

ہندوستان کے کثیر الاشاعت ہفت روزہ 'انڈیا ٹوڈے' نے ملکی انتخابات کے فوراً بعد ملک گیر پیمانے پر ایک سروے کرایا تھا۔ اس سروے میں عوام کی بھاری اکثریت نے 'افراطِ زر' اور 'بیروزگاری' کو ہندوستان کے اہم ترین مسائل قرار دیا۔ اس سروے میں عوام سے یہ بھی پوچھا گیا

کہ وہ ایٹم بم کی حمایت کرتے ہیں یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں کچھ دنوں پہلے پوکھران دھماکوں پر جشن منانے والی ہندوستانی جنتا میں سے صرف ۲۲ فیصد نے بم کی حمایت کی، ۳۸ فیصد نہ بم کی حمایت میں تھے اور نہ مخالفت میں، جبکہ ۴۰ فیصد کی رائے ایٹم بم کے خلاف تھی۔

اس وقت غیر سرکاری اعداد وشمار کے مطابق مختلف ملکوں میں ۳۰ رسے ۳۵ ر ہزار جوہری بموں کا انبار لگا ہوا ہے جن کی تخریبی قوت ہمارے کرۂ ارض کو تو کیا، ایسی پچاسوں دنیاؤں کو منٹوں میں صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کرسکتی ہے۔ یہ ہلاکت خیز قوت انسان کو کہاں لے جائے گی؟ کل کیا ہوگا؟ جنگ ہوگی تو فاتح کون اور مفتوح کون ہوگا؟ اسی طرح کا ایک سوال بیسویں صدی کی عظیم ترین شخصیت البرٹ آئن اسٹائن سے کیا گیا، اس کا جواب تھا:

'میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ تیسری جنگ کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ ہاں، یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ چوتھی جنگ لاٹھیوں اور پتھروں سے لڑی جائے گی۔'

اگر لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ ہتھیاران سے کیسی سہولتیں چھین رہے ہیں تو شاید انہیں یقین نہ آئے لیکن وہ دن اب دور نہیں جب انہیں اس بات کا یقین آجائے گا۔ اس دن ہندوستان اور پاکستان میں اگر ریفرنڈم کرایا جائے گا اور یہ پوچھا جائے گا کہ وہ ان ہتھیاروں کی خریداری کے حق میں ہیں یا ان ہتھیاروں پر خرچ ہونے والی رقم کے ذریعہ قحط، بھوک، جہالت اور بیماری سے نجات چاہتے ہیں تو یہ آپ اور میں سب ہی جانتے ہیں کہ اس ریفرنڈم کا کیا نتیجہ سامنے آئے گا۔

ہندوستان اور پاکستان کے وہ لوگ جو مئی ۱۹۹۸ء میں سرخوشی کے عالم میں جشن منا رہے تھے، انہیں ایک ایسی دنیا کا تصور بھی کرنا چاہیے جہاں کے دریا، سمندر، جھیلیں اور تالاب برف زار ہو چکے ہیں۔ دہکتی ہوئی گرم راکھ کی برسات ہو رہی ہے۔ اس کی تپش سے جنگل جل رہے ہیں اور شہروں کی بلند وبالا اور فولادی ڈھانچے والی عمارتیں موم کی طرح پگھل رہی ہیں۔ ایسی سردی ہے جو نقطۂ انجماد سے بیس اور تیس درجے کم ہے۔ ایسی رات ہے جو برسوں تک قائم رہے گی۔ نیلا آسمان گم ہو گیا ہے۔ وہ آسمان جسے کہکشاں اپنا دوشالہ اڑھاتی تھی، شام کا پہلا تارا جس کی پیشانی پر جگمگاتا تھا، اس آسمان کو نیوکلیائی آگ کے دھوئیں نے نگل لیا ہے۔ انسان پگھل گئے اور دنیا خاک کا ڈھیر ہے۔ یہ میری، آپ کی اور ہماری دنیا ہے۔

یہ کسی سائنسی فلم کا منظرنامہ نہیں، کسی تخیلاتی کہانی کا ٹکڑا نہیں۔ انسان کا...... میرا...... آپ

کا......ہم سب کا ممکنہ مستقبل ہے۔

اپنی اس بربادی کا سامان ہم نے خود کیا ہے۔ ہمارے اسلحہ خانوں میں اس وقت ۳۰ سے ۳۵ ہزار ایٹم بموں کی ہلاکت خیزیاں سوتی ہیں اور ان میں سے کوئی سا بھی ایٹم بم......لاکھوں ٹن بارودی قوت رکھتا ہے۔ ہم انسانوں کو خلائی جنگوں کا عارضہ بھی لاحق ہو چکا ہے۔ جن کے پاس ایٹمی ہتھیار نہیں، انہیں یہ غم کھائے جاتا ہے کہ ابھی تک انہوں نے یہ مہیب طاقت کیوں حاصل نہیں کی۔

کیسی ستم ظریفی ہے کہ امریکا نے ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما پر جو پہلا بم گرایا اس کا نام 'ننھا لڑکا' رکھا تھا، وہ ننھا لڑکا چند سیکنڈ کے اندر اس ہنستے بستے شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا گیا، پلک جھپکتے ہی ساٹھ ہزار افراد لقمہ اجل بنے اور ہزاروں نے سسک سسک کر مہینوں اور برسوں میں جان دی۔

ہیروشیما کے رہنے والوں کے سینوں میں ایٹمی تباہی کا زخم آج بھی ہرا ہے۔۱۹۹۴ء میں ہیروشیما نے اس زخم کی یادیں منائی کہ ۶ راگست کی رات اس کے دریا کی لہروں پر بہتی ہوئی رنگ برنگی کاغذی قندیلیں رخصت ہو جانے والوں کو یاد کر رہی تھیں۔ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے والوں کو یاد کرنے کا یہ ایک جاپانی انداز ہے۔ اس رات دریا کے کنارے ایک لاکھ آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں اور شہر کے ان گنت گھروں کے طاقچوں پر شانتی کے شہزادے گوتم بدھ کی مورتیاں گیان دھیان میں گم تھیں۔ ایسی ہی مورتیاں اس روز بھی کچھ سوچ رہی تھیں جب موت کی چھتری نے اس بدبخت شہر کے آسمان پر نیلی، گلابی، سرخ، زرد اور کاسنی روشنیوں کے رنگ میں سایہ کیا۔ اس روز ہزارہا بچوں، بوڑھوں، عورتوں، مردوں، کتابوں، پرندوں، پیڑوں اور شانتی کے شہزادے گوتم کی مورتیاں اس جہنم میں جل گئی تھیں جس کے در انسان نے، انسان پر کھولے تھے۔

ہیروشیما سے کچھ فاصلے پر ناگاساکی ہے۔ وقت ان شہروں میں ٹھہر گیا ہے۔ ۶ راور ۹ راگست ۱۹۴۵ء کی تاریخیں ان میں منجمد ہو گئی ہیں جب انسان نے انسانوں کے قتل عام کا وہ بے رحمانہ اور سفاکانہ طریقہ پہلی مرتبہ آزمایا جس کی ماضی میں نظیر نہیں ملتی۔ یہ وہ شہر ہیں کہ ان میں جو لوگ ہلاک ہونے سے بچ گئے ان کی اذیت اتنی کربناک تھی کہ انہیں ہلاک ہونے والوں کے مقدر پر رشک آتا تھا۔

۶ راگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشیما پر جب ایٹم بم گرایا گیا تو ایک ۱۲ رسالہ بچہ یاسوٹا کیٹا بھی اس

بدنصیب شہر میں رہتا تھا۔ اس روز اس کے شہر پر جو کچھ گزری، وہ اسی کے لفظوں میں سنیے:

'مجھے آج بھی وہ دن پوری طرح یاد ہے۔ میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ صبح سویرے میری ماں نے مجھے بہن کو کھانا پہنچانے کے لیے کہا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میری ماں نے مجھے بہت بُرا بھلا کہا۔ بادلِ ناخواستہ میں نے کھانا لیا اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ میں ابھی اسٹیشن پر پہنچا ہی تھا کہ سائرن بجنے لگا۔ میں بھاگا بھاگا گھر واپس پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ حملے کی خبر سن کر ماں مجھے بہن کے پاس نہیں بھیجے گی۔ ماں نے مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر دوبارہ بھیج دیا۔ میں اسٹیشن کے بینچ پر بیٹھا ریل گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک تیز روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور ایک لمحے کے لیے ہر چیز پر نیلاہٹ مائل زردی چھا گئی۔ چند لمحوں کے لیے میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں نیم بیہوش ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہر چیز مسخ ہو چکی ہے۔ اس روشنی کے فوراً بعد ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ مجھے لگا کہ جیسے کسی نے میرا معدہ چیر کر میری انتڑیاں باہر نکال لی ہیں۔ اس روشنی اور دھماکے نے بڑی بڑی عمارتیں ملبے کا ڈھیر بنا ڈالیں۔ جس جگہ پر میں کھڑا تھا وہ بم گرنے کے مقام سے تقریباً سات کلومیٹر کے فاصلے پر تھی لیکن اس کے باوجود دھماکے کا اثر ایسا تھا کہ اس نے مجھے ہوا میں اُچھال دیا۔ یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو گیا۔ پھر مجھے اپنے گالوں پر تپش محسوس ہوئی۔ میں نے اوپر دیکھا کہ نارنجی رنگ کی لہروں کی صورت میں روشنی اور تپش چاروں جانب پھیل رہی ہے۔ میں ایک بینچ کے نیچے چھپ گیا۔ اسی آگ اور تپش کے بیچ میں نے وہ جنگی جہاز دیکھے جن سے یہ ایٹم بم گرایا گیا تھا۔ میں گھر پہنچا تو میری ماں بھی خوف سے کانپ رہی تھی۔ علاقے کے سبھی لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ دراصل ہوا کیا ہے۔ اسی اثنا میں ہمیں کچھ لوگ اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ لوگ بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ہر کوئی بُری طرح زخمی اور جھلسا ہوا

تھا۔ ہمارے قریب پہنچ کر تقریباً سبھی گر پڑے۔ کوئی مر رہا تھا، کوئی پانی مانگ رہا تھا، کوئی چیخ رہا تھا اور کوئی خاموش کھلی آنکھوں کے ساتھ آسمان کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ ہم لوگ دہشت کے عالم میں انہیں بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ اچانک میری ماں نے مجھ سے پوچھا کہ میری بہن کہاں ہے۔ وہ بھی اس وقت شہر میں تھی۔'

اگلی صبح میں اپنی بہن کی تلاش میں نکلا۔ ہیروشیما کا یہ علاقہ جہاں بم گرایا گیا تھا، لاشوں سے اَٹا پڑا تھا۔ ہر طرف خون، جسموں کے جلنے کی بدبو اور لاشیں تھیں۔ دریا کے کنارے لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ لوگ پانی کی تلاش میں دریا تک پہنچے لیکن خود کو موت سے نہ بچا سکے۔ اسی دریا کے کنارے مجھے اپنی بہن ملی۔ وہ زندہ تھی۔ اس کا جسم بُری طرح جھلس چکا تھا۔ تمام رات وہ درد سے چیختی اور ماں کو پُکارتی رہی تھی۔ ہمیں اس کے کپڑے قینچی سے کاٹنے پڑے۔ بہت کوشش کے باوجود ہم اس کی کھال کپڑوں کے ساتھ اُترنے سے روک نہ پائے۔ اگلے تین دن وہ موت اور حیات کی کشمکش میں رہی۔ یہ تین دن ہمارے گھر پر موت کا سایہ رہا۔ موت کا سایہ تو خیر پورے ہیروشیما پر تھا۔ جب میری بہن مری تو اس وقت ہیروشیما کے ان گنت گھروں سے ماتم کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

کیا آپ اس منظر کا تصور کر سکتے ہیں کہ ایک پورا شہر ملبے کا ڈھیر بن جائے، صرف یہی نہیں، آج بھی ہیروشیما میں مائیں معذور بچوں کو جنم دے رہی ہیں۔ کیا یہ حیوانیت نہیں؟ ایٹم بم کی طاقت انسانیت کو تباہ کرنے کی طاقت ہے۔ یہ ہنستے بستے شہروں کو کھنڈر بنا دینے کی طاقت ہے۔ کیا آپ اپنے بچوں کو یہی مناظر دینا چاہتے ہیں، جو میں نے بارہ برس کی عمر میں دیکھے؟ ہمیں جنگ نہیں امن چاہیے۔ ہمارے سامنے علم، خوشحالی اور تہذیب کی کئی منزلیں ہیں۔ ہمیں ان منزلوں کو سر کرنا ہے۔ ہمیں موت نہیں چاہیے۔ ہمیں اپنے بچوں کا محفوظ مستقبل چاہیے۔ نفرتوں

کو بھول جائیں اور صرف انسانیت کو یاد رکھیں۔اس طرح ہم اپنی زمین کو جنت بنا سکتے ہیں۔اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یہ زمین اور اس زمین پر موجود تہذیب کھنڈر بن جائے گی—ہمیشہ کے لیے۔

۹/اگست ۱۹۴۵ء کو ناگاساکی پر جو کچھ گزری، اس کے بارے میں میکاواچی کا کہنا ہے:

اگست ۱۹۴۵ء میں مجھے ناگاساکی میڈیکل کالج میں داخلہ لیے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے۔ ۹/اگست گرمیوں کا ایک شفاف اور خوبصورت دن تھا۔صبح آٹھ بجے میں اپنے کمرے سے کالج کے لیے روانہ ہوا۔ مجھے کالج پہنچنے کے لیے ٹرام بس میں سوار ہونا تھا۔ جب میں بس اسٹاپ پر پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ بس کو حادثہ پیش آگیا ہے اور وہ آگے نہیں جا سکتی۔ میں نے گھر واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ میری سب سے بڑی خوش قسمتی ثابت ہوا۔

گیارہ بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں ایک کلاس فیلو کے ساتھ بیٹھا گپ کر رہا تھا کہ ہم نے بی۔۲۹ جہازوں کی آواز سنی۔ چند منٹوں بعد ایک چمکدار زرد روشنی بلند ہوئی اور انتہائی زوردار دھماکہ ہوا۔ ہم گھبرا گئے اور نچلی منزل میں غسل خانے میں چھپ گئے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ چھت میں سوراخ ہو چکا تھا اور تمام شیشے ٹوٹ چکے تھے۔شیشے کا ایک ٹکڑا میرے کاندھے میں جا لگا تھا آسمان سیاہ پڑ چکا تھا اور کالی بارش شروع ہو چکی تھی۔مکان ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے۔

میں عورتوں کی چیخ و پکار کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ہر طرف جھلسی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جن میں سے سفید ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے ایک گھوڑا مردہ پڑا تھا۔میرے کالج کی عمارت تباہ ہو چکی تھی۔ جس وقت حملہ ہوا، میرے کلاس فیلو لیکچر سن رہے تھے، جب میں وہاں پہنچا تو ان میں سے کچھ ابھی زندہ تھے۔ان میں اپنے جسموں کو ہلانے کی

طاقت نہ تھی۔ ایک نوجوان بہت کوشش کے بعد کھڑا ہوا اور چکرا کر دوبارہ گر پڑا۔ میں نے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی۔ وہ مر چکا تھا۔ چند دنوں میں وہ سب موت کے منہ میں چلے گئے۔ میں ان کے چہرے اور ان کی آواز کبھی نہیں بھول سکتا۔

۱۵/اگست ۱۹۴۵ء کو میں گاؤں میں اپنے آبائی گھر واپس چلا گیا۔ میں جس ریل گاڑی میں تھا اس میں ایسے کئی لوگ سفر کر رہے تھے جو ناگاساکی پر ٹوٹنے والی قیامت سے بچ نکلے تھے لیکن اس ہولناک تباہی اور اتنے بہت سے دوستوں اور رشتہ داروں کو اذیت ناک موت مرتے ہوئے دیکھنے کے بعد اپنے بچ جانے پر بھی ان کے چہروں پر خوشی کے کوئی آثار نہ تھے۔ میں نے جو دیکھا، وہ میرے لیے آج بھی ناقابل برداشت اور ناقابل بیان ہے۔ جب تک ہم اجتماعی طور پر ان ہتھیاروں کو ختم کرنے کا فیصلہ نہیں کریں گے، ناگاساکی میں ہلاک ہونے والوں کی روحیں تڑپتی رہیں گی۔

میں نے اس ایٹمی قتل عام سے بچ رہنے والوں کی وہ تصویریں دیکھی ہیں جنہیں دیکھ کر انسان ہفتوں کے لیے چین اور آرام سے محروم ہو جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ وہ لوگ جنہوں نے ان تصویروں کے حقیقی مناظر میں سانس لی ہوگی...... یہ کراہتے ہوئے، چیختے ہوئے، آہ وزاری کرتے ہوئے لہولہان انسان دیکھے ہوں گے...... ان پر کیا گزری ہوگی اور آخر کار انہیں کس طور قرار آیا ہوگا؟

یہ ۶/اور ۹/اگست ۱۹۴۵ء کی تصویریں ہیں اور ان دو تاریخوں کی باقیات کے عکس ہیں۔
ہیروشیما اور ناگاساکی............ایک عالمِ ہُو!

دوسری جنگ عظیم میں ہارتا ہوا جاپان، امریکیوں کے ایک 'نئے ہتھیار کا تجربہ' کرنے کے لیے 'موزوں علاقہ' تھا۔ چنانچہ وہاں بسنے والے انسان 'تجربہ کے لیے استعمال ہونے والے چوہے' (Guinea Pig) کے طور پر استعمال کر لیے گئے۔ تجربہ جب 'صد فیصد کامیاب' رہا تو ان دونوں شہروں پر گزرنے والے عذاب کی تفصیلات پر اور وہاں کے زندہ اور مردہ شہریوں کی تصویریں

شائع کرنے پر پابندی عائد کردی گئی۔ 'زبردستی مارے اور رونے بھی نہ دے' کی اس سے اعلیٰ مثال ہمیں اور کہاں ملے گی۔

ہم ناواقف رہے...... ہمیں ناواقف رکھا گیا۔ جنگ کے کئی برس بعد تک ہم حقائق سے ناواقف رہے۔ مقبوضہ افواج نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ہونے والی ایٹمی بمباری کے بارے میں کچھ بھی شائع کرنے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ حقائق اکٹھا کرنے والی جاپانی ٹیمیں جو ان شہروں کی وسیع تباہی کی تفصیلات کا جائزہ لینے اور بچ رہنے والوں کو طبی امداد دینے کے لیے بنائی گئی تھیں، ان کے کاموں میں بھی رُکاوٹ رہی۔

۸ستمبر ۱۹۵۱ء کو سان فرانسسکو ٹریٹی پر دستخط ہونے کے بعد ہی ایٹمی بمباری کے متاثرین کی تصویروں، روغنی تصویروں، کہانیوں، ناولوں اور متاثرین کی لکھی ہوئی یادداشتوں تک عوام کی رسائی ہو سکی۔ اس موضوع پر اعلیٰ ترین شاہکار Ashai Graphics کے ۶راگست ۱۹۵۲ء کے شمارے میں پیش کیے گئے یعنی تباہی کے چھ برس بعد یہ شمارہ 'ایٹمی تباہ کاریوں پر سے پہلی مرتبہ پردہ اُٹھتا ہے' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا۔ اس شمارے میں چھپنے والی تصویریں اتنی ہیبت ناک تھیں کہ انہیں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ان تصویروں سے ہیروشیما اور ناگاساکی سے باہر رہنے والوں کو پہلی مرتبہ ان شہروں کی ہولناک تباہی کے بارے میں معلوم ہوا۔

آج دنیا میں ان دو شہروں کو رسمی طور پر ضرور یاد کیا جاتا ہے، ہر سال اگست کے مہینے میں ان کا سوگ بھی منایا جاتا ہے۔ لیکن حقیقتاً ان شہروں کو، ان میں ہلاک ہونے والے اور ان کے 'زندہ مقتولوں' کو بھلایا جا چکا ہے۔ انہیں اگر بھلا نہ دیا گیا ہوتا اور انسان اگر ان دو شہروں کے قتل پر شرمندہ ہوتا تو آج ساری دنیا میں ایٹمی اسلحے کی دوڑ جاری نہ ہوتی اور ہر ملک اپنے 'دفاع'، کے نام پر ایٹمی طاقت بننے کے لیے بے قرار نہ ہوتا۔

ہمیں یہ بات بھی جاننی چاہیے کہ ان دو مقتول شہروں کی تباہی و بربادی کی داستان کو فاتح نے نہ صرف یہ کہ دبا دیا بلکہ برسوں تک دنیا تو دور کی بات ہے، خود جاپان کے شہری اس تباہی و بربادی کی تفصیل سے واقف نہ تھے۔ جاپان پر قابض امریکی فوجوں کے غیر انسانی رویے کے سبب بچ رہنے والوں کو ناکافی طبی امداد بہم پہنچائی جا سکی۔ ان کی آبادکاری کا کام بھی بہت سست رفتاری سے ہوا۔ ۸ستمبر ۱۹۵۱ء کے بعد جاپانی اخباروں اور رسالوں کو اس بات کی اجازت ملی کہ وہ

ان شہروں اوران کے باشندوں پر گزرنے والی قیامت کی تصویریں یااس کے بارے میں تحریریں شائع کر سکتے ہیں۔ یہ اجازت ان شہروں کی ہلاکت کے مکمل چھ برس بعد ملی تھی۔

ان دوشہروں کی ہلاکت کو ۵۵ برس گزر چکے۔ جاپان اب دنیا کی عظیم صنعتی طاقت ہے۔ دونوں شہر دوبارہ سے بسائے جا چکے ہیں، لیکن ہیروشیما میں 'امن پارک' کے شمال میں وہ پسماندہ علاقہ ہے جو 'ایٹمی جھونپڑ پٹی' کہلاتا ہے۔ یہ جھونپڑ پٹی دریائے اوتا تک پھیلی ہوئی ہے اور یہاں تقریباً ایک ہزار خاندان رہتے ہیں جو چار ہزار افراد پر مشتمل ہیں۔ اس جھونپڑ پٹی میں بیشتر وہ لوگ رہتے ہیں جو ایٹمی حملے سے متاثر ہوئے۔ یہاں اور ہیروشیما کے دوسرے پسماندہ علاقوں میں آج بھی ایٹمی حملے کے وہ بیمار موجود ہیں جو ۶ اگست ۱۹۴۵ء سے بستر پر پڑے ہیں۔ تابکاری کا شکار ہونے والے ان معذوروں اور مجبوروں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا کبھی کوئی علاج نہ ہوا۔ وہ لحظہ لحظہ مرتے ہیں اور پھر بھی زندہ ہیں۔ انہوں نے کبھی 'اٹامک بم اسپتال' کی شکل نہیں دیکھی، اس کی دہلیز بھی پار نہیں کی، کیونکہ وہ غریب تھے۔ اتنے غریب کہ اپنا علاج کرانے کے بھی اہل نہ تھے۔ ایسے لوگ ہیروشیما کی کسی کھنڈر بستی میں چھپر کے نیچے زندگی گزارتے ہیں یا تنگ اور پُر ہجوم گلیوں کے کسی کونے میں پڑے رہتے ہیں اور مٹھی بھر چاول کے لیے گزرنے والوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔

وہ بچے جو اس مہیب سانحے کے مہینوں بعد پیدا ہوئے، ان میں سے بیشتر کسی نہ کسی طور معذور ہیں۔ کوئی اندھا ہے، کسی کی عمر ۲۶ سال ہے مگر ذہنی عمر ۲۶ مہینے سے زیادہ نہیں، کسی کے پاؤں مڑے ہوئے ہیں اور کسی کی انگلیاں ٹیڑھی ہیں۔ یہ بچے 'ہیروشیما' کے بچے کہلاتے ہیں اور اپنے ساتھ ڈاکٹروں کے وہ تصدیق نامے لیے پھرتے ہیں جو ان کی پیدائش کے بعد ان کی ماؤں کو دیے گئے تھے اور جن میں لکھا تھا...... 'ایٹمی تابکاری کا وہ شکار جو ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو رحم مادر میں موجود تھا۔' یہ تصدیق نامے دو چار یا دس پانچ نہیں، ہزاروں کی تعداد میں جاری کیے گئے تھے۔ ان میں سے ہزاروں بچے سسک کر ختم ہوئے لیکن ہزاروں اب بھی زندگی کی تہمت پوری کر رہے ہیں۔

ان دوشہروں پر جو کچھ گزری، اس کا ایک مظہر تو لاشوں کے ڈھیر، جھلسے ہوئے بدن، مسمار عمارتیں اور خاکستر باغات تھے اور دوسری طرف وہ نفسیاتی اثرات ہیں جو اس عظیم سانحے سے بچ

رہنے والوں پر مرتب ہوئے۔ ان متاثرین کو کس نام سے یاد کیا جائے۔ شاید ان کے لیے 'زندہ مقتول' کا لفظ مناسب رہے گا۔

ابتدائی دنوں میں ان میں سے بیشتر افراد کو اس بات کا احساس یا علم ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں یا سو رہے ہیں۔ بدن کے کسی حصے میں یا ہر حصے میں نا قابل برداشت درد انہیں زندہ ہونے کا یقین دلاتا، دن پر وہ رات کا گمان کرتے اور کبھی آدھی رات کو سمجھتے کہ دن نکل آیا ہے۔ ان میں سے بعض کے لیے جسمانی اذیت اِس قدر نا قابل برداشت تھی کہ وہ چیخ چیخ کر روتے۔ پاس سے گزرنے والوں کی منتیں کرتے، گڑگڑاتے کہ انہیں جان سے مار دیا جائے۔ انہیں زندگی نہیں چاہیے۔

ان زندہ مقتولوں کے لیے ماں باپ، بھائی بہن، شوہر بیوی، بچوں، رشتہ داروں اور دوستوں کا چشم زدن میں یوں صفحۂ ہستی سے غائب ہو جانا...... خود ان کا جو کہ امیر، خوشحال یا متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے، بھکاری بن جانا، ایک ایسا ذہنی صدمہ تھا جس نے ان میں سے بیشتر لوگوں کو ذہنی طور پر پھر کبھی متوازن نہیں ہونے دیا۔ ان لوگوں کے دل اُمید سے خالی ہو گئے اور ان کی زندگی سے رشتے منہا ہو گئے۔ اب کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں وہ جا سکتے ہوں۔ اب کوئی شخص ایسا نہ تھا جسے وہ 'اپنا' کہہ کر پکار سکتے ہوں۔

ان میں سے بیشتر جھلس گئے تھے۔ ان کے 'مسخ چہرے' اور سکڑے ہوئے سیاہ بدن کو لوگ جب غور سے دیکھتے تو انہیں ان صحتمند لوگوں سے نفرت ہوتی۔ انہیں دنیا زہر لگتی اور دنیا والے قاتل۔ ان میں سے بہتوں نے اپنے آپ کو اسپتال کے کمروں یا حکومت کی طرف سے فراہم ہونے والی رہائش میں قید کر لیا۔ وہ پہروں آئینے کے سامنے کھڑے رہتے اور ان میں اپنی کھوئی ہوئی صورت ڈھونڈتے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اپنے شاداب چہرے کی بجائے ایک ایسا چہرہ ہوتا جسے وہ خواہش کے باوجود کسی طور نہ پہچان پاتے۔ جھلسی ہوئی بھنویں، جلے ہوئے بال، آنکھوں کے ڈلے باہر کی طرف نکلے ہوئے، ہونٹوں کا تناسب بگڑا ہوا، چہرے کی کھال کہیں سے سمٹی اور کہیں سے لٹکی ہوئی۔

ان لوگوں کے اندر احساس تنہائی اور بیگانگی پوری شدت سے اُبھرا اور ان میں سے بیشتر کو جسمانی درد کے علاوہ ہر احساس سے عاری کر گیا۔ ان میں سے بہتوں نے جسمانی صحت یابی کے

بعد اپنے آپ کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی کوشش کی۔ ان کے خاندان ختم ہو گئے تھے۔ دوست نہیں رہے تھے، اس لیے اب وہ صرف اپنی محنت پر ہی بھروسہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے 'کام' ڈھونڈنا شروع کیا اور اپنی اپنی ملازمتوں پر جاتے ہوئے انہوں نے نئے رشتے قائم کرنے اور نئے گھر بنانے کی کوشش کی۔ ان میں سے بہت سے اس احساس جرم کا شکار ہوئے اور اس میں مبتلا رہے کہ ان کا زندہ رہنا، مر جانے والے رشتوں کے ساتھ غداری تھی۔ اس احساس جرم نے ایسے لوگوں کی زندگی جہنم بنا دی۔ زندہ رہ جانے والوں میں سے کچھ کو اس خیال نے زندہ رہنے پر مجبور کیا کہ وہ اپنے خاندان کے زندہ رہ جانے والے تنہا فرد ہیں اور یہ اُن کی ذمہ داری ہے کہ وہ ختم ہو جانے والے عزیزوں کے نام پر خوشبوئیں جلائیں اور اُن کی نجات کی دُعا کریں۔

یہ زندہ مقتول ہر وقت اس نفسیاتی دباؤ کا شکار رہے اور آج بھی رہتے ہیں کہ تابکاری کے دُور رس اثرات جانے کب ان پر حملہ کر دیں۔ وہ اپنے بچوں کی جسمانی اور ذہنی صحت کی طرف سے ہر وقت پریشان رہتے ہیں کیونکہ ایسی متعدد مثالیں سامنے آئی ہیں جن میں تابکاری سے متاثر ہونے والے والدین کے بہ ظاہر صحتمند بچوں پر پیدائش کے برسوں بعد تابکاری کے اثرات ظاہر ہوئے۔ ان لوگوں کو اس بات کا بھی ہمیشہ احساس رہا اور رہتا ہے کہ ان کے وہ ہم قوم جو دوسرے شہروں میں آباد تھے اور جو اس سانحے سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے، وہ ان میں اور اپنے آپ میں فرق کرتے ہیں اور انہیں رحم کی نظر سے دیکھتے ہیں، یا کبھی کبھار اُن کا رویہ اِن کے ساتھ ایسا ہوتا ہے جیسے انہیں چھوت کی کوئی بیماری ہو۔

طاقت کے نشے میں چور ہو کر ان دو شہروں کو جس طور ذبح کیا گیا اس کی لفظوں سے تصویر کھینچی نہیں جا سکتی۔ اس ذبح عظیم کا اندازہ ان تصویروں سے کیا جا سکتا ہے جن میں سے بعض اس سانحے کے چند گھنٹوں بعد، دوسرے دن، چند دنوں، چند مہینوں اور چند برسوں بعد کھینچی گئیں۔ ایٹمی حملے کے متاثرین نے اپنے ذہن پر نقش ہو جانے والی موت، انسانی بے چارگی، درد اور اذیت کو جس طور کینوس پر نقوش اور رنگوں سے ابھارا ہے، وہ بھی دیکھنے اور محسوس کرنے والی چیزیں ہیں۔ میں کراچی میں جاپانی قونصل خانے کے اتا کا صاحب کی بہت ممنون ہوں جن کی وساطت سے میں ان سینکڑوں تصویروں اور پینٹنگز کو دیکھ سکی جنہوں نے جنگ اور ایٹمی ہتھیاروں سے نفرت کے رنگ کو میرے اندر اور گہرا کیا۔

ڈومن کین ایک جاپانی فوٹوگرافر ہے۔ اسے ہیروشیما کی ہلاکت کے بارہ برس بعد ایک جاپانی ہفت روزہ کی طرف سے اس شہر کے کھنڈرات اور اس کے متاثرین کی تصویریں اُتارنے کے لیے بھیجا گیا تھا، اس کا کہنا ہے کہ ۲۳ جولائی ۱۹۵۷ء کی سہ پہر کو میں اسے روزمرہ کا کام سمجھ کر روانہ ہوا تھا۔ لیکن وہ ایک ایسا لمحہ تھا جس نے میری زندگی بدل ڈالی۔ میں نے اتنا درد و الم، اتنی بے بسی، انسان اور انسانیت کی تذلیل کے ایسے مناظر کبھی نہیں دیکھے تھے اور تب میں نے اپنی زندگی جوہری ہتھیاروں کے خلاف جدوجہد کے لیے وقف کر دی۔

وہ کہتا ہے کہ جب میں اپنا کیمرہ لے کر ہیروشیما کے کھنڈرات میں نکلا تو بچ رہنے والے گروہ در گروہ میرے کیمرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری تصویریں اُتارو، انہیں لے جاؤ اور ساری دنیا کو دکھا دو تا کہ دنیا میں پھر کبھی کوئی اس کرب سے نہ گزرے، جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ کین کا کہنا ہے کہ میں نے ہیروشیما میں ہزاروں تصویریں اُتاریں اور ان میں سے ایک بھی ایسی نہ تھی جسے اُتارنے کے لیے کیمرے کا بٹن دباتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو نہ بہہ رہے ہوں۔

اس سانحہ کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایٹمی ہتھیار تیار ہی نہیں کیے جاتے لیکن اس کی بجائے زیادہ 'بہتر' اور زیادہ 'موثر' ایٹم بم بنائے جانے لگے۔ تمام بڑی طاقتوں کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کی دوڑ شروع ہو گئی اور اس کے حق میں دلیل یہ دی گئی کہ 'عالمی امن' برقرار رکھنے کے لیے ایٹمی ہتھیار نہایت ضروری ہیں اور یہ بھی کہ زیادہ سے زیادہ ایٹمی ہتھیار، امن عالم کی ضمانت اور علامت ہیں۔

آج دنیا کے بہت سے ملک ایسے ہیں جن میں جنگی جنون کو اور ایٹمی قوت بننے کی خواہش کو ہوا دی جاتی ہے۔ ان ملکوں کے ننگے اور بھوکے عوام کو 'عظیم طاقت' بننے کے سنہری خواب دکھائے جاتے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کی تباہی کے لیے اپنی مٹھی کے چاولوں اور اپنے ہاتھ کی روٹی سے بھی دستبردار ہو جائیں کیونکہ وہ اپنے دشمن سے اسی وقت محفوظ رہ سکتے ہیں جبکہ وہ ایٹمی طاقت ہوں۔

میرے خیال میں ایسے تمام ملکوں میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے کھنڈرات، انسانی ڈھانچوں کے ڈھیر، بچ رہنے والوں کے جھلسے ہوئے جسموں اور ان کے مسخ چہروں کی تصویریں

ابتدائی جماعتوں سے نصاب میں شامل ہونی چاہئیں۔ بچوں کو، ان کے والدین اور اساتذہ کو معلوم تو ہو کہ جوہری ہتھیار کیا ہوتے ہیں اور وہ انسانوں پر جہنم کے کون کون سے در کھول دیتے ہیں۔

ان دو شہروں کی ہلاکت کو ۵۵ برس گزر چکے۔ ان کی ہلاکت کے حوالے سے ایک کتاب کا ذکر ناگزیر ہے جو ۱۹۶۲ء میں چھپی تھی اور جس کا نام 'جلتا ہوا ضمیر' (The Burning Conscience) تھا۔ یہ ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے والے پائلٹ میجر کلاڈ ایتھرلے اور معروف آسٹروی دانشور گنٹر اینڈرز کی خط و کتابت پر مشتمل تھی، اس کا دیباچہ بیسویں صدی کے عظیم فلسفی اور امن پرست دانشور برٹرنڈ رسل نے لکھا تھا۔

میجر کلاڈ ایتھرلے ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے والے طیارے کا پائلٹ تھا۔ وہ ایک نوجوان پُرجوش اور خوش باش امریکی تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ جمہوریت، انسانیت، امن پسندی اور وطن پرستی ایسی اعلیٰ اقدار کی 'حفاظت' کے لیے اسے 'ننھا لڑکا' نامی ایک بم ایک شہر پر گرانا ہے اور واپس آجانا ہے۔ وہ اپنے نشانے پر پہنچا، اس نے ایک نظر شہر کو دیکھا، اپنے ساتھی کو اشارہ کیا، بم طیارے سے جدا ہوا، طیارہ واپسی کے لیے مڑا تو میجر ایتھرلے نے نیچے پھیلے ہوئے شہر پر نظر کی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ چند لمحوں کے اندر اندر وہ جیتا جاگتا شہر نابود ہو چکا تھا۔ وہ اپنا 'فرض' انجام دے چکا تھا۔ اس کے ساتھی اس بات پر پھولے نہیں سما رہے تھے کہ انسانی تاریخ کے مہلک ترین ہتھیار کو سب سے پہلے استعمال کرنے کا اعزاز انہیں حاصل ہوا ہے جبکہ کلاڈ کا چہرہ زرد تھا، جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ننھے لڑکے تو اپنی شرارتوں سے لوگوں کا دل موہ لیتے ہیں، یہ بم کیسا 'ننھا لڑکا' تھا جس نے چند سیکنڈ کے اندر اندر ایک ہنستے بستے شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ وہ فوجی اڈے پر پہنچا تو ہیرو تھا۔ اس کے ساتھی، اس کے اس سفر پر اُسے مبارکباد دے رہے تھے، فتح کا جشن منا رہے تھے لیکن وہ چپ چاپ ایک طرف کو جا بیٹھا اور پھر اس نے کئی دن اور کئی رات کسی سے کلام نہیں کیا۔

میجر کلاڈ ایتھرلے بیسویں صدی کی امریکی تاریخ کا وہ باضمیر انسان ہے جس نے ۶ راگست ۱۹۴۵ء کو ہی جان لیا تھا کہ سیاستدان اور جرنیل 'فرض شناسی' اور 'وطن سے وفاداری' کے نام پر اس سے ایک ایسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کے کرنے کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ جاگتا رہتا تو اس کی آنکھوں میں ایک شہر کے صفحۂ ہستی سے مٹ

جانے کا منظر کھنچا رہتا اور سوتا تو اذیت کے جہنم میں جھلستے ہوئے ہزاروں چہرے اسے اپنی طرف تکتے نظر آتے۔ ان کی کربناک چیخیں اس تک پہنچتیں اور وہ دیوانوں کی طرح سوتے سے اُٹھ بیٹھتا۔ انسانیت کا مجرم ہونے کا یہ احساس اسے دیمک کی طرح کھانے لگا۔ تنگ آکر اس نے امریکی فضائیہ کی شاندار ملازمت ترک کر دی اور پیٹ پالنے کے لیے معمولی نوکریاں کرنے لگا۔ ذہنی حالت بگڑی تو نفسیاتی معالجوں کے پاس گیا۔ ان ہی دنوں ۱۹۵۰ء میں امریکی صدر ٹرومین نے ایٹم بم سے کہیں زیادہ مہلک ہتھیار 'ہائیڈروجن بم' بنانے کا اعلان کیا تو ایتھرلے پر ڈپریشن کا اتنا شدید دورہ پڑا کہ اس نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔ دوسری مرتبہ اس نے اپنی کلائی کی رگیں کاٹ لیں لیکن بچا لیا گیا۔ اسی دوران وہ ہیروشیما کے ان ہسپتالوں کو وقتاً فوقتاً رقم بھیجتا رہا جہاں ایٹمی حملے کے متاثرین کا علاج ہوتا تھا۔ اس نے جاپانی ڈاکٹروں، صحافیوں اور دانشوروں کو خط لکھے اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہیروشیما پر گرائے جانے والے بم کی ہولناکی اور تباہ کاری کی شدت سے وہ واقف نہ تھا۔ نادانستگی میں اس سے جس جرم کا ارتکاب ہوا اس کی اذیت نہ اسے دن کو چین لینے دیتی ہے اور نہ رات کو آرام کرنے دیتی ہے۔

اُن ہی دنوں امریکیوں نے صدارتی انتخاب میں دوسری جنگ عظیم کے ایک جرنیل جنرل آئزن ہاور کو اپنا صدر منتخب کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایتھرلے کو یقین ہو گیا کہ جنگی جنون کو ہوا دینے والے عناصر امریکی سماج میں روز بروز طاقتور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی امریکی عوام کو اس سچ سے آگاہ کرنے کے لیے وقف کر دے گا کہ اس کے جرنیلوں اور سیاستدانوں نے ملک اور قوم کے نام پر انسانیت کے خلاف کن جرائم کا ارتکاب کیا ہے اور ان کا جنگی جنون آئندہ بھی امریکا کی رسوائی اور بدنامی کا سبب بن سکتا ہے۔ ایتھرلے کا یہ عزم امریکی محکمۂ دفاع کے لیے ناقابل برداشت تھا، چنانچہ وہ گرفتار کر لیا گیا اور محض سرکاری ماہرین نفسیات کی گواہی پر اسے تیسرے درجے کا پاگل قرار دے کر ٹیکساس کے فوجی ہسپتال میں قید کر دیا گیا۔

پاگلوں کے اس وارڈ میں رہتے ہوئے بھی اگر ایتھرلے کا ذہنی توازن برقرار رہا اور اگر امریکی محکمۂ دفاع اسے آزاد کرنے پر مجبور ہوا تو اس کا سہرا آسٹریا کے فلسفی اور دانشور گنٹر اینڈرز کے سر ہے جس نے امریکی ہفت روزہ 'نیوز ویک' میں ضمیر کی ملامت کے عذاب میں گرفتار میجر ایتھرلے کی قید کا قصہ پڑھا اور عالمی ضمیر کی عدالت میں اس کا مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ گنٹر نے

ایتھرلے کے نام پہلا خط ۳ جون ۱۹۵۹ء کو اور آخری ۱۱ر جولائی ۱۹۶۱ء کو تحریر کیا۔ ان دو برسوں کے دوران وہ صرف ایتھرلے کو ہی خط نہیں لکھتا رہا بلکہ اس نے امریکی اخبارات میں، ججوں، وزارت انصاف، اٹارنی جنرل رابرٹ کینیڈی سے بھی مراسلت کی اور ایک کھلا خط اس وقت کے امریکی صدر جان ایف۔ کینیڈی کے نام لکھا جو یورپ اور امریکا میں مختلف زبانوں میں چھپا اور جس کی کاپیاں متعدد قابل ذکر دانشوروں کو بھیجی گئیں۔ یہ گنتر تھا جس نے ایتھرلے کو فوجی پاگل خانے سے رہا کرنے کی اپیل پر برٹرنڈ رسل، البرٹو موراویا ایسے مشہور فلسفی اور ادیبوں کے علاوہ ہیروشیما کے میئر کے دستخط بھی حاصل کیے۔ یہ گنتر تھا جس نے اپنی اور 'پاگل' ایتھرلے کی خط وکتابت شائع کرائی اور دنیا پر یہ ثابت کیا کہ فوجی ڈاکٹر جنہیں 'دیوانہ' قرار دیں، وہ کیسے 'فرزانے' ہوتے ہیں۔

ایتھرلے نے ایک خط میں لکھا تھا:

'میں سمجھتا ہوں وہ وقت آ پہنچا ہے جب بطور فرد ہم اس بات کا ازسرِنو جائزہ لیں کہ سماجی اداروں یعنی سیاسی جماعت، ٹریڈ یونین، مذہب اور مملکت کے سامنے کیا ہمیں سپر ڈال دینی چاہیے؟ اور کیا اپنے خیالات اور اپنے افعال ہمیں ان کے احکامات کے تابع کر دینے چاہئیں؟'

ایک دوسرے خط میں اس نے لکھا......

'انسانیت کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے انسانوں کو ہم خانوں میں نہیں بانٹ سکتے اور امن اس دنیا میں صرف بھائی چارے اور مفاہمت کے ذریعے ہی قائم کیا جاسکتا ہے!'

جاپانی عوام کے نام اس نے ایک خط میں تحریر کیا:

'میں وہ فوجی ہوں جس نے ہیروشیما کو نیست و نابود کیا۔ میرا ضمیر اس جرم پر عذاب میں مبتلا ہے۔ میں معافی کا طلب گار ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے خلاف کیوں صف آرا ہوں؟ جنگ ایک وحشیانہ اور غیر انسانی فعل ہے۔ ہم اشرف المخلوقات ہو کر خود ہی ایک دوسرے کو کیسے تباہ کر سکتے ہیں؟ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے ہیروشیما کی راکھ میں سونے والے 'امن' کے لیے فریاد کرتے ہیں۔'

یہ تن تنہا گنٹر کی ذات تھی جس نے میجر ایتھرلے کو اس کے باضمیر ہونے پر مسلسل داد دی۔ اس کے حوصلے پست نہیں ہونے دیے اور عالمی ضمیر کو بیدار کر کے امریکی وزارت دفاع کو مجبور کیا کہ ان کی جنگجویانہ پالیسیوں پر اعتراض کرنے والے اور امریکی رائے عامہ کو ان پالیسیوں کے خلاف ہموار کرنے والے اس صحیح الدماغ اور باضمیر شخص کو رہا کریں جسے انہوں نے پاگل قرار دے کر قید کر رکھا ہے۔

ہیروشیما اور ناگاساکی کے بے گناہ مقتول کی یاد منانے کے ساتھ ہی میجر ایتھرلے کے ضمیر کی خلش کو بھی یاد کرنا چاہیے اور گنٹر اینڈرز اُس سے بھی زیادہ داد کا حقدار ہے کیونکہ یہ اسی کے خطوط اور تحریریں تھیں جنہوں نے امریکا اور یورپ میں 'حب وطن' اور 'فرض کی ادائیگی' ایسے محترم جذبوں کو اپنے جنگی جنون کی تسکین کے لیے استعمال کرنے والے جرنیلوں اور سیاستدانوں کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کیا۔ آج کی جنگ زدہ اور تصادم آمادہ دنیا میں ایسے ہی فلسفیوں اور دانشوروں کی ضرورت ہے۔

میجر کلاڈ ایتھرلے ایک عام امریکی فوجی افسر تھا جو ضمیر کے اس عذاب میں گرفتار ہوا۔ اب ذرا اس شخص کا تصور کیجیے جسے عزت، دولت، شہرت، سب ہی کچھ حاصل ہے۔ اپنے شعبے میں اس کا نام نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس کا شمار ملک کے طبقۂ اعلیٰ میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے میدان کا 'نابغہ' تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں نے اس کے ملک کو 'عظیم عالمی طاقت' بننے میں مدد دی ہے۔

اور پھر آہستہ آہستہ رات کے اندھیرے میں، دن کے اجالے میں، شام کے جھٹ پٹے میں اور صبح کے سرمئی دھندلکے میں...... اس کا نفس اس سے کلام کرتا ہے...... سوالات قائم کرتا ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جو اس کی تخلیقی صلاحیتوں اور اخلاقی ذمہ داریوں کے درمیان ایک کشمکش، ایک تصادم کو جنم دیتے ہیں۔ اس کشمکش کا احوال خود اس شخص کے الفاظ میں پڑھیے......

> '۱۹۵۳ء اور ۱۹۶۸ء کے درمیان میرے سماجی اور سیاسی خیالات میں بنیادی ارتقا ہوا۔ بطور خاص ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۲ء کے درمیان جب میں تھرمونیوکلیئر ہتھیاروں کی تیاری اور نیوکلیائی تجربوں سے متعلق معاملات میں ذاتی طور پر حصہ لے رہا تھا۔ مجھے اچانک ان اخلاقی مسائل سے دو

چار ہونا پڑا جو میری ان مصروفیات کے باعث پیدا ہو رہے تھے۔ یہ اسی کا
نتیجہ تھا کہ میں پانچویں دہائی کے آخری حصے میں نیوکلیائی ہتھیاروں اور
نیوکلیائی تجربوں پر مکمل پابندی یا ان کی تعداد کو محدود کرنے کے لیے سرگرم
عمل ہو گیا۔ ۱۹۶۳ء میں فضاء بالائے فضا اور سمندر میں ایٹمی تجربوں پر
پابندی کا معاہدۂ ماسکو، جن لوگوں کی کوششوں سے عمل میں آیا، میں ان
میں سے ایک تھا۔ ان معاملات سے متعلق سوالات روزانہ میرے ذہن
میں سر اُٹھاتے تھے اور ان کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔'

اس شخص کا اپنے ضمیر سے مکالمہ جتنا شدید ہوا، اتنی ہی شدت سے اس نے نیوکلیائی ہتھیاروں کے خلاف آواز بلند کی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر نئے ایٹمی تجربے کے بعد فضا میں تابکار ذرات کا اضافہ ہو جاتا ہے جو بے شمار اذیت ناک بیماریوں کا سبب بنتا ہے اور لاتعداد بے گناہ افراد ان بیماریوں کے سبب لحظہ لحظہ مرتے ہیں۔ تابکاری سے متاثر ہونے والوں کے المیے کا ذمہ دار وہ خود کو سمجھتا تھا اور یہ اتنی بڑی ذمہ داری تھی جس کے بوجھ سے دیوتاؤں کی ہڈیاں چٹخ جائیں، وہ تو گداز دل انسان تھا۔

ضمیر سے ہونے والے ان مکالمات نے اسے انسانوں کے اجتماعی دُکھوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ملک کے بہت سے افراد اپنے بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ آزادیٔ اظہار و افکار انہیں میسّر نہیں اور سرکاری نقطۂ نظر سے اختلاف کے سبب ان کا مقدر تنہائی، تذلیل اور تحقیر ہے۔ اس نے ان معاملات پر صدائے احتجاج بلند کی تو وہ تمام لوگ چونک اُٹھے جو صاحبانِ اقتدار تھے اور کل تک اس کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ پہلے اسے سمجھایا گیا، پھر روک ٹوک شروع ہوئی اور جب اس پر بھی وہ باز نہ آیا تو وہ شخص جو دو دہائیوں سے اپنے ملک کے خفیہ ترین منصوبوں پر کام کرتا رہا تھا، اسے ان تمام منصوبوں پر کام کرنے سے روک دیا گیا۔ اس سے وہ تمام سہولتیں اور مراعات واپس لے لی گئیں جو اس وقت تک اسے حاصل تھیں۔

وہ امنِ عالم، تخفیفِ اسلحہ، سفر اور رابطوں کی آزادی، سزائے موت اور آزادیٔ تحریر و تقریر کے بارے میں لکھتا رہا، بولتا رہا، روزانہ کسی نہ کسی 'سرکاری معتوب' کے حق کے لیے لڑتا رہا، اور تب سرکاری ذرائع ابلاغ نے اس شخص کے خلاف 'جہاد' کا آغاز کیا۔ اس پر الزامات لگائے۔ وہ شخص جو

امن، انسانیت، آزادی اور انسانی حقوق کے لیے لڑتا رہا تھا۔ اُس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ عالمی جنگ کا خواہاں اور انسانوں کا دشمن ہے۔ اسے 'غدار' اور 'بے ایمان' قرار دیا گیا۔

۱۹۷۵ء میں اسے امن کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ یہ انعام اس بات کا اظہار تھا کہ امن اور حقوق انسانی کے لیے اس کی جدوجہد کو دنیا احترام کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ لیکن اس کے ملک میں اس اعزاز پر شدید اعتراضات کیے گئے اور اس پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ ملک سے باہر نہیں جا سکتا، نوبل انعام نہیں لے سکتا۔

صرف اسی پر بس نہیں ہوا، جنوری ۱۹۸۰ء میں اسے ان تمام اعزازات اور خطابات سے محروم کر دیا گیا جو طبیعات کے میدان میں اس کی خدمات کے صلے کے طور پر اسے دیے گئے تھے اور پھر کسی قسم کی فرد جرم عائد کیے اور مقدمہ چلائے بغیر اسے شہر بدر کر کے ایک ایسے دور افتادہ علاقے میں رکھا گیا جہاں اس کا اپنے عزیزوں، دوستوں اور ساتھیوں سے کوئی رابطہ نہ تھا۔

اس شخص کا نام آندرے سخاروف تھا۔ وہ سابق سوویت یونین کا شہری تھا۔ ایک ایسا شہری جس پر اس کا ملک جس قدر ناز کرے، کم تھا۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آندرے سخاروف ایسے عظیم سائنسدان کا نام کچھ عرصے تک سابق سوویت یونین میں انتہائی تحقیر اور توہین سے لیا جاتا تھا۔ کون سے دشنام سے وہ محفوظ رہا اور کون سی برائی تھی جو اس سے منسوب نہ کی گئی۔ لیکن اس شخص نے سرکاری دباؤ کے سامنے سپر انداز ہونے سے انکار کر دیا۔ برسوں پہلے وہ سچ کے سفر پر روانہ ہوا تھا اور زندگی کے آخری لمحے تک وہ اسی سفر میں رہا۔ عرصہ پہلے وہ اپنا مقدمہ، اپنے ہی ضمیر کی عدالت میں پیش کر چکا تھا اور اس ضمیر نے جو فیصلہ دیا تھا، وہ آخری سانس تک اسی پر قائم رہا۔

سخاروف کے بارے میں ایک روسی ادیب وکٹر نکراسوف نے لکھا......

> 'اس شخص کو کسی بات سے خوف نہیں آتا۔ نہ کسی بات سے اور نہ کسی شخص سے۔ میرا خیال ہے کہ یہ شخص خوف کے احساس سے قطعاً عاری ہے۔ تو کیا وہ اس بارے میں کبھی سوچتا ہی نہیں؟ اس کے پاس تو دوسری اہم چیزوں کے بارے میں سوچنے کے لیے بھی وقت نہیں۔ انسان...... انسان...... انسانی مقدرات...... صرف یہی معاملات اس کا مسئلہ ہیں۔'

آندرے سخاروف کو انسانوں سے محبت تھی۔ وہ عشقِ بشر میں گرفتار تھا۔ اس کے لیے انسان

سے زیادہ اہم کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ان کے دکھ بانٹنا چاہتا تھا۔ ان کے آزار، اسے اپنے ذاتی عذاب محسوس ہوتے تھے۔ اپنے گمنام و بے نام ہم وطنوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے اس نے تنہائی اور تذلیل کا ایک تاریک دور گزارا۔

اگست ۱۹۸۹ء میں ہیروشیما کے مقتولین کی یاد منائی گئی تو ایک امریکی پادری جارج زبلیسکا نے ہلاک شدگان کے لیے خصوصی عبادت میں شرکت کے لیے جاپان کا سفر اختیار کیا اور ہیروشیما میں جب وہ اس خصوصی عبادت میں زیرلب دعائیں پڑھ رہا تھا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

یہ امریکی پادری کون تھا؟

یہ شخص اگست ۱۹۴۵ء میں جزیرہ تنیان پر پادری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ۶/اگست ۱۹۴۵ء کو صبح سویرے جب 'اینولا گے' نامی طیارہ ایٹم بم لے کر ہیروشیما جانے کے لیے تیار ہو گیا تو پادری جارج زبلیسکا نے صبح صادق کی خوشگوار خنکی میں اس طیارے کے عملے کی 'کامیابی' کے لیے خصوصی دعا کی تھی۔ اس نے دعا کی تھی کہ طیارہ دشمنوں کو نشانہ بنانے اور پھر عملے کے ساتھ صحیح سلامت جزیرہ تنیان لوٹ آنے میں کامیاب رہے۔

پادری جارج زبلیسکا پر جب ہیروشیما کی ہولناک تباہی کی داستان اپنی المناکیوں کے ساتھ واضح ہوئی تو پھر اسے کبھی چین کی نیند نہیں آئی۔ اس کا کہنا ہے کہ اپنی خصوصی دعا کا مفہوم اور اس کی حقیقت جاننے کے بعد میں ہر لمحہ جہنم میں رہا اور آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس جگہ جانا چاہیے اور وہاں ہلاک ہونے والوں کے لیے خصوصی عبادت میں شریک ہونا چاہیے۔ شاید اسی طرح میرا احساس گناہ کچھ کم ہو سکے۔

اپنے احساس جرم کا شعوری سطح پر اعتراف کرنے میں پادری زبلیسکا نے برسوں لگا دیے لیکن یہاں ایک ولندیزی جنگی قیدی کا ذکر کرنے کا جی چاہتا ہے جو اس وقت جاپانیوں کی قید میں تھا اور اس سے اور اس کے دوسرے ساتھیوں سے 'ناگاساکی' کی بندرگاہ پر جبری مشقت لی جاتی تھی۔ جاپانی سپاہی اور افسر، ان جنگی قیدیوں کے ساتھ نہایت بے رحمانہ سلوک روا رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ ولندیزی قیدی روزانہ رات کو جب سونے کے لیے لیٹتا تو خدا سے گڑگڑا کر دعا کرتا کہ یہ

پورا شہر ملیا میٹ ہو جائے، اس میں ان لوگوں کے ساتھ انتہائی غیر انسانی رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔

اس ولندیزی قیدی کا کہنا ہے کہ ناگاساکی پر جب بم گرا ہے تو وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جبری مشقت میں مصروف تھا۔ اس سانحے کے بعد اس نے خون میں لتھڑے ہوئے ایسے جاپانی سپاہیوں کو دیکھا جن کی کھال ان کے بدن سے الگ ہو کر جھول رہی تھی اور وہ اذیت سے چیخ رہے تھے، تڑپ رہے تھے۔ یہ ولندیزی قیدی اور اس کے بعض دوسرے ساتھی جو اس سانحے میں بچ رہے تھے، اپنے کیمپ کی طرف بھاگے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ ان کا ایک ولندیزی افسر جو کہ خود بھی جاپانیوں کی قید میں تھا، تمام ولندیزی سپاہیوں کو اکٹھا کر رہا تھا پھر اس افسر نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ کیمپ میں موجود جتنے بھی جنگی قیدی زخمی ہو گئے ہیں، یا ڈیوٹی پر موجود جاپانی سپاہی یا افسر زخمی ہوئے ہیں، ان سب کو پیٹھ پر لاد کر قریبی پہاڑی تک لے جائیں تا کہ زخمیوں کو بھڑکتی ہوئی آگ سے محفوظ کیا جا سکے۔

ولندیزی قیدیوں کی سمجھ میں چند لمحوں تک شاید اپنے افسر کی بات نہ آئی۔ ان پر ظلم و ستم روا رکھنے والے، انہیں قید رکھنے والے جاپانی اگر آگ کا ایندھن بن رہے تھے تو ٹھیک ہی تھا۔ لیکن افسر کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا تھا، اس ولندیزی قیدی کا کہنا ہے کہ جب میں نے اپنے ساتھ بدسلوکی کرنے والے جاپانی سپاہیوں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر انہیں محفوظ مقام تک پہنچانا شروع کیا تو میرے دل سے ان کے لیے تمام نفرت بھاپ بن کر اُڑ گئی۔ میں نے انسانی اذیت کے وہ ناقابل بیان منظر دیکھے کہ میں جن لوگوں کی موت کی دعائیں کرتا تھا، ان ہی کو بھاگ بھاگ کر بچانے کی، انہیں کچھ آرام پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لمحے میرے لیے ولندیزیوں میں اور جاپانیوں میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ دوست دشمن کی تمیز مٹ گئی تھی۔ ہم سب انسان تھے، ہم میں کوئی ظالم نہیں تھا، کوئی مظلوم نہیں تھا۔ سب ایک جیسی بھیانک تباہی سے دوچار تھے اور درد کے رشتے میں منسلک تھے۔ ایک کی اذیت، سب کا عذاب تھی۔ بم نے ہمارے درمیان تمام نفرتوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔

امریکی پادری اور ولندیزی جنگی قیدی کے یہ محسوسات اس بات کا اشارہ ہیں کہ جہاں ایٹم بم نے دنیا کو خوف اور غیر یقینی صورتحال کا اسیر کر لیا ہے، وہیں اس نے انسان کو ایک نئے رشتے کا احساس بھی دیا ہے۔ اس رشتے میں شمال و جنوب، مشرق و مغرب میں رہنے والوں کی تخصیص نہیں۔ نیوکلیائی خوف نے کرۂ ارض پر رہنے والے تمام انسانوں کو ایک بہت بڑے خاندان میں

بدل دیا ہے اور یہ خاندان نیوکلیائی ہتھیاروں سے نجات چاہتا ہے۔

۶ راگست ۱۹۴۵ء سے پہلے 'جنگ' بے شمار انسانوں کے لیے سرخوشی کا سبب بنتی تھی کیونکہ کسی بھی جنگ کے دوران یہ بات حتمی تھی کہ لڑنے والے فریقوں میں سے کوئی ایک فاتح ہوگا اور کوئی ایک مفتوح۔ جنگ کا فیصلہ ہونے تک دونوں فریق 'فتح' کے خواب میں مگن رہتے تھے لیکن اب فاتح ومفتوح کا جھگڑا ختم ہو چکا ہے۔ نیوکلیائی ہتھیاروں کے استعمال کا راستہ اول فنا اور آخر فنا ہے۔ آج انسان کے سامنے یا مکمل نیستی کا راستہ ہے یا زندگی کے اور خوبصورت انسانی مستقبل کے خواب ہیں۔

جوہری اسلحے کی مخالفت ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے جوہری بموں اور ان سے رونما ہونے والی ناقابل تصور تباہ کاری کے فوراً بعد شروع ہوگئی تھی لیکن انسان 'طاقت' کے سحر میں آسانی سے گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس کے حصول کی آرزو اسے بیتاب رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایٹم بم کے پہلے استعمال کے فوراً بعد نتائج سے بے پروا ہوکر اس بھیانک طاقت کو حاصل کر لینے کے لیے دنیا کی تمام بڑی طاقتیں بیقرار ہوگئیں۔ اپنی بالادستی قائم کرنے کی خواہشمند چند اقوام کا 'جوہری کلب' چند برس کے اندر ہی وجود میں آ گیا اور زیادہ سے زیادہ جوہری ہتھیاروں کی پیداوار ان دولتمند اور ترقی یافتہ اقوام کی عزت نفس کا مسئلہ بن گیا۔ انسانیت کے شرمناک قتل کی اس دوڑ میں ۱۹۷۰ء کی دہائی سے ہندوستان اور پاکستان جیسے غریب ملکوں نے شامل ہونا بھی اپنا فرض سمجھا اور ان ملکوں کے رہنما بجائے اس کے کہ اپنے عوام کو اس دوڑ میں شامل ہونے کے سنگین نتائج سے آگاہ کرتے، انہوں نے اپنے عوام کے جذبات سے کھیلتے ہوئے اِن غریب ممالک کے وسائل بھی اس جنون کی نذر کر دیے۔

ایٹمی تجربات اور ان کے نتائج کی بات کرتے ہوئے بے ساختہ اس شخص کی یاد آتی ہے جو بلاشبہ بیسویں صدی کی چند عظیم ذہانتوں میں سے ایک تھا اور 'انسان' بھی بہت بڑا تھا۔ اس شخص کا نام البرٹ آئن اسٹائن تھا۔ وہ ایک صلح جو اور امن پسند انسان تھا۔ اس کی زندگی سائنس کی لیبارٹریوں میں نت نئے تجربات کرتے ہوئے اور ان کے نتائج کا کھوج لگاتے ہوئے گزری، اسے ابتدائی زندگی میں سیاست سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن نازی جرمنی میں بڑھتے ہوئے جنگی جنون اور نسلی نفرت سے اسے خوف آتا تھا۔ اس خوف کے باوجود اس نے برلن کے ایک ایسے انسٹی

ٹیوٹ میں پروفیسر کے طور پر کام کرنے کی پیشکش قبول کر لی جسے نظریاتی طبیعات کے موضوع پر تحقیق کے لیے بین الاقوامی اہمیت حاصل تھی۔

پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو آئن اسٹائن امن کے لیے لڑ رہا تھا جبکہ اس کے ساتھی پروفیسر، سائنسداں اور اسکالر جنگی جنون کے سیلاب میں بہہ چکے تھے۔ اس موقع پر آئن اسٹائن نے کھل کر جنگ کی مخالفت کی اور اسے 'فریب کی وبا' سے تشبیہہ دی۔ آئن اسٹائن کے ان خیالات کو جرمنی میں شدید ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور یہ اس کی سوئس شہریت ہی تھی جس نے اسے گرفتاری سے بچائے رکھا۔ کچھ ایسا ہی حال اس کے دوست اور اس عہد کے عظیم فلسفی برٹرینڈ رسل کا انگلستان میں تھا۔ وہ بھی جنگ کا بدترین دشمن تھا۔ اسے بھی برطانوی عوام 'غدار' اور 'بزدل' جیسے 'خطابات' سے نوازتے تھے۔

جنگ ختم ہوئی تو جرمنی میں آئن اسٹائن کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر مہم چلائی گئی جس میں اس کے نظریہ اضافیت کو بھی رد کرتے ہوئے باطل قرار دیا گیا۔ یہ صورت حال اُس کے ساتھیوں اور دوسرے پروفیسروں کے لیے صدمے اور تکلیف کا سبب تھی۔ لیکن ان کی بزدلی آڑے آئی اور وہ اس کے حق میں آواز اُٹھانے کی ہمت نہ کر سکے۔ آئن اسٹائن کو ہجوم سے گھبراہٹ ہوتی تھی اور وہ لوگوں کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ پھر وہی شخص اس زمانے میں نہ صرف جرأت و بیباکی کے ساتھ جلسوں سے خطاب کرنے لگا بلکہ اس نے ایسے تمام مقدمات میں بیانات دیے جو علمی حیثیت رکھنے والے مختلف اسکالرز پر صرف اس لیے چلائے جا رہے تھے کہ وہ جرمن حکومت سے مختلف مؤقف اور نقطہ نظر رکھتے تھے۔

ہٹلر کے اقتدار سنبھالنے کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ آئن اسٹائن کو جان بچا کر جرمنی سے فرار ہونا پڑا۔ اس زمانے میں فاشزم کی مخالفت کرنے والے ادیبوں اور دانشوروں کی کتابوں کے ساتھ آئن اسٹائن کی کتابیں بھی جرمنی میں جلائی جا رہی تھیں۔ اسی زمانے میں نازیوں نے آئن اسٹائن کے سر کی قیمت بیس ہزار مارک مقرر کی۔ وہ خود اپنی جان کی اتنی بھاری قیمت پر حیران ہوتا رہا۔

جرمنی سے جان بچا کر نکلنے کے بعد وہ امریکا چلا گیا اور پھر وہیں کا ہو رہا۔ ۱۹۳۹ء میں کچھ سائنسدانوں نے آئن اسٹائن سے رابطہ کیا اور اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ امریکی صدر

روز ویلٹ کو خط لکھے اور ان سے اصرار کرے کہ وہ ایٹم بم کی تیاری کی طرف توجہ دیں کیونکہ نازی جرمنی بھی ایٹم بم کی تیاریوں میں تیزی سے مصروف ہے۔ صلح جو اور امن پسند آئن اسٹائن نے اس خوف سے کہ کہیں جرمنی جوہری ہتھیار بنانے میں پہل نہ کر جائے، اپنی زندگی کا وہ قدم اُٹھایا جس کا قلق اس کے دل سے مرتے دم تک نہ گیا۔ اس کی تجویز کو مانتے ہوئے امریکی صدر نے 'مین ہیٹن پروجیکٹ' کی منظوری دے دی، یہی وہ پروجیکٹ تھا جس نے دنیا کے پہلے ایٹم بم کو جنم دیا۔ یہ درست ہے کہ آئن اسٹائن نہ تو جوہری طبیعات پر کام کر رہا تھا اور نہ اس نے 'مین ہیٹن پروجیکٹ' کی کامیابی میں کوئی کردار ادا کیا۔ اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ اسی کی ترغیب پر یہ پروجیکٹ قائم ہوا اور اسی کے تحت ۱۶ر جولائی ۱۹۴۵ء کو وقت سحر دنیا کا پہلا کامیاب ایٹمی تجربہ ہوا جس کی بنیاد پر وہ ایٹم بم تیار ہوئے جو ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے اور جن کے گرائے جانے سے اس دنیا میں جوہری اسلحے کی تباہ کاریوں کا آغاز ہوا۔

آئن اسٹائن نے ایٹمی اسلحے کی تیاری کے سلسلے میں امریکی صدر کو جو خط لکھا تھا، اس پر اسے عمر بھر پشیمانی رہی۔ ایک جگہ اس نے لکھا......

'اگر مجھے گمان بھی ہوتا کہ جرمنی ایٹم بم بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا تو میں اس بم کے سلسلے میں کبھی کچھ نہ کرتا۔'

آئن اسٹائن نے اپنی آخری عمر اسی احساس جرم کے ساتھ بسر کی تھی اور پھر اس کا کفارہ اس طرح ادا کیا کہ آخری سانس تک جوہری اسلحے اور جنگی جنون کے خلاف اپنی پوری قوت سے لکھتا اور بولتا رہا۔ آئن اسٹائن نے جوہری اسلحے کے خلاف اس وقت آواز بلند کی جب ترقی یافتہ ملکوں کے صرف رہنما ہی نہیں، ان کی رائے عامہ بھی تباہ کن ہتھیاروں کو تیار کرنے اور موقع آنے پر اسے 'دشمن' کے خلاف استعمال کرنے کے حق میں تھی۔ یہی وہ جنگجویانہ رویہ تھا جس نے دنیا میں ایٹم بم کے حصول کو قوموں کی بڑائی اور ان کی عزت نفس کا مسئلہ بنا دیا۔

جنگ عظیم دوئم میں اتحادی ہونے کے باوجود روس نے امریکا کی ایٹمی طاقت سے خود کو خطرے میں محسوس کیا۔ چنانچہ چار سال بعد ۱۹۴۹ء میں روس نے پہلا ایٹمی دھماکہ کیا اور اس کے ساتھ ہی دنیا کی ان دو بڑی طاقتوں میں نیوکلیائی اسلحے کی دوڑ کا بھیانک آغاز ہو گیا۔ یکم نومبر ۱۹۵۲ء کو امریکا نے ہائیڈروجن بم کا دھماکہ کرکے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ اگلے برس ۱۲ر اگست

۱۹۵۳ء میں روس کا ہائیڈروجن بم بھی تیار تھا۔ ۵۰ کی پوری دہائی ایٹمی دھماکوں کی دہائی تھی۔ روس کے پہلے خلائی سیارے 'اسپوتنک' کی کامیابی کے بعد امریکہ نے صرف ۱۹۵۸ء میں ۷۷/ایٹمی دھماکے کیے جبکہ اسی برس روس نے ۱۸/اور برطانیہ نے ۷/ایٹمی دھماکے کیے۔ ۱۹۶۲ء میں امریکا کے ۹۴/اور روس کے ۷۲/دھماکوں سمیت مجموعی طور پر ۱۷۱/ایٹمی دھماکے ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں چین بھی نیوکلیئر کلب میں شامل ہوگیا۔ ۱۹۹۴ء تک نیوکلیئر کلب کے پانچ ممبران مجموعی طور پر ۲۰۳۶/ایٹمی دھماکے کر چکے تھے۔ ان میں ۱۰۳۰/امریکا، ۷۱۵/روس، ۱۹۲/فرانس اور ۴۱/چین نے کیے۔ چونکہ ۱۹۶۵ء میں سطح زمین پر ایٹمی تجربات کرنے پر پابندی لگا دی گئی تھی، لہٰذا اب تمام ایٹمی تجربات زیر زمین ہو رہے تھے۔

روس اور امریکا کی یہ دوڑ صرف ایٹم بموں تک محدود نہ رہی۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ہائیڈروجن بموں کی دوڑ شروع ہوگئی جس کے بعد بین البراعظمی میزائلوں کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ ۱۹۶۰ء میں امریکا کے پاس ۶۳۰۰/ایٹمی ہتھیار تھے جبکہ روس کے پاس ۲۰۰ تھے۔ ۱۹۶۵ء میں روس کے ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد ۶۰۰ ہوگئی جبکہ امریکا کی تعداد بڑھ کر ۵۰۰۰ ہو چکی تھی۔ ۱۹۸۵ء میں امریکا کے پاس ۱۱۱۰۰/اور روس کے پاس ۸۵۰۰ نیوکلیائی ہتھیار تھے۔ ۱۹۹۰ء میں دنیا کے کل ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد ۵۰،۰۰۰ تھی۔

آئن اسٹائن، برٹرینڈ رسل، آندرے سخاروف وہ لوگ تھے جنہوں نے 'غداری' اور 'وطن دشمنی' کے الزام سنے اور سہے۔ انہیں ماؤف بوڑھوں کے نام سے پکارا گیا۔ ان کے ہم وطنوں نے ان پر گندے انڈے اور ٹماٹر برسائے۔ برٹرینڈ رسل کو لندن کی سڑکوں پر گھسیٹا گیا اور اس خوش خیال فلسفی کے ساتھ کسی مجرم اور آوارہ گرد کا سا سلوک کیا گیا۔ آئن اسٹائن نے جلاوطنی کی زندگی گزاری، آندرے سخاروف نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن ان لوگوں نے ہمت نہیں ہاری، اپنی آواز مدھم نہیں ہونے دی۔ یہ لوگ تنہا اس عذاب ناک سفر کو طے کرتے رہے جو یہ آنے والی نسلوں کی زندگی، ان کی خوشحالی اور ان کی خوش خیالی کے لیے کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ دکھ ان کے لیے اُٹھائے جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

آئن اسٹائن نے ایک جگہ لکھا:

'ہمارے سامنے دو راستے ہیں، یا تو ہم جوہری اسلحے سے نجات حاصل کر

لیں یا نسل انسانی کی مکمل تباہی اور اس کے نیست و نابود ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔قومی تفاخر ایک بچکانہ بیماری ہے۔یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت چھوت کی بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ہماری نصابی کتابیں جنگ کی تعریف و توصیف سے بھری ہوئی ہیں اور اس کے لائے ہوئے عذابوں اور تباہ کاریوں کو چھپاتی ہیں۔ یہ کتابیں ہمارے بچوں کی رگوں میں نفرتوں کا زہر انڈیلتی ہیں۔ میں جنگ کی بجائے امن کی تبلیغ کروں گا۔ میں نفرت کی بجائے محبت کو پھیلاؤں گا۔'

یہ آئن اسٹائن، آندرے سخاروف، برٹرینڈ رسل اور دوسرے متعدد دانشور اور سائنسدان تھے جنہوں نے مغرب و مشرق کی نئی نسلوں کو اپنے حکمرانوں سے مختلف طور پر سوچنے کے لیے مجبور کیا۔ ایک ایسے زمانے میں جب سب ہی اپنے اپنے لشکروں کی تعداد بڑھا رہے ہوں اور اپنے اپنے ہتھیار چمکا رہے ہوں، جب ہر طرف جنگی جنون کی سیاہ آندھی چل رہی ہو اور آگ ہر طرف سے یلغار کر رہی ہو تو ان لوگوں کی قدر و قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے جو چلو بھر پانی لے کر اس سرخ و سیاہ جہنم کی مہیب آگ کو بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ درجن بھر کنیڈین نوجوانوں نے کروز میزائل تیار کرنے والی فیکٹریوں کی دیواروں پر اپنا خون چھڑکا اور اس 'جرم کی پاداش' میں گرفتار ہوئے، تو یہ بارہ نوجوان ذہن کے افق پر اُمید کے بارہ سورج بن کر طلوع ہوتے ہیں اور ڈوبتا ہوا دل تھم سا جاتا ہے کہ ہوش دنیا سے ابھی مکمل طور پر رخصت نہیں ہوا اور باضمیر ابھی زندہ ہیں۔ میں نے ان نوجوانوں کے بارے میں ۱۹۹۴ء میں پڑھا تھا۔

دنیا میں یہ دو انتہائیں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں۔ایک طرف نیرو تھا، جس نے ایک زندہ شہر کو آگ کے دائرے میں جلتے اور مرتے دیکھا اور عالم وجد میں بانسری بجاتا رہا اور اسی پہلی صدی عیسوی میں مشہور رواقی فلسفی سینکا تھا جس کا کہنا تھا کہ زندگی محض خیر سے عبارت ہے اور جو شومئ قسمت سے نیرو جیسے نیم دیوانے شہنشاہ کا استاد تھا۔ یہ وہی شاہی استاد سینکا ہے جو خیالات کے اختلافات کے سبب شاگرد شہنشاہ کے غیض و غضب کی بھینٹ چڑھا اور جسے حکم دیا گیا کہ موت اس کا مقدر ہے۔لیکن وہ شاہی جلاد کے ہاتھوں موت کے گھاٹ نہیں اُتارا جائے گا بلکہ اسے

خودکشی کرنی پڑے گی تا کہ شاگرد شہنشاہ پر یہ 'الزام' نہ آئے کہ اس نے اُستادِ محترم کے خون سے ہاتھ رنگین کیے۔

اسی سینکا نے ایک خط لکھا تھا جس میں کہا تھا کہ......

'ہم میں سے صرف افراد ہی نہیں، اقوام بھی پاگل ہوگئی ہیں۔ایک آدمی قتل ہو جائے تو ہم شور مچا دیتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم لڑائیاں کیوں لڑتے ہیں؟ ہم بستیوں کو تہ تیغ کر کے اسے اپنی فتح وعظمت کا نشان کیسے ٹھہراتے ہیں؟ نہ ہماری ہوس کی حد ہے اور نہ ہمارے ظلم کی۔ جب فرد سے کوئی جرم سرزد ہوتا ہے تو ہم اسے سزا دیتے ہیں لیکن ہماری سینیٹ اور ہماری منتخب اسمبلی کے اراکین کے حکم سے جو ظلم وستم ہوتا ہے اس کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ انتظامیہ کے افسران اور سرکاری ملازموں سے وہ کام کرائے جاتے ہیں جو عوام کے لیے ممنوع ہیں۔ایک قتل کسی تاریک کل میں ہو جائے تو قاتل، گردن زدنی ہے لیکن ہمارے سپاہی جب مفتوح بستیوں کے نہتے شہریوں کا قتل عام کر کے لوٹتے ہیں تو انہیں انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے، ان پر پھول برسائے جاتے ہیں۔'

اس خط کے مندرجات پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ نیرو اور اس کا استاد ایک ہی زمانے میں سانس لیں۔ 'بے چارہ' شاگرد، استاد کو خودکشی کا حکم نہ دیتا تو کیا کرتا؟ اسی طرح کروز میزائل کی فیکٹری کی دیواروں کو اپنے خون سے رنگین کرنے والے نوجوان گرفتار نہ کیے جاتے تو کیا ہار پھول پہنا کر رخصت کیے جاتے؟

سینکا کے اس خط کے ذکر کے ساتھ ہی ٦ جولائی ۱۹۴۴ء کا لکھا ہوا سر ونسٹن چرچل کا ایک خفیہ خط یاد آتا ہے جو اس نے برطانوی محکمۂ دفاع کے نام لکھا تھا جس میں کہا تھا کہ......

'ہوسکتا ہے کہ ابھی اس بات میں چند ہفتے یا چند مہینے باقی ہوں جب میں آپ لوگوں کو حکم دوں کہ جرمنی کے ہر گوشے اور ہر کونے میں زہریلی گیس پھیلا دی جائے اور یہ سمجھ لیں کہ جب یہ کر گزرنے کا وقت آئے گا تو ہمیں سو فیصدی اس پر عمل کرنا ہوگا۔اس حکم کو دینے سے پہلے میری خواہش ہے

کہ اس معاملے پر کچھ سمجھدار افراد غیر جذباتی اور غیر متشددانہ انداز میں غور
وفکر کریں۔اس بارے میں شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والے ان لوگوں کی
رائے لینے کی کوئی ضرورت نہیں جو ان دنوں دعائیں اور مناجاتیں گاتے
ہوئے ہمیں کبھی اس کونے میں اور کبھی اس نکڑ پر نظر آتے ہیں۔'

سر ونسٹن چرچل جیسے سیاستدانوں اور جرنیلوں کی آج بھی کوئی کمی نہیں۔آج کل جبکہ روزانہ اخبارات، رسائل اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہمیں فوجوں کی تعداد، ہتھیاروں کے نام، طیاروں کی اقسام اور بموں کی ہلاکت خیزی کا دائرہ اثر بتایا جاتا ہے تو بے اختیار پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد یاد آتی ہے۔فرانس، جرمنی، برطانیہ، اٹلی، سوویت یونین اور امریکا کے ہلاک شدگان کی کل تعداد پہلی جنگ عظیم میں چوراسی لاکھ اٹھارہ ہزار تھی، جبکہ دوسری جنگ عظیم میں ان ملکوں کے ہلاک شدگان میں جاپانی ہلاک شدگان کا بھی اضافہ ہوا تھا اور یہ تعداد بڑھ کر ایک کروڑ انہتر لاکھ تینتیس ہزار تک جا پہنچی تھی۔دونوں ہی مرتبہ ہلاک شدگان کے اعداد وشمار مرتب ہونے سے بہت پہلے اپنی اپنی فوجیوں کی شان وشوکت اور ان کی عددی قوت کا اعلان کیا گیا تھا۔ٹینکوں کی تعداد بتائی گئی تھی، بمبار طیاروں کے اعداد وشمار جاری ہوئے تھے اور ہر دو فریق نے خود کو 'ناقابل تسخیر' قرار دیا تھا...... کاش جنگوں کے شائقین ایک جنگ کے آغاز سے پہلے، سابقہ جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد سے بھی دنیا کو آگاہ کر دیا کریں۔

جائزہ لیا جائے تو دنیا پر حکومت کرنے والے سیاستدانوں، فوجی جرنیلوں، افسر شاہی کے افراد اور اسلحے کے بڑے بڑے صنعتکاروں کی کل تعداد بہ مشکل تمام چند ہزار افراد پر مشتمل ہوگی۔ یہ چند ہزار افراد دنیا کی ہر قوم سے تعلق رکھتے ہیں، ہر زبان بولتے ہیں، ہر عقیدے اور ہر نسل اور رنگ کی نمائندگی کرتے ہیں۔یہی ہیں جو دنیا پر اور انسانیت پر جنگیں مسلط کرتے ہیں اور جن کی ہوس اقتدار اور ہوس زر کسی طور کم نہیں ہوتی۔دوسری طرف دنیا بھر کے عوام ہیں، دانشور، ادیب، سائنسدان اور فنکار ہیں جنہیں ان جھگڑوں سے غرض نہیں، جو امن چین سے اپنے اپنے گھروں میں رہنا چاہتے ہیں، اپنے اپنے شہروں کو محفوظ و مامون دیکھنا چاہتے ہیں، اپنا کام کرنا چاہتے ہیں۔جنہیں بڑوں کی اس شطرنج کے نہ آداب واصول معلوم ہیں اور نہ اس بازی سے کوئی دلچسپی ہے۔اس کھیل میں کوئی بھی جیتے، کوئی بھی ہارے، گھر عوام کے گرتے ہیں...... بیٹے ان کے

مارے جاتے ہیں اور بیٹیاں اُن کی برباد ہوتی ہیں۔ یہ عوام صرف تیسری دنیا میں ہی نہیں، پہلی اور دوسری دنیا میں بھی رہتے ہیں۔ انہیں بھی جنگ سے اتنا ہی ڈر لگتا ہے جتنا ہمیں۔ موت کا خوف انہیں بھی ستاتا ہے اور شہروں کی موت ان کے اعصاب پر بھی آسیب کی طرح سوار رہتی ہے۔ ٹورنٹو کے یہ بارہ لڑکے ان ہی عوام میں سے ہیں۔ پیرس اور واشنگٹن کی سڑکوں پر امن مظاہرے کرنے والے بھی عوام ہیں۔ جنگ سے اور وہ بھی نیوکلیائی اور کیمیاوی جنگ سے مغرب کتنا لرزاں ہے، اس کا اندازہ ان کے ادب سے ہوتا ہے۔ ان کے یہاں ایسے متعدد افراد ہیں جنہوں نے جنگ کے خوف سے یا جنگ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے زندگی جیسی خوبصورت چیز تج دی۔

اس وقت مجھے اس ماں کا خط یاد آرہا ہے جو انٹرنیشنل فزیشنز فار دی پریونشن آف نیوکلیئر وار کے نام لکھا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا:

'میں آپ کو ایک چیک بھیج رہی ہوں، یہ چیک میری جانب سے نہیں، میرے اس بیٹے کی جانب سے ہے جس نے کچھ دنوں پہلے خودکشی کر لی۔ یہ رقم خطیر نہیں، انجان اور اجنبی لوگ میرے بیٹے کی یاد میں مجھے جو رقم بھیجتے ہیں انہیں اکٹھا کر کے میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔ آئندہ جب بھی مجھے ایسے عطیے موصول ہوئے وہ میں آپ کو ہی بھیج دوں گی۔ آپ کو میں اپنے بیٹے کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔ وہ ۲۳ برس کا تھا اور ہوش سنبھالنے کے بعد سے نیوکلیائی لڑائی کا خوف اس کے اعصاب پر ہمہ وقت چھایا رہا۔ وہ شاعر اور موسیقار تھا۔ اس کی بیشتر نظمیں اور دھنیں جنگی جنون میں مبتلا لوگوں کے خلاف تھیں۔ یہ لوگ ہمارے چاروں طرف نظر آتے ہیں۔ اس نے اپنے کمرے کی چھت سے لٹک کر خودکشی کی تھی۔ اسے جب نیچے اُتارا گیا تو اس کی جیب سے اخبار کا ایک تراشہ نکلا جس میں نیوکلیائی جنگ کی تباہ کاریوں کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں۔ اس خوف نے میرے بیٹے کے اعصابی نظام کو شل کر دیا تھا پھر وہ اس خوف میں اتنا ڈوبا کہ اس نے خود ہی اپنی جان لے لی۔ خوف اس کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔'

اس غمزدہ ماں نے خط کے آخر میں لکھا تھا:

'میں یہ سب کچھ آپ لوگوں کو اس لیے لکھ رہی ہوں تا کہ آپ کے توسط سے بے شمار افراد یہ جان لیں کہ ہم نے اپنے نوجوانوں کو کس قدر شدید ذہنی اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے اور ہم انہیں کس طرح مرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس بارے میں سوچیں کہ وہ جو ابھی زندہ ہیں اور جنہوں نے اپنے آپ کو ختم نہیں کیا ہے، وہ ایک بہتر، پُر اُمید اور پُرامن و پُرسکون دنیا میں زندہ رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ کیا ہم انہیں اسی لیے وجود میں لائے تھے کہ وہ ایک پاگل، جنگ زدہ اور زہرناک دنیا میں سانس لیں اور تڑپ تڑپ کر مر جائیں؟'

ایک گمنام ماں، ایک رواقی فلسفی اور ایک برطانوی مدبر کے یہ خطوط ہمارے ہاتھ میں آئینہ تھما دیتے ہیں اور اس آئینے میں ہمیں مظلوموں اور ظالموں کے چہرے نظر آتے ہیں۔ اس آئینے میں آگ میں گھرے ہوئے اور خون میں ڈوبے ہوئے خواب ہیں اور بے قابو آگ کو اپنے خوابوں سے بجھانے کی آرزو کرنے والے انسان ہیں جن میں سے کچھ کو یہ خواہش اس قدر نڈھال کر دیتی ہے کہ وہ شعر کہنے کی بجائے اپنے کمرے کی چھت سے لٹک کر مر جانے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں اور کچھ کروز میزائل تیار کرنے والی فیکٹری کی دیواروں پر اپنا خون چھڑکتے ہیں اور گرفتار ہوتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ تمام تباہ کن ہتھیاروں کی ایجاد سائنس دانوں کا کارنامہ ہے لیکن اس پر انہیں آمادہ کرنے اور انعام واکرام دینے کا جرم اعلیٰ فوجی اور سیاستدانوں کے سر ہے۔ ان مہیب ہتھیاروں کو ایجاد کرنے والے اب ان کی دہشت ناکی سے سب سے زیادہ لرزہ براندام ہیں۔ پہلے ایٹمی تجربات اور ہتھیاروں کے مخالف سائنسدانوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا لیکن اب ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اس وقت امریکی، فرانسیسی، برطانوی، روسی اور دیگر قومیتیں رکھنے والے لاتعداد سائنسدان تمام دنیا کو ان خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں جن سے ہماری دنیا کسی بھی لمحے دوچار ہو سکتی ہے۔ کس قدر مضحکہ خیز صورت حال ہے کہ فرانسیسی حکومت ۱۹۹۰ء میں چار کھرب چھہتر ارب فرانک (۴۰۰۰ ۷ ۴ ملین) کی رقم مخصوص کر رہی تھی تا کہ اس سے پانچ سال تک فرانسیسی افواج کے لیے

جوہری اسلحے کی خریداری کی جا سکے۔ دوسری طرف فرانسیسی سائنسدان ان ہی جوہری ہتھیاروں کے خلاف کتابیں لکھ رہے تھے...... تقریریں کر رہے تھے۔

۱۹۸۹ء میں دو فرانسیسی سائنسدانوں، ہیوبرٹ ریوز اور البرٹ جیکوارڈ کی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ ان کتابوں میں دونوں نے نیوکلیائی جنگ کے نتیجے میں انسان کے مکمل خاتمے اور دنیا کی بربادی کی تفصیلات بیان کی تھیں۔

جیکوارڈ کا کہنا تھا کہ کسی بھی نیوکلیائی جنگ کے نتیجے میں انسان واقعتاً بھاپ بن کر اُڑ جائیں گے، کونوں کھدروں میں بچ رہنے والے جو انسان چند دن یا شاید چند ہفتے زندہ رہ سکیں، ان کے نصیبوں پر رشک کریں گے جو پہلے ہی لمحے ختم ہو گئے۔ جیکوارڈ کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق ۸۰ء کی دہائی کے اختتام پر دنیا میں جو نیوکلیائی اسلحہ تھا، اگر اس کا صرف ایک فیصد بھی کسی جنگ میں استعمال ہو گیا تو زمین پر اس نیوکلیائی سردی کا آغاز ہو جائے گا جس کا خاتمہ شاید ہزاروں برس بعد ہی ممکن ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں دنیا ایک بار پھر 'برفانی دور' سے دوچار ہو جائے گی۔

فرانسیسی سائنسدان سوزان سولومن ہے جو انٹارکٹک کے فرانسیسی اسٹیشن پر ایک عرصے تک متعین رہی اور سترہ سائنس دانوں کی ٹیم کی سربراہ تھی۔ وہاں ایک مہینے تک برف پر مختلف تجربات کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ زمین کی فضا کے حفاظتی غلاف اوزون میں امریکا کے رقبے کے برابر جو سوراخ ہو چکا ہے، اسے ماحول کی آلودگی کے علاوہ نیوکلیائی تجربات بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یاد رہے کہ چند برس پہلے امریکیوں نے فرانس کے کانکورڈ طیاروں کو بھی اوزون کے غلاف کو نقصان پہنچانے کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔

امریکی محقق کارل ساگان اور روسی سائنسدان نکیتا موئی یو اس بات پر متفق رہے ہیں کہ دنیا میں اگر نیوکلیائی جنگ چھڑ گئی تو اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ کروڑوں ٹن دہکتی ہوئی راکھ دنیا پر برسے گی جس کی وجہ سے دنیا مکمل تاریکی میں ڈوب جائے گی اور 'نیوکلیائی رات' کا آغاز ہو گا بلکہ اوزون کا غلاف بھی پارہ پارہ ہو جائے گا۔ یہ وہ غلاف ہے جو کرۂ ارض پر انسان کو سورج کی بالائے بنفشی شعاعوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

فرانسیسی سائنس دان ریوز نے لکھا کہ دنیا پر نیوکلیائی راکھ کی گرد کی جو چادر تنے گی، سورج کی گرمی اور روشنی اس دبیز چادر سے گزر نہیں سکے گی جس کے نتیجے میں دنیا کا درجہ حرارت نقطۂ انجماد

سے بیس اور تیس درجے نیچے گر جائے گا۔ تب دنیا میں اس نیوکلیائی 'سردی' کا آغاز ہوگا جس کی تباہ کاریوں کا انسان ابھی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ موسموں کی اس اچانک تبدیلی کے سبب سمندروں اور ہواؤں میں بھیانک تلاطم ہوگا جو خوفناک طوفانوں کو جنم دے گا۔ بے پناہ سردی اور سورج کی روشنی زمین پر نہ پہنچ سکنے کے سبب روئیدگی ختم ہو جائے گی۔

جیکوارڈ بتاتا ہے کہ سال چھ مہینے بعد نیوکلیائی راکھ کی برسات جب ختم ہوگی اور 'نیوکلیائی رات' سے دنیا کو نجات دینے کے لیے سورج کی روشنی زمین پر پہنچے گی تو اوزون کا غلاف تباہ ہو جانے کے سبب، سورج کی وہی روشنی جو دنیا کے لیے سرچشمۂ حیات تھی، اس کی بالائے بنفشی شعاعیں دنیا میں تباہی مچادیں گی۔

اور جب یہ سب کچھ ہو رہا ہوگا اس وقت کرۂ ارض پر انسان کا نام و نشان بھی نہیں ہوگا۔ جیکوارڈ لکھتا ہے کہ یورپ اور امریکا کے وہ لوگ جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ زیرزمین جوہری پناہ گاہیں انہیں موت سے، ہلاکت اور عذاب سے محفوظ رکھیں گی۔ وہ اپنے آپ کو محض بہلا رہے ہیں۔ اس کا اصرار ہے کہ اپنی ایجاد کا پہلا لقمۂ تر خود انسان ہوگا جو نیوکلیائی جنگ کا آغاز ہوتے ہی بھاپ بن کر اڑ جائے گا، خاک بن کر بجھ جائے گا۔

جس دنیا میں ان ہلاکت آفریں ہتھیاروں پر کھربوں روپے خرچ کیے جا رہے ہیں، اسی دنیا میں اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق تیسری دنیا کے ایک ارب انسان 'پاورٹی لیول' سے نیچے یا یوں کہہ لیں کہ 'غربت کی انتہا' پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ۸۷ کروڑ انسانوں کو ناکافی غذا ملتی ہے، پچاس کروڑ انسان ناخواندہ ہیں جبکہ ڈیڑھ ارب انسانوں کو کسی بھی قسم کی طبی سہولتیں میسّر نہیں ہیں۔

نیوکلیائی ہتھیاروں پر خرچ ہونے والی ہوشربا رقم کا تو یہاں ذکر ہی نہیں، صرف ایک جیٹ بمبار کی قیمت سے تیسری دنیا کے دیہی علاقوں میں چالیس ہزار طبی مراکز کھولے جا سکتے ہیں اور صرف ایک تباہ کن بحری جہاز کی قیمت کے مساوی رقم اگر تیسری دنیا کے لوگوں کو بجلی پہنچانے پر صرف کی جائے تو نوے لاکھ افراد کے گھر بجلی کی روشنی سے جگمگا سکتے ہیں۔

غرض ایک طرف نیوکلیائی اندھیرے اور رگوں میں خون جما دینے والی سردی کا دہشت ناک تصور ہے تو دوسری طرف روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے شہر، قصبے اور دیہات ہیں۔ ایک جانب تابکاری سے اذیت ناک موت کے گھاٹ اترتا ہوا انسان ہے تو دوسری جانب طبی مراکز

میں بچائی جانے والی انسانی جانیں ہیں۔

متعدد فرانسیسی، برطانوی، امریکی اور روسی سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ہم انسان اور انسانیت کی مکمل تباہی کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی نیوکلیائی جنگ کی صورت میں دنیا کا خاکستر ہو جانا اور بنی نوع انسان کا بلکہ دنیا سے ہر ذی حیات کا نابود ہو جانا حتمی ہے۔ اسی لیے ہم دنیا بھر کے انسانوں کو ان خطرات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں جو ان کے سروں پر اور ان کی آنے والی نسلوں کے مستقبل پر منڈلا رہے ہیں۔ یہ ہمارے ضمیر کا مسئلہ ہے اور ہمارے وجود کا بھی۔ ہم اپنے بعد اپنی نسلوں کی صورت میں زندہ رہنا چاہتے ہیں، اپنی زمین کو ان کی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں اور اسے ان کی انگلیوں سے محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ہم ان اداروں اور ان افراد کے خلاف مسلسل صدائے احتجاج بلند کرتے رہیں گے جو انسانوں کو اس اجتماعی خودکشی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

اس وقت مجھے ۶۰ کی دہائی کے وہ دن یاد آئے جب کراچی ایک دلکش اور پُر ماجرا شہر تھا، یہاں سنیما گھر پائے جاتے تھے، لوگوں کو اچھی فلموں کی آمد کا انتظار رہتا تھا، سنیما گھروں پر لمبی لمبی قطاریں لگتی تھیں اور بین الاقوامی طور پر شہرت یافتہ فلمیں اپنے اترنے کے بعد بھی عرصے تک موضوع گفتگو رہتی تھیں۔ ان ہی دنوں کی بات ہے کراچی کے کسی سنیما گھر میں ایک فلم 'دی تھرڈ ورلڈ وار' ریلیز ہوئی۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ فلم جاپان میں بنی تھی اور اس کا مرکزی کردار ایک جاپانی لڑکی تھی جو اسکول میں نرسری کے بچوں کو پڑھانے پر مامور تھی۔ اس فلم میں دنیا کے بڑے بڑے شہروں، نیویارک، لندن، پیرس، ٹوکیو، اور دِلّی کو نیوکلیائی آگ میں جلتے ہوئے، بہتے اور پگھلتے ہوئے لاوے میں تبدیل ہوتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور انسان اپنی تمام محبتوں اور نفرتوں کے ساتھ اس جہنمی آگ میں بھسم ہو گئے تھے۔

'دی تھرڈ ورلڈ وار' ہو یا 'ہیروشیما اور ماں کی دعا'، 'The Day After' ہو یا 'Armagidion' یا اس موضوع پر بننے والی دوسری فلمیں ایسی نہیں ہیں جنہیں دیکھ کر بھلایا جا سکے۔ اسی قبیل کی ایک فلم 'دی لیٹر آف اے ڈیڈ مین' ہے۔ یہ بھی اس نیوکلیائی جنگ کے بارے میں ہے، جس کے خوف سے دنیا کی تمام قومیں دہشت زدہ ہیں اور پھر بھی ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری اور ان کے حصول کے لیے بیقرار ہیں۔ اس فلم کے بارے میں بعض بین الاقوامی رسالوں میں پڑھا،

تو اُمید نہ تھی کہ اسے دیکھ سکوں گی کیونکہ یہ فلم سوویت یونین میں بنی تھی اور کراچی میں سوویت یونین کی فلمیں عنقا و نایاب تھیں۔ لیکن سوویت کلچرل سینٹر کے ڈائریکٹر طاش مرزائیو کی عنایت کے سبب میں اس فلم کو دیکھ سکی۔

یہ ان بچوں کے بارے میں تھی جو ایٹمی پناہ گاہ سے نکلے تھے تو ان کے اردگرد کی ہوا نا قابل یقین حد تک سرد تھی۔ ان کے پیروں کے نیچے نیوکلیائی آگ کی راکھ تھی۔ دنیا کا تمام حسن خاکستر ہو چکا تھا اور اب ان کے بھاری بوٹوں سے سرمئی راکھ بن کر لپٹ رہا تھا۔ وہ زمین جس پر دریا لہریں لیتے تھے، پیڑ جھومتے تھے، بچے قلقاریاں مارتے تھے، نوجوان محبت کرتے تھے، محبوبائیں انتظار کرتی تھیں، بوڑھے کہانیاں سناتے تھے، جس کی فضا میں تتلیاں اڑتی تھیں، جس کی ہواؤں میں خوشبو تھی، رعنائی و برنائی تھی۔ وہ اب محض خاک کا ڈھیر تھی۔ وہ نیلا آسمان جسے کہکشاں اپنا دوشالہ اڑھاتی تھی، چاند کی کشتی جس کی وسعتوں میں تیرتی تھی اور شام کا پہلا تارا جس کی پیشانی پر ہیرے کی طرح جگمگاتا تھا، اس نیلگوں آسمان کو نیوکلیائی آگ کے دھوئیں نے نگل لیا تھا۔ اب محض خنکی تھی، ایک بیکراں اندھیرا تھا اور پاگل کر دینے والا سکوت۔

اس فلم کو دیکھتے ہوئے یہ احساس جاں فزا تھا کہ جو کچھ بھی میں دیکھ رہی ہوں، وہ ایک فلم ہے، ایک کہانی ہے، حقیقی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اس کے ساتھ ہی ہر مرتبہ یہ احساس بھی ہوا کہ اس وقت ہماری دنیا ہوس جنگ میں مبتلا جن جنونیوں کے چنگل میں ہے، ان سے بعید نہیں کہ کب وہ کسی تخیلاتی فلم کے دہشت زدہ کر دینے والے مناظر کو حقیقت میں بدل دیں۔

یہ ایک ایسا تھرا دینے والا خیال ہے جو ہم سب کو بہت کچھ سوچنے اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں بہت کچھ کرنے اور مسلسل کرتے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس فلم کے ڈائریکٹر کانسٹنٹائن پشانکی کا شمار سابق سوویت یونین کے ان ذہین اور باصلاحیت نوجوان فلم ڈائریکٹروں میں ہوتا تھا جو فلم کو انسانی احساسات اور جمالیات کا موثر ترین ذریعۂ اظہار سمجھتے ہیں۔ اس نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا......

> 'مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے اور اسی احساس نے مجھ سے یہ فلم بنوائی ہے جسے دیکھنے کے بعد انسان کے ذہن میں صرف ایک ہی سوال گردش کرتا ہے کہ ایٹم بم کی شکل میں انسان نے کہیں اس 'جن' کو تو بوتل

سے آزاد نہیں کر دیا جو آخر کار اپنے آزاد کرنے والے کو سموچا نگل جائے گا
اور ہماری دھرتی ریزہ ریزہ ہو کر کائناتی دھول میں بدل جائے گی'۔

اپنے انٹرویو میں اس نے کہا تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ جنگ کا خوف انسانوں کے ذہنوں سے کابوس کی طرح چمٹ جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ شدید بارش کے دوران جب بادل کڑکیں تو میرا پانچ سالہ بچہ مجھ سے چمٹ جائے اور پوچھے...... 'ڈیڈی، کیا جنگ شروع ہو گئی ہے؟' میں یہ نہیں چاہتا۔

اور یہ ہم میں سے بھلا کون چاہتا ہے۔ شاید دنیا کے بیشتر انسانوں کو اس عالمی صورت حال سے نفرت ہے، جس نے کم عمر بچوں کے ذہنوں کو بھی جنگ کی ہیبت اور دہشت سے یوں بھر دیا ہے کہ وہ آسمانی بجلی کے کڑکنے کو جنگ کا آغاز تصور کر لیتے ہیں اور بارش سے لطف اندوز ہونے کی بجائے خوف سے لرزنے لگتے ہیں۔

یہ فلم ان خطوط پر مشتمل تھی جو لحظہ لحظہ کر کے نیوکلیائی موت مرتے ہوئے ایک باپ نے اپنے مردہ بیٹے کے نام لکھے۔ اس فلم کا مرکزی کردار ایک بوڑھا سائنسدان ہے جو شہر کے ایک آرٹ میوزیم کے تہہ خانے میں چند دوسرے افراد کے ساتھ ہے۔ تہہ خانے سے باہر سب کچھ ختم ہو چکا ہے اور جو لوگ تہہ خانے کے اندر موجود ہیں، موت ان کا بھی مقدر ہے۔

یہ تمام تباہی ایک کمپیوٹر کی غلطی سے شروع ہوتی ہے۔ کمپیوٹر آپریٹر کافی پی رہا ہے۔ اُسے پھندا لگتا ہے اور اسی دوران کمپیوٹر غلط طور پر دوسری عالمی طاقت کی جانب سے ایٹمی حملے کی نہ صرف خبر دیتا ہے بلکہ فوراً جوابی حملے کے احکامات بھی جاری کر دیتا ہے۔ کمپیوٹر آپریٹر چیختا ہے، ہذیانی انداز میں کہتا ہے...... 'یہ اطلاع سراسر غلط ہے...... ہم پر نیوکلیائی حملہ نہیں ہوا ہے۔ جوابی کارروائی فوراً روک دو، میزائلوں کی روانگی منسوخ کر دو'۔ لیکن اس سے سات سیکنڈ کی تاخیر ہو گئی ہے۔ یہ وہی سات سیکنڈ ہیں جن کے دوران اسے کافی کا پھندا لگا تھا اور پھر یہ پھندا، ساری دُنیا کے گلے میں پھانسی کا پھندا ثابت ہوتا ہے۔ آپریٹر جانتا ہے کہ اس تاخیر کے سبب انسانیت کے ہاتھ سے سب کچھ نکل چکا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ چودہ منٹ کے اندر اندر ساری دُنیا تباہ ہو جائے گی اور اس 'علم' کا بوجھ اتنا مہیب اور بھیانک ہے کہ کمپیوٹر آپریٹر اسی وقت خودکشی کر لیتا ہے۔

فلم کا مرکزی کردار سائنسدان آرٹ میوزیم کے تہہ خانہ میں اپنی بیوی، چند ساتھیوں اور

بچوں کے ساتھ ہے اور جانتا ہے کہ اسے سسک سسک کر ختم ہو جانا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا بیٹا جو باہر تھا، ختم ہو چکا ہے لیکن وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے بیٹے کے خیال سے گفتگو کرتا رہتا ہے۔ بیٹا جو مستقبل کی علامت ہے، اسے خط لکھتا رہتا ہے:

'ڈیئر ایرک، قبل اس کے کہ ہم سب، تمہاری ماں، میں اور خود تم...... کائنات کا حصہ بن جائیں، ہمارے پاس زندہ رہنے کے لیے چند گھنٹے ہیں۔ میں اور تمہاری ماں آرٹ میوزیم کے تہہ خانے میں اپنے چند ساتھیوں سمیت پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم یہاں تمہارا انتظار کریں گے۔ شاید تم بچ گئے ہو۔ تمہاری ماں کا کہنا ہے کہ تم ختم ہو چکے ہو لیکن میں اس بات پر یقین نہیں کرنا چاہتا۔'

اس فلم کے ہیرو رولان بیکو نے اس فلم کے پریمیئر کے موقع پر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اس نے اس فلم میں بنیادی کردار کیوں ادا کیا، بے ساختہ کہا تھا:

'اس فلم میں کام کرنا میرے لیے ناگزیر تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس فلم میں کام کر کے میں نے اپنی شہری اور انسانی ذمہ داری ادا کی ہے۔'

فلم میں 'سات سیکنڈ' کو ایک خوبصورت اور بامعنی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا تھا کہ صرف 'سات سیکنڈ' کی غلطی نظامِ شمسی کے سب سے حسین اور ذہین کرّے کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ عہد نامہ عتیق کے مطابق تخلیق اور تعمیر کے لیے خدا کو بھی چھ دنوں اور چھ راتوں کی مدت درکار ہوئی تھی تب ہی ساتویں دن خداوند خدا نے آرام کیا تھا۔

یہ حتمی موت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر بھی زندگی پر یقین رکھنے کی ایک عظیم کہانی ہے۔ یہ ان بچوں کی کہانی ہے جو اس آرٹ میوزیم کے تہہ خانے میں موجود ہیں جنہیں فلم کا ہیرو یعنی بسترِ مرگ پر پڑا ہوا سائنسدان، یقین دلاتا ہے کہ زندگی، موت سے عظیم ہے اور انسان کائنات میں سانس لینے والا سب سے بہادر اور جی دار، ذی حیات ہے۔ یہ ایک مردہ کرّے پر زندگی کے لیے جدوجہد کرنے والے ان بچوں کی کہانی ہے جن سے مرتے ہوئے ایک بہادر انسان نے کہا تھا...... 'ہمت نہ ہارنا، چلتے جانا جب تک کہ تمہارے وجود میں توانائی کا ایک شمہ بھی موجود ہے۔'

'لیٹر فرام اے ڈیڈ مین' ہو یا اس موضوع پر بننے والی دوسری فلمیں، امن اور زندگی کے حق

میں لکھے جانے والے ناول، کہانیاں، شاعری...... ان سب کا مقصد عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنا اور انسانوں کو ان خطرات سے آگاہ کرنا ہے جو ان کے سر پر پہنچ چکے ہیں۔ایک ایسی ہی تحریر ہندستان کی مشہور ادیب ارون دھتی رائے کی ہے۔ پوکھران دھماکوں کے فوراً بعد ۳۱/جولائی ۱۹۹۸ء کو ہندوستانی رسالے 'فرنٹ لائن' میں ان کا ایک مضمون 'تخیل کی موت' کے نام سے شائع ہوا۔ارون دھتی رائے نے لکھا:

'ایٹمی ہتھیار پاگل پن کے پیامبر ہیں...... یہاں ہندوستان میں اور یہاں سے تھوڑی دور پاکستان میں، ہر مرد، عورت اور بچے سے میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں: اسے اپنا ذاتی مسئلہ سمجھئے۔آپ جو کوئی بھی ہوں، ہندو، مسلمان، شہری، دیہاتی، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا...... جب وہ دِن آئے گا تو آپ سے آپ کے ذاتی کوائف نہیں پوچھے جائیں گے۔تباہی ہر ایک کے لیے یکساں ہوگی...... ہندوستان کا ایٹم بم اس حکمران طبقے کی جانب سے حتمی غداری ہے جس نے اپنے عوام کو دھوکا دیا ہے......ہم اپنے سائنسدانوں کو تعریف کے کتنے ہی ہاروں سے لاد دیں، ان کے سینوں پر کتنے ہی تمغے آویزاں کر دیں، حقیقت یہی ہے کہ بم بنانا بہت آسان کام ہے، چالیس کروڑ عوام کو تعلیم دینا اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے......ایٹم بم انسان کے ہاتھوں وجود میں آنے والی سب سے زیادہ جمہوریت دُشمن، ملک دُشمن، قوم دُشمن، اِنسانی دُشمن اور شیطانی چیز ہے۔'

۱۱/مئی ۱۹۹۸ء کو ہندوستان نے جو ایٹمی دھماکے کیے، اس پر ارون دھتی رائے نے اور کئی دوسرے ہندوستانی دانشوروں اور ادیبوں نے اپنے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔اس سے بہت پہلے ہندوستان کے ایٹمی پروگرام سے خوفزدہ ہو کر ساحر لدھیانوی نے کہا تھا:

کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں، آسماں کی خیر نہیں

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

افسوس کہ یہ آوازیں مدھم رہیں۔ مہاتما بدھ، مہاویرا اور مہاتما گاندھی کی جنم بھومی پر وہ دانش غالب نہ آسکی جو ہندوستان کی سرزمین پر ایٹمی عفریت کی پیدائش کو روک سکتی۔ اب ہم ساحر کی طرح اس خوف سے دوچار ہیں کہ ہمارے وجود تو دور کی بات ہیں، یہ ایٹمی بلائیں کہیں ہماری پرچھائیوں کو بھی جلا کر راکھ نہ کر دیں۔

قوموں اور ملکوں کو جنگی جنون میں مبتلا کر دینا بہت آسان ہے لیکن انہیں امن وآشتی کا راستہ دکھانا ایک مشکل کام ہے۔ وہ لوگ جو آج کیمیاوی ہتھیاروں یا ایٹمی اسلحے کی موجودگی پر فخر کرتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ اگر ان کی مرضی کے مطابق معاملات نہیں طے کیے گئے تو وہ ان ہتھیاروں کا استعمال کر گزریں گے۔ انہیں ذمہ دارانہ عہدوں پر نہیں، پاگل خانوں میں ہونا چاہیے۔

جوہری ہتھیار بندی جنوبی اشیا پر کس طرح اثر انداز ہوگی اس کی واضح تصویر ہمیں سامنے دکھائی دے رہی ہے۔ اس ہتھیار بندی کے شائقین نے برصغیر کے کروڑوں انسانوں کے ہاتھ سے ان کی آدھی روٹی بھی چھین لی ہے۔ وہ خطیر رقم جو دونوں ملکوں کے غریبوں کی حالت سدھارنے پر صرف ہو سکتی تھی، وہ جوہری آتش بازی کی نذر ہوگئی ہے۔ یہ بات برصغیر کے خواص وعوام کی سمجھ میں نہ جانے کب آئے گی کہ اگر لاکھوں سپاہیوں پر مشتمل افواج اور اسلحے کے انبار ہی قوموں کے ناقابل تسخیر ہونے کا سبب ہوا کرتے تو ویتنام سے دنیا کی عظیم ترین فوجی طاقت امریکا کو شرمناک پسپائی نہ اختیار کرنی پڑتی اور دوسری جنگ عظیم میں جاپان پر ایٹمی حملہ کر کے اسے شکست فاش دینے کے بعد، اس پر فوج اور اسلحہ نہ رکھنے کی پابندی لگانے والے امریکا کو صرف ۴۸ برس بعد جاپان سے تجارتی مراعات کے لیے درخواست نہ کرنی پڑتی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دنیا کی عظیم طاقت سوویت یونین اپنے اسلحہ خانوں میں ہزاروں ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی کے باوجود یوں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاتی۔

یہ کام دانشوروں، ادیبوں اور فنکاروں کا ہے کہ جنگی جنون میں مبتلا لوگوں کے سامنے سر

اُٹھا کر کھڑے ہو سکیں اور یہ کہہ سکیں کہ اے لوگو! ہم لڑائی کے لیے اپنے ہتھیار کیسے اُٹھائیں کہ ادھر اور ادھر دونوں طرف ہمارے باپ، بیٹے، بھائی اور بھتیجے ہیں...... ہم لہلہاتی ہوئی فصلوں اور رس سے بسے شہروں پر بم کیسے برسائیں کہ دونوں طرف ہمارے دل کے رشتے اور خون کے ناتے ہیں...... ہماری مشترک تہذیب کے حسین ترین آثار اور افکار ہیں...... ہمارے بچے ان شہروں میں کھیلتے ہیں اور یہاں ہمارے پرکھوں کی قبریں ہیں...... ان کی راکھ یہاں کے کھیتوں کھلیانوں میں بکھری ہوئی ہے۔ قبرستانوں اور شمشانوں پر بھی بھلا کہیں آگ برسائی جاتی ہے؟

اپنی بات ختم کرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ آپ کو ایک کہانی سناؤں۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک قصبے میں دو بچے رہتے تھے۔ دونوں دو برس کے ہوئے تو ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔ کبھی ایک دوسرے کو گھونسا مار کر بھاگ جاتا، کبھی دوسرا پہلے کو تھپڑ رسید کر دیتا۔ دونوں بارہ برس کے ہوئے تو ایک دوسرے کے خلاف ڈنڈوں اور پتھروں کا استعمال شروع کر دیا۔ کبھی ایک کا سر پھٹتا، کبھی دوسرے کا ہاتھ ٹوٹتا۔ بائیس برس کے ہوئے تو دونوں نے ایک دوسرے پر گولیاں برسانے کا شغل اختیار کیا۔ بیالیس برس کو پہنچتے پہنچتے وہ ایک دوسرے پر بم برسانے لگے اور جب ۶۲ برس کے ہوئے تو ایک دوسرے کے خلاف جراثیم کے ہتھیار تیار کرنے لگے۔ ۸۲ برس کی عمر میں دونوں مر گئے۔ مرنے کے بعد بھی ان کا ایک دوسرے سے ناتا نہ ٹوٹا، اور ان کے وارثوں نے انہیں پہلو بہ پہلو دفن کر دیا۔ قبر کا کیڑا اپنے لاتعداد بیٹوں بیٹیوں، پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں کے ساتھ ان دونوں کی لاشیں کھا رہا تھا تو قبر کے کیڑوں کا یہ خاندان اس بات سے آگاہ نہ تھا کہ اس نے جن دو لاشوں پر اتنے دنوں دعوت اُڑائی ہے وہ ایک دوسرے کے دشمن جانی تھے اور وہ کیڑے جانتے بھی کیسے کہ دونوں قبروں کی مٹی تو ایک ہی جیسی تھی۔

ذرا ٹھہریئے، کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور بات سنہ ۵۰۰۰ عیسوی تک جاتی ہے۔ سنہ ۵۰۰۰ء میں ایک بجو نے زمین سے سر نکال کر اپنے چاروں طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ پیڑ جھومتے ہیں، کوے کائیں کائیں کرتے ہیں۔ کتے بھونکتے ہیں، مچھلیاں اور گھونگھے چاند اور ستارے، سمندر کی لہریں، دریا کی موجیں زمین پر رینگتی ہوئی چیونٹی اور ہوا میں اڑتی ہوئی گوریا سب اسی طرح ہیں۔ بجو نے آدمی کو تلاش کیا لیکن وہ اسے نہیں ملا، اس نے قریب سے گزرتے ہوئے لکڑ بگھے سے آدمی کے بارے میں پوچھا تو اس نے افسوس سے گردن ہلائی اور کہا...... 'آدمی......؟ ہاں، کبھی کبھار کوئی

آدمی بھی نظر آجاتا ہے۔'

مجھے نہیں معلوم کہ جنگ پسند لوگ اس کہانی سے کیا سبق لیں گے لیکن میں دونوں طرف کے جنگ پسندوں کو یہ حق نہیں دینا چاہتی کہ وہ برصغیر کو ہمیشہ کے لیے کورو کشیتر یا پانی پت کا میدان بنا دیں۔ میں اس خیال سے لرزتی ہوں کہ حتمی جنگ کے ہزاروں برس بعد باڑھ پر آئے ہوئے دریا میدانی علاقوں کی مٹی بہالے جائیں تو ہماری وہ ہڈیاں نظر آنے لگیں جو اس وقت بھی تابکاری سے آلودہ ہوں گی۔

ہیروشیما اور ناگاساکی سے پہلے ہم انسانوں کا خیال تھا کہ افراد کو موت آسکتی ہے، تہذیبیں فنا ہو سکتی ہیں، تاریخ دفن ہو سکتی ہے لیکن انسانیت لازوال ہے۔ ہماری دھرتی 'ابدالآباد' تک 'آباد' رہنے کے لیے ہے لیکن ان دو شہروں کی تباہی نے ہم انسانوں کا یہ یقین ہم سے چھین لیا ہے۔ آج ہم سہمے ہوئے بچوں کی طرح ہیں۔ آج ہم جانتے ہیں کہ کسی جنونی حکمران کا ایک اشارہ یا کسی غیر ذمہ دار انسان کی لاپروائی اس کرۂ ارض کو مردہ سیارے میں تبدیل کر سکتی ہے اور 'انسان' ہمیشہ کے لیے معدوم ہو سکتا ہے۔

مجھے ایک بار پھر 'لیٹر فرام اے ڈیڈ مین' یاد آئی۔ عام انسانوں کے نام، مستقبل کی جانب سے بھیجا جانے والا ایک کھلا ہوا خط جو ہماری نفرتوں اور ہماری دشمنی کی لایعنیت ہم پر عیاں کرتا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں اس سوال کو اُٹھاتا ہے کہ ہم ایک ایسی جنگ کیوں لڑیں جس میں ہر فریق محض ہارنے کے لیے لڑے گا اور یہ ہار چند انسانوں یا چند قوموں کی نہیں، تمام انسانیت کی ہوگی۔

'دی لیٹر فرام اے ڈیڈ مین' کا ایک کردار کہتا ہے......

'اب وقت آگیا ہے کہ ہم یہ بات تسلیم کر لیں کہ انسان کی تاریخ ہر زندہ شے کو ملیامیٹ کر دینے کی تاریخ ہے۔ انسان کو دانش دی گئی تھی لیکن وہ اس دانش کو استعمال کرنے کے طریقے نہیں جانتا تھا۔ اس کی ذہانت نے وہ تمام طریقے ایجاد کیے جنکے ذریعے انسان اور انسانیت مکمل طور پر خودکشی کر سکیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہم انسان اس بات کا اعتراف کر لیں کہ ہم مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔ ہم انسانیت کے نام پر ایک تہمت ہیں۔ فطرت نے ہمیں جو کچھ عطا کیا تھا، ہم نے اس میں سے ذرہ برابر بھی

استعمال نہیں کیا۔'

جنگ کی باتیں، جب تک باتیں رہیں...... بہت شاندار، پُرشکوہ اور باوقار محسوس ہوتی ہیں لیکن جنگ جب انسانوں پر مسلط ہو جائے تو وہ تمام اعلیٰ اقدار کو چاٹ جاتی ہے اور تمام خوبصورتیوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتی ہے اور اپنے پیچھے لاشوں کے پہاڑ اور خون کے دریا چھوڑ جاتی ہے۔ اور اب ہم سب جس آخری جنگ کی بڑی جوش و خروش سے تیاریاں کر رہے ہیں اس کے بعد نہ فتح کا پھریرا اڑانے والے رہیں گے اور نہ شکست کی ذلت سہنے والے۔ پھر تو فاتح و مفتوح اس اجتماعی قبرستان میں ایک ساتھ سوئیں گے جس کا نام 'زمین' ہوگا۔

(اس مضمون کے اقتباسات مئی ۲۰۰۰ء میں ضمیر نیازی کی مرتبہ کتاب 'زمین کا نوحہ' کی تقریب رونمائی کے موقع پر پڑھے گئے۔)

کتابیات

1. Ahmad, Samina, David Cortright,*Pakistan and the Bomb.*
2. *Ashai Graphics,* 6 August 1952.
3. Bidwai, Praful, Achin Vinaik,*South Asia on a Short Fuse.*
4. Dr. Mehboobul Haq in*The Times of India,* April 1996.
5. Eatherly, Maj. Claude,*Burning Conscience*.
6. *Economic & Political Weekly,* Bombay (different issues.)
7. 'Editorial', *Indian Social Institute Bulletin,* June 1998.
8. Einstein, Albert, *Selected Writings & Speeches of Albert Einstien.*
9. *Encarta Encyclopedia* 2000.
10. *Encyclopedia Britannica* Vol. 12 Edition 1964.

11. *Encyclopedia Britannica* Vol. 20 Edition 1964.
12. *Encyclopedia Britannica* Vol. 23 Edition 1964.
13. Fenton, Ian (ed.), *The Psychology of Nuclear Conflict.*
14. Gandhi, Mohandas Karamchand, *Writings of Mahatma Gandhi.*
15. *India Today,* May 1998.
16. Ken Domon, *Living Hiroshima.*
17. Kothari, Smitu Zia Mian, *Out of The Nuclear Shadow.*
18. Letter of a Mother, *International Physician for the Prevention of Nuclear War.*
19. Mahbubul Haq, Dr., *Human Development Report on South Asia* 1997.
20. Monthly *STP* (different Issues), Moscow.
21. *Out Look,* 25 May, 1989.
22. Records of the Military Adcisor to the office of Near Eastern & African Affairs, Record Group 59, National Archives, Washington DC.
23. Russell, Bertrand, *Autobiography.*
24. Sakharov, Anderi Dimitrievich, *Progress, Co-existence and Interllectual Freedom.*
25. *Social Sciences* (Different Issues), Moscow.
26. *Soviet Film* (monthly), 'Interview of Constentine Pushanki', Moscow, 1987.
27. *Soviet Film,* 'Letter from a Dead Man' (Film Review), Moscow, 1987.
28. 'Speech of Mr. Deepaknar Banerjee, Member Indian Parliament', *Main Stream,* May 1998.
29. *Towards a Liberating Peace,* The United Nations University.
30. Venkataramani, M.S. *The American Role in Pakistan.*

۳۱۔ 'ایٹمی دوڑ کی تاریخ،نوائے انسان،اگست ۱۹۹۸ء۔
۳۲۔ جاوید، قاضی، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقا۔
۳۳۔ رائے، اروندھتی، تخیل کی موت (مترجم اجمل کمال)
۳۴۔ حنا، زاہدہ، 'پگھلتا ہوا انسان اور نیوکلیائی رات، روزمانہ جنگ، ۱۱رنومبر ۱۹۸۸ء
۳۵۔ ......'...... 'دوشہروں کا ذبیحہ، روزنامہ جنگ، ۴راگست ۱۹۸۹ء
۳۶۔ ......'...... 'آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ، روزنامہ جنگ، ۱۵ردسمبر ۱۹۸۹ء
۳۷۔ ......'...... 'اپنے ضمیر سے مکالمہ، روزنامہ جنگ، ۱۶رمارچ ۱۹۹۰ء
۳۸۔ ......'...... 'جوہری اسلحہ اور البرٹ آئن اسٹائن، روزنامہ جنگ، ۸ جون ۱۹۹۰ء
۳۹۔ ......'...... 'افق پر اُمید کے بارہ سورج، روزنامہ جنگ، ۸فروری ۱۹۹۱ء
۴۰۔ ......'...... 'ضمیر کی عدالت میں، روزنامہ عبرت، ۷راگست ۱۹۹۴ء
۴۱۔ ......'...... 'نقطہ نظر میں تبدیلی کی ضرورت، روزنامہ اردو نیوز، روزنامہ عبرت، ۱۹رجنوری ۱۹۹۶ء
۴۲۔ ......'...... 'غربت کی لکیر اور پاکستان، روزنامہ اردو نیوز، روزنامہ عبرت، ۵فروری ۱۹۹۸ء
۴۳۔ ......'...... 'تباہی کے سامان اور خوشحالی کے ارمان، روزنامہ اردو نیوز، روزنامہ عبرت، ۱۴رمئی ۱۹۹۸ء
۴۴۔ ......'...... 'ایٹمی تجربہ: جلد بازی سے کام نہ لیا جائے، ہفت روزہ زندگی، ۲۱ مئی ۱۹۹۸ء
۴۵۔ ......'...... 'جنوبی ایشیا میں ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ، روزنامہ اردو نیوز، روزنامہ عبرت، ۲۱ جون ۱۹۹۸ء
۴۶۔ ......'...... 'ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ روکی جائے، روزنامہ اردو نیوز، روزنامہ عبرت، ۵ جون ۱۹۹۸ء
۴۷۔ ......'...... 'جنوبی ایشیا: دنیا کا خطرناک ترین خطہ، روزنامہ جنگ، ۸ جون ۱۹۹۸ء
۴۸۔ ......'...... 'امن برصغیر کی مشترک ضرورت ہے، روزنامہ جنگ، ۱۷رفروری ۱۹۹۹ء
۴۹۔ ......'...... 'ہندوستان اور ہائیڈروجن بم کا امکانی دھماکہ، روزنامہ جنگ، ۲۶ مئی

۱۹۹۹ء

۵۰۔ ....' 'جوہری ہتھیار بندی اور برصغیر کے مفلس عوام، روزنامہ اردو نیوز، روزنامہ عبرت، ۲۷ مئی ۱۹۹۹ء

۵۱۔ کٹیانو، ڈاکٹر ماریکو، پاکستانی عوام کے نام ایک کھلا خط (مترجم: ارم رحمان)

۵۲۔ لدھیانوی، ساحر، پرچھائیاں۔

برصغیر خودکشی پر تُلا ہوا ہے

آج سے چار برس پہلے ۲۸ مئی کی یہی تاریخ تھی جب پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے تھے۔ پاکستانی حکومت کی جانب سے کہا گیا تھا کہ ہم یہ دھماکے ہندوستان کے ایٹمی دھماکوں کے جواب میں کرر ہے ہیں۔

۱۱رمئی ۱۹۹۸ء سے ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کے درمیان پاکستان میں ایٹمی دھماکے کرنے کے سلسلے میں ایک بہت گرما گرم بحث چلی لیکن شاید اسے بحث کہنا زیادتی کی بات ہے، اس لیے کہ بحث دوطرفہ ہوتی ہے۔ یہاں تو مجھ جیسی چند کمزور آوازیں تھیں جو اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے یہ کہہ رہی تھیں کہ ہندوستان میں بی۔ جے۔ پی حکومت نے سراسر ظالمانہ اقدام کیا ہے، ہمیں اس سلسلے میں ہندوستان کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ میرا کہنا تھا کہ ہمارا شمار دنیا کے غریب ترین ملکوں میں ہوتا ہے۔ دونوں ملکوں کی نصف آبادی سے کچھ ہی کم غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتی ہے، ہمارا اپنے قیمتی وسائل کو عوام کی بہبود پر خرچ کرنے کی بجائے اسلحے، جنگی تیاریوں اور نیوکلیائی ہتھیاروں پر پھونک دینا دیوانگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس وقت مجھے مہاتما گاندھی کے چند جملے یاد آ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا......

> 'اس غریب ترین اور کمزور ترین شخص کو یاد کیجیے جسے آپ نے دیکھا ہو اور اپنے آپ سے پوچھئے کہ جو قدم آپ اُٹھانے جا رہے ہیں کیا اس کا کچھ فائدہ اس کو ہوگا؟ کیا اسے اس سے کچھ حاصل ہوگا؟ کیا اس سے وہ اپنی زندگی اور اپنی قسمت پر کچھ قدرت حاصل کر سکے گا؟'

مجھے یقین ہے کہ یہ سطریں ہندوستانی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی اور جنگجویانہ نفسیات

رکھنے والے ان کے دوسرے ساتھیوں کی نظر سے یقیناً گزری ہوں گی۔ اس کے باوجود انہوں نے جنگ کے راکھشس کے چرنوں میں پانچ جوہری دھماکوں کی بھینٹ دیتے ہوئے لمحے بھر کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی اور ان دھماکوں کے بعد جلسۂ عام میں تلواریں لہرا کر اپنی مردانگی کا اعلان کرتے رہے۔ دنیا کی چھٹی اور ساتویں ایٹمی طاقت بن جانے کی خوشی میں دونوں ملکوں میں مٹھائیاں بانٹی گئیں، سڑکوں پر رقص ہوا، دھمال ڈالا گیا۔ دنیا کے دو نہایت غریب ملک گھر پھونک تماشا دیکھ کر تصویر بن گئے اور عالمی برادری ان دونوں پر ہنستی رہی۔

ہندوستانی حکومت کا کہنا تھا کہ ان ایٹمی دھماکوں کے بعد ہندوستان نا قابل تسخیر ہے۔ اس کے چند دنوں بعد پاکستان نے جوابی ایٹمی دھماکے کر دیے تو ہندوستانی پارلیمنٹ میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کے ممبر پارلیمنٹ مسٹر بنرجی نے اپنے وزیر اعظم سے پوچھا کہ اگر ایٹمی تجربے ہندوستان کی سلامتی کے لیے ناگزیر تھے اور آپ نے یہ تجربے کر کے ہندوستان کو نا قابل تسخیر بنا لیا تھا تو اب پاکستان کے ایٹمی تجربوں کے بعد آپ ملک کی سلامتی کو کیسے 'محفوظ' بنائیں گے؟ واجپائی صاحب کے پاس بنرجی صاحب کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

دونوں ملکوں کی اسٹبلشمنٹ اپنے اپنے ملکوں کو نا قابل تسخیر بنانے کا یہ سلسلہ چار برس سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دونوں طرف سے طاقت کا توازن قائم کرنے کے نام پر ایٹمی ہتھیاروں کو نشانے پر پہنچانے کے نئے تجربے کیے جا رہے ہیں۔ وہ 'پرتھوی'، 'اگنی' اور 'ترشول' بناتے ہیں تو ہم 'غزنوی'، 'شاہین' اور 'ابدالی' داغ دیتے ہیں۔ دونوں طرف سے کبھی ہائیڈروجن بم بنانے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا ہے اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اپنے پاس موجود بموں کی ہلاکت خیزی بڑھانے پر غور کر رہے ہیں۔ یوں کہہ لیجئے کہ طاقت کا توازن قائم کرنے کے نام پر ہمارا برصغیر خودکشی پر تلا ہوا ہے۔

مجھے اس وقت برٹرینڈ رسل کے وہ کھلے خط یاد آ رہے ہیں جو ۶۰ کی دہائی میں اس نے امریکی صدر جنرل آئزن ہاور اور روسی وزیر اعظم نکیتا خروشیف کے نام لکھے تھے، انہیں 'دُنیا کے طاقتور ترین حضرات' کے نام سے یاد کیا تھا اور ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ پر دونوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اس موقف کو اختیار کرنے کا 'صلہ' اسے یہ ملا تھا کہ اسے 'غدار' کہا گیا، گرفتار کیا گیا اور اپنے ہی ملک میں اس پر ملامت کی گئی۔ رسل اس وقت زندہ نہیں تھا، جب سوویت یونین اور امریکا کے

رہنما ایٹمی اسلحے کی تخفیف کے معاہدوں پر دستخط کر رہے تھے۔ لیکن رسل کو غدار کہنے والے، اس پر گندے انڈے اور سڑے ہوئے ٹماٹر پھینکنے والے متعدد افراد زندہ تھے۔ آج بھی زندہ ہیں۔ انہیں شاید شرم بھی نہ آئی ہو کہ آخر کار وقت نے انہیں غلط ثابت کر دیا اور 'سنکی فلسفی' تاریخ میں سرخ رو رہا!

بیسویں صدی کے نصف آخر میں آئن اسٹائن، رسل، سخاروف، روٹ بلاٹ اور ان جیسے دوسرے متعدد دانشوروں، فلسفیوں، سائنسدانوں اور ادیبوں نے ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف آواز بلند کی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے زمین اور اس پر بسنے والے انسان کے لیے، ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو جانے والی عظیم تہذیبوں کے آثار اور موجود تمدنوں، تہذیبوں اور ثقافتوں پر مشتمل آبادیوں کے لیے ایٹمی تباہ کاریوں سے پناہ چاہی اور اپنے اپنے ملکوں میں 'غدار' اور 'بزدل' قرار پائے۔

افسوس کہ دنیا کے ہر خطے اور بطور خاص برصغیر میں ان 'غداروں' اور 'بزدلوں' کی تعداد آٹے میں نمک کی مقدار سے بھی کم رہی ہے ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ بیسویں صدی کے آخری برسوں میں ہندوستان اور پاکستان کے حکمران، اپنے لوگوں کے مسائل حل کرنے کی بجائے اپنے بیش قیمت وسائل ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری میں جھونک دیں اور پھر اس پر فخر بھی کریں، اس پر اپنے بیشتر دانشوروں سے داد بھی پائیں۔

ان دنوں روزانہ اخبارات میں نہایت سنجیدگی سے یہ بتایا جارہا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ چھڑنے کی صورت میں کتنے کروڑ افراد ہلاک ہوں گے۔ دِلّی اور لاہور کے ممکنہ ہلاک شدگان کی تعداد بتائی جاتی ہے، ایٹمی حملے کی صورت میں کراچی اور بمبئی میں جان سے جانے والوں کے اندازے لگائے جاتے ہیں۔ نہایت ذمہ دار عہدوں پر فائز ان عاقل و بالغ افراد کے یہ بیانات نظر سے گزرتے ہیں تو یاد آتا ہے کہ پچاس کی دہائی میں نیوکلیائی جنگ چھڑنے کے نتیجے میں اس وقت کے امریکی وزیر کارجہ ڈلس کا مشغلہ بھی اسی نوعیت کے اندازے لگانا تھا۔ وہ شخص جس کا نام آج امریکا میں بھی لوگ بھلا چکے ہیں، اس نے ۱۹۶۱ء میں نہایت سکون کے ساتھ اپنے سرکاری بیان میں یہ کہا تھا کہ ایٹمی جنگ چھڑی تو ۱۶ر کروڑ انسان امریکا میں اور ۲۰ر کروڑ سوویت یونین میں ہلاک ہو جائیں گے۔ ڈلس کا کہنا تھا کہ یورپ اور برطانیہ میں تو کوئی انسان باقی نہیں بچے گا۔ چشم زدن میں کروڑوں انسانوں کی ہلاکت کی اس سفاکانہ انداز میں گفتگو کرنے والوں کو اصولی طور پر پاگل خانے میں ہونا چاہیے۔ افسوس کہ برصغیر ایسے ہی ذہنی بیماروں

کے چنگل میں ہے۔ اس پُر آشوب زمانے میں برصغیر کے ان ادیبوں اور دانشوروں کی تعداد بہت کم ہے جو اس جنگی جنون کے خلاف اٹل بہاری واجپائی اور جنرل پرویز مشرف پر ایک ہی سانس میں کڑی تنقید کر سکیں جو ان سے یہ پوچھ سکیں کہ ایک دوسرے کے خلاف فوجیں کھڑی کر کے اور ایک دوسرے کے شہروں کو ایٹمی ہتھیاروں کی زد پر لے کر وہ برصغیر کی اور اس کے شہریوں کی کون سی خدمت سرانجام دے رہے ہیں؟

دنیا میں اس وقت لگ بھگ پچاس ہزار سے زیادہ چھوٹے اور بڑے ایٹمی ہتھیار ہیں۔ جوہری ہتھیاروں کے انبار دنیا میں ایک دن میں نہیں لگے۔ یہ عمل گزشتہ ۵۰، ۵۲ برس سے جاری ہے۔ یہ درست ہے کہ اس بم کا بیج نازی جرمنی میں پھوٹا، اس نے امریکا میں پرورش پائی اور یہ جاپان کے بے گناہ شہریوں پر قہر بن کر گرا۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو اس نیوکلیائی ذبح عظیم کی سب سے بڑی قانونی، اخلاقی اور سیاسی ذمہ داری امریکا پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن ہم جو آج یہاں موجود ہیں اور جن میں سے اکثر بائیں بازو سے وابستہ ہیں یا اس کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں۔ کیا ہم سب نے جوہری ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی سے آگاہ ہونے کے باوجود ۱۹۴۹ء میں سوویت یونین کے جوہری تجربات پر خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا؟ کیا سوویت یونین کے نیوکلیائی سائنسدان آندرے سخاروف کی طرح ہم سب کی ذمہ داری نہیں تھی کہ ہم سوشلسٹ بلاک سے اپنی وابستگی کے باوجود ان ہلاکت خیز ہتھیاروں کے خلاف آواز بلند کریں؟ کیا ہم نے اپنی نظریاتی عینک سے سوویت یونین اور بعد میں سوشلسٹ چین کے نیوکلیائی اسلحہ خانوں میں دگنے چوگنے ہوتے ہوئے جوہری ہتھیاروں کو سرمایہ داری پر سوشلزم کی 'فتح' کے حوالے سے نہیں دیکھا؟ کیا ہم نے اس بات پر 'فخر' محسوس نہیں کیا کہ اب ہم بھی مغربی بلاک کے کروڑوں افراد کو جوہری جہنم میں جلا کر راکھ کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

یہ صدمے کی بات ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ اگر میکارتھی ازم کی راہ پر چلنے والے افراد اور اقوام سوشلسٹ شیطان کو جوہری ہتھیاروں سے تہس نہس کر دینے کے نشے میں سرشار تھے تو خود کو ترقی پسند اور انسان دوست کہلانے والے بھی سرمایہ داری کے عفریت کو ملیامیٹ کرنے کے خیال میں مست تھے۔

اگر ہم برصغیر پر ایک نظر ڈالیں تو یہاں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ پنڈت نہرو جو مہاتما

گاندھی کے چیلے تھے، وہ ہمیں جوہری توانائی کے پردے میں جوہری ہتھیاروں کے تجربات کے لیے ہومی بھابھا کی سرپرستی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور رہی سہی کسر ان کی بیٹی ۱۹۷۴ء میں ایٹمی تجربے کرکے پوری کر دیتی ہیں۔ پاکستان میں اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو ۱۹۶۶ء میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم گھاس کھائیں گے مگر ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔ ۱۹۷۱ء میں برسراقتدار آنے کے بعد وہ اپنی انسان دوستی اور امن پرستی کے دعوؤں کے باوجود پاکستان کے جوہری پروگرام کو اس حد تک بڑھاوا دیتے ہیں جس کا منطقی انجام چند دنوں پہلے ہم نے 'غوری'، 'غزنوی' اور 'ابدالی' میزائلوں کے تجربات کی صورت میں دیکھا ہے۔

ہندوستان ہو یا پاکستان، دونوں ملکوں کا جوہری پروگرام چند مہینوں یا برسوں پر نہیں، دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ۳۵، ۴۰ برس پر پھیلی ہوئی اس خوفناک مہم جوئی کو روکنے میں مجھے اپنا اور اپنے ہم خیال دوستوں کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ ہم سب جانتے تھے کہ جوہری توانائی کے پردے میں جہنمی موت اور ماحولیاتی تباہی کے اژدہے پروان چڑھ رہے ہیں، بدترین غربت اور افلاس کے مارے ہوئے ہمارے شہریوں کے ہاتھ کا نوالہ چھین کر ان اژدہوں کو پالا جارہا ہے، ان کی نئی اور زیادہ بھیانک نسلیں پروان چڑھائی جارہی ہیں۔

یہ سب کچھ جاننے کے باوجود ہم نے کبھی 'حب الوطن'، کبھی 'قومی تحفظ' اور کبھی Deterrence کے نام پر اپنی ملٹری اور سول بیوروکریسی کے ان تمام جرائم سے نگاہیں چرائیں۔ ہم نے امن کی تحریکیں نیم دلی سے چلائیں۔ ہم جو بائیں بازو سے تعلق رکھنے کا، روشن خیال اور انسان دوست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ہم نے یہ اصول نہیں اپنایا کہ جو غلط کام ہمارا دشمن کر رہا ہے، وہ ہمارے لیے بھی غلط ہے۔ ہم نے کبھی اس طرح نہیں سوچا کہ جو بات ہم اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں، وہ اپنے مخالفین کے لیے بھی ناپسند کریں۔ ہم نے تمام انسانی حقوق اپنے لیے تو چاہے لیکن اپنے خالفین کے لیے ان حقوق کی خواہش نہیں کی۔ ہم نے ویتنام پر امریکی بمباری کی مذمت کی، اس کے خلاف جلوس نکالے لیکن جب افغانستان میں طالبان پر کلسٹر بم اور دوسرے مہلک اور ممنوعہ ہتھیار استعمال کیے جارہے تھے تو ہم چپ رہے۔ صرف اس لیے کہ نظریاتی اعتبار سے ہم طالبان کے مخالف تھے۔ ہم نے افغانستان پر امریکی مظالم کے خلاف احتجاج کو دینی مدرسوں کے استادوں اور شاگردوں کے لیے چھوڑ دیا۔ ہم نے یہ اصول اپنایا کہ اگر ظالم ہمارے

قبیلے کا ہوتو اس کی ہر زیادتی پر مرحبا کہیں، اور اگر مظلوم ہمارا نظریاتی مخالف ہے تو اس کا بہتا ہوا خون اور اس کے ساتھ ہوتا ہوا ظلم ہمیں نظر نہ آئے۔ شکنجوں میں اس کی ٹوٹتی ہوئی ہڈیوں کی آواز بھی ہمیں سنائی نہ دے۔ اپنے ان ہی رویوں کی بناء پر ہم جو بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں، اخلاقی میدان میں ہار چکے ہیں۔ اسی طرح کیا یہ سوال پاکستان میں دائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں سے نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ جو پاکستان کو 'اسلام کا قلعہ' بنانا چاہتے ہیں، وہاں طالبان پر امریکی بمباری کے خلاف صرف مدرسوں کے مٹھی بھر طلباء جلوس نکالیں اور دائیں بازو کے دانشور ہونے کا دعویٰ رکھنے والے ان جلوسوں سے دور رہیں؟ ادھر ہندوستان جسے وہ 'اسلام دشمن' اور 'مسلمان دشمن' کہتے نہیں تھکتے، وہاں کلکتہ اور دوسرے شہروں میں پچاس ہزار اور اسی ہزار کے جلوس طالبان کے قتل عام کے خلاف نکالے جائیں اور ان میں شریک ہونے والوں کی بہت بھاری اکثریت بائیں بازو کے ہندوؤں پر مشتمل ہو۔ کیسا مذاق ہے کہ جرمنی اور فرانس میں ہزاروں لاکھوں افراد امریکی صدر کیخلاف مظاہرے کریں، 'افغانیوں اور فلسطینیوں کے قاتل واپس جاؤ' کے نعرے لگائیں، خود امریکی شہری اپنے صدر کی جنگ جویانہ پالیسیوں کے خلاف جلوس نکالیں اور جو ہم خود کو روشن خیال اور لبرل پاکستانی کہتے ہیں، ہم امریکا سے شدید نظریاتی اختلاف کے باوجود افغانستان پر اس کی غیر اخلاقی اور غیر انسانی کارروائیوں کے خلاف پانچ ہزار کا جلوس بھی نہ نکالیں؟

دراصل ہم نے جوہری اسلحے کی مخالفت اور امن کی حمایت کے معاملات کو محض ایک رسمی کارروائی کا رنگ دے دیا ہے۔ یہ مخالفت اور یہ حمایت ہمارا ایمان نہیں، ایک فرض ہے جو ہم پورا کر دیتے ہیں۔ اگر ہم اس فرض کو عرس کے طور پر مناتے تب بھی بہتر ہوتا، اس لیے کہ عرس منانے والے تو سال بھر اس دن کا انتظار کرتے ہیں، اور جب اس میں شریک ہوتے ہیں تو ان کی وارفتگی، ان کے ایمان کی پختگی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔

ایک ایسی صورت حال میں وہی ہونا تھا جو ہوا ہے۔ ہم سمٹتے گئے اور جنگ کے، جوہری اسلحے کے حامی پھلتے پھولتے گئے۔ پاکستان میں جوہری ہتھیاروں کی تیاری کا آغاز ہوا تو ہم نے اس جوہری پروگرام کو اس لیے چیلنج نہیں کیا کہ اس کی سرپرستی کرنے والا سوشلسٹ ہونے کا دعویدار تھا اور آج اس وقت بھی مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی، دونوں کے درمیان اس بات کی کھینچا تانی ہے کہ

کون پاکستان کو جوہری طاقت بنانے کا سہرا اپنے سر باندھے۔

آج ہمیں یہ سوال بھی اُٹھانا چاہیے کہ یہ جوہری ہتھیار جن پر آج ہم بہت نازاں ہیں، انکا جنگ کے دوران کوئی کردار ہے بھی یا نہیں؟ ہمیں یہ بتایا جارہا ہے کہ ہم عنقریب ایسے میزائلوں کا تجربہ کریں گے جو بہ یک وقت دو دو اور دو چار ایٹمی ہتھیار لے کر دشمن کے شہروں کا صفایا کر سکیں گے۔ ہمیں پُرمسرت لہجے میں یہ سنایا جارہا ہے کہ برصغیر میں ہوائیں اس طور چلتی ہیں کہ اگر ہندوستان ہم پر بم گرائے تب بھی تابکاری کے بادل اسی کی طرف جائیں گے، گویا نہ پاکستانی عوام انسان ہیں اور نہ ہندوستانی عوام۔ یہ تو کسی ایسے صحرا کی بات ہو رہی ہے جہاں نہ آدم رہتے ہیں نہ آدم زاد۔ دونوں طرف سے دلّی، بمبئی، کلکتہ، کراچی، کانپور، لاہور اور لکھنو، آگرہ اور پشاور پر بم مارنے کی، پہلے ہلّے میں تین کروڑ انسانوں کی ہلاکت کی بات یوں کی جارہی ہے جیسے کھیتوں اور کھلیانوں کو چاٹ جانے والے ٹڈی دَل پر اسپرے کا تذکرہ ہو۔

ایسا کیوں ہے کہ دنیا بھر کے جرنیل جوہری ہتھیاروں کی عظمت کے ہر وقت قصیدے پڑھتے ہیں، اس کے باوجود آج روس اور امریکا اپنے انہی جوہری ہتھیاروں میں کمی کے معاہدے کررہے ہیں۔ ان ملکوں نے اپنے اور دنیا بھر کے عوام کی آسائشوں اور خوشیوں کی قیمت پر اربوں کھربوں روپے ان ہتھیاروں کی تیاری پر خرچ کیے اور اب ان کو تلف کرنے پر اربوں روپے خرچ ہورہے ہیں۔

ہمیں اپنے جرنیلوں سے یہ سوال کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ جوہری اسلحہ اگر 'قومی دفاع' کی بنیاد ہے تو ایسا کیوں ہوا کہ ۱۹۴۵ء سے ۲۰۰۳ء تک کوریا، ویتنام، الجزائر، فاک لینڈ، عراق یا افغانستان میں جنگ جیتنے کے لیے امریکا، روس، برطانیہ، فرانس اور چین خواہش کے باوجود جوہری ہتھیار استعمال نہ کرسکے۔

اسی طرح ہمیں ہندوستان میں بی۔ جے۔ پی کی حکومت اور انتہا پسند ہندوستانی دانشوروں سے بھی کچھ پوچھنے کا حق پہنچتا ہے۔ ابھی سترہ دن پہلے انہوں نے اپنے ایٹمی دھماکوں کی سالگرہ منائی ہے۔ اس روز ہندوستان بھر میں بڑی دھوم دھام سے اس سالگرہ کا جشن ہوا، جس میں حکومت سے تعلق رکھنے والوں اور انتہا پسند رہنماؤں نے بڑے پیمانے پر شرکت کی۔ اس روز کیا کسی کو وہ بوڑھا یاد نہیں آیا جس کی تصویریں سارے ہندوستان کے سرکاری دفتروں اور نجی اداروں

میں آویزاں ہیں اور جس کی زندگی اہنسا کا پرچار کرتے ہوئے گزر گئی؟

میرا جی چاہتا ہے کہ ہندوستان کے ایٹمی پروگرام کی سرپرستی کرنے والے پنڈت نہرو اور مسز اندرا گاندھی کی سمادھیوں پر جاؤں اور ان سمادھیوں پر کھڑے ہو کر اس شخص کے الفاظ دہراؤں جو اس نے ہیروشیما پر ایٹم بم کے گرائے جانے کے ٹھیک گیارہ مہینے بعد لکھے تھے......

'امریکی دوستوں کا کہنا ہے کہ کسی بھی دوسری چیز کی نسبت ایٹم بم، اہنسا (عدم تشدد) کو قائم کرنے کا سبب بنے گا...... جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، ایٹم بم نے ہزاروں سال کے دوران انسان کو سہارا دینے والے تمام اعلیٰ ترین جذبات کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس سے پہلے جنگ کے نام نہاد قوانین اسے کسی حد تک گوارا بناتے تھے لیکن ہم اب اس برہنہ سچ کو سمجھ چکے ہیں کہ جنگ......قوت کے قانون کے سوا کسی قانون کو تسلیم نہیں کرتی۔ ایٹم بم نے اتحادی فوجوں کو ایک کھلی فتح سے ہمکنار کر دیا ہے......اس عظیم المیے سے صرف یہی سبق سیکھا جا سکے کہ جوابی ایٹم بم تیار نہ کیے جائیں......تشدد کو جوابی تشدد سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ انسانیت تشدد کے چنگل سے صرف عدم تشدد کے ذریعہ ہی رہائی پا سکتی ہے۔ میکس ملر کی برسوں پُرانی اس بات پر میں یقین رکھتا ہوں کہ 'سچ کو اس وقت تک دہراتے رہنے کی ضرورت ہے جب تک کہ وہ لوگ موجود ہیں جو اس سچ میں یقین نہیں رکھتے۔'

افسوس کہ اہنسا پر یقین رکھنے اور اس کے اصولوں پر عمل کرنے والے اشوک اعظم اور مہاتما گاندھی کے ہندوستان میں سچ پر خاک ڈالی گئی۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ناتھورام گوڈسے کے ریوالور سے نکلنے والی گولی مہاتما گاندھی کے سینے میں پیوست ہوئی تھی۔ ۱۱ رمئی ۱۹۹۸ء کو ہندوستان کے ایٹمی دھماکوں نے ان کے فلسفے کو بھی خون میں نہلا دیا۔

ہم جب ہندوستان اور پاکستان کے جوہری ہتھیاروں کی بات کرتے ہیں تو ہمیں ان انتہا پسندوں کو بھی یاد رکھنا چاہیے جو کسی بھی وقت کسی اسلحہ خانے سے ایسے مہلک ہتھیار چرا کر اپنے نظریاتی مخالفوں کے شہروں کو نشانہ بنا سکتے ہیں اور اگر نہ چرائیں تو اپنے نظریاتی حامی سائنسدانوں

سے ڈرٹی بم تیار کرا سکتے ہیں۔اس موقع پر مجھے ہندوستانی دانشور دیپنکر بنر جی کی بات یاد آتی ہے جوانہوں نے ۱۱ مئی ۱۹۹۸ء کو ہندوستان کے ایٹمی تجربات کے دو دن بعد کہی تھی۔ دیپنکر بنر جی نے کہا تھا کہ نسل، رنگ یا مذہب کی تفریق کے بغیر......

'جوہری ہتھیاروں کی دیکھ بھال انسان کرتے ہیں اور انسانوں سے ہی کبھی کبھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ان ہتھیاروں کو آلات کنٹرول کرتے ہیں اور کبھی کبھی آلات خراب بھی ہو جاتے ہیں۔ان کے استعمال کا فیصلہ عموماً فرد واحد کا ہوتا ہے۔لیکن ایک فرد ہمیشہ دانشمند کے فیصلے نہیں کرتا۔اس فرد کا ذہنی توازن کبھی بگڑ بھی سکتا ہے۔'

دیپنکر بنر جی کا اُٹھایا ہوا یہ سوال پاکستان، ہندوستان اور دنیا بھر کے ان تمام ملکوں کے حکمرانوں سے کیا جانا چاہیے جو اپنے اسلحہ خانوں میں جوہری ہتھیار رکھتے ہیں اور ان پر اتراتے ہیں۔ یہ سوال برصغیر کے انتہا پسند اور جنگجوئی کو بڑھاوا دینے والے تمام عناصر اور افراد سے کرنا چاہیے کہ وہ دہشت کے توازن میں اپنی نجات سمجھتے ہیں یا امن کی عنایتیں انہیں اچھی لگتی ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اگر نیوکلیائی جنگ چھڑتی ہے، اگر جوہری ہتھیار استعمال ہوتے ہیں تو ان کی آنچ ڈھاکہ اور کھٹمنڈو تک جائے گی۔اس کے کھنڈر سے اُٹھنے والے نیوکلیائی بادل سری لنکا کو بھی ڈھانپ لیں گے اور تبت کی ان بودھ خانقاہوں تک اس آگ کی تپش محسوس کی جائے گی جہاں ابھی بارود کی بو بھی نہیں پہنچی۔ ہمالیہ کی برف پگھلے گی اور چین کے وہ کھیت بھی جھلس جائیں گے جو چینی کسانوں نے پہاڑوں میں سیڑھیاں تراش کر اُگائے ہیں۔ یہ مسئلہ صرف پاکستان اور ہندوستان کا نہیں، یہ جنوبی ایشیا کا معاملہ ہے۔ یہ اس سے آگے کی زمینوں کی زندگی کا مسئلہ ہے۔

ہم یہ کیسے بھول سکتے ہیں کہ ان شہروں میں ہم سب کا ماضی رہتا ہے، ہمارا حال اور مستقبل سانس لیتا ہے۔کیا ہم یہ سوچ بھی سکتے ہیں کہ سندھو، راوی، گنگا، جمنا، سون، اور موسیٰ ندی، دلدل بن جائیں اور یہ دلدلیں کروڑوں انسانوں کی لاشوں سے پٹی پڑی ہوں؟ کیا ہم اپنے تہذیبی، تاریخی، ثقافتی ورثے کو بھاپ بن کر اڑتے ہوئے دیکھنے کا تصور بھی کر سکتے ہیں؟ ہمارے برصغیر میں ویدوں اور رامائن لکھی گئی، یہاں مہاتما بدھ اور مہاویر پیدا ہوئے، خسرو، میر، کبیر، غالب اور

نظیر، بھٹائی، بلھے شاہ، سچل، سورداس، تلسی داس اور میرابائی، اقبال اور فیض نے یہاں شاعری کی۔ یہاں اجنتا اور ایلورا تراشے گئے، یہاں تاج محل تعمیر ہوا، اسی برصغیر کے حصے میں ہزار ہا سادھو، سنت، پیر، فقیر، اولیا آئے۔ علی ہجویری، معین الدین چشتی اجمیری، شرف الدین یحییٰ منیری، نظام الدین اولیا اور دیوا شریف کی درگاہیں کیا اسی لیے ہیں کہ یہ دھول بنا کر اڑا دی جائیں؟

میں پاکستانی شہری ہونے کے ساتھ ہی برصغیر کی شہری بھی ہوں۔ میرے لیے کراچی، کلکتہ اور کانپور میں، لاہور اور لکھنو میں، دلّی اور پشاور میں کوئی فرق نہیں۔ یہ برصغیر کے شہر ہیں، میں ان سب میں رہتی ہوں اور یہ سارے شہر میرے اندر آباد ہیں۔ غوری چلے یا اگنی، نشانہ برصغیر کی کوئی بھی بستی، کوئی بھی ویرانہ بنے، ہلاکت میری ہوگی۔ کسی ہندو یا کسی مسلمان، کسی سکھ یا کسی عیسائی، کسی عورت، مرد، بچے، بوڑھے، کسی کٹر پنتھی یا کسی ناستک کے روپ میں، میری ہی ذات ہلاک ہو رہی ہوگی۔

(یہ مضمون 'پاکستان پیس کولیشن' (Pakistan Peace Coalition) کی جانب سے منعقد ہونے والے سیمینار میں ۲۸ مئی ۲۰۰۲ء کو پڑھا گیا۔ پاکستانی حکومت اس روز اپنے ایٹمی دھماکوں کی چوتھی سالگرہ منا رہی تھی۔)

سماج میں نراج اور جنگی جنون

کسی بھی سماج میں ریاست اور اقتدار کے سرچشموں پر قابض مقتدر طبقات کے معاشی، سیاسی اور فوجی اقتدار کی توسیع، فاشسٹ رجحانات، قومی تکبر، مریضانہ حب الوطن اور مجرمانہ احساس برتری کا دوسرا نام جنگ گزیدگی یا جنگوازم (Gingoism) ہے۔

مذہب، وطن، نسل یا قوم کے تحفظ کے نام پر یہ مقتدر طبقات نفرت اور دشمنی کی وہ آگ بھڑکاتے ہیں جس کا ایندھن بسی بسائی بستیاں، آباد عبادت گاہیں، نہتے بچے، عورتیں اور مرد ہوتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں جنگ جوئی کی ابتدا اس وقت سے ہو گئی تھی جب ایک آدمی نے زمین پر لکیر کھینچ کر حد بندی کی تھی اور کہا تھا کہ یہ زمین میری ہے۔ دولت و ملکیت کے تحفظ اور فروغ کے لیے انسان نے تانبے کے دور سے ایٹمی ہتھیاروں اور خلائی جنگوں کے زمانے تک لڑائیاں لڑی ہیں۔

جنگ جوئی اور جنگ گزیدگی انسانی تاریخ کی ابتدا سے موجود ہے لیکن جدید سیاست میں جنگوازم کی اصطلاح ۱۸۷۸ء میں برطانیہ میں اس وقت رائج ہوئی جب روس اور برطانیہ کی لڑائی سر پر تلی کھڑی تھی اور جنگی جنون سے بھرے ہوئے برطانوی عوام لندن اور لیورپول کی سڑکوں پر غول در غول یہ گیت گاتے پھر رہے تھے کہ......

'ہم لڑنا نہیں چاہتے
لیکن 'جنگو' کی قسم
اگر ہم لڑے
تو ہمارے پاس جہاز ہیں
جہازی اور سپاہی بھی

اور دولت کی بھی ہمیں کمی نہیں!'

لطف کی بات یہ ہے کہ جس 'جنگو' کی برطانوی عوام قسم کھا رہے تھے، وہ دوسری صدی عیسوی میں دیومالائی حیثیت اختیار کر جانے والی ایک جنگ جو جاپانی ملکہ 'جنگو' تھی۔ اس نے کوریا سے طویل جنگیں لڑیں، شاندار فتوحات حاصل کیں، دہائیوں تک جاپان پر جابرانہ حکومت کی اور دنیا سے جاتے ہوئے اپنے بیٹے کو اپنا ولی عہد نامزد کرنے کے ساتھ ہی اسے جنگ کا دیوتا قرار دے گئی۔

جنگ گزیدگی یا جنگوازم کی اصطلاح کی گہرائی میں جائیں تب ہی یہ بات سامنے آتی ہے کہ تانبے کے دور سے ایٹمی ہتھیاروں اور خلائی جنگوں کے زمانے تک، کسی بھی سماج میں جنگ گزیدگی کا عمل کیوں کر شروع ہوتا ہے، عوام کو جنگ جوئی میں کیسے مبتلا کیا جاتا ہے، جنگ جوئی پر آمادہ عناصر امن وامان کے زمانے میں ہونے والے ثقافت وتہذیب کے فطری ارتقاء کو کس طرح تہس نہس کرتے ہیں، اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر ان عناصر کے ہمدرد اور معاون ادیب، دانشور، مورخ اور صحافی حقائق کو کس طرح مسخ کرتے ہیں، جھوٹ اس طرح اتنی مرتبہ دہرایا جاتا ہے کہ 'مستند سچ' بن جاتا ہے، فرضی اور ناموجود دشمن کو تراش خراش کر لاعلم عوام کو کس طرح خوف میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ ان تمام معاملات پر تفصیلی بحث کے بغیر تہذیب وثقافت پر جنگ گزیدگی کے اثرات کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔ یہاں میں پاکستان میں جنگ جوئی، جنگ گزیدگی اور جغرافیائی سرحدوں سے لے کر نظریاتی سرحدوں پر ہر لحہ حالت جنگ میں رہنے کی صورت حال اور پاکستانی سیاست پر اس کے اثرات کے بارے میں اختصار سے کچھ عرض کرنا چاہوں گی۔

کم عمری میں ہی پاکستان کے مجھ جیسے تمام نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ بتایا گیا کہ ہندو ہمارا دشمن ہے، متعصب ہے، جنونی اور جنگ جو ہے، اس نے پاکستان کے قیام کو دل سے بھی تسلیم نہیں کیا، اس کی منزل پاکستان پر قبضہ کر کے اکھنڈ بھارت کا قیام ہے، اس کی اور انگریزوں کی سازش سے ہندوستان کی عظیم مسلم سلطنت پارہ پارہ ہوئی، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو نے انگریزوں کا ساتھ دیا، اور یہ مسلمان تھے جن کی جدوجہد سے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ اس موقع پر ہندو نے ہم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، ۱۹۴۷ء میں ہماری ہزارہا عورتیں بے حرمت کی گئیں، لاکھوں نہتے مسلمان قتل کیے گئے، ہندوستان میں آج بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوتے

ہیں، مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے، مشرقی پاکستان اگر ہم سے جدا ہوا تو وہ دراصل ہندوؤں کی سازش تھی، اس نے ہم پر جنگیں مسلط کیں اور وہ ہمیں ہر قیمت پر تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے۔

غرض ہندو کے مظالم، تعصب اور گھناؤنی سازشوں کی ایک طویل فہرست تھی جو پاکستانی ذرائع ابلاغ نے اور یہاں کے بہت سے دانشوروں نے ہمارے دماغوں میں بٹھا دی اور ہم اپنے چالاک اور سفاک دشمن کے خلاف ہر لمحہ حالت جنگ میں رہنے لگے۔

ذاتی طور پر تاریخ مجھے لبھاتی تھی، سو میں نے ان تاریخی ناولوں کے انبار پڑھ ڈالے جن میں سرفروش اور پُرجوش سپہ سالار اور سپاہی تلواریں لہراتے ہوئے ہندوستان عرف کفرستان میں داخل ہوتے تھے اور فتح کے پھریرے اڑاتے ہوئے کسی راجکماری کے بے حد اصرار پر اسے مشرف بہ اسلام کر لیتے تھے اور پھر اگلے قلعے اور اگلی راجکماری کی طرف بڑھ جاتے تھے۔

تاریخی ناولوں کے بعد مستند تاریخ پڑھنے کی باری آئی تو میں نے عیسائیوں اور ہندوؤں کی لکھی ہوئی تاریخ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، اس لیے کہ مجھے بتایا گیا کہ یہ مورخین متعصب ہیں، مسلمان دشمن ہیں، ان کی کتابیں جھوٹ کا پلندا ہیں۔ سو میں نے نہایت خشوع وخضوع سے مسلمان مورخوں اور وقائع نگاروں کو پڑھنا شروع کیا۔ ان مورخین نے فخر وانبساط سے مجھے یہ بتایا کہ ہم ایک ہزار برس تک ہندوستان کے طول وعرض میں گھوڑے دوڑاتے رہے، اسے پامال کرتے رہے، ان جنگوں میں ہم نے کروڑ سے زیادہ انسان قتل کیے، لاکھوں عورتیں......لیکن چھوڑیے، ہٹائیے عورتوں کی بات جانے دیجیے۔ اس لیے کہ وہ تو ہر زمانے کے لشکریوں کی راحت کا سامان رہی ہیں۔ ان کتابوں نے مجھے بتایا کہ دین کی سربلندی کے لیے ہم نے سینکڑوں مندر مسمار کیے اور پھر مشرکین کے جھوٹے دیوی دیوتاؤں کے ہزارہا مجسمے توڑ کر ہندوستان کی بعض مشہور مساجد کی سیڑھیوں میں دبا دیے تاکہ وہ ہر روز نمازیوں کے قدموں تلے روندے جائیں۔ مشرکین ومفتوحین کی توہین وتذلیل کے معاملات اور واقعات سے یہ کتابیں بھری ہوئی تھیں۔

میری ہزار سالہ تاریخ کی اس خوں آشامی اور سفاکی نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ اس وقت مجھ پر یہ اندوہ ناک انکشاف ہوا کہ میں ان حملہ آوروں کی اولادوں میں سے ہوں اور یہ بھی کہ تاریخ نے ہندوستان کے ساتھ کیسا بھیانک اور المناک مذاق کیا ہے۔

وہ ہندوستان جو ہزاروں برس سے فلسفہ، علم وادب، تہذیب وتمدن، فنِ تعمیر اور فنونِ لطیفہ کی شاندار روایات رکھتا تھا، جہاں ظالم و جابر راجاؤں اور خونریز جنگوں کے ردِ عمل میں بدھ مت اور جین مت جیسے امن پسند اور انسان دوست مذاہب کو عروج ہوا، جن میں انسان تو دور کی بات ہے، کسی چیونٹی کا مسل دیا جانا بھی ممنوع تھا، وہی ہندوستان ساتویں صدی عیسوی سے ان جنگ جو اور پُر جوش حملہ آوروں کی زد میں آیا جنہوں نے زر، زمین اور زن کی ہوس پر دین کی اشاعت کا پردہ ڈالا اور ایک ہزار برس تک اس سرزمین کو پامال کرتے رہے، ہندوستان کا ثقافتی ورثہ ملیامیٹ کرتے رہے۔

اپنی تاریخ سے آگاہ ہونے کے بعد میں نے کچھ اور کتابیں پڑھیں تو معلوم ہوا کہ بہت سے راجپوت لال قلعے کی طرف پیر کر کے نہیں سوتے تھے، بے شمار ہندوؤں نے حمد، نعت، منقبت اور مرثیے لکھے، وہ مسلمان صوفیوں کی درگاہوں پر جاتے اور منتیں مانگتے تھے، خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے مزار پر چاند تارے کے ساتھ ساتھ 'کلش' بھی نصب تھا اور ہندو مسلم رواداری کا ایک نشان تھا۔ اس درگاہ کا لنگر چونکہ ہندو بھی کھاتے تھے، اس لیے اجمیر کی تاریخی دیگوں میں پکنے والے لنگر میں گوشت تو دور کی بات ہے، لہسن تک استعمال نہیں ہوتا تھا۔ تا کہ ہندو زائرین بھی اسے کھا سکیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پہلے دو شہید ایشوری پانڈے اور منگل پانڈے تھے۔ جھانسی کی رانی، تانتیا ٹوپے، نانا فرنویس اور کنور سنگھ اپنے ہزار ہا ہندو سپاہیوں کے ساتھ مغل بادشاہ کے لیے لڑتے ہوئے مارے گئے، بیسویں صدی میں مسلمانوں نے تحریک خلافت چلائی تو مہاتما گاندھی کے علاوہ اس تحریک میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ وہ ہندو بھی تھے جنہوں نے تحریک خلافت کی کامیابی کے لیے چندے دیے تھے۔

ہندوستان میں نفرت اور تعصب کی نئی لہر اس وقت اُٹھی جب سقوطِ دہلی کے بعد مسلمان جو آقا تھے، وہ غلام ہوئے۔ انہوں نے اپنے نئے آقا انگریز کے سامنے جب سر جھکایا تو ان کے پہلو بہ پہلو ہندو بھی موجود تھے جنہیں مسلمانوں نے سینکڑوں برس سے غلام بنا کر رکھا تھا۔ ماضی کے آقا اور غلام اب دونوں ہی محکوموں کی صف میں تھے اور دونوں کو اپنی بقا کی جنگ لڑنی تھی۔ یہیں سے وہ معاملہ اُٹھا جسے سب سے پہلے سرسید نے زبان دی۔ یہیں سے اس نئے جنگ جویانہ رویے کا آغاز ہوا جس نے ایک طرف مہاسبھا اور سنگ پریوار کی صورت اختیار کی اور دوسری طرف تقسیم سے

پہلے مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست اور تقسیم کے بعد پاکستان میں ان انتہا پسند تنظیموں اور گروہوں کو جنم دیا جنھوں نے آج پاکستان کے عام شہری کا جینا دشوار کر دیا ہے۔

اس جنگ گزیدگی نے برصغیر کے امن اور سکون کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ بات اب یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ دونوں طرف ایٹم بم کو فٹ بال کی طرح اُچھال اُچھال کر دکھایا جاتا ہے اور دونوں طرف کے جنگجو ایک دوسرے پر 'ایٹمی گول' کرنے کے لیے بے چین و بیتاب ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اخلاق واعمال کی 'نگرانی' کرنے والے بار بار یہ اعلان کرتے ہیں کہ ایم۔ ایف۔ حسین کی پینٹنگز اور سعادت حسن منٹو کی کہانیاں فحش ہیں، مخرب الاخلاق ہیں۔ جان کی امان ملے تو عرض کروں کہ حضور ایٹم بم کی نمائش سے بڑی فحاشی بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔

پاکستان اور ہندوستان عقائد کے فرق کے باوجود مشترک جغرافیہ، تاریخ، تمدن، تہذیب، ثقافت اور ادب رکھتے ہیں۔ برصغیر جو کسی زمانے میں سونے کی چڑیا کہلاتا تھا، اب جنگی جنون کی ہنڈیا ہے۔ ہندوستانی ثقافت کو اس جنگ گزیدگی سے جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کے بارے میں لکھنا کلدیپ نیّر، خوشونت سنگھ، مہاشیتا دیوی، کرشنا سوبتی، جوگندر پال اروندھتی رائے، شومورتی اور چندر کشور جسوال کی ذمہ داری ہے۔ لیکن اس جنگ گزیدگی نے پاکستانی ثقافت کو جس طور تباہ کیا ہے، اس کی نشاندہی کرنا اور اس کے خلاف آواز بلند کرنا ہم پر لازم ہے۔

جنگ جوئی کے غلبے نے پاکستان کو یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ Ideas جیسے مہذب اور علم دوست نام سے پاکستان میں ہتھیاروں کی نمائش ہوتی ہے جس میں ہتھیار کو امن کا علمبردار بتایا جاتا ہے۔ کراچی جیسے بڑے اور صنعتی شہر سے وہ مطبوعات شائع ہوتی ہیں جن میں ہندوؤں، احمدیوں، عیسائیوں، شیعوں، بریلویوں اور دیوبندیوں کے خلاف اشتعال انگیز تحریریں ہوتی ہیں۔ وہ روادار سماج جس میں شیعہ اور سنی اپنے اپنے عقائد پر سختی سے قائم رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے، اب عنقا ہے۔ شہروں کی دیواروں پر 'شیعہ کافر' اور 'شیعہ واجب القتل' جیسے نعرے لکھے جاتے ہیں۔ پاکستانی آئین تمام مذاہب اور فرقوں کی جان کی سلامتی، عبادت کی آزادی اور روزگار کے مواقع کی یقین دہانی کراتا ہے۔ لیکن ہمارے بہت سے علماء احمدیوں کو ملازمتوں سے نکالنے اور ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کے بیانات دیتے ہیں۔

پاکستان کا ایک بہت بڑا تجارتی ادارہ جو لاکھوں کروڑوں ڈالر کا زرمبادلہ کماتا ہے، اس کی مصنوعات دکانوں پر نہ رکھنے کی متشدد مہم صرف اس لیے چلائی جاتی ہے کہ وہ ادارہ ایک احمدی خاندان کی ملکیت ہے۔ پاکستان کے نامور اور نوبل انعام یافتہ سائنسداں ڈاکٹر عبدالسلام موت سے پہلے وطن واپسی کے لیے ترستے رہے۔ احمدیوں اور ہندوؤں کو پاکستان کا غدار کہا جاتا ہے، ان پر روزگار کے دروازے بند کیے جاتے ہیں۔ مندر، چرچ اور دوسری اقلیتوں کی عبادت گاہوں پر حملے ہوتے ہیں۔ بہت سی مساجد کی پیشانی پر اب وہ مسلک تحریر کیا جاتا ہے صرف جس کے ماننے والے ہی اس میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ جمعہ اور عیدین کی نمازیں فوج یا پولیس کے پہرے میں ادا ہوتی ہیں۔ چند دنوں پہلے ۲۱ ر مساجد کی نشاندہی کی گئی جنہیں ایجنسیوں نے خطرناک مقامات قرار دیا ہے۔ امام باڑوں اور احمدیوں کی مسجدوں میں نمازیوں کو دوران نماز ایک وقت میں شکار کرنے کا اسکور ۲۵ ر سے زیادہ ہے۔

ہمارے بہت سے لکھنے والے بھی جنگ گزیدگی کا شکار ہیں، وہ جنگی نعرے دیتے ہیں، جنگی ترانے لکھتے ہیں اور ہتھیاروں کی ستائش کرتے نہیں تھکتے۔ عورتیں سماج کا ایک ایسا گروہ ہیں جو معتوب ہیں اور شیطان کی نمائندہ ہیں۔ لاہور میں لڑکیوں کے ساتھ ہونے والی غنڈہ گردی کے ایک اندوہ ناک واقع پر اس شہر کی تاریخی مسجد کا امام یوں تبصرہ کرتا ہے کہ جب لڑکیاں اور عورتیں بے پردہ نکلیں گی تو پھر یوں تو ہوگا۔ آج انتہا پسندوں اور جنونیوں کا سب سے آسان نشانہ عورت ہے۔ عصمت دری ڈیڑھ برس کی بچی کی ہوتی ہے اور ستر برس کی بڑھیا کی بھی۔ عورتوں کے قتل اور ان کے ساتھ ہونے والے تشدد کے واقعات میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ سولہ سال کے بیٹے پچاس سال کی ماں کو بدچلن قرار دے کر قتل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

الیکشن کے ذریعہ برسر اقتدار آنے کے لیے بیتاب چند جماعتیں یہ کہنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتیں کہ بے دینی فحاشی جمہوریت کی پیداوار ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ برسر اقتدار آ کر وہ جمہوریت کا خاتمہ بالخیر کر دیں گی۔ ان کی طرف سے وکالت کا پیشہ ناجائز قرار دیا جا چکا ہے۔ زولوجی، بیالوجی اور اسی نوعیت کے دوسرے علوم اگر لڑکیاں حاصل کریں تو یہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے۔ بسنت منانا غیر شرعی اور حرام ہے۔ کبوتر بازی، پتنگ بازی، ویڈیو گیمز، شیطان کا پھیلایا ہوا جال ہیں، ٹیلی ویژن، فلم، موسیقی، آلات موسیقی سب حرام اور ناجائز ہیں۔ این۔ جی۔ اوز

مسلمانوں کو گمراہ کرنے والے ادارے ہیں اور یہود و ہنود و نصاریٰ کی سازش ہیں۔ کرکٹ اور ہاکی فحاشی کے زمرے میں شامل ہیں۔ شمالی علاقوں میں دکانوں اور گھروں سے ٹی۔ وی سیٹ، ڈش انٹینا، آڈیو اور ویڈیو کیسٹ، ٹیپ ریکارڈر نکال کر جلا دیے جاتے ہیں۔ مزاحمت کرنے والوں کو زدوکوب کیا جاتا ہے اور ان پر جرمانے عائد کیے جاتے ہیں۔

جنگ گزیدگی اور جنگی جنون نے انتہا پسندی کو جس طرح ہوا دی ہے، ہماری ثقافت کی بنت جس طور ادھیڑ دی ہے، یہ اس کی مختصر ترین مثالیں ہیں۔ میرے خیال میں برصغیر اور بطور خاص پاکستان میں جنگ گزیدگی سے لڑنے کے لیے محض امن کا نام لے کر ہم ایک روادار اور رنگا رنگ سماج کی طرف واپس نہیں جا سکتے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ ہم پاکستان میں اقتدار پر قابض آمریت کے خلاف آواز اُٹھائیں اور جمہوریت کی بحالی کے لیے جدوجہد کریں۔ پاکستان جمہوریت کے ذریعہ وجود میں آیا اور ۱۹۴۸ء سے ہی ملکی سلامتی کے نام پر جنگوازم کے مبلغین کے چنگل میں پھنس گیا۔ وہ ملک جس کی سول اور ملٹری بیوروکریسی اقتدار کا قبضہ لینے کے صرف دو مہینے بعد ۱۹۴۷ء میں ہی ساری دنیا سے ہتھیار خریدنے کی تگ و دو کر رہی ہو اور امریکی حکومت سے اس مقصد کے لیے بھاری قرضے مانگ رہی ہو، جس نے کبھی فوجی حکومتوں کی شکل میں اور کبھی پس پردہ رہ کر جنگی جنون کو اس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ انتہا پسند تنظیمیں کھلے بندوں مسلح رضاکاروں کی جنگی تربیت کرتی ہیں۔ آئی۔ ایس۔ آئی کا ایک سابق سربراہ پاکستانی فوج کو دنیا کی سب سے بڑی جہادی تنظیم کہتا ہے اور بعض انتہا پسند تنظیموں کے یہ بیانات سہ کالمی سرخیوں میں شائع ہوتے ہیں کہ پاکستان کے ۲۵ رشہروں میں ریاست کی نہیں، ہماری عمل داری چلے گی، ہم اپنی عدالتیں لگائیں گے اور امن و امان قائم رکھنے کی ذمہ داری پولیس کی نہیں، ہمارے رضاکاروں کی ہوگی۔ ایک طرف حکمران اشرافیہ یا اس کی سرپرستی میں کام کرنے والے عناصر کی یہ صورت حال ہے، دوسری طرف پاکستانی عوام ہیں جنہوں نے ہر انتخاب میں غیر انتہا پسند اور لبرل سیاسی جماعتوں کو ووٹ دیا ہے۔ پاکستانی عوام کے اسی سیکولر سیاسی رویے سے خوفزدہ ہو کر سرچشمۂ اقتدار پر قابض قوتیں ملک میں جمہوریت کو پنپنے نہیں دیتیں اور ہر دوسرے چوتھے برس فوج برسر اقتدار آ جاتی ہے۔

پاکستان کی وہ طاقتیں جس کی بقا جنگی جنون کو بھڑکانے اور سارے سماج کو جنگ گزیدگی کی

دلدل میں دھکیل دینے پر منحصر ہے، ان سے امن قائم کرنے کی درخواست یا توقع، بھیڑیے سے بھیڑ کی نگہداشت کی احمقانہ اُمید ہے۔ وہ عناصر جو 'ہتھیار برائے امن' کا نعرہ لگاتے ہوں ان سے 'امن برائے انسان' کی توقع یا دیوانگی ہے یا حد سے بڑھی ہوئی فرزانگی۔

جنگوازم اور جنگ گزیدگی کا سب سے المناک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ رویے سماج میں نراج اور انتشار پیدا کرتے ہیں، فرقہ وارانہ، نسلی، لسانی اور علاقائی تنازعات اور تضادات ابھر کر آتے ہیں، ثقافت کا فطری ارتقا رک جاتا ہے اور ثقافتی تنوع اور رنگارنگی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔

جنگ گزیدگی اور جنگوازم کا آغاز کسی بیرونی دشمن سے تحفظ کے نام پر ہوتا ہے لیکن یہ خطرناک رویہ اور رجحان بالآخر خود اس ملک کی سماجی، ثقافتی، تہذیبی، مذہبی، نسلی اور لسانی یکجہتی کو پارہ پارہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ نام نہاد بیرونی دشمن تو محفوظ رہتا ہے لیکن جنگ گزیدگی کی دیمک خود اس سماج کو بنیادوں سے بلندیوں تک چاٹ جاتی ہے۔ پاکستان آج اسی صورت حال کا شکار ہے۔

(یہ مضمون نومبر ۲۰۰۰ء میں ارتقا لٹریری فورم اور 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کی جانب سے ہونے والے سہ روزہ سیمنار 'قلم برائے امن' میں پڑھا گیا۔)

سیہ پوش عورتیں، ماتم گسار مرد۔۱

آج پاکستان میں آغا حشر کا ڈرامہ 'یہودی کی لڑکی' اسٹیج پر پیش نہیں کیا جا سکتا حالانکہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی یہ ڈرامہ ہندوستان کے طول وعرض میں سینکڑوں بار کھیلا گیا اور بے پناہ مقبول ہوا۔ اس زمانے میں کسی جانب سے بھی اس کے مرکزی خیال پر اعتراض نہیں کیا گیا جو یہودیوں پر توڑے جانے والے ظلم وستم سے عبارت ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی نوآبادی ہونے کی بناء پر ہندوستانیوں کی بڑی تعداد جرمنوں کے ساتھ تھی، برطانیہ نے حکومت مغلوں سے چھینی تھی اس لیے مسلمان برطانیہ کی شکست کے خواہاں تھے اور اکبر اعظم کے وزن پر اسے ہٹلر اعظم کہتے تھے، تعلیم یافتہ نوجوان اس کی خودنوشت 'مین کمف' اپنے سرہانے رکھ کر سوتے تھے اور گلی گلی پھرنے والے سبزی فروش 'جرمن کا گولہ ہورہی ہے پیاز' کی ہانک لگاتے تھے۔ ایک ایسی ذہنی حالت میں ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۵ء کے دوران جرمنی میں یہودیوں پر ستم کے جو کوہ گراں توڑے گئے ان سے مسلمانوں کی اکثریت سرسری گزری۔ رہی سہی کسر کلامِ اقبال نے پوری کی۔ اقبال کی تعلیم جرمنی میں ہوئی تھی، وہ نطشے سے بے حد متاثر تھے۔ اس کا 'سپر مین' کا تصور ان کا دل لبھاتا تھا، سامی النسل یہودیوں سے جرمن آریاؤں کی شدید نسلی نفرت کو اقبال نے جرمنی میں قیام کے دوران شاید محسوس کیا ہو، انہوں نے 'پنجہ یہود' اور 'فتنہ یہود' جیسی اصطلاحات کو ہندی مسلمان کی سائیکی میں راسخ کر دیا۔

الم ناک بات یہ ہے کہ ڈھائی ہزار برس سے تمام دنیا میں در بہ در ہونے اور نشانہ قہر بننے والے یہودیوں کو جب اسرائیل کی صورت میں ایک ریاست ہاتھ آئی تو وہ بھی کھل کر کھیلے اور انہوں نے فلسطینیوں کے ساتھ وہ ظالمانہ رویہ اختیار کیا جس کی کچھ برس پہلے تک خود انہیں شکایت

رہی تھی۔

اسرائیل اور عربوں کے درمیان ایک نہیں کئی جنگیں ہو چکی ہیں اور ہر جنگ میں اسرائیل کی ریاست سمٹی نہیں، پھیلی ہے۔ اس پھیلاؤ نے عرب اسرائیل تصادم، تشدد اور تضاد میں اضافہ کیا ہے، شرق اوسط میں عربوں کے خون نے نفرتوں کو جنم دیا ہے۔ اس کے باوجود زمینی حقیقت یہی ہے کہ اردن، مصر اور ترکی اس سے سفارتی تعلقات رکھتے ہیں، ایران کے بھی اسرائیل سے گہرے روابط تھے لیکن خمینی کی آمد کے ساتھ ہی ایران اور اسرائیل سے بہترین تعلقات کا باب ختم ہوا۔ ترکی سے اسرائیل کے تعلقات اتنے گہرے ہیں کہ دونوں ساتھ مل کر جنگی مشقیں کرتے ہیں جبکہ پاکستان کی مساجد میں ہر جمعہ کو بعدِ نماز، اجتماعی دعا میں یہ جملہ نہایت رقت سے دہرایا جاتا ہے کہ 'یا اللہ اسرائیل کو نیست و نابود فرما۔ یا اللہ فلسطین کو آزاد فرما۔' یہاں یہ بات کہے بنا رہنا ذرا مشکل ہے کہ اردن میں پناہ لینے والے فلسطینیوں کی 'سرکوبی' اور 'صفائی' کے لیے جس جرنیل نے 'شاندار کارکردگی' کا مظاہرہ کیا تھا، وہ عیسائی یا یہودی نہیں، ایک پاکستانی جرنیل تھا۔ اس جرنیل کی کلف لگی وردی پر چوڑے ریشمی فیتے میں ٹنکا ہوا ایک اعزاز اپنی آب و تاب دکھاتا تھا جو اسے ان خدمات کے صلے میں عطا ہوا تھا۔

ارضِ فلسطین کے لیے صرف فلسطینی ہی نہیں لڑے، لبنان کا وسیع المشرب سماج اور اس کے حسین شہر بھی اسی لڑائی میں غارت ہوئے۔ یہ وہی لبنان ہے جس کے دارالحکومت بیروت کے لیے فیض صاحب نے 'بیروت بدیلِ باغِ جناں' کہا تھا۔

اسرائیل کی توسیع پسندی اور جارحیت نے فلسطینی نوجوانوں میں اس غیظ و غضب کو جنم دیا جس کے سبب ۹ دسمبر ۱۹۸۷ء کو مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں 'انتفاضہ' کا آغاز ہوا۔ اسرائیل کی فوجی طاقت کے خلاف غلیلوں اور پتھروں سے لڑی جانے والی یہ لڑائی اپنے دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اور دنیا کی سیاست پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے جو دو ٹاور دہشت گردی کا شکار ہوئے اس کا سبب اسرائیل کی ناانصافیاں اور امریکہ کی ان ناانصافیوں سے چشم پوشی ہے۔

ہم بن گوریان، موشے دایان، گولڈا میئر، ایہود بارک اور ایریل شیرون سے واقف ہیں، ہم صابرہ اور شتیلا کیمپوں میں رہنے والے فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم سے آگاہ ہیں۔ اپنے

ٹیلی وژن اسکرین پر ان اسرائیلی سپاہیوں کو دیکھتے ہیں جن کی گولیاں شیر خوار بچوں کے حلقوم کے لیے حرملہ کا تیر بن جاتی ہیں۔ اسرائیلی جرنیلوں کے وہ بیانات پڑھتے ہیں جن سے تکبر اور نفرت کی سڑاند اٹھتی ہے، جن کی وردیاں فلسطینیوں کے خون سے تر بتر ہیں۔

لیکن ایک اسرائیل اور بھی ہے۔

یہ مردکئی ونونو، ریوون کامنیر، ڈان الماگور، جوسٹ ہلٹر مان، 'Women in the Black' ...... 'End the Occupation' ...... 'There is a Limit' ...... 'Israeli Women Against the Occupation' کا اسرائیل ہے۔

اس دوسرے اسرائیل کی بات کا آغاز میں سیہ پوش عورتوں Women in the Black سے کروں گی۔ سیہ پوش عورتوں کی اس تحریک کا آغاز ۱۹۸۸ء میں اس وقت ہوا جب اسرائیلی عورتوں نے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر اپنی حکومت کے قبضے کے خلاف احتجاج کو اپنے ضمیر کا مسئلہ سمجھا۔ اس احتجاج میں انہوں نے اپنے ساتھ عرب خواتین کو بھی شامل کیا اور پھر یہ دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ ۱۹۸۸ء سے ان سیہ پوش عورتوں نے انتفاضہ کی حمایت میں اور اسرائیلی حکومت کی ریاستی دہشت گردی کے خلاف تل ابیب، حیفہ اور یروشلم میں ہفتہ وار مظاہروں کو اپنا معمول بنالیا۔ اپنے سیاہ لباس کو وہ سوگ کا اور مزاحمت کا رنگ قرار دیتی ہیں۔ جن اسرائیلی عورتوں نے یہ سیہ پوش تحریک شروع کی ان کا کہنا تھا کہ ہم جنگی جنون، ریاستی دہشت گردی، انتہا پسندانہ نسل پرستی، قوم پرستی اور عورتوں کے خلاف جنسی جرائم جیسے معاملات پر اپنا احتجاج جاری رکھیں گے۔

ان سیہ پوش عورتوں نے اپنے احتجاج کا آغاز یروشلم سے کیا اور اس کے بعد اپنا یہ معمول بنالیا کہ وہ ہر جمعہ کو دوپہر ایک بجے پیرس چوک پر جمع ہوتیں جو یروشلم کا ایک بارونق اور پُر ہجوم علاقہ ہے۔ اسرائیلی وزیراعظم کی سرکاری رہائش گاہ وہاں سے بہ مشکل پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ سو کی تعداد میں اور کبھی سو سے زیادہ یہ عورتیں سر سے پیر تک سیاہ لباس میں پیرس چوک پہنچتیں اور بالکل خاموشی کے ساتھ وہاں ایک گھنٹہ کھڑی رہتیں، ان سب کے ہاتھوں میں سفید رنگ کا ایک پنجہ ہوتا جس پر 'قبضہ ختم کرو' کی عبارت تحریر ہوتی۔ ان اسرائیلی عورتوں کو انتہا پسند یہودیوں کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، غنڈے ان پر آواز کستے، ان کے سامنے سڑک پر تھوکتے، فحش اشارے کرتے، کبھی ان کے چوک پہنچنے سے پہلے اس جگہ پر قبضہ کر لیتے جہاں وہ ہر ہفتے کھڑی

ہوتی تھیں، لیکن ان عورتوں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور ۱۹۸۸ء سے اب تک ان سیہ پوش عورتوں نے جس استقامت سے اپنی حکومت کے خلاف مزاحمت کی ہے اور فلسطینیوں کے حق کے لیے آواز بلند کی ہے، وہ بے مثال ہے۔ یہ تحریک یہودی خواتین نے شروع کی، ان میں سے بیشتر اسرائیل کی نسائی تحریک اور بائیں بازو سے وابستہ ہیں۔ ان کی اس تحریک نے بوسنیا کے بحران میں بلغراد کی عورتوں کو راہ دکھائی اور انہوں نے سلوبودان ملاسووچ کی حکومت کے اور نسلی بنیادوں پر مسلمانوں کے قتل عام، عورتوں کے خلاف جنسی جرائم اور جنگی جنون کو بھڑکانے کی ریاستی سرپرستی کے خلاف شدید مزاحمت کی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ۲۰۰۰ء میں 'سیہ پوش عورتوں' کی تحریک کو Millenium Peace Prize دیا گیا اور جون ۲۰۰۱ء میں ڈنمارک اور ناروے کے آٹھ اراکین پارلیمنٹ نے اس تحریک کو نوبل انعام کے لیے نامزد کیا۔

سیہ پوش عورتوں کی یہ تحریک جسے یروشلم کی یہودی خواتین نے آغاز کیا اس کا کہنا ہے:

> 'ہم سیاہ لباس پہن کر ان کا غم مناتے ہیں جو بے گناہ مارے گئے۔ ہماری خاموشی جنگ کے خلاف ہے۔ ہم اس بات پر احتجاج کرتے ہیں کہ عصمت دری کو عورتوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ نسلی صفائی اور حقوقِ انسانی کی خلاف ورزی دنیا میں جہاں بھی ہورہی ہے ہم اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ ہم خاموش رہتے ہیں اس لیے کہ جنگ اور نفرت نے جن انسانی المیوں کو جنم دیا ہے، انہیں بیان کرنے کے لیے لفظ ناکافی ہیں .... ہم عورتوں سے کہتے ہیں کہ وہ آئیں اور ہماری حمایت کریں، ان عورتوں کے بارے میں سوچیں جن کی عصمت دری کی گئی، جبری حراستی کیمپ میں جن پر تشدد کیا گیا، جنہیں قتل کیا گیا، جو لاپتہ ہوئیں، جن کے گھر گرائے گئے۔ ہم سیہ پوش ہو کر ان کا اور جنگ کے تمام متاثرین کا غم مناتے ہیں۔ ہم انسانی فطرت اور زندگی کی خوبصورت بُنت کی بربادی کے ماتم میں ہیں۔'

ایسا نہیں ہے کہ اسرائیل میں صرف اسرائیلی خواتین نے ہی فلسطینیوں کے حق میں آواز بلند کی، دسمبر ۱۹۸۷ء میں انتفاضہ کے شروع ہوتے ہی ہزاروں اسرائیلیوں نے اس دستاویز پر دستخط

کیے جس کا نام 'The Twenty-First Year Convenant for the Struggle Against the Occupation' ہے۔ اس احتجاجی دستاویز پر دستخط کرنے والوں کے نام اخبارات میں اشتہار کے طور پر چھپے تاکہ عام اسرائیلی شہریوں کو اندازہ ہوسکے کہ اسرائیلی دانشوروں، ادیبوں، صحافیوں، قانون دانوں اور مختلف پیشہ ور تنظیموں سے تعلق رکھنے والوں کی کتنی بڑی تعداد ریاستی جبر اور دہشت گردی کے خلاف ہے۔ یہ اشتہار اخبارات کے تین مکمل صفحات پر مشتمل تھا۔ اس دستاویز پر دستخط کرنے والوں کا کہنا تھا کہ فلسطینیوں کے حقوق کی پامالی اور علاقوں پر غاصبانہ قبضے نے اسرئیلی سماج کے تمام پہلوؤں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ معیشت، تعلیم، نظام انصاف، تہذیب وثقافت، سیاست، ادب اور عبرانی زبان سب ہی ان ظالمانہ اقدامات سے متاثر ہورہی ہیں۔

'قبضہ ختم کرو' End the Occupation کا عبرانی نام dai lakibush ہے۔ یہ تحریک انتفاضہ کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ پی ایل او کو فلسطینیوں کی واحد نمائندہ تنظیم تسلیم کرتے ہوئے اس کے ساتھ مکالمہ کیا جائے، اسرائیل کے ساتھ ساتھ ایک خودمختار اور آزاد فلسطین قائم کیا جائے اور ہر نوعیت کی ریاستی دہشت گردی ختم کی جائے۔ اس تحریک میں اکثریت بائیں بازو کی مختلف تنظیموں اور گروہوں کی رہی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ عرب اسرائیلی اتحاد کے بغیر شرق اوسط میں امن کبھی قائم نہیں ہوسکے گا۔ یہ تحریک اسرائیل کے مختلف شہروں میں بڑے بڑے امن مظاہرے کرتی رہی ہے اور اپنے مختلف جلسوں میں ان فلسطینی عربوں کو مہمان بناتی ہے، اور ان سے تقریر کراتی ہے جو ریاستی دہشت گردی کا شکار ہوئے۔

Yesh Gvul اسرائیل کے ریزرو فوجیوں کی ایک تنظیم ہے جس کے معنی ہیں 'There is a Limit' یعنی 'ہر بات کی حد ہوتی ہے۔' یہ تنظیم ان ڈھائی ہزار ریزرو فوجیوں نے بنائی جنہوں نے لبنان پر اسرائیلی حملے کے وقت لبنان جاکر لڑنے سے انکار کردیا تھا۔ انہوں نے اسرائیلی حکومت کے نام اپنے دستخطوں سے جاری ہونے والے خط میں لکھا:

> 'لبنان کی جنگ، مقبوضہ علاقوں اور آبادیوں میں تشدد کی کارروائیاں اس بات کا مظہر ہیں کہ انسانی جان، اخلاقی اقدار کی کوئی پروانہیں کی جارہی۔ یہ اقدام فلسطینیوں اور ہمارے دوسرے پڑوسیوں کے ساتھ امن سے

رہنے میں رکاوٹ ہے، یہ اقوام عالم میں اسرائیل کو تنہا کردے گا اور اس بات کو ثابت کردے گا کہ اسرائیلی حکومت کو زمینی قبضہ، امن سے زیادہ عزیز ہے......ہم نے اسرائیلی ریاست کی فلاح و بہبود، اس کے دفاع اور تحفظ کا حلف اٹھایا ہے اور ہم اس حلف سے وفادار ہیں، اسی لیے ہم حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں غاصبانہ قبضے اور تشدد کی کارروائیوں میں حصہ نہ لینے کی اجازت دی جائے۔'

انتفاضہ کا آغاز ہوا تو انہوں نے مقبوضہ علاقوں میں فوجی کارروائیاں کرنے سے انکار کر دیا۔ اور انہوں نے اخبارات میں 'انکار کی دستاویز' بھی شائع کرائی جن پر ۵۰۰ فوجیوں اور میجر کا عہدہ رکھنے والے دو افراد کے دستخط تھے۔ یہ 'درخواست' نہیں 'انکار' تھا۔ Yesh Gvul نے انتفاضہ کے آغاز کے بعد فلسطینیوں کے خلاف پُرتشدد کارروائیوں میں ملوث فوجیوں میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے کتابچے تقسیم کیے جن میں انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ 'فرض' اور 'قومی مفاد' کے دائرے میں نہیں آتا اور وہ آنے والے دنوں میں 'حکم بجا لانے' کا بہانہ بنا کر ان قانونی کارروائیوں اور سزاؤں سے نہیں بچ سکیں گے جو جنیوا کنونشن کے تحت ان پر عائد ہوتی ہیں۔ 'انکار کی دستاویز' پر دستخط کرنے والوں اور ان کے حمایتی بہت سے فوجیوں پر مقدمے چلے اور بہتوں کو جیل کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔

ہمیں اسرائیل کی کمیونسٹ پارٹی، 'Progressive List for Peace' اور 'Arab Democratic Party' کو نہیں بھولنا چاہیے جو ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے مقبوضہ علاقوں میں ایک فلسطینی ریاست کے قیام کی مسلسل حمایت کرتی رہی ہیں۔

ہمیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ فلسطینی علاقوں پر قبضے کی اسرائیل میں جب بیسویں سالگرہ منائی جا رہی تھی تو اسرائیل کے دارالحکومت تل ابیب میں چھ ہزار سے زیادہ اسرائیلی اپنی حکومت اور اس کے قبضے کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم اس ناجائز قبضے کا خاتمہ اور اس علاقے میں ایک آزاد فلسطینی ریاست کا قیام چاہتے ہیں۔ یہ یہودی مظاہرین تھے اور ان میں کوئی مسلمان یا عیسائی عرب شامل نہیں تھا۔

اسرائیلی یونیورسٹیوں میں پڑھانے اور پڑھنے والے بہت سے یہودی پروفیسر اور طالب

علم ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ 'قبضہ' صرف فلسطینیوں کا ہی نہیں اسرائیلیوں کا بھی دشمن ہے کیونکہ اس نے اسرائیلی یہودیوں کی اعلیٰ اقدار اور تہذیبی روایات کو تہس نہس کر دیا ہے۔ اسی بنیاد پر یہ لوگ 'انتفاضہ' کی حمایت کرتے ہیں۔

یہ اس اسرائیل کی جھلکیاں ہیں جس سے ہم واقف ہی نہیں اور ہم جو پندرہ کروڑ کی تعداد میں ہیں ان میں سے پندرہ سو بھی ایسے نہیں جو مردکئی ونونو کے نام سے واقف ہوں۔

مردکئی ونونو ۱۲ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مراکش میں پیدا ہوا۔ اس کے خاندان نے ۱۹۶۳ء میں اسرائیل کا رخ کیا جبکہ مردکئی ابھی بچہ تھا۔ ۷۱ء سے ۷۴ء کے درمیان اس نے لازمی فوجی خدمات انجام دیں اور ۱۹۷۶ء میں ایک ٹیکنیشین کے طور پر اسرائیل کے ڈیمونا نیوکلیائی ریسرچ سینٹر میں کام شروع کیا۔ ۱۹۷۹ء میں اس نے گوریان یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور یہیں اس کے خیالات میں انقلاب آیا۔ وہ بائیں بازو کی سیاست سے وابستہ ہوا۔ یونیورسٹی میں پڑھتے ہوئے اس نے لبنان پر اسرائیلی حملے اور قبضے کے خلاف مظاہروں میں حصہ لیا، ڈیمونا نیوکلیئر ریسرچ سینٹر کی سرگرمیوں کے خلاف ہونے والے مظاہروں میں بھی شریک رہا۔ ۱۹۸۵ء میں ایک بار پھر اس نے ڈیمونا سینٹر میں ملازمت حاصل کر لی۔ اس مرتبہ ملازمت حاصل کرنے کے مقاصد کچھ اور تھے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ خفیہ طور پر ایک کیمرہ سینٹر کے اندر لے جانے میں کامیاب ہو گیا جہاں اس نے تنصیبات کی تصویریں اتاریں۔ اس خطرناک کام میں کامیابی کے چند ہفتوں بعد اس نے ملازمت سے استعفیٰ دیا، سفر پر نکلا اور ایشیا سے ہوتا ہوا آسٹریلیا جا پہنچا۔ اس دورن وہ ڈیمونا سینٹر کی حقیقیت کے بارے میں لوگوں سے گفتگو کرتا رہا تھا۔ لندن کے 'سنڈے ٹائمز' کو اس 'بڑی خبر' کی سن گن ملی تو انہوں نے آسٹریلیا میں مردکئی سے رابطہ کیا اور اس سے لندن چلنے کے لیے کہا۔ لندن پہنچ کر مردکئی نے تصویریں اور دوسری شہادتیں 'سنڈے ٹائمز' کے حوالے کیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ اسرائیل ایک بڑی ایٹمی طاقت بن چکا ہے اور اس کے پاس ۲۰۰ سے زیادہ نیوکلیائی ہتھیار ہیں۔ اس 'دھما کہ خیز انکشاف' کے بعد مردکئی لندن سے روم روانہ ہو گیا۔ یہ ایسی 'بڑی خبر' تھی جس نے دنیا سے زیادہ اسرائیل کو ہلا کر رکھ دیا اور اسرائیلی خفیہ ایجنٹوں نے اسے ۳۰ دسمبر ۱۹۸۶ء کو روم سے اغوا کر کے اسرائیل پہنچا دیا جہاں اس پر 'غداری' اور 'جاسوسی' کے الزام میں خفیہ طور پر مقدمہ چلایا گیا اور ۱۸ر برس قید کی سزا سنائی گئی۔ مردکئی ونونو نے اشکلان جیل میں

ساڑھے گیارہ برس کی قید تنہائی گزاری، صرف تین برس پہلے اس کی قید تنہائی ختم ہوئی ہے لیکن ابھی بھی اپنی آزادی کے لیے اسے اپریل ۲۰۰۴ء کا انتظار کرنا ہے۔

قیدِ تنہائی کا ایک دن بھی لوگوں پر بھاری ہوتا ہے لیکن مردکئی نے ۴۱۹۷ دن اور راتیں قید تنہائی میں گزاریں، اس کی کوٹھری ٦ فٹ چوڑی اور ۹ فٹ لمبی تھی اور وہ اپنے لیے کھانا اور پانی لانے والوں کی صورتیں دیکھنے سے بھی محروم رکھا جاتا تھا۔ آج بھی اس کا یہی کہنا ہے کہ 'میں نے اپنی جان اس لیے خطرے میں ڈالی اور اپنی آزادی اس لیے قربان کی کہ میں لوگوں کو ان نیوکلیائی ہتھیاروں کے خطرات سے آگاہ کرسکوں جنہوں نے اس پورے خطے کو اپنی زد پر لے رکھا ہے۔ میں نے تمام شہریوں اور تمام انسانیت کے نمائندے کے طور پر یہ سب کیا ہے۔'

مردکئی ونونو کو مختلف بین الاقوامی امن تنظیموں کی جانب سے انعامات اور اعزازات دیے گئے ہیں۔ اس کا نام ہر سال نوبل امن انعام کے لیے نامزد ہوتا ہے۔ اس کی رہائی کے لیے اسرائیل میں اور اسرائیل سے باہر سینکڑوں مظاہرے ہو چکے ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل، یورپین پارلیمنٹ، حقوق انسانی کی دوسری تنظیموں نے اس کی رہائی کے لیے اسرائیلی حکومت سے بار بار اپیلیں کی ہیں۔ وہ 'ضمیر کا قیدی' قرار دیا جاچکا ہے اور ساری دنیا کے ہزاروں دانشور، ادیب، قانون دان اور صحافی اس کی ہمت اور استقامت کو داد دیتے ہوئے اس کے حق میں لکھتے ہیں۔ اس کا برج میزان Libra ہے، چنانچہ ہر سال ۱۲/ اکتوبر کو اسرائیل اور دنیا بھر کی مختلف امن پسند تنظیموں سے تعلق رکھنے والے اشکلان جیل کے سامنے جمع ہوتے ہیں اور مردکئی کی سالگرہ مناتے ہیں، وہ اس کے لیے گیت گاتے ہیں جو اس کے کانوں تک نہیں پہنچتے، وہ اس کے جنم دن کا جشن مناتے ہیں جس میں وہ کبھی شریک نہیں ہوا۔

اسرائیل میں اس کی رہائی اور آزادی کے لیے ہر سال ہفتۂ رہائی منایا جاتا ہے۔ کنسٹ (اسرائیلی پارلیمنٹ) کے ۲ فروری ۲۰۰۰ء کے اجلاس میں پہلی مرتبہ اسرائیل میں موجود نیوکلیائی ہتھیاروں اور مردکئی ونونو کی رہائی کے معاملے پر بحث کا آغاز ہوا۔ کنسٹ میں اس مباحثے کے دوران ایک اسرائیلی رکن پارلیمنٹ عصام مخاوَل Issam Makhoul نے جو تقریر کی وہ ضمیر کی آزادی اور جرأت گفتار کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ عصام مخاوَل نے بات کی ابتدا کرتے ہوئے کہا:

'میں اس بات کا آغاز البرٹ آئن اسٹائن اور برٹرینڈ رسل کے ایک

مشترکہ بیان سے کروں گا جو ۹ جولائی ۱۹۵۵ء کو جاری ہوا تھا اور جس میں ان دونوں نے کہا تھا 'ہم اس موقعہ پر کسی ایک یا دوسری قوم، کسی براعظم یا کسی مذہب سے تعلق رکھنے والے کے طور پر بات نہیں کر رہے، ہم اس انسانی گروہ کے ایک فرد کے طور پر اپنی بات کہہ رہے ہیں جس کا اس کرۂ ارض پر وجود اب شبہے میں پڑ چکا ہے...... یہ ہم سب کے لیے ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ہم کسی طور آنکھیں نہیں چرا سکتے کہ کیا ہم نسل انسانی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں؟ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا نسل انسانی جنگ سے تائب ہونے کے لیے واقعی تیار ہے؟'

عصام مخاؤل نے اپنی اس تقریر میں آگے چل کر کہا:

'گزشتہ ۴۰ برس سے نیوکلیائی ہتھیاروں کے بارے میں اسرائیلی حکومتوں کی پالیسی فریب، جھوٹ اور دھوکے پر مبنی رہی ہے...... میں کنسٹ (پارلیمنٹ) کے تمام اراکین سے کہوں گا کہ وہ گزشتہ برس چھپنے والی کتاب 'Vanunu & The Bomb' کا ضرور مطالعہ کریں۔ یہ کتاب 'Committee for Mordechai Vanunu and Middle East Free of Atomic, Biological and Chemical Weapons' نے چھاپی ہے اور اس میں نیوکلیائی ہتھیاروں، مردکئی ونونو اور دوسرے متعلقہ معاملات کے بارے میں متبادل معلومات بھی ہیں اور ان 'اطلاعات' کو جھوٹ ثابت کیا گیا ہے جو اسرائیلی حکومت، اخبارات اور بہت سے دانشور، اسرائیلی عوام کے ذہنوں کو سلانے اور انہیں برین واش کرنے کے لیے مہیا کرتے ہیں۔ ....اسرائیل اور اس کے ہمسایہ ملکوں کو کسی نیوکلیائی جنگ کی صورت میں ہی خطرہ نہیں ہے۔ جنگ کے بغیر بھی ہمارے اپنے گھر کے آنگن میں ایک ایسا نیوکلیائی آتش فشاں موجود ہے جو کسی سانحے کی صورت میں پھٹ سکتا ہے............پچھلے برس اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی تھی

جس کے مطابق اسرائیل اپنا نیوکلیائی فضلہ افریقی ملک ماریطانیہ بھیج رہا ہے جہاں اسے زمین کی گہرائی میں دفن کر دیا جاتا ہے .... میں اسرائیلی وزیراعظم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ سچ ہے؟ کیا اسرائیل نے بھی تیسری دنیا کو آلودہ کرنے کا مجرمانہ نوآبادیاتی رویہ اختیار کر لیا ہے، جسے چند برس پہلے ماحولیاتی تنظیموں کے شدید دباؤ کے باعث یورپی ملکوں نے ترک کر دیا تھا؟'

عصام مخاوَل کی یہ طویل تقریر ان اسرائیلیوں کے ضمیر کی آواز ہے جو فلسطینیوں کی زمین پر قبضے، نیوکلیائی اسلحے کی تیاری اور مردکئی ونونو کو دی جانے والی ظالمانہ سزا کے خلاف ہیں جن کا خیال ہے کہ جنگ مسائل کا حل نہیں اور کسی بھی فلسطینی اور اسرائیلی کے بہتے ہوئے لہو کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔

اسرائیل میں ایسے لوگوں کی تعداد سینکڑوں نہیں، ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہے جو اپنی حکومت کے موقف کو غلط سمجھتے ہیں، جن کا خیال ہے کہ فلسطین کی آزاد ریاست قائم ہونی چاہیے، جو فلسطینیوں کے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہیں لیکن جو ابھی تک 'خاموش' ہیں۔ ظلم اگر ہو رہا ہو اور آپ خاموش رہیں تو آپ بھی ظالموں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر سیہ پوش اسرائیلی عورتوں کا، فوجیوں اور دانشوروں، طلبہ اور صحافیوں کا اور دوسرے ان اسرائیلیوں کا قد بالا ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تحریر، تقریر، اپنے اقدام سے اسرائیل کی ریاست کے خلاف آواز بلند کی، کلمہ حق کہا، اپنی آزادی خطرے میں ڈالی، ایسے مرحلے پر مردکئی ونونو ایک ایسا بڑا نام ہو جاتا ہے جس کا ثانی دنیا میں مشکل سے ملے گا جس نے اپنے ضمیر کی آواز پر اپنی آزادی قربان کر دی اور ۴۱۹۷ راتوں اور دنوں کو ۶ فٹ چوڑی اور ۹ فٹ لمبی کوٹھری میں کسی سے کلام کیے بغیر اور کسی کی آواز سنے بغیر گزارا۔

یہ اس اسرائیل کی تصویر ہے جو ہمارے اخبارات میں کبھی نہیں چھپتی، جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے لیکن ہمیں اس بارے میں جاننا چاہیے شرق اوسط میں دور دور تک جنگ کے الاؤ بھڑک رہے ہیں۔ یہ اسرائیل کے وہ لوگ ہیں جو اس آگ کی خوفناکی سے سہمے ہوئے ہیں، وہ اپنے ضمیر اور اپنی زمین کے غدار نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی تعداد کم ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ

ان کے خیالات سے اتفاق رکھنے والے بے شمار لوگ اسرائیل میں موجود ہیں لیکن اس کی ہمت نہیں رکھتے کہ آواز بلند کریں اور ریاستی جبر کا سامنا کریں۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود یہ لوگ اپنے کام میں مگن ہیں۔ ان کی مثال ان پرندوں کی سی ہے جو آگ کے دہکتے ہوئے الاؤ کو بجھانے کے لیے اپنی اپنی چونچ میں پانی کی ایک بوند لے کر آتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ دن ضرور آئے گا جب اپنی چونچ میں پانی کی بوند لے کر پرندوں کے غول کے غول آئیں گے اور اس آگ کو بجھادیں گے۔

سیہ پوش عورتیں، ماتم گسار مرد۔۲

'سیہ پوش عورتیں اور ماتم گسار مرد'(۱) دسمبر۲۰۰۲ء میں لکھا گیا اور 'دنیا زاد' کے خصوصی شمارے 'عاشق من الفلسطین' میں شائع ہوا لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اسرائیل کے اندر فلسطینیوں کے حق کے لیے لڑنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوا ہے ان آوازوں کے بارے میں ہمیں اس لیے جاننا چاہیے کہ ہمارے یہاں اسرائیل کی یک طرفہ تصویر پیش کی جاتی ہے۔ صہیونیوں اور یہودیوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا اور نہ ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسرائیلی ریاست فلسطینیوں کے ساتھ جو کچھ کر رہی ہے اس کے خلاف اسرائیل کے اندر سے ہونے والی مزاحمت کیا ہے اور اس کا دائرہ کتنا پھیلا ہوا ہے۔

یہ ۲۷ دسمبر ۲۰۰۸ء کی بات ہے جب صبح کو اسرائیلیوں کی آنکھ کھلی تو انتہا پسند یہودی سیاستدان اور فوجی جرنیل، جنگ کے بھوکے بھیڑیے کو فلسطینیوں پر آزاد چھوڑ چکے تھے۔ وہ اسرائیلی جنھوں نے اپنے پڑوسی فلسطینیوں کی زندگیاں دیوانگی پر اترے ہوئے اپنے سیاستدانوں کے ہاتھوں پہلے بھی برباد ہوتے دیکھی تھیں، انھوں نے فوری طور پر اس بہیمانہ حملے کے خلاف ایک دوسرے سے رابطے شروع کیے، ان میں 'کولیشن آف ویمن فار پیس' سب سے آگے تھی۔ اس نے حداش، گش شولوم، برابوت یک آواز تحریک اور دوسری امن تنظیموں سے فون اور انٹرنیٹ پر رابطے شروع کیے اور اسی شام چھ بجے جنگ مخالف مظاہرے کا اعلان کر دیا گیا۔

شام چھ بجے سے پہلے اسرائیلی پولیس 'رائٹ پولیس' گھڑ سوار پولیس اور پولیس کی گشتی گاڑیوں نے تل ابیب کے اس پُر رونق چوک کو گھیرے میں لے لیا جہاں یہ امن مظاہرہ ہونا تھا۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے بہت سے بینر تیار کیے تھے جن میں سب سے نمایاں یہ نعرہ تھا کہ 'یہ

میری جنگ نہیں ہے' عبرانی' عربی اور انگریزی میں لکھے ہوئے اس بڑے بینر کی تصویریں ہمارے یہاں بھی بعض انگریزی اخبارات میں شائع ہوئیں۔ امن کے لیے آواز بلند کرنے والے ان نہتے مظاہرین کا 'دماغ درست کرنے کے لیے' جو پولیس فورس بھیجی گئی اس کے پاس دور مار رائفلیں تھیں۔ چھ بجے تک ہزاروں مظاہرین جمع ہو چکے تھے۔ اسرائیلی الیکٹرانک میڈیا، پریس اور حکومت جس پیمانے پر جنگی جنون بھڑکاتی ہے اسے نظر میں رکھا جائے تو نہتے فلسطینیوں پر ہونے والے حملے کے صرف ۱۲ر گھنٹے بعد یہ ایک بڑا جنگ مخالف مظاہرہ تھا جس میں شریک لوگوں کی پولیس سے جھڑپیں ہوئیں' بہت سے نوجوان گرفتار ہوئے لیکن مظاہرین دوسرے دن بھی آئے اور تیسرے دن بھی۔

یہاں یہ عرض کرتی چلوں کہ 'یک آواز تحریک' میں ۷۸۱، ۳۱، ۳ر اسرائیلی، ۷۷۷، ۹۵، ۲ر فلسطینی اور دنیا بھر کے ۱۵۴، ۲۱ر افراد شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آزاد فلسطین اور اسرائیلی قبضے اور تشدد کے خاتمے کی بات کرتے ہیں۔ ان دنوں گش شولوم کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اسرائیلی دارالحکومت کی سڑکوں پر مظاہرے کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پوسٹر ہیں جن پر لکھا ہے Stop the Mad War گش شولوم میں شامل لوگ وہ ہیں جنھوں نے مقبوضہ علاقوں میں فوجی خدمات دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ایسوسی ایشن فار سول رائٹس ہے، بیت شولوم ہے جو امن پسند عورتوں کی ایک تنظیم ہے۔ فلسطینی گھروں کو مسمار کرنے کے جرم اور فلسطینی علاقوں پر قبضے کے خلاف آواز بلند کرنے والی تنظیمیں ہیں۔

انتہا پسند یہودی' عسکریت پسند اسرائیلی حکمران اور فوجی جرنیل ان تمام تنظیموں اور ان میں شامل افراد کو 'غدار' قرار دیتے ہیں اور ان سے انتقام لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ فلسطینیوں کے لیے امن اور انصاف کے طلب گار اسرائیلیوں پر سڑکوں اور گھروں پر حملے کیے جاتے ہیں اور ان حملوں کا سب سے زیادہ شکار اسرائیلی عورتیں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسرائیل کی باضمیر عورتیں تھیں جنھوں نے فلسطینیوں کے حق میں امن تحریک چلانے کا آغاز کیا تھا۔ یہ بیس برس پہلے کا قصہ ہے۔ جس کی تفصیل 'سیہ پوش عورتیں اور ماتم گسار مرد' (۱) میں موجود ہے۔ دسمبر ۲۰۰۱ء میں ۵ براعظموں کے ۱۵۰ر شہروں میں مختلف قومیتوں' نسلوں اور عقیدوں کی سیاہ پوش عورتوں نے بھرپور مظاہرے کیے۔ ان میں سب سے بڑا مظاہرہ یروشلم میں ہوا جہاں ۵ ہزار

سے زیادہ اسرائیلی اور فلسطینی عورتوں نے اس مظاہرے میں حصہ لیا۔ ان میں دو بینروں کی عبارت لوگوں کی توجہ کا مرکز رہی۔ 'قبضہ ہم سب کو ہلاک کر رہا ہے' اور 'ہم ایک دوسرے کے دشمن ہونے سے انکار کرتے ہیں'۔ ان عورتوں نے اسرائیلی پولیس اور سیاستدانوں کے خلاف احتجاجی مظاہرے جاری رکھے تو وہ 'غدار' اور 'وطن فروش' کہی گئیں، ان پر پتھر پھینکے گئے، جوتے برسائے گئے' قاتلانہ حملے کیے گئے لیکن اسرائیل بھر میں ہزاروں عورتیں ہر جمعہ کی دوپہر اپنے گھروں سے نکلتی ہیں اور فلسطینیوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتی ہیں اور اپنے سیاستدانوں اور فوجیوں سے 'امن' کی طلب گار ہوتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تشدد ہمارے لوگ کریں یا دنیا کی کسی بھی قومیت، نسل اور مذہب سے تعلق رکھنے والے، یہ ہمارے لیے ناقابل قبول ہے۔ ہم ہر نوعیت کے تشدد کو رد کرتے ہیں۔ صدیوں سے عورتوں کی بے حرمتی کو دوسری قوم کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہم اس ظالمانہ فعل کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہیں۔

'ففتھ مدر' نامی تنظیم کی بنیاد مارچ ۲۰۰۲ء میں رکھی گئی۔ اس میں بیشتر عورتیں وہ تھیں جنھوں نے Four Mothers Movement چلائی تھی اور جنھوں نے لبنان پر اسرائیلی قبضے کے خاتمے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ ماؤں اور عورتوں کی حیثیت سے ہم اسے لازم سمجھتے ہیں کہ اپنی آواز بلند کریں اور اپنے عسکریت پسندوں، سیاستدانوں، فوجیوں اور قانون نافذ کرنے کے نام پر لاقانونیت پھیلانے والوں کو بتا دیں کہ اس تنازعے کو گولیوں سے نہیں صرف گفتگو سے حل کیا جا سکتا ہے۔

مئی ۲۰۰۶ء میں حماس نے انتخابات جیتے تو اسرائیلی شہریت رکھنے والی تانیا رائن ہارٹ نے لکھا کہ حماس کی حکومت کو تسلیم کیا جانا چاہیے کیونکہ یہ انصاف اور بین الاقوامی قوانین کا تقاضہ ہے۔ تانیا نے اپنے اس مضمون میں اسرائیلی حکومت کو یہ بھی یاد دلایا کہ حماس نے جنوری ۲۰۰۵ء میں اعلان کیا تھا کہ وہ مسلح جدوجہد سے کنارہ کر کے سیاسی جدوجہد کو اختیار کرے گی اور اس کے بعد گزشتہ ۱۷ مہینوں میں اس نے اپنے اس عہد کی پاسداری کی اور اس کی طرف سے دہشت گردی کا کوئی بھی واقعہ نہیں ہوا۔ تانیا نے اپنے اسی مضمون میں اپنی حکومت کو یہ بھی یاد دلایا تھا کہ اس نے ۱۹۹۳ء میں ہونے والے اوسلو معاہدے کی کسی بھی شق کی پاسداری نہیں کی اور فلسطینیوں سے ان

کی سرزمین کو چھیننے کا سلسلہ جاری رکھا۔

میں اسرائیل کی شہری گیلا سورسکی کا مضمون پڑھتی ہوں جس نے لکھا کہ جب دہشت گرد سیاستدان بن جائیں تو وہی ہوتا ہے جو اسرائیل میں ہو رہا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ مناہم بیگن ایک دہشت گرد یہودی تنظیم کا سربراہ تھا اور اس کے ہاتھوں پر ۱۹۴۶ء میں کنگ ڈیوڈ ہوٹل میں ایک دہشت گرد حملے میں مارے جانے والے ۹۱ شہریوں کا خون تھا لیکن وہ ہمارا وزیراعظم ہوا' اسی طرح وہ ایریل شیرون پر شدید تنقید کرتی ہے جو بیروت، غزہ، صابرہ، شتیلہ کیمپوں میں ہونے والی ہولناک خونریزی کا ذمہ دار تھا اور اسرائیلیوں نے اسے اپنا وزیراعظم منتخب کیا۔

مسلم اُمہ اسرائیلی افواج کے ہاتھوں فلسطینی بچوں، عورتوں، بوڑھوں، نہتے شہریوں کا قتل عام دیکھ چکی، ہمارے عرب اور غیر عرب مسلمان حکمرانوں نے ان مظالم کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا، وہ بھی ہم سب کے سامنے ہے۔ شاید وقت آ گیا ہے کہ مسلم اُمہ اپنے حکمرانوں کی طرف دیکھنے کی بجائے ان غیر مسلم عناصر کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرے، جو فلسطین پر اسرائیل کے ناجائز قبضے اور اس کی نازل کی ہوئی ابتلا کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور نسل پرست یہودیوں کے پہلو میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صیہونیوں کے بارے میں حقائق کو آشکار کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، جلسے کرتے ہیں، پولیس کا تشدد برداشت کرتے ہیں اور سینکڑوں ایسے یہودی بھی ہیں جو فلسطینیوں پر گولی چلانے سے انکار کی پاداش میں آج بھی جیل میں ہیں۔ ان میں مرد ہیں، عورتیں ہیں اور لارا میلو جیسی نوجوان لڑکیاں بھی ہیں۔ ہم ان لوگوں سے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ آج نہیں تو کل اسرائیل اور فلسطین تنازعے میں کوئی مثبت کردار ادا کر سکیں گے۔ تل ابیب میں ہر جمعہ کو کسی بارونق چوک پر نکلنے والی سیہ پوش یہودی عورتیں، ان کا ساتھ دینے والے مرد، جو عدم تشدد کی اور ہلاکت گریزی کی بات کرتے ہیں، آج نہیں تو کل اسرائیل کے اجتماعی ضمیر کو جھنجھوڑنے میں کامیاب ہوں گے۔ خون ریزی اور ہر قیمت پر غلبہ حاصل کرنا بہت سے انسانوں کی سرشت ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہنے والوں کی اکثریت کو امن اچھا لگتا ہے۔ امن ان کی آنے والی نسلوں کی زندگیوں اور خوشیوں کی ضمانت ہے۔ اگر جنگ دنیا کے ہر تنازعے کا حل ہوتی تو آج کرۂ ارض پر انسان معدوم ہو چکا ہوتا اور اس دنیا میں صرف چرند اور پرند نظر آتے۔

جون ۲۰۱۰ء میں غزہ کے لیے روانہ ہونے والے بحری جہاز 'فلوٹیلا' کا واقعہ ابھی ہم سب کے ذہنوں میں ہے۔ اسرائیل نے اس امن کارواں کے ساتھ جو سلوک کیا اس نے عالمی برادری کو دہشت زدہ کر دیا ان دنوں روزنامہ 'ایکسپریس' میں میرا کالم ۶ جون ۲۰۱۰ء کو 'عالمی ضمیر فلسطینیوں کے ساتھ ہے' شائع ہوا۔ میں نے لکھا کہ غزہ کے غذا سے محروم لوگوں کے لیے دنیا بھر کے ۴۰ ملکوں کے امن رضا کار غذائی اجناس، دوائیں، سیمنٹ، دوسرا تعمیراتی سامان اور معذوروں کے لیے وہیل چیئر لے کر جا رہے تھے لیکن انہیں بین الاقوامی پانیوں میں پہلے بہ جبر روکا گیا اور پھر اسرائیلی بحری جنگی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں سے اسرائیلی 'ایلیٹ کمانڈو' امدادی سامان اور امن رضا کار لے جانے والے سب سے بڑے جہاز پر اترے۔ اس وقت جب صبح کاذب تھی، قتل اور خون کا وہ ڈراما شروع ہوا جس کی ایک ایک تفصیل ہم اخباروں میں پڑھ چکے ہیں، ٹیلی ویژن اسکرین پر دیکھ چکے ہیں۔

ہمیں برطانوی اخبار 'گارجین' کی لنڈا گرانٹ کا شکر گزار ہونا چاہیے جس نے اس موقع پر ہمیں ۱۹۴۷ء کے اس خستہ حال بحری جہاز کی یاد دلائی جو دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد فرانس سے فلسطین کی طرف روانہ ہوا تھا، اس میں نازی قید سے رہائی پانے والے ۴۵۰۰ تباہ حال اور فاقوں سے نڈھال یہودی سوار تھے۔ یہ لوگ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد مختلف کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے تھے اور اس امید پر زندہ تھے کہ شاید کوئی ملک انہیں قبول کر لے۔ اس وقت کچھ صہیونیوں نے ان نیم مردہ لوگوں کو نہ صرف فلسطین تک پہنچانے بلکہ دنیا اور بہ طور خاص برطانوی اور یورپی عوام کی توجہ ان کی حالت زار کی جانب مبذول کرانے کے لیے یہ طے کیا کہ وہ ایک جہاز میں حیفہ بھیجے جائیں گے جس کی ناکہ بندی برطانوی بحریہ نے کر رکھی تھی اور یہ خبردار کر رکھا تھا کہ کسی کو بھی اس ناکہ بندی کو توڑنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ جہاز جس کا نام Exodus رکھا گیا تھا جب حیفہ کی بندرگاہ سے کچھ فاصلے پر تھا تو اسے برطانوی بحریہ کی طرف سے واپس جانے کا حکم ملا جسے 'اکزاڈس' کے پولش کپتان نے ماننے سے انکار کر دیا۔ برطانوی بحریہ کے تین تباہ کن جہاز برطانوی فوج کے جوانوں کے ساتھ 'اکزاڈس' پر چڑھ دوڑے اور انہوں نے بہ جبر اس جہاز کو واپس بھیجنا چاہا، وہ لوگ جو اپنی زندگی سے تنگ آ چکے تھے ان میں سے کوئی ڈنڈا اور کوئی گوشت کے بند ڈبے لے کر ان 'شیر دل' جوانوں سے نبرد آزما ہوا۔ نتیجے میں شیر دل نوجوان محفوظ

رہے لیکن پناہ کی تلاش میں نکلنے والے تین یہودی مارے گئے اور 'اکزاڈس' کو بین الاقوامی پانیوں میں لنگر انداز ہونا پڑا۔ چند دنوں بعد یہ لوگ ایک دوسرے بحری جہاز پر منتقل کیے گئے اور واپس جرمنی بھیج دیے گئے جہاں سے نازی فوجیوں نے انہیں پولینڈ کے بدنام زمانہ کیمپوں میں دھکیل دیا تھا۔ پولینڈ اس وقت ہٹلر کی فوجوں کے قبضے میں تھا اور وہاں بے شمار یہودی کنسنٹریشن کیمپوں میں اجتماعی طور پر ہلاک کیے گئے تھے۔ یہ ساڑھے چار ہزار یہودی جب واپس جرمنی پہنچائے گئے تو یورپ اور امریکا کی رائے عامہ برطانوی اور امریکی حکومتوں کے خلاف ہوگئی اور یہ واقعہ فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل نامی یہودی ریاست کے قیام میں ایک بڑا محرک ثابت ہوا۔ لنڈا گرانٹ کا کہنا ہے کہ ۶۳ برس بعد ۲۰۱۰ء میں ہونے والا یہ دردناک واقعہ بالکل اسی طرح یورپ اور امریکا کے عوام کی بڑی اکثریت کا نقطہ نظر بدل سکتا ہے اور وہ اپنی اپنی حکومتوں پر فلسطینیوں کے ساتھ انصاف کے لیے دباؤ بنا سکتے ہیں۔

فلسطینیوں کی خود مختار اور آزاد ریاست بہ طور خاص غزہ کی پٹی جس میں پندرہ لاکھ سے زیادہ فلسطینی نہایت ذلت آمیز زندگی گزار رہے ہیں، ان کے لیے امدادی سامان لے جانے والے جہازوں اور کشتیوں پر اسرائیلی بحریہ کے اس غیر قانونی اور ظالمانہ حملے کو یقیناً یورپی اور امریکی عوام کی رائے پر اثر انداز ہونے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم اس بارے میں فہم و دانش سے کام لیں اور اسے صرف ملت اسلامیہ کا معاملہ بنا کر پیش کرنے کے بجائے انسانی المیے کے طور پر اجاگر کریں۔

جذباتی ہو کر 'اسرائیل کتا ہائے ہائے' کے نعرے لگانا، مشتعل ہو کر اپنی ہی املاک کو نقصان پہنچانا، آگ لگانا، لوٹ لینا یا اپنی جان دے دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اب تک کچھ نہیں ہوا ہے۔ فلسطینیوں پر جو ستم گزر رہے ہیں، لبنان میں جو کچھ ہوا اس سے ساری دنیا واقف ہے۔ لیکن کسی مسئلے کے بارے میں جاننا ایک بات ہے اور اس مسئلے کے لیے یورپی اور امریکی عوام کے جذبات کو ابھارنا ایک اور بات۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس وقت غزہ کی پٹی کی ناکہ بندی صرف اسرائیل نے ہی نہیں مصر نے بھی کر رکھی ہے اور اس بارے میں دونوں کا نقطۂ نظر ایک ہے۔ دونوں غزہ کی پٹی پر حماس کی حکومت کو اپنے لیے ایک بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔

یاسر عرفات جب تک زندہ تھے اور فلسطینیوں کے رہنما تھے، اس وقت تک فلسطینیوں کو

تیسری دنیا اور یورپ و امریکا کے انصاف پسند ادیبوں، صحافیوں اور امن رضا کاروں کی غیر مشروط حمایت حاصل تھی لیکن جب فلسطین کی آزادی کو 'مسلم امہ' کی حمایت سے جوڑ دیا گیا اس وقت سے فلسطین کے بہت سے غیر مسلم حامی خاموش ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اس امدادی بیڑے پر ہونے والے وحشیانہ حملے کے فوراً بعد اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب میں فلسطینیوں کے حق میں اور اپنی حکومت کے خلاف سینکڑوں یہودیوں نے مظاہرہ کیا۔ اسی طرح اسرائیل میں چھپنے والے اخباروں میں بعض یہودی صحافیوں نے جرأتمندی سے اپنی حکومت کے اس سفاکانہ اقدام کے خلاف احتجاج کیا۔ ہمیں اس حقیقت سے بھی آگاہ ہونا چاہیے کہ اس جہاز پر اسرائیل عرب کینسیٹ کی ممبر پارلیمنٹ حنان ال زوبی سوار تھیں جنھوں نے حملے کے وقت اسرائیلی فوجیوں کو عبرانی میں میگا فون سے خبردار کیا کہ وہ حملے سے باز رہیں کیونکہ اس پر غیر مسلح رضا کار اور دنیا کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے صحافی سوار ہیں۔

اس 'کاروان آزادی' کے سب سے بڑے جہاز پر فلسطینیوں سے یک جہتی کے اظہار کے لیے سوار جرمن پارلیمنٹ کے تین ارکان انیتے گروتھ، انگے ہوگر اور نارمن پیچ سوار تھے جو بار بار اپنی حکومت سے اپیل کرتے رہے کہ اس کاروان آزادی کو جرمنی کی طرف سے تحفظ فراہم کیا جائے۔ اسی طرح قبرص کی پارلیمنٹ کے کئی ارکان اس کاروان میں شامل ہونا چاہتے تھے لیکن قبرص کی حکومت نے ان جہازوں کو نہ اپنی بندرگاہ میں آنے کی اجازت دی، نہ قبرص کی پارلیمنٹ کے ان باضمیر ارکان کو اس کاروان میں شامل ہونے دیا گیا۔

جہازوں کے اس کاروان میں ۴۰ ملکوں کے لوگ شامل تھے۔ عالمی ضمیر کی نمائندگی کرنے والے ان لوگوں کی یہ فہرست بہت طویل ہے، ان میں امریکی شہری گریٹا برلن شامل تھی جو ۱۹۶۰ء سے فلسطینیوں کے ساتھ انصاف کے لیے ہونے والی جدوجہد میں شامل رہی ہے۔ اس نے مقبوضہ مغربی کنارے کے تین سفر کیے ہیں اور فلسطینیوں کی تباہ حالی کے بارے میں بلاکم وکاست لکھا ہے۔ جولائی ۲۰۰۳ء میں جنین پر لگی ہوئی تاروں کی باڑھ میں جو دروازہ لگا ہوا تھا اسے گرانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ اسرائیلی سپاہیوں کی چلائی ہوئی گولیوں سے زخمی ہوئی تھی لیکن اب تک فلسطینیوں کی حمایت سے دستبردار نہیں ہوئی۔ اس جہاز پر امریکی شہری میڈی اپسٹین بھی تھی۔ میڈی کی عمر ۸۶ برس ہے۔ وہ نسلاً اور مذہباً یہودی ہے۔ جرمنی میں ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئی، اس کے

ماں باپ نازی کنسنٹریشن کیمپ میں زہریلی گیس سے ہلاک کیے گئے۔ ہیڈی ان کی اکلوتی اولاد تھی جو خوش بختی سے زندہ رہ گئی اور ان دس ہزار یہودی بچوں کے ساتھ امریکا بھیج دی گئی جو نازیوں کے ہاتھوں سے بچ رہے تھے۔ ہیڈی کی زندگی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سے امن اور سماجی انصاف کے لیے کام کرتے گذری ہے۔ وہ بوڑھی یہودی عورت ۲۰۰۳ء سے اب تک فلسطینیوں کے حق آزادی کے لیے مقبوضہ علاقوں کا پانچ مرتبہ دورہ کر چکی ہے۔

عالمی ضمیر کی نمائندگی کرنے والوں کے اس 'کاروان آزادی' میں ۶۳ سالہ امریکی نرس کیتھرین شینز بھی شامل تھی جو انسانی حقوق، غذائی تحفظ اور صحت کے مسائل کے لیے کام کرتی رہی ہے۔ وہ غزہ کے بیماروں کے علاج کے لیے سفر کر رہی تھی۔ اسی جہاز پر ڈیوڈ شرمر ہارن بھی تھا۔ قومیت امریکی، عمر ۸۰ برس، پیشہ فلم سازی۔ وہ اس سے پہلے بھی فلسطینیوں کے لیے امن وانصاف کی بات کرنے غزہ آیا تھا۔ آئرلینڈ کی کویی بٹرلی تھی' عمر ۳۱ برس' وہ حقوق انسانی کے لیے کام کرنے والی آئرش رضا کار ہے جو زمبابوے، گوئٹے، مالا، لبنان، عراق، ہیٹی اور فلسطین میں کام کر چکی ہے۔ ۲۰۰۲ء کے دوران جینین میں فلسطینیوں کے کیمپ میں اس نے ایک برس گزارا۔ اسرائیلی فوجیوں کی گولی سے زخمی ہوئی۔ گرفتار ہوئی اور جبری طور پر مقبوضہ علاقے سے نکال دی گئی۔ اس نے غزہ میں فلسطینیوں کے قتل عام کے دوران ایمبولینس چلائی، زخمی فلسطینیوں کو لاشوں کے انبار سے نکال کر محفوظ مقام پر پہنچایا اور اسرائیلی جنگ جرائم کی عینی شاہد ہے۔

اسی طرح بلفاسٹ کی مائی ریڈ ماگیور اس کاررواں میں سفر کر رہی تھی۔ عمر ۶۶ برس، ۱۹۷۶ء میں اسے امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ یہ انعام اسے شمالی آئرلینڈ میں نسلی اور سیاسی اختلافات کے حل کے لیے عدم تشدد کے اصولوں پر کار بند ہو کر تنازعات کے خاتمے کی کوششوں پر دیا گیا۔ اسرائیلیوں، فلسطینیوں اور دوسرے یورپی ملکوں کے امن رضا کاروں کے ساتھ فلسطینیوں کے حق میں جلوس نکالنے کی خطا میں اسے گولی ماری گئی تھی۔ 'اس آزادی کاررواں' میں شریک لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے بس یہ جان لیجیے کہ اس میں آئرلینڈ کی سینیٹ کا ۳۷ سالہ ارکن مارک ڈیلی، آئرلینڈ سے ہی ۳۶ سالہ شین ڈیلی اور ۲۸ سالہ فلاچرا لوائین بھی تھا۔ یہ وہ ہے جس نے آئرلینڈ کے شینن ایئرپورٹ پر احتجاجی مظاہرہ کیا تھا کیونکہ اس ایئرپورٹ سے افغانستان اور عراق پر ہونے والے حملوں کے لیے اسلحہ اور فوجی بھیجے جا رہے تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ فلسطینیوں اور

بطور خاص غزہ کی صورتحال کے بارے میں یورپی اور امریکی عوام کے ضمیر کو جھنجھوڑنا چاہتا ہے۔

برطانیہ سے ۳۲ سالہ اریک ہیرسن، اسکاٹ لینڈ سے ۴۳ سال تھریسا میک ڈرموٹ، ۵۵ سالہ ڈینس ہیالی، جرمنی سے ۵۶ سالہ انیتے گروتھ جو اپنی پارلیمنٹ کی رکن ہے اور حقوق انسانی کے حوالے سے کئی اہم بین الاقوامی اداروں میں کام کر چکی ہے۔ ۵۹ سالہ انگے ہوگر جرمن رکن پارلیمنٹ، ۵۷ سالہ پروفیسر ڈاکٹر نارمن پیچ جرمنی کا رکن پارلیمنٹ اس کے علاوہ ہالینڈ کی ۲۹ سالہ این ڈی جونگ جو پی ایچ ڈی ہے، یونان کا ۳۹ سالہ گیورگوس کولتناز، بیلجیم کی مارگریٹا اور انگے نیفس، دونوں نوجوان ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے یہ دونوں لڑکیاں استاد ہیں اور دونوں فلسطینیوں کے حق آزادی کو درست سمجھتی ہیں۔ اسی طرح لندن میں رہنے والی پولش ادیب اور صحافی ایوا جینی وکز ہے جس کے مضامین 'گارجین'، 'لی مونڈ'، 'ریڈ پیپر' اور 'زیڈنٹ' جیسے مؤقر اخباروں میں چھپتے ہیں، جن میں وہ عراقیوں، افغانیوں اور فلسطینیوں کے لیے لکھتی ہے۔ یہ ایک طویل فہرست ہے۔ ان جہازوں میں چند فلسطینی خواتین بھی سوار تھیں جو امریکی یا جرمنی شہری ہیں لیکن اپنے لوگوں کے حقوق کے لیے لڑنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔

ساری دنیا میں اسرائیل کے ظالمانہ رویوں کے خلاف پورے یورپ میں مظاہرے ہوئے، فلسطینیوں کے حق میں غیر مسلم صحافیوں اور ادیبوں نے لکھا۔ رابرٹ فسک نے جو لکھا اسے پڑھیے اور خیر وہ تو ان میں ہے جو فلسطین، لبنان، عراق، افغانستان ہر اس جگہ کے بارے میں بے باکی سے لکھتا ہے جہاں مسلمان نشانہ ہیں۔ وینزویلا کے صدر ہیوگو شاویز نے سرکاری سطح پر سخت احتجاج کیا۔ فلسطینیوں کے حق آزادی کے لیے لکھنے والے صحافی، ادیب، شاعر اور قانون دان اور فلم ساز ہزاروں کی تعداد میں ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اسرائیل کے اندر موجود ہیں اور یہودی ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی 'خاموش اکثریت' ہے۔

لندن میں ہزارہا لوگوں نے برطانوی وزیر اعظم کی رہائشگاہ ڈاؤننگ اسٹریٹ پر اسرائیلی دہشت گردی کے خلاف مظاہرہ کیا۔ اس کا اہتمام 'اسٹاپ دی وار کولیشن' نے کیا تھا۔ کولیشن کی آرگنائزر لنڈسے جرمن نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ امن کارواں پر اسرائیلی حملہ کے نتیجے میں ۹ بے گناہوں کی ہلاکت نے ساری دنیا کے سامنے غزہ کی ناکہ بندی اور اسرائیل کی وحشیانہ کارروائیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ مظاہرین نے سینٹرل لندن کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے

اسرائیلی سفارتخانے کے سامنے پرُ جوش احتجاج کیا۔ اسی طرح امریکی شہر لاس اینجلس میں سفید فام امریکیوں نے اسرائیلی حملے کے خلاف مظاہرہ کیا جس میں شامل خواتین اور مرد 'اسرائیل شرم کرو' جیسے پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے۔ ہمیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ اسرائیل کی ایک مشہور اور اپنی حکومت کے عتاب کا نشانہ بننے والی امن تنظیم 'گش شولوم' نے کاروان امن اور آزادی پر ہونے والے حملے سے ایک ہفتہ پہلے اس حملے کے امکان کا اندازہ لگاتے ہوئے اسرائیلی عوام کے نام ایک پیغام میں کہا تھا کہ: 'اسرائیلی ریاست کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں اگر اس کی بحریہ امن رضا کاروں پر سمندر میں حملہ کرے اور اس حملے کی فلم ساری دنیا کے ٹیلی ویژن اسکرینوں پر نظر آئے۔ وقت آ گیا ہے کہ غزہ کا یہ دم گھونٹ دینے والا محاصرہ ختم کیا جائے اور غزہ میں رہنے والوں کو باہر کی دنیا سے آزادانہ رابطہ کرنے دیا جائے۔ وہ بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں کا آزادانہ انتظام اسی طرح سنبھالیں جس طرح دنیا کے دوسرے ملکوں میں ہوتا ہے۔'

ہم ریشل کوری کو کیسے بھول سکتے ہیں جو امریکی شہری تھی اور امن رضا کار۔ ۲۰۰۳ء میں وہ فلسطینی مہاجر کیمپ پر اسرائیلی بلڈوزروں کے دھاوے کے وقت موجود تھی۔ وہ انسانی ڈھال کے طور پر ایک فلسطینی گھر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ ایک اسرائیلی بلڈوزر جو اس فلسطینی کے گھر کو گرانے کے لیے بڑھ رہا تھا، اس نے گھر کے سامنے سے کچی زمین سے مٹی کے ساتھ کوری کو بھی اٹھالیا اور لوگوں کی چیخ وپکار کے باوجود بلڈوزر چلانے والے نے کوری کو زمین پر گرا کر اسے ایک مرتبہ کچلا اور دوبارہ کوری کی ہڈیوں اور بدن کو کچل کر رزق خاک بنا دیا۔ ہم ریشل کوری یا ایسی ہی دوسری غیر مسلم عورتوں اور مردوں کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ ہم سابق برطانوی رکن پارلیمنٹ جارج گیلوے کو داد کیوں نہ دیں کہ وہ اس حملے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استنبول میں ایک ترک نوجوان کے جنازے میں شریک تھے اور امریکی خاتون فلم ساز لارالی اور اس کے کیمرہ مین کا ذکر تو رہا جاتا ہے جنہوں نے امن کارواں میں شامل نہتے لوگوں پر بنائی ہوئی اسرائیلی قتل وغارت کی فلم اقوام متحدہ کے حوالے کردی ہے تاکہ جھوٹ اور سچ کا دنیا کو علم ہوسکے۔

ہم یونان، فرانس، جرمنی اور یورپ کے شہروں میں سفید فام یورپیوں کے اسرائیل مخالف مظاہرے دیکھتے ہیں۔ ہم ٹیلی ویژن اسکرین پر ان یہودی ربیوں کو دیکھتے اور سنتے ہیں جو اپنی حکومت کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور فلسطینیوں کے لیے آزادی اور عزت سے جینے کا حق

طلب کرتے ہیں۔ ہمیں ان اسرائیلی سپاہیوں کو بھی یاد رکھنا چاہیے جنہوں نے نہتے فلسطینی شہریوں پر گولی چلانے سے انکار کیا، ملازمت سے برخاست ہوئے اور جیل بھیجے گئے۔ ہم مردکئی ونونو کو بھی نہیں بھول سکتے جس نے اسرائیلی نیوکلیائی پروگرام کا راز فاش کیا تھا، اس جرم میں وہ اغوا کر کے اسرائیل لایا گیا جہاں اس نے ۱۸؍برس سے زیادہ مدت کی قید تنہائی کاٹی۔

لنڈا گرانٹ نے درست لکھا ہے کہ جس طرح ۱۹۴۷ء میں تباہ حال یہودیوں کو لے کر آنے اور لوٹا دیا جانے والا بحری جہاز 'اکزاڈس' یہودیوں کے حق میں یورپی اور امریکی رائے عامہ پر اثر کر گیا تھا، اسی طرح ۲۰۱۰ء میں امن اور آزادی کے اس کارواں پر اسرائیل کا وحشیانہ حملہ بھی فلسطینیوں کے حق میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کا نقطۂ آغاز ثابت ہوسکتا ہے۔ اب یہ فلسطینیوں کے مسلمان ہمدردوں اور وکیلوں پر منحصر ہے کہ وہ اس المناک واقعہ کو صرف مسلم امہ کا غم یا اشتعال بنا کر پیش کرتے ہیں یا اسے پوری انسانیت اور انصاف پر حملہ قرار دیتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں نہ فلسطینی سمندر میں غرق کیے جاسکتے ہیں اور نہ اسرائیلی ریاست کو دنیا کے نقشے سے کھرچا جاسکتا ہے۔ ہم فلسطینیوں کو انسانی حقوق اور ایک ریاست دلانے کا کام اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہم دنیا کو یہ بتائیں کہ انسانوں پر صیہونی مظالم برداشت نہیں کیے جائیں گے۔

اسرائیلی ریاست کی درندگی پر نفرین کرتے ہوئے ہم یہ کیسے بھلا دیتے ہیں کہ فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم میں ہمارا بھی کچھ حصہ تھا۔ جنرل ضیاء الحق کی وردی پر نیلے رنگ کے ریشمی پٹکے میں جو 'ستارۂ اردن' آنکھوں کو خیرہ کرتا تھا، کیا وہ انہیں اردن میں پناہ لینے والے مظلوم فلسطینیوں کے سَتھراؤ کے انعام میں نہیں دیا گیا تھا؟ 'فلوٹیلا' پر حملے کے بعد ایہود اریان کا ایک مضمون اسرائیل، امریکا اور بعض دوسرے یورپی ملکوں میں شائع ہوا۔ جس میں ایہود اریان نے لکھا کہ:

> 'میں اسرائیل سے محبت کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود گزشتہ ہفتے غزہ کے سمندروں میں پیش آنے والا واقعہ انتہائی افسوسناک ہے جس میں اسرائیلی کمانڈوز نے امداد لانے والے بحری جہاز پر حملہ کیا اور ۹؍امدادی کارکنوں کو ہلاک کردیا۔ یہ واقعہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ میں بھی اسرائیلیوں کے اسی گروپ کا حصہ ہوں جو اس بات سے پریشان ہیں کہ ملک آخر کس طرف آگے بڑھ رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ فلسطینیوں کے ساتھ

تنازع ہمیں نہ صرف اخلاقی اقدار سے دور کر رہا ہے بلکہ ہمارے دیگر احساسات سے بھی دور کرتا جا رہا ہے۔ صورتحال واضح ہے۔ مختصر عرصے میں زیادہ لوگ مارے جا رہے ہیں اور ہمیں اس بات کی پرواہ ہی نہیں۔ اسرائیلی اعداد و شمار کے مطابق ۰۹-۲۰۰۸ء کے دوران کیے جانے والے غزہ محاصرے کے دوران ہمارے اور ان کے درمیان پیش آنے والے پُرتشدد واقعات میں فلسطینیوں کا جانی نقصان ۱۱۰۰ ر تک پہنچانے میں صرف ۲۲ دن کا وقت لگا۔ ۱۹۸۷ء سے ۹۳ء تک کے درمیان یعنی تقریباً پانچ سال کے دوران اسرائیل اور فلسطین کے درمیان ہونیوالے تصادم میں اتنی ہی تعداد میں لوگ مارے گئے تھے۔ یہ ۱۹۴۹ء کے بعد سب سے بڑا جانی نقصان تصور کیا جا رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے دل پتھر کے ہو چکے ہیں۔ پہلے انتفاضہ میں جب بھی اسرائیلی کارروائی میں فلسطینی مارے جاتے تو اسرائیلی ملٹری پولیس ایسے واقعات کی داخلی تحقیق کرتی تھی لیکن اس کے بعد گزشتہ ایک دہائی کے دوران چند ایک واقعات کی ہی تحقیقات ہوئی ہیں اور یہ بات طے ہے کہ گزشتہ ہفتے پیش آنے والے تازہ ترین واقعے کی تحقیقات ہونے کا امکان نہیں ہے۔'

• ۱۰ رجنوری ۲۰۱۱ء کو ایجنسی فرانس کی جاری کی ہوئی یہ خبر دنیا کے بہت سے اخباروں میں شائع ہوئی کہ مغربی کنارے پر اریل کے علاقے میں قائم یونیورسٹی میں اسرائیل کے ڈیڑھ سو سے زیادہ اساتذہ نے پڑھانے سے انکار کر دیا ہے اور ایک محضر نامے پر دستخط کیے ہیں۔ اس محضر نامے کے بارے میں اسرائیل کے ایک پبلک ریڈیو پر بات کرتے ہوئے وزمان انسٹیٹیوٹ آف سائنس سے وابستہ رون نعمان نے کہا کہ: 'ہم اریل کے علاقے میں کسی بھی قسم کی تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ یہ یونیورسٹی ایک ناجائز آبادی میں قائم ہے اور اس کا مقصد فلسطینیوں کو ان کی آزاد اور خودمختار ریاست کے قیام سے باز رکھنا ہے۔ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھی اس بات کا ادراک کریں کہ قبضے کو جاری رکھنا اسرائیل کو نقصان پہنچاتا ہے اور عالمی برادری کی نظر میں اس کی قانونی حیثیت کو معرضِ بحث میں لاتا ہے۔'

اس محضرنامے پر ۱۵۵/اساتذہ کے دستخط موجود ہیں۔ ایریل یونیورسٹی سینٹر آف سامریہ ایک ایسی آبادی میں قائم ہے جس پر اسرائیل نے ناجائز قبضہ کیا۔ یہاں ۸۰۰۰ لوگ آباد ہیں۔ یہ فلسطینی شہر نابلس کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔

ایک اسرائیل یہ بھی ہے۔ آج اس اسرائیل کی آواز کمزور ہے۔ لیکن کل۔؟ وہ کل ضرور آئے گی جب اسرائیل کی خاموش اکثریت اپنے صہیونی حکمرانوں کی خلاف آواز بلند کرے گی۔

روٹی یا بندوق

۱۱رمئی ۱۹۹۸ء کا دن جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ایک الم ناک دن کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔اس دن ہندوستان نے پوکھران میں ایٹمی دھماکے کیے جس کے جواب میں پاکستان کی طرف سے چاغی میں ایٹمی دھماکے کیے گئے۔اس طرح جنوبی ایشیا میں ایٹمی ہتھیاروں کی اس دوڑ کا آغاز ہوا جس کا انجام نہ جانے کیا ہو۔یہ بات شاید سب کے علم میں نہ ہو کہ جنوبی ایشیا کا شمار دنیا کے غریب ترین خطوں میں ہوتا ہے جس کے دو بڑے ملک ہندوستان اور پاکستان ہیں۔اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات اور کیا ہوگی کہ ان دونوں ملکوں کے محدود وسائل کو سوا ارب سے زیادہ انسانوں کی حالت زار کو بہتر بنانے کی بجائے محاذ آرائی اور اسلحے کی دوڑ پر خرچ کیا جا رہا ہے۔میں جب بھی اس موضوع پر قلم اٹھاتی ہوں مجھے بے ساختہ ڈاکٹر محبوب الحق یاد آ جاتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی تحریریں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ڈاکٹر محبوب الحق اس نظریے کے زبردست حامی تھے کہ وسائل کو جنگ کا ایندھن بنانے کی بجائے انسانی ترقی پر خرچ کرنا چاہیے۔انہوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان اور پاکستان کو باہمی کشیدگی ختم کر دینی چاہیے اور اسلحے کی دوڑ میں اپنے قیمتی وسائل کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ڈاکٹر محبوب الحق کا کہنا تھا کہ دونوں ملکوں کی حکومتیں اپنے عوام کی اندوہ ناک غربت سے بے نیاز ہو کر ہر سال اپنے دفاعی اخراجات پر ۲۰رارب ڈالر لٹا رہی ہیں۔سعودی عرب، پاکستان اور ہندوستان سے ۲۵ گنا زیادہ امیر ملک ہے مگر سعودی عرب ہر سال ان دونوں کنگال ملکوں سے آدھی رقم دفاع پر خرچ کرتا ہے۔یاد رہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں فوجیوں کی تعداد ڈاکٹروں سے چھ گنا زیادہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے کہ پاکستان اور

ہندوستان کی حکومتیں جنگی ساز وسامان کی خریداری اور فوج پر بے تحاشا وسائل ضائع کرنے کے بعد بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے بھیک کا تقاضہ کرتی ہیں اور اس ضمن میں قرض حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے ذلت آمیز اور نقصان دہ معاہدے کرنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر محبوب الحق بعض دانشوروں کی اس دلیل کو بھی مسترد کرتے تھے کہ جنوبی ایشیا میں جنگ روکنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان دہشت اور خوف کا توازن موجود ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ اس توازن کی بھی آخر کوئی حد تو مقرر کرنی ہوگی۔ اگر کسی ملک کے غریب عوام فٹ پاتھ پر راتیں بسر کر رہے ہوں تو اس کی فوجوں کو جدید ترین جہازوں اور توپیں خریدنے کا حق نہیں پہنچتا۔ عام شہریوں کے بچے اسکول کی ٹوٹی پھوٹی عمارتوں میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں اور سرکاری افسران ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ کوئی قوم جس قدر چاہے ہتھیاروں کے انبار لگا لے اگر اس کے عام شہریوں کی غربت ختم نہیں ہوتی تو وہ قوم ہمیشہ کمزور ہی رہے گی۔

ایک بڑے ماہر معاشیات ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر محبوب الحق یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ جنوبی ایشیا کے غریب ملک غربت، پس ماندگی اور جہالت کی دلدل سے کس طرح باہر نکل سکتے ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے اعداد وشمار کے ذریعے بعض تلخ حقائق کو اجاگر کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ آج کل تمام پس ماندہ ممالک کو جنوبی کوریا بننے کا شوق ہو رہا ہے لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جنوبی کوریا ہر سال اپنی آبادی کے ہر فرد کی بنیادی تعلیم پر تقریباً ۱۳۰ ر ڈالر خرچ کرتا ہے جبکہ ملائیشیا تعلیم پر سالانہ ۱۲۸ ر ڈالر فی کس خرچ کر رہا ہے اور اگر اس کا موازنہ جنوبی ایشیا کے ممالک سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اپنی آبادی کے ہر فرد کی بنیادی تعلیم پر سالانہ ۹ ر ڈالر، پاکستان ۳ ر ڈالر اور بنگلہ دیش ۲ ر ڈالر فی کس کے حساب سے خرچ کر رہے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان جنوبی ایشیا کے پس ماندہ ممالک کی صف اول میں شامل ہیں جبکہ ترقی پذیر دنیا کے دوسرے کئی ملک تیزی سے ترقی کے سفر پر گامزن ہیں۔ حتیٰ کہ سب صحارا کے پس ماندہ افریقی ممالک بھی بعض شعبوں میں جنوبی ایشیا سے آگے نکل گئے ہیں۔ ان افریقی ممالک میں خواندہ افراد کی تعداد ۵۵ فی صد ہے جبکہ جنوبی ایشیا میں مجموعی شرح خواندگی ۴۷ فی صد ہے۔ جنوبی ایشیا کے ۸۰ کروڑ باشندے صحت وصفائی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ جنوبی ایشیا میں ۳۸ کروڑ افراد ناخواندہ ہیں اور ۳۰ کروڑ انسان نل کی بجائے جوہڑ کا پانی پینے پر مجبور ہیں۔ جنوبی

ایشیا میں سماجی محرومی اور انسانی مایوسی کی صورت حال نا قابل یقین حد تک ابتر ہے۔

۱۹۸۷ء میں دنیا میں جنگی اخراجات پر ۱۰۰۰ ارب بلین ڈالر سالانہ صرف ہو رہے تھے، اب یہ رقم کم ہو کر ۷۵۰ بلین ڈالر سالانہ رہ گئی ہے۔ اس طرح عالمی سطح پر دفاعی اخراجات میں سالانہ تقریباً ۲۸ بلین ڈالر کی کمی واقع ہوئی ہے۔ اس دوران دنیا کے صرف دو خطے ایسے تھے جہاں دفاعی اخراجات پہلے سے بھی بڑھ گئے اور دونوں کا شمار دنیا کے پس ماندہ ترین خطوں میں ہوتا ہے یعنی جنوبی ایشیا اور صحارا کے افریقی ممالک۔ ان دو 'دانش مند' علاقوں کے علاوہ لاطینی امریکا سے لے کر مشرق وسطیٰ تک تمام ممالک نے اپنے دفاعی اخراجات کم کر کے عوام کی بہبود پر اخراجات میں اضافہ کیا ہے۔ یہ حقائق عام طور پر معلوم نہیں ہیں چنانچہ ان پر زور و شور سے بات کرنے کی ضرورت ہے تاکہ جنوبی ایشیا کے منصوبہ سازوں کو بھی شرمندہ کیا جا سکے کہ وہ اس طرف توجہ دیں۔

ہندوستان جنوبی ایشیا میں سپر پاور بننے کا خواب دیکھ رہا ہے لیکن اگر ہندوستان میں غربت کا گمبھیر مسئلہ اسی طرح موجود رہا تو یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کے منصوبہ سازوں کو چین کی معاشی پالیسیوں کا جائزہ لینا ہوگا جن کے نتیجے میں اس کی سالانہ شرح ترقی ۱۲ فی صد تک جا پہنچی ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بارے میں یہ نتیجہ نکالنا محض سادہ لوحی ہوگی کہ سرمایہ داری کو اشتراکیت پر فتح حاصل ہوئی۔ اس صورت حال کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مضبوط معاشی نظام کی پشت پناہی کے بغیر کوئی سیاسی نظام زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ سوویت یونین اس لیے ٹوٹا کہ اشتراکی حکمران عوام کو روٹی فراہم کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ معاشی بدحالی اور غربت کی موجودگی میں روس کے ٹینک، ایٹمی آبدوزیں اور کے جی بی کے ایجنٹ سب بیکار تھے۔

آج دنیا میں سب سے زیادہ غریب ہندوستان میں بستے ہیں، ایسے میں ہندوستانی حکومتیں اگر یہ سمجھتی ہیں کہ وہ عوام کو سماجی انصاف فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دفاعی بجٹ کا حجم نہ صرف برقرار رکھ سکتی ہیں بلکہ اس میں اضافہ بھی کر سکتی ہیں تو پھر ہندوستان کو واقعی حق پہنچتا ہے کہ وہ علاقائی سپر پاور بن جائے۔ تاہم یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ ہندوستان ایسا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا چنانچہ ہندوستان کی حکومت کو سوچنا ہوگا کہ وہ روٹی اور بندوق میں سے کس کا انتخاب کرے۔

پندرہ سال قبل ۱۹۸۰ء میں عراق میں دفاعی اخراجات اور شہری سہولتوں پر خرچ کی جانے

والی رقم میں فرق دنیا میں سب سے زیادہ تھا یعنی ترقیاتی شعبوں پر اخراجات سے ۸ گنا زیادہ دفاع پر خرچ ہو رہا تھا۔ صومالیہ میں یہ تناسب ۵:۱ رتھا اور نکارا گوا میں ۳۵:۱۔ اس کے باوجود جنگ کا حقیقی چیلنج سامنے آنے پر ان میں سے کوئی ملک بھی اپنی قومی سلامتی کا تحفظ نہ کر سکا۔ اس کے برعکس کوسٹاریکا نے اپنی فوج ۱۹۴۸ء میں ختم کر دی اور اب وہ اپنے ملک کی آمدنی کا ایک تہائی حصہ تعلیم، صحت اور خوراک پر خرچ کر رہا ہے۔ آج کے دور میں وسطی امریکا کے بحرانی خطے میں کوسٹاریکا واحد خوشحال جمہوری ملک ہے۔

ڈاکٹر محبوب الحق ایک سچے پاکستانی اور دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے جنوبی ایشیا کے غریب عوام کی حالت زار کو بہتر بنانے کے لیے اپنے قلم سے زبردست جہاد کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا اصرار تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو سیاسی عزم کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تعلقات کو معمول پر لانا چاہیے۔ اس ضمن میں ان کا کہنا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کو آگے بڑھ کر اس خطے کو مایوسی، غربت اور محرومی کی دلدل سے نکالنا چاہیے۔ اس ضمن میں سارک کی تنظیم ایک اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ سارک ممالک کو ایک معاہدے کے ذریعے فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ملک اپنے دفاعی بجٹ میں سالانہ ۵ فی صد کمی کر کے یہ رقم اپنے ملک کی تعلیم اور صحت کے شعبے میں خرچ کرے گا۔

'ٹائمنر آف انڈیا' میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں ڈاکٹر محبوب الحق نے لکھا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں ایک دن میں سیاچن کی برف پوش چوٹیوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ایک ملین ڈالر خرچ کرتی ہیں۔ ان بے مقصد اخراجات کا فائدہ؟ کیوں نہ دونوں ملک اپنی اپنی فوج برف پوش چوٹی سے چند میل نیچے بلا لیں اور اس مسئلے کے حل کے لیے میز پر بیٹھ جائیں تب ہی کچھ رقم بچائی جا سکے۔ پاکستان اور ہندوستان کو یہ بھی چاہیے کہ اقوام متحدہ جیسے اداروں میں اپنی ایٹمی ترقی کے بلند بانگ دعوے کرنے کی بجائے اپنے ایٹمی پروگرام پر نظر ثانی کریں تاکہ یہ رقم عوام کی بھلائی کے کاموں پر خرچ کی جا سکے گی۔

دونوں ملکوں کے موجودہ سیاسی نظام میں شاید ان تجاویز پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کی زیادہ گنجائش موجود نہیں کیونکہ ایسی تجاویز قبول کرنے کے لیے عقل اور تدبر جیسی خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں عوام کو قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیے اور امن کی پرزور وکالت کے ساتھ

روز بروز طاقتور ہوتے سرحدوں سے ماورا ذرائع ابلاغ کی مدد سے اس نقطہ نظر کو آگے بڑھانا چاہیے۔ دونوں طرف کے لکھنے والوں کو اپنے عوام سے یہ کہنا چاہیے کہ ہچکچاہٹ میں مبتلا ان سیاستدانوں کو ایک طرف چھوڑ کر عوام کو خود آگے بڑھنا پڑے گا کیونکہ حکمران اور سیاستدان شاید سماجی انصاف کے لیے کبھی اپنی شہرت اور زندگیاں خطرے میں ڈالنا پسند نہیں کریں گے۔

یقینی طور پر دونوں ملکوں کے انتظامی ڈھانچے میں ایسے عناصر کی کمی نہیں جن کا مفاد موجودہ صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھنے میں مضمر ہے۔ عام لوگ دفاعی اخراجات پر اعتراض کرنے سے اس لیے گھبراتے ہیں کہ اس بارے میں ساری بحث کو قومی سلامتی کے بنیادی سوالات سے خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ بہت کم شہری اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہمیں جدید ترین ہتھیاروں کے لیے شہری سہولتوں اور سماجی مواقع کی صورت میں کتنی زیادہ قیمت چکانا پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ اس صورت حال کو تبدیل کرنا ممکن نہیں؟

آج برصغیر کے علاوہ دنیا بھر میں ہر جگہ لوگ تبدیلیوں کی قیادت کر رہے ہیں اور آج کے دور میں خیالات کی برق رفتار ترسیل کے باعث تبدیلیوں کی رفتار بھی کہیں بڑھ گئی ہے۔ تاہم کسی بھی سماج میں کوئی تبدیلی معلومات کے پھیلاؤ کے بغیر ممکن نہیں۔ دانشوروں کا یہ فرض ہے کہ وہ عوام میں صحیح شعور پیدا کریں جسے صحافیوں اور انسانی حقوق کے کارکنوں کی مدد سے پھیلایا جا سکے۔

۱۱؍ اور ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو ایٹمی دھماکے کر کے جنوبی ایشیا کے دونوں غریب اور پس ماندہ ملک ایٹمی طاقت بن چکے ہیں۔ آج ڈاکٹر محبوب الحق کے خدشات حرف بہ حرف درست ثابت ہو رہے ہیں۔ وقت نے ثابت کیا ہے کہ ان تجربات کے بعد دونوں ملک خود کو پہلے سے زیادہ غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔ ایٹمی طاقت بننے کے بعد جنگ کا خطرہ کم ہونے کی بجائے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اگر دونوں جانب کی حکومتوں کی طرف سے دانش مندی کا ثبوت نہ دیا گیا تو جنوبی ایشیا ایٹمی جنگ کا ایندھن بنے نہ بنے یہاں کے لوگ مسلسل غربت اور جہالت کے جہنم کا ایندھن بنتے رہیں گے۔

'اردو نیوز'، جدّہ

۱۶؍ مئی ۲۰۰۰ء

اب تو جرنیل بھی کہہ رہے ہیں

اگست کی ابتدائی تاریخوں میں یہ بات کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ ۱۴راگست کے اخبارات جشنِ آزادی کی مبارکبادوں کے ساتھ ساتھ حمود الرحمٰن کمیشن کی مختصر رپورٹ کی تفصیلات سے بھرے ہوئے ہوں گے۔ ایک انگریزی معاصر نے تو اسی روز ہندوستان سے جاری ہونے والی یہ رپورٹ ایک ضمیمے کی صورت میں شائع کی۔ اس رپورٹ کی اشاعت نے پوری قوم کو دو حصوں میں تقسیم کردیا، پاکستانیوں کا ایک حلقہ اس مکمل رپورٹ کی اشاعت کا خواہاں ہے اور سقوطِ ڈھاکہ کے ذمہ دار جرنیلوں کو سخت ترین سزائیں دینے کا مطالبہ کررہا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اگر اس قومی سانحے کے ذمہ دار بعض جرنیل دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب فوجیوں کو بعد از مرگ اعزازات دیے جاسکتے ہیں تو ان کی نااہلی، مجرمانہ غفلت اور اپنے ہی وطن کے ایک حصے کو 'مفتوحہ علاقہ' سمجھنے اور اپنے ہم وطنوں کو 'دشمن' سمجھ کر روندنے کے رویے کی بعد از مرگ سزا کیوں نہیں سنائی جاسکتی۔ دوسرا نقطۂ نظر رکھنے والا حلقہ اسے ہندوستان کی 'سازش' قرار دیتا ہے، اور اس رپورٹ کو 'فرضی' اور 'من گھڑت' بتاتا ہے۔

پاکستان آج جس سیاسی اور سماجی بحران سے دوچار ہے اس کے اسباب پر اس رپورٹ میں بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ توازن، فطرت کا ایک اٹل قانون ہے۔ جب توازن ٹوٹتا ہے تو نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ اس کلیے کا اطلاق کائنات کی ہر شے پر ہوتا ہے۔ قدرتی آفات ہوں یا سماجی بحران، یہ سب اس وقت رونما ہوتے ہیں جب توازن برقرار رکھنے والے عناصر میں کہیں کوئی بے ترتیبی پیدا ہوتی ہے یا پیدا کردی جاتی ہے۔ تاریخ عظیم تہذیبوں کے عروج وزوال کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ وجوہ تلاش کیجیے تو یہی معلوم ہوگا کہ جب تک

ارتقاء کے عمل میں توازن قائم رہا تہذیبیں اور قومیں ترقی کرتی رہیں اور توازن کے بگڑتے ہی سب کچھ نیست ونابود ہوگیا۔ توازن کے اس اصول کا اطلاق انفرادی طور پر ہر معاشرے اور ملک پر ہوتا ہے۔ وہ ملک جو توازن کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہتے ہیں وہاں بڑے بحران پیدا نہیں ہوتے۔ جبکہ ان اصولوں سے انحراف کرنے والے ملک مسلسل بحران کی حالت میں رہتے ہیں اور اس کی بھاری قیمت ادا کرتے ہیں۔ آج پاکستان اپنی تاریخ کے نازک موڑ پر کھڑا ہے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کا توازن ایک مرتبہ پھر ٹوٹ چکا ہے جسے اگر فوری طور پر بحال نہ کیا گیا تو ملک جس بحران میں مبتلا ہے وہ نہایت سنگین ہوجائے گا اس کے مضمرات کو لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔

اس سے قبل کہ یہ بحران شدید ہوجائے اور خدانخواستہ تاریخ خود کو دہرانے لگے بہتر یہی ہوگا کہ بعض حقائق پر کھل کر گفتگو کرلی جائے۔ اس حقیقت کا کھل کر اعتراف کرنا چاہیے کہ آئین کسی بھی ملک میں توازن کو برقرار رکھنے والی ایک بنیادی دستاویز ہوتی ہے۔ آئین فرد واحد یا چند افراد نہیں بناتے بلکہ اس کی تیاری ایک دستور ساز اسمبلی کرتی ہے۔ اس اسمبلی کے ارکان کو فرد واحد نامزد نہیں کرتا بلکہ ان کا انتخاب براہ راست عوام کرتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی ملک کا آئین اس ملک کے عوام کے جذبات اور مفادات کا ترجمان ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ عوام کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے وہ مکمل طور پر خودمختار ہوتی ہے، وہ آئین کے دائرہ کار میں عمل کرتی ہے اور اسے ریاست کے ماتحت اداروں پر بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ کی اکثریت اپنا قائد منتخب کرتی ہے جو حکومت کا سربراہ ہوتا ہے اور ماتحت اداروں کے سربراہ اس کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ وزیراعظم کو صرف پارلیمنٹ برطرف کرسکتی ہے یا وہ آئین کے مطابق مستعفی ہوکر دوبارہ عوام سے رجوع کرسکتا ہے۔ بصورت دیگر معینہ مدت پر انتخابات ہوتے ہیں اور سیاسی نظام کا تسلسل اور توازن برقرار رہتا ہے۔ ہمارے ملک کا المیہ یہ ہے کہ بعض فوجی جرنیلوں نے اس توازن کو بار بار توڑا جس کے نتیجے میں ملک دولخت ہوا لیکن اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا گیا، اس غلطی کو بار بار دہرایا گیا اور ہر مرتبہ اس تباہ کن اقدام کو جائز اور ناگزیر قرار دیا گیا۔ کسی بھی ملک کا سب سے بڑا المیہ اور سانحہ اس کا ٹوٹ جانا ہوا کرتا ہے۔ پاکستان میں یہ سانحہ ۱۹۷۱ء میں پیش آیا، یہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کا منطقی نتیجہ تھا۔ اگر ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت ۱۹۵۸ء میں ہونے والے انتخابات

کا راستہ روک کر سیاسی عمل کے توازن کو درہم برہم نہ کیا جاتا تو آج ہم باقی ماندہ نہیں بلکہ متحدہ پاکستان کے شہری ہوتے۔ ملک ٹوٹنے کا سانحہ جب رونما ہوا اس وقت ملک پر جنرل یحییٰ خان کا قبضہ تھا۔ ۹۰/ ہزار فوجیوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دینے والے بھی پاکستان کے نامی گرامی فوجی جرنیل تھے۔ اس سانحے کی تحقیقات کرنے کے لیے حمود الرحمٰن کمیشن قائم کیا گیا جس نے اپنی رپورٹ مکمل کی اور اس سانحے کے ذمہ دار جرنیلوں کا کورٹ مارشل کرنے کی سفارش کی۔ لیکن یہ رپورٹ کبھی عوام کے سامنے پیش نہیں کی گئی۔ اب جبکہ ہندوستان کے ایک جریدے کے ذریعے اس رپورٹ کا ایک حصہ ہمارے سامنے آیا ہے تو اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فوج نے ۱۹۵۸ء میں اگر اقتدار پر قبضہ نہ کیا ہوتا تو یہ الم ناک صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ قومی اخبارات میں حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ پر بحث جاری ہے اور بڑی حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ اب بعض سابقہ فوجی جرنل اور ایئر مارشل حضرات بھی وہی موقف اختیار کر رہے ہیں جس موقف کو بیان کرنے کے الزام میں مجھ جیسے بہت سے دوسرے لوگوں کے حب وطن پر شبہ کیا جاتا تھا اور 'غدار' کے القاب سے نوازا جاتا تھا۔

فضائیہ کے سابق سربراہ ایئر مارشل اصغر خان کا کہنا ہے کہ فوج اپنی غلطیاں تسلیم کرے اور اپنے جسم کے اندر سے فاسد مادے کو صاف کرے۔ اصغر خان کہتے ہیں کہ 'آپ ہمیشہ جھوٹ پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ آپ آج یہ موقف اختیار کر کے کہ کوئی جرنیل کرپٹ نہیں تھا یا اس نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی، اپنی اخلاقی حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ آپ کو اپنے اندر صفائی کرنی ہوگی تا کہ آپ کی اخلاقی طاقت برقرار رہے بہ صورت دیگر آپ کی حیثیت کرائے کی فوج جیسی ہو جائے گی۔'

ریٹائرڈ ایئر مارشل نور خان نے مطالبہ کیا ہے کہ حمود الرحمٰن رپورٹ کو عوام کے سامنے پیش کیا جائے اور ایک غیر جانبدار کمیشن بنا کر فوج سے تعلق رکھنے والے تمام ذمہ دار افراد کو خواہ وہ زندہ ہوں یا مر چکے ہوں سزائیں دی جائیں۔ نور خان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ، اوجڑی کیمپ کی تباہی اور کارگل کی جنگ ایسے تمام معاملات کو کمیشن کے دائرہ کار میں شامل کیا جائے تا کہ اصل حقائق سامنے آسکیں۔

سابق وزیر داخلہ میجر جنرل نصیر اللہ بابر یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں جن افراد کو ۱۹۷۱ء کے سانحے کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے ان کا کورٹ مارشل کیا جائے تا کہ فوج

کے ادارے کا وقار بحال ہو سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے ہندوستان میں جو رپورٹ تیار کی گئی تھی اس کے نتیجے میں جنرل چوہدری کو برطرف کر دیا گیا تھا۔ میجر جنرل بابر کا کہنا ہے کہ جو اعلیٰ افراد ۱۹۷۱ء کے سانحے کے ذمہ دار تھے ان کے خلاف کارروائی کرنے کی بجائے ضیاءالحق دور میں انہیں ترقیاں دی گئیں۔ ایئر مارشل اصغر خان نے بھی لیاقت علی خان کے قتل سے لے کر اوجڑی کیمپ کی تباہی تک رونما ہونے والے تمام واقعات کی تحقیقاتی رپورٹوں کو عوام کے سامنے پیش کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

ان دنوں صرف (ر) ایئر مارشل نور خان، میجر جنرل (ر) نصیراللہ بابر اور ایئر مارشل (ر) اصغر خان ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی کئی فوجی جرنیل اس بات کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ تمام فوجی آمروں اور ان کے ساتھیوں کا کھلا اور شفاف احتساب ہونا چاہیے تاکہ محض چند جرنیلوں نے فوج کے ادارے کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا ازالہ کیا جا سکے۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ آج بعض ریٹائرڈ فوجی جرنیل بھی تاریخ کے حقائق کو تسلیم کرنے پر تیار ہو چکے ہیں۔ اب وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ فوجی آمروں کے مختلف ادوار میں ملک کی سلامتی کو نقصان پہنچا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں رن کچھ ہاتھ سے گیا۔ ۱۹۷۱ء میں آدھا ملک گنوایا گیا اور ۱۹۸۵ء میں سیاچن نکل گیا۔ یہ تمام حادثات اور سانحات منتخب جمہوری حکومتوں کے دور میں نہیں بلکہ مختلف فوجی حکومتوں کے زمانوں میں رونما ہوئے۔

میں اپنی بات ختم کرتے ہوئے یہی کہوں گی کہ سیاسی اور سماجی نظام کے توازن کو اگر درہم برہم کر دیا جائے تو ملک اور قومیں بحران اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ہمارا بھی یہی المیہ ہے۔ فوج ریاست کا ایک ماتحت ادارہ ہے۔ اس کا کوئی بھی سربراہ جب آئین، پارلیمنٹ اور جمہوریت کی نفی کرتے ہوئے اقتدار پر قبضہ کرتا ہے تو سیاسی اور سماجی توازن بکھر جاتا ہے۔ ہر طرف غیر یقینی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ فوج کا ادارہ اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کو چھوڑ کر غیر ضروری مسائل میں الجھ جاتا ہے۔ ملک میں وہ استحکام کو قائم کرنے کا دعویدار ہوتا ہے جبکہ وہی 'استحکام' ملک میں انتشار اور نراج کا سبب بن جاتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان اسی لیے دولخت ہوا کہ اقتدار پر ایک مدت سے فوج کا غاصبانہ قبضہ تھا، اس قبضے کو طویل تر کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے ایک غیر ملکی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

پے در پے اتنے سانحات اور تجربات سے گزرنے کے باوجود ہم نے اگر اب بھی ایک غیر فطری اور غیر متوازن صورتحال کو برقرار رکھنے پر اصرار کیا تو اس کے نتائج ماضی سے مختلف کیسے ہو سکتے ہیں؟

اس سوال پر ہمیں بار بار غور کرنا ہوگا!!

روز نامہ 'جنگ'، کراچی
۳۱ر اگست ۲۰۰۰ء

تاریخ کیا واقعی دفن کی جاسکتی ہے؟

پاکستان میں اور تیسری دنیا کے بیشتر ملکوں میں حکمرانِ وقت کی کہی ہوئی بات سکۂ رائج الوقت ہوتی ہے چنانچہ ان دنوں پاکستان میں اگر یہ بحث زور شور سے ہو رہی ہے کہ آخر ہم تاریخ کو دفن کیوں نہیں کر دیتے تو اس پر حیران نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تاریخ کو دفن کرنے کی بات حاکمِ وقت نے کی ہے۔

بیسویں صدی میں تاریخ کی سینکڑوں نہیں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں لیکن عالمی شہرت ان میں سے چند کو حاصل ہوئی۔ ان میں سے ایک جرمنی کے اوسوالڈ اشپنگلر کی The Decline of West 'زوالِ مغرب' ہے۔ یہ کتاب ضخیم ہے لیکن اس کے بعد شائع ہونے والی دو کتابوں نے اس کی ضخامت کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ برطانیہ کے ایک عالم و فاضل فرد آرنلڈ ٹوائن بی نے A Study of History 'مطالعہ تاریخ'، ۱۰ رجلدوں میں لکھی اور اس کے بعد امریکی نژاد ول دیوراں اور بیگم ایریئل دیوراں نے ۱۱ جلدوں میں The Story of Civilization 'تمدن کی کہانی' تحریر کی۔ ان میں سے اشپنگلر اور ٹوائن بی کی کتابیں خواص کے لیے ہیں جبکہ دیوراں نے اپنا کلام عوام سے رکھا چنانچہ دلکش و دل آویز زبان میں تاریخ وتہذیب کا ایک سمندر ہے جس کی شناوری کیجیے اور یہ کہیے کہ میں نے یہ جانا کہ کچھ نہیں جانا۔ یہ جانیے کہ کیسے کیسے لوگ تھے جو مٹ گئے مگر جن کی تاریخ مٹائی نہ جاسکی۔

عہد نامہ قدیم پڑھ جایئے تو ابتدا سے آخر تک تاریخ کا قصہ ہے لیکن بہ طور خاص 'پیدائش'، 'گنتی'، 'سلاطین' اور 'تواریخ' کے ابواب میں گم شدہ قبیلوں اور قوموں کی تاریخ ہمیں اپنا چہرہ دکھاتی ہے۔ ان غلطیوں کی نشاندہی کرتی ہے جو بعض قوموں سے ہوئیں اور جس کے نتیجے میں وہ نابود

ہوئیں۔

عہد نامہ قدیم کا ایک صحیفہ جو دنیا کے کلاسیکی ادب میں شمار کیا جاتا ہے وہ 'نوحہ' ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے یرمیاہ نبی نے دربدری کے دوران لکھا۔ اور اسی عہد نامہ قدیم کا ایک صحیفہ 'زبور' ہے جس میں 'اسیروں کا نوحہ' By the River of Babylone ہے۔ اسیروں کا یہ نوحہ 'ہم بابل کی ندیوں پر بیٹھے اور صیہون کو یاد کر کے روئے' ۱۹۷۰ء کی دہائی میں بونی ایم نے گایا تو وہ دنیا کے کونے کونے میں پھیل گیا۔ یہ وہی نوحہ ہے جسے یہودیوں نے اتنی مرتبہ دہرایا کہ ڈھائی ہزار برس بعد وہ صیہون کی سرزمین پر اپنی ایک مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ہمارے حاکم وقت نے کہا ہے کہ سقوط ڈھاکہ کی تاریخ کو بھلا دینا چاہیے، یرمیاہ نبی نے سقوط یروشلم پر نوحہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

صیہون میں عورتوں کو
اور یہودا کے شہروں میں کنواریوں کو بے حرمت کیا گیا۔
سردار اپنے ہاتھوں سے لٹکائے گئے۔
بزرگوں کے چہرے کا لحاظ نہیں کیا گیا۔
نوجوانوں نے چکی کا پاٹ اٹھایا۔
اور لڑکوں نے ایندھن کے نیچے ٹھوکر کھائی۔
ہمارا رقص، ماتم سے بدل گیا ہے۔

یروشلم کے سقوط، اس کی تباہی، اسرائیلیوں کی اسیری اور ان کی دربدری کو ان کے دانشور اگر 'بھلا دی جانے والی ذلت' قرار دے کر اپنے لوگوں کو یہ نکتہ تعلیم کرتے کہ شکست کے معاملات کا بھلا دیا جانا ہی بہتر ہے تو آج یہودی تاریخ کا ایک گم شدہ ورق ہوتے۔

ماضی قریب میں جائیں تو دیکھتے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم کے شکست خوردہ جرمنی نے صلح نامہ ورسائی کی ذلت آمیز شرائط کو اگر 'تاریخ کا حصہ' قرار دے کر فراموش کر دیا ہوتا تو کیا صرف بیس برس کے اندر وہ پھر ایک عظیم عسکری قوت بن کر ابھر سکتا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے آغاز کی جرأت کر سکتا تھا؟ جرمن قوم نے اپنی قوت، اپنی بدترین شکست سے کشید کی تھی۔

اس طرح ہم دوسری جنگ عظیم میں جاپان کی الم ناک شکست کو دیکھتے ہیں۔ جاپانیوں نے

اگر 'تاریخ کو بھلانے' کا رویہ اختیار کیا ہوتا اور اپنی شکست کو 'تاریخ کا حصہ' سمجھ کر اپنے روزمرہ معمولات میں مصروف ہو جاتے تو آج وہ دنیا کی اہم ترین صنعتی اور اقتصادی قوت نہ ہوتے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں سامنے آنے والا ایک امریکی دانشور پال کینیڈی اپنی کتاب The Rise and the Fall of Great Powers 'عظیم طاقتوں کا عروج زوال' میں جب اختتامیہ لکھنے بیٹھتا ہے تو اول تو یہ بات ہمارے سامنے رکھتا ہے کہ صرف ماضی بعید ہی نہیں ماضی قریب بھی تاریخ کا درجہ رکھتا ہے۔ دوسری بات وہ یہ کہتا ہے کہ مستقبل کو جاننے، سمجھنے اور اس کے بارے میں اندازے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ماضی پر نظر ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ گزشتہ پانچ صدیوں میں بڑی طاقتیں کس طرح عروج وزوال سے آشنا ہوئیں۔

اگر ہم تاریخ سے سیکھنے کا رویہ رکھتے تو ہمیں یاد رہتا کہ ہندی اور صرف ہندی پر اصرار نے برصغیر کو تقسیم کرانے میں ایک بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اگر ہم یہ بات ذہن میں رکھتے تو ۱۹۴۸ء اور پھر ۱۹۵۲ء میں پاکستان میں کبھی بھی اردو اور صرف اردو کو قومی زبان قرار دینے پر اصرار نہ کرتے۔ بنگلہ کو اس کا جائز حق دیتے اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان لسانی نفرتوں کی بارود نہ بچھتی۔

اگر ہم نے تاریخ کے اس پہلو کو یاد رکھا ہوتا کہ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۲ء میں اردو اور صرف اردو کو قومی زبان بنانے کا نعرہ لگا کر ہم نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کیسی نفرتیں بوئی تھیں تو اردو سندھی کے مسئلے پر دونوں طرف سے انتہا پسندانہ رویہ اختیار نہ کیا جاتا اور سندھ میں ۱۹۷۲ء کے وہ لسانی فسادات رونما نہ ہوتے جنہوں نے سندھی اور اردو بولنے والوں کی طاقت کو تقسیم کر دیا اور جس کے نتیجے میں ۲۸ برس کے دوران کسی جمہوری جدوجہد کا ہراول دستہ بننے کی بجائے سندھی اور اردو بولنے والے دست وگریباں رہے اور سندھ لہولہان ہوا۔

ہم نے اگر تاریخ کو دفن کر دینے کا رویہ اختیار نہ کیا ہوتا تو ہم ۲۴ راکتوبر ۱۹۵۳ء کو پاکستان کی پہلی قانون ساز اسمبلی کی تحلیل اور اس کے نتائج کو یاد رکھتے اور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۹۹ء تک طالع آزماؤں کے ہاتھوں اسمبلیوں کی تذلیل اور تحلیل کا تماشا نہ دیکھتے اور پاکستان وہاں نہ پہنچتا جہاں پہنچ چکا ہے۔

اگر ہمارے منتخب حکمرانوں نے تاریخ کو بھلانے کا رویہ اختیار نہ کیا ہوتا تو انہیں یاد رہتا کہ ایک بیوروکریٹ غلام محمد نے پاکستان کی گاڑی جمہوریت کی پٹڑی سے اتار دی تھی، اس افسوس

ناک تجربے کے بعد بھی انہوں نے بیوروکریسی کو چھوٹ دی اور اتنی چھوٹ دی کہ ایک پٹواری صدر مملکت کے عہدے تک جا پہنچا۔ ہمارے منتخب حکمرانوں کو یاد رکھنا چاہیے تھا کہ یہ سول اور ملٹری بیوروکریسی کا اتحاد تھا جس کی بناء پر ۲۴/اکتوبر ۱۹۵۳ء کو ایک بیوروکریٹ گورنر جنرل نے ملک کی سیاسی کابینہ میں دو جرنیل بہ طور وزیر شامل کر لیے تھے۔ جنرل اسکندر مرزا نے ہوم منسٹر کا حلف اٹھایا تھا اور جنرل ایوب خان وزیر دفاع کے عہدے پر فائز ہوئے تھے اور یوں فوج کو اقتدار میں آنے کا وہ راستہ ملا تھا، جس راستے پر چل کر ۴/اکتوبر ۱۹۵۵ء کو گورنر جنرل اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو جنرل اسکندر مرزا پاکستان کے پہلے فوجی صدر ہوئے۔

وہ سقوط ڈھاکہ جس سے آج ہم آنکھ ملاتے ہوئے شرماتے ہیں، وہ اسی لیے ممکن ہو سکا کہ ہم نے ماضی قریب کی تاریخ کو یاد رکھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ ہم نے ان زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش نہیں کی جو شہید مینار کی صورت ڈھاکہ کے سینے پر موجود تھے، ہم نے ون یونٹ بنا کر اور پیرٹی کا اصول اپنا کر چھوٹے صوبوں کا حق اور مشرقی پاکستان کی اکثریت غصب کی، ہم نے مولوی تمیز الدین کیس سپریم کورٹ سے جیت لیا اور اپنا اخلاقی مقدمہ بنگالیوں کے سامنے ہار گئے، ہمارے ایک جرنیل نے کبر و نخوت کے ہمالہ پر چڑھ کر یہ کہا کہ 'مجھے انسان نہیں زمین چاہیے۔' اس پُر غرور لہجے کی قیمت ہم نے صرف چند مہینوں میں ادا کر دی۔ زمین ہم سے چھن گئی اور ہمارے فوجی جنگی قیدی ہوئے۔ ہم نے سقوط ڈھاکہ سے کچھ سیکھا ہوتا تو بلوچستان کے نہتے لوگوں پر چڑھائی نہ کی ہوتی۔ ایم آر ڈی تحریک میں سندھ کے دیہاتوں کو فتح کرنے کی کوشش نہ کی ہوتی اور ۹۰ کی دہائی میں سندھ کے شہروں کو فتح کرنے نہ نکلتے۔ ہم نے اگر انگریز کی 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کی ناکامی سے سیکھا ہوتا تو ہم سندھ میں اردو اور سندھی بولنے والوں کو ایک دوسرے سے متصادم کرنے کا رویہ اختیار نہ کرتے۔

ہم نے سوویت یونین کی تحلیل سے یہ نہیں سیکھا کہ اگر کسی سپر پاور کے شہریوں کو مہنگائی، کھانے پینے کی اشیاء کی کمیابی اور آزادیٔ اظہار پر پابندی نے پریشان کر رکھا ہو تو ایسے ملک اپنے اسلحہ خانوں میں روایتی اور نیوکلیائی اسلحے کے ڈھیر رکھنے کے باوجود عوامی غیظ و غضب کے سامنے ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ اناج سے چھلکتے ہوئے گودام، حکومت کا بہتر نظام اور انصاف کا اہتمام لوگوں کو جوڑ کر رکھتا ہے، اپنی حکومتوں پر تنقید لوگوں کو حکومت میں شریک رہنے کا احساس دلاتی رہتی ہے

اور ذہن اور بدن کی یہی سیری 'حب وطن کا سریش' بن جاتی ہے، ملکوں کو جوڑ کر رکھتی ہے۔

بڑے دانشوروں اور تاریخ دانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تاریخ کے بہاؤ کو جب بھی کسی مخصوص مفاد والے نظریے کے مطابق رکھنے یا اس کے دھارے کو موڑنے کی کوشش کی گئی ہے تو اس نے ایسی تمام کوششوں کی ہنسی اڑائی ہے، تاریخ کو جب بھی جبری اور غیر فطری طور پر بھلانے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ کسی چھل پائی کی طرح اچانک دھم سے کود کر ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ تاریخ قوموں کا مجموعی نامہ اعمال ہے۔ اس سے سیکھا تو جاسکتا ہے، اس سے جان نہیں چھڑائی جاسکتی۔

پاکستان میں ماضی بعید کے جاہ و جلال اور شان و شکوہ کو اس غیر منطقی انداز میں سامنے لایا گیا کہ قوم اس بات پر یقین کرنے لگی کہ یہ جاہ و جلال اور شان و شکوہ اس کا پیدائشی حق ہے اور وہ کسی نوعیت کی جدوجہد، محنت اور ریاضت کے بغیر 'قوم ملک سلطنت، پائندہ تابندہ باد' کے عہدے پر فائز رہے گی۔ تاریخ قوموں کا لہو ہوتی ہے جو ان کے بدن کو زندہ، گرم اور توانا رکھتی ہے۔ اس لہو کو ان کی رگوں سے نچوڑ لیا جائے تو وہ مردہ ہو جاتی ہیں اور محض تاریخ کی کتابوں میں ان کا تذکرہ رہ جاتا ہے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۲۰ ستمبر ۲۰۰۰ء

سچ کی اشاعت اور آمریت

تیسری دنیا کے ملکوں میں سینکڑوں ہزاروں بولیاں بولی جاتی ہیں۔ زبانیں لکھی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں اخبارات، رسالے اور کتابیں چھپتی ہیں۔ حکومتیں توقع کرتی ہیں کہ لکھنے والے خواہ وہ صحافی ہوں یا ادیب، وہ مورخ ہوں یا وقائع نگار، چیزوں کو ان کے نقطۂ نظر سے دیکھیں، باتوں کو ان کے قلم سے لکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری دنیا میں حکمرانوں کے اور صحافیوں اور ادیبوں کے درمیان ہر وقت ایک رن پڑا رہتا ہے۔ آپ نے چند دن پہلے ختم ہونے والے اولمپک کھیلوں میں شاید وہ شمشیر زن دیکھے ہوں جو اپنی تلواریں ہوا میں لہراتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنی نگاہوں میں تولتے ہیں اور پھر ایک دوسرے پر وار کرتے ہیں۔ ان کھیلوں میں دونوں کھلاڑیوں کی تلواروں کی لمبائی، ان کا وزن ان کی تراش خراش ایک سی ہوتی ہے، ان کے سروں اور چہروں پر جو حفاظتی نقاب ہوتے ہیں، وہ یکساں ہوتے ہیں۔ مقابلہ دونوں کی ذہانت اور صلاحیت کا ہوتا ہے۔ وہ جیت جاتا ہے جو اپنی ہنرمندی کا بہتر مظاہرہ کرتا ہے۔ جبکہ تیسری دنیا کی حکومتوں اور صحافیوں اور ادیبوں کے درمیان سچ کو چھپانے اور اسے عیاں کرنے کا جو مقابلہ ہوتا ہے اس میں حکومتوں کے دونوں ہاتھوں میں لامحدود اختیارات کا گُرز اور آمرانہ احکامات کی تلوار ہوتی ہے، جس کا چاہو سر کچل دو، جس کی چاہے گردن اڑا دو۔ اس کے مقابلے پر لکھنے والا ایک منحنی سا قلم ہاتھ میں لیے سچ لکھنے کی اپنی سی کوشش کرتا رہتا ہے۔

بیسویں صدی میں آزادیٔ اظہار کا بہت شور رہا لیکن عین اسی زمانے میں اخباروں اور کتابوں کو جس جس طرح کچلا گیا، اس کا تذکرہ ہوتے رہنا چاہیے۔ ہم ایک نظر اپنے ہمسایہ ملک ایران پر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ رضا شاہ اول کے زمانے میں آزادیٔ تحریر وہاں ایک ایسی چیز تھی

جسے لوگ خواب میں بھی دیکھتے تو کانپ اٹھتے تھے۔ اس لیے کہ وہاں اخبارات اس لیے نہیں تھے کہ ملکی سیاسی اور سماجی حالات بیان کیے جائیں۔ ادب اس لیے نہیں تھا کہ اس کے ذریعے لوگوں تک سچ پہنچے۔ رضا شاہ اول کے دور کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ ایران کے لبرل لوگوں نے ڈرتے اور جھجھکتے ہوئے جب اخبارات کو یا ادب کو احتجاج کا ذریعہ بنایا تو کتابیں ضبط کر لی گئیں، اخبار بند کر دیے گئے۔ صحافی اور ادیب قید کیے گئے، ان میں سے بعض کے منہ تانت سے سلوا دیے گئے اور کچھ کو رضا شاہ اول کے حکم سے ایک مینار میں زندہ چنوا دیا گیا۔ صادق ہدایت جدید ایرانی ادب کا سب سے بڑا نام ہے۔ اس کی کہانی 'بوف کور' کا شمار جدید ایرانی ادب کی بڑی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک قصائی کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں ظالم کا مسلسل ظلم اور اس ظلم کے تماشائیوں کی بے حسی کی حد تک پہنچی ہوئی بے بسی دکھائی گئی ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اس کہانی کی ایران میں اشاعت ناقابلِ تصور بات تھی، چنانچہ صادق ہدایت جب ۱۹۳۷ء میں ہندوستان آئے اور بمبئی میں کچھ دن ٹھہرے تو ان کی اس کہانی کا ایک حصہ کتابچے کی صورت میں بمبئی سے بہت محدود تعداد میں شائع ہوا، شاید ۵۰۰ کی تعداد میں۔ صادق ہدایت کی مکمل کہانی ایران میں برسوں بعد شائع ہوئی اور اس کا دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

بات اخبارات سے نکلی تھی اور ادب تک جا پہنچی۔ اصل مسئلہ چھپے ہوئے سچے حرف کا ہے۔ تیسری دنیا کے حکمرانوں اور بہ طور خاص آمروں کا یہ وتیرہ ہے کہ انہیں چھپے ہوئے سچے حرف سے خوف آتا ہے، خواہ وہ سچا حرف کسی اخبار میں چھپے یا کسی کہانی، کسی نظم، کسی گیت میں نظر آئے۔ کیسی دلچسپ بات ہے کہ وہ ایران جس نے ۱۹۷۹ء میں شہنشاہیت کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکا تھا اور جس کے ادیبوں اور صحافیوں کو یقین تھا کہ اب ان کے خیالات کی اشاعت آزادانہ ہو سکے گی، اسی ملک میں متعدد ادیب اور دانشور قتل ہو چکے ہیں، اصلاح پسندوں کے تمام اخبارات بند کیے جا چکے اور ان کے مدیر، ان میں لکھنے والے بندی خانوں میں اس دن کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب ان کے ملک پر آزادیٔ اظہار کا سورج واقعی طلوع ہو گا۔

ہمارے سرحدوں کے ساتھ ہی وہ علاقہ ہے جو کبھی سوویت یونین کہلاتا تھا اور آج رشین یونین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس رشین یونین میں بھی صحافی اور ادیب اس بات پر اترائے ہوئے تھے کہ اب انہیں اپنی بات کہنے کی بہت حد تک آزادی ہے، اب وہ حکمرانوں پر تنقید کر سکتے

ہیں، سماجی مسائل و معاملات پر کھل کر لکھ سکتے ہیں۔ پیوٹن حکومت کے آنے کے بعد ان کی یہ خوشیاں بھاپ بن کر اڑ چکی ہیں اور اس وقت وہاں کے آزاد اخبارات اور ٹیلی وژن اسٹیشن حکومت کی گرفت میں ہیں۔حکومت کی طرف سے اعلان کیا جاچکا ہے کہ مملکت کا 'نظریاتی تحفظ' اس کا مسئلہ ہےاور وہ عوام تک پہنچنے والی تمام اطلاعات کو اپنی گرفت میں رکھے گی۔ یہ روسی حکومت طے کرے گی کہ عوام تک پہنچنے والی کون سی خبر 'خطرناک' ہے اور کس خبر کی اشاعت مملکت کے 'نظریاتی تحفظ' کو نقصان نہیں پہنچاتی۔سوویت یونین کے سابق صدر میکائل گورباچوف جو روس میں آزادیٔ تحریر کے بانی ہیں، انہوں نے اس صورت حال پر شدید احتجاج کیا اور وہ موجودہ روسی صدر سے ملاقات کی کوشش کر رہے ہیں تا کہ انہیں آزادیٔ تحریر پر عائد کی جانے والی پابندیوں کے خطرناک نتائج سے آگاہ کر سکیں۔

بیسویں صدی میں تیسری دنیا کے کچھ ملک ایڈولف ہٹلر جیسے 'منتخب آمر' کے ظلم وستم سے دوچار ہوئے اور بیشتر ملکوں میں جرنیل منتخب حکومتوں کا تختہ الٹ کر برسر اقتدار آئے۔غرض آمریت کسی بھی راستے سے آئی ہو، اس نے سب سے پہلے آزادیٔ تحریر وتقریر پر پابندیاں لگائیں۔

آمر کی نفسیات کے بارے میں ایک مغربی دانشور کا کہنا ہے کہ آمر انسان کو ایک رذیل مخلوق خیال کرتا ہے۔ کیونکہ رذیل لوگ ہی اس کے دربار میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کے اردگرد کے ماحول کو آباد کرتے ہیں۔ دہشت زدہ معاشرہ بہت عرصے تک فکر سے عاری اور انفعالیت سے پُر انداز میں برتاؤ کرتا رہتا ہے۔اس سے اطاعت کرانے کے عوض اسے صرف کھانا دینا کافی ہوتا ہے۔ محض تھوڑی سی تفریح مل جائے تو خوش رہتا ہے۔ سیاسی بازی گری کے ترکش کے تیر صدیوں سے وہی پرانے چلے آرہے ہیں۔اسی لیے ہمیں سیاست کے میدان میں نوآموز لوگ اتنی تعداد میں دکھائی دیتے ہیں جنہیں یقین ہوتا ہے کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ آجائے تو وہ آسانی سے حکمرانی کرلیں گے۔مگر اس کے باوجود بڑے حیران کن واقعات بھی پیش آجاتے ہیں۔ دیکھیے، آپ کے سامنے ایک ہجوم ہے جسے کھانا اور تفریح میسر ہے لیکن اس نے اطاعت جاری رکھنے سے انکار کردیا ہے۔ اب وہ جس شے کا مطالبہ کررہا ہے وہ تفریح سے بڑھ کر ہے۔اسے آزادی چاہیے، انصاف چاہیے۔آمر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ انسان کو اس کے پورے

وجود، اس کی پوری رعنائی میں دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ ایسا ہی انسان آخرکار اس کی حاکمیت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے، یہی اس کا دشمن ہے اور اسی کو ختم کرنے کے لیے آمر اپنی پوری طاقت جمع کرتا ہے۔ آمریت لوگوں کے ساتھ حقارت سے بھی پیش آتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ خود کو ان سے تسلیم کرانے کے لیے بھی پورا زور لگاتی ہے۔ قانونی طور پر ناجائز ہونے کے باوجود۔۔۔ یا شاید اسی کے باعث۔۔۔ وہ قانونی طور پر جائز ہونے کا ڈھونگ رچاتی ہے۔ اس معاملے میں وہ مریضانہ حد تک حساس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسے اپنے کمتر ہونے کا بھی مسلسل احساس رہتا ہے (خواہ یہ احساس کتنی ہی گہرائی میں چھپا ہوا کیوں نہ ہو)۔ اس لیے وہ خود کو اور دوسروں کو یہ دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی کہ اسے عوامی مقبولیت حاصل ہے۔ خواہ یہ مقبولیت محض تصنع ہی کیوں نہ ہو، بڑی تسکین بخش ہوتی ہے۔ اگر یہ صرف ڈھونگ ہے تب بھی کیا ہرج ہے؟ آمریت کی دنیا میں اکثر چیزیں ڈھونگ ہی تو ہوتی ہیں۔

آمریت کے زمانوں میں آزادیٔ تحریر کے لیے جو لڑائی پاکستان میں لڑی گئی اس میں ادیبوں کا حصہ بہت کم ہے۔ یہ لڑائی پاکستانی صحافیوں نے لڑی ہے، وہی ہر زمانے میں مطعون بھی ٹھہرے اور معتوب بھی رہے ہیں۔ حکمرانوں کا پیمانہ صبر لبریز ہونے لگے تو اس کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، پاکستانی صحافت کے افق پر بھی وہ آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ مشکل صرف اتنی سی ہے کہ دنیا کی کسی بھی آمریت کو اب تک اس نکتے کی تفہیم نہیں ہو سکی کہ وہ لوگوں کے صبر کو ایک حد سے زیادہ نہ آزمائے۔ عوام کے صبر کا پیمانہ چھلک جائے تو بڑی بڑی آمریتیں زمیں بوس ہو جاتی ہیں۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۴/اکتوبر ۲۰۰۰ء

درد کی داستان

'پاکستان اور اقلیتیں' کی تقریب رونمائی کے موقع پر احمد سلیم، ادارۂ امن و انصاف اور اس کی معاون جرمن تنظیمیں، حوری نورانی، لیونارڈ اور نوشین ڈی سوزا، سب ہی مبارکباد کے حق دار ہیں کہ ان سب کی مشترک کوششوں اور کاوشوں سے اس اہم اور نازک مسئلے پر وہ کتاب سامنے آئی جسے اگر درد کی داستان کہا جائے تو مناسب ہوگا۔

بادشاہوں کی خلوت گاہوں کی دیواروں پر جڑے ہوئے آئینے خریدی ہوئی کنیزوں کی بے بسی کا رقص دکھاتے تھے۔ اس کتاب کے صفحوں پر پاکستانی اقلیتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں، زیادتیوں اور ظالمانہ رویوں کی سفاکانہ تفصیل دکھائی دیتی ہے۔

اب جبکہ پاکستان کو بنے ہوئے نصف صدی سے زیادہ گزر چکی ہے اس بات کا اعتراف کر لینے میں ہرج ہی کیا ہے کہ ہم کمال کے منافق ہیں۔ ہندوستان میں تھے اور مسلمان ہونے کے ناتے اقلیت میں تھے تو ہم نے وہاں طوفان اٹھا دیا۔ ہمارا کہنا تھا کہ انگریز کے برصغیر سے رخصت ہوجانے کے بعد متعصب، غیر روادار اور جنونی ہندو اکثریت ہمیں نگل جائے گی، اس لیے ہمیں ایک الگ ملک چاہیے۔ لیجیے صاحب، ہندوستان تقسیم ہوگیا اور ہم اچانک اقلیت سے اکثریت میں ہوگئے۔ ہم جب اقلیت میں تھے تو جس علاقے میں پاکستان بننے والا تھا وہاں کی مذہبی اقلیتوں کو ہم نے اس کا یقین دلایا تھا کہ ان کے مذہب اور رہن سہن کو چھیڑا نہیں جائے گا اور انہیں اپنے سیاسی اور سماجی نظریات کے اظہار کی آزادی ہوگی۔

فروری ۱۹۴۸ء میں جناح صاحب نے امریکا سے نشر ہونے والی اپنی ایک ریکارڈ شدہ گفتگو میں کہا تھا کہ......

'پاکستان کسی صورت میں بھی ایک تھیوکریٹک ریاست نہیں ہوگا جس پر الہامی مشن کے ساتھ مُلّا حکمرانی کرے۔ ہمارے یہاں بہت سے غیر مسلم ہندو، عیسائی اور پارسی ہیں لیکن وہ سب پاکستانی ہیں، وہ سب ان حقوق ومراعات سے فیض یاب ہوں گے جن سے کوئی دوسرا شہری، اور وہ پاکستان کے معاملات میں اپنا مناسب کردار ادا کریں گے۔'

۱۹۴۸ء میں یہ صورت حال تھی لیکن صرف ایک برس کے بعد 'قرارداد مقاصد' سامنے آئی اور اس کے بعد سال بہ سال ریاست کا ادارہ زیادہ سے زیادہ فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرتا گیا۔ چنانچہ آج اقلیت تو دور کی بات ہے، اکثریت بھی فرقوں کی بنیاد پر تقسیم کی جا چکی ہے، شیعہ اقلیت، سنی اکثریت سے خوفزدہ اور زخم خوردہ ہے، دیوبندی اور بریلوی ایک دوسرے کو کافر قرار دینے پر تلے رہتے ہیں۔

اس کتاب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس میں پاکستانی سماج کے لیے اقلیتوں کی بے لوث خدمات اور اس کے عوض ان کے ساتھ ہونے والی آئینی ناانصافیاں اور ریاستی سطح پر غیر انسانی سلوک دونوں ہی اکٹھا کر دیے گئے ہیں۔ کہنے کو اسے کلیسا کے ایک ادارے کی طرف سے مرتب کیا گیا ہے لیکن اس میں پاکستان کی تمام اقلیتوں اور ان کے نامور و نامدار افراد کے کارنامے تحریر کیے گئے ہیں۔ جداگانہ انتخابات کے نام پر اقلیتوں کو جس طرح ملک کے قومی دھارے سے کاٹا گیا، اس میں جہاں ضیاءالحق ایسے آمروں کے نام آتے ہیں وہاں وزارتوں اور اسمبلیوں کی رکنیت کے لیے کچھ بھی کر گزرنے والے مسیحی اور دوسری اقلیتوں کے نام نہاد نمائندوں کی فہرست بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اقلیتی عوام کی خواہشوں کے برعکس جداگانہ انتخابات کو اپنی اقلیت کے لیے امرت دھارا کہتے سنائی دیتے ہیں۔ معذرت کے ساتھ اس کی بہترین مثال پاکستان کے پہلے وزیر قانون اور اچھوت رہنما جوگندر ناتھ منڈل کی ہے جنہوں نے وزارت کے بدلے ۱۹۴۹ء میں پہلے قرارداد مقاصد کی حمایت کی، پھر حکومت کے اشارے پر اچھوتوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا حق منوایا اور ہندو اقلیت کو کچھ اور کمزور کیا اور جب ان سے تمام مقاصد حاصل ہو گئے تو ۱۹۵۳ء میں وہ وزارت سے فارغ کر دیے گئے، اور پھر ان کی زندگی کے آخری دن ہندوستان میں گزرے۔ ہمیں آج بھی کئی جوگندر ناتھ منڈل نظر آتے ہیں۔

یہ وہ نام نہاد مسیحی یا ہندو رہنما ہیں جو اس بات کو چھپا جاتے ہیں کہ ۵۰ء کی دہائی میں پاکستان کی قانون ساز اسمبلی میں ہونے والی بحث کے دوران کہا گیا تھا کہ 'جداگانہ انتخابات قوم دشمنی اور جمہوریت مخالف فلسفے کے حامل ہیں۔ کسی ملک کی قومی زندگی کو مذہبی ٹکڑوں میں بانٹنا، جمہوریت کو جڑ سے اکھیڑنے کے مترادف ہے۔ جداگانہ انتخابات قومی یک جہتی کی قیمت پر فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارتے ہیں۔'

ابتدائی برسوں سے ہی پاکستان میں ریاست کا ادارہ ایک فرقہ وارانہ ہئیت اختیار کر گیا۔ ملک میں جمہوریت اگر پروان چڑھتی رہتی اور اس کی جڑیں مضبوط ہوتیں تو فرقہ واریت کا یہ رنگ ہلکا ہوتا جاتا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ جمہوریت پنپنے اور پروان چڑھنے کی بجائے بوٹوں کے تلے روندی گئی۔ غیر جمہوری حکومتوں کو اپنے اقتدار کی مدت اور قوت میں اضافے کے لیے فرقہ واریت کے عفریت اور فرضی اور ابدی دشمنوں کی موجودگی کی ضرورت پڑتی ہے، چنانچہ آج پاکستانی سماج میں عدم رواداری اور تشدد کے مظاہر ان ہی ضرورتوں کی پیداوار ہیں۔

پاکستان اس وقت فرقہ وارانہ دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے لیکن اس کے باوجود ریاست کا ادارہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور اقلیتوں کے ساتھ رواداری اور انصاف کا دعویدار ہے۔ اس فرقہ وارانہ مزاج کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں سنگھ پریوار نے جب بابری مسجد گرائی تو حالانکہ اس وقت پاکستان میں ایک منتخب حکومت موجود تھی، اس کے باوجود ریاست کے فرقہ وارانہ مزاج کے سبب لاہور میں پنجاب کے ایک صوبائی وزیر نے لاہور ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے بل ڈوزر سے بہ نفس نفیس بابری مسجد کا بدلہ لینے کے لیے مندر گرانے میں فخر محسوس کیا تھا۔ یہ انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ جسے انہوں نے گرایا وہ مندر نہیں ایک چرچ تھا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مندر گرایا گیا یا چرچ۔ ریاست کے ادارے نے اپنے مقاصد کی خاطر فرقہ واریت کو جس قدر ہوا دی اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ایسے انتہا پسند پیدا ہو جائیں جو اپنے ہی مختلف فرقوں کی عبادت گاہوں کا احترام نہ کرتے ہوں اور امام باڑوں اور مسجدوں میں گھس کر نمازیوں کو خون میں نہلاتے ہوں۔ ایک ایسے ملک میں اقلیتیں کیا شکایت کریں؟ ہم تو وہ لوگ ہیں کہ نئی نئی اقلیتیں ایجاد کرتے ہیں اور پھر زندگی ان پر حرام کر دیتے ہیں۔ انہیں ہر وقت غدار کے خطاب سے نوازا جاتا ہے اور انہیں، ملازمتوں سے نکالنے کے لیے مطالبے کیے جاتے ہیں۔ توہین رسالت کی آڑ میں جب خود اپنے ہم مذہبوں سے ذاتی دشمنی نکالی جاتی ہو تو

پھر مسیحیوں اور ہندوؤں کو اس بارے میں کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

یہاں میں اپنا یہ نقطۂ نظر واضح کرنا چاہوں گی کہ 'مذہبی اکثریت' یا 'مذہبی اقلیت' کی اصطلاحات کو میں گمراہ کن سمجھتی ہوں، میرے خیال میں ہر وہ شخص جو پاکستان کا شہری ہے، اس کی واحد سیاسی پہچان پاکستان کا شہری ہونا ہے، مذہبی طور پر وہ کس مذہب یا کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے؟ یہ اس کا اور اس کے خدا کا معاملہ ہے اور اسے خدا اور بندے پر ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ صرف اور صرف اس بات پر اصرار ہی پاکستان کو ایک مستحکم اور روادار ملک بنا سکتا ہے کہ اس ملک میں رہنے والے تمام باشندے مساوی حقوق رکھتے ہیں اور اسی طرح تمام مذاہب کے ماننے والے اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے اس کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔

پاکستان میں اقلیتوں کی حالت زار کا مسئلہ جمہوریت سے جڑا ہوا ہے۔ جبکہ ہمارے دانشور کسی حکمران کو کتے کے دو پلّے بغل میں دبائے دیکھیں تو اسے فوراً 'روشن خیال' ہونے کا سٹرفکیٹ جاری کر دیتے ہیں اور اپنا سارا وزن اس کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں، اگر کمال اتاترک کو ہیرو کہہ دیا جائے تو بیشتر دانشور پاکستان کے راتوں رات ایک ایسے سیکولر ملک ہو جانے کا مژدہ سنانے لگتے ہیں جس میں مخلوط طریقہ انتخاب بس رائج ہی ہونے والا ہے اور جنونیوں کو ان کی چار دیواریوں میں بند کیا جانے والا ہے۔ یہ تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی سیاست کے افق پر طلوع ہونے والا نیا ستارہ ان مسائل پر قابو نہیں پا سکتا ہے، اس لیے کہ آمریت کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ عوامی قوت کو تقسیم در تقسیم کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ اقتدار کو طول دینے کے لیے کبھی خود کو جہادی ثابت کرنا پڑتا ہے اور کبھی سیکولر۔ یہ تو اب لوگوں کی عقل و فراست ہے جو آمریت میں ملک کی اکثریت اور اقلیت کے لیے راہ نجات ڈھونڈتے ہیں۔

'پاکستان اور اقلیتیں' ایک ایسی کتاب ہے جسے زیادہ سے زیادہ پڑھا جانا چاہیے۔ پاکستان کی اکثریت اور اقلیت کے دن اسی وقت پھریں گے جب عوامی سطح پر اکثریت اور اقلیت کے درمیان مکالمہ ہو، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ایک دوسرے کو شریک کیا جائے، آئین کی فرقہ وارانہ شقوں کے خاتمے کی کوشش کی جائے اور جمہوری جدوجہد کا ناتا مذہب سے جوڑنے کی بجائے، زمینی حقائق سے جوڑ کر دیکھا جائے۔

(یہ مضمون ۲۳ فروری ۲۰۰۱ء کو 'پاکستان اور اقلیتیں' کی تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

اے کاش ہمارے یہاں بھی ......!

چند دن پہلے ایک انگریزی معاصر میں اس کے مشہور کالم نویس کی ایک تحریر شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ کسی شخص کا فوج کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہونا کوئی ایسا نقص نہیں جو اس کے صدر مملکت ہونے کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔ دلیل کے طور پر انہوں نے جنرل جارج واشنگٹن اور جنرل چارلس ڈی گال کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ دونوں نام ایسے ہیں جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور بہت سے سوال اٹھاتے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے امریکا میں جب برطانوی تسلط کے خلاف بغاوت شروع ہوئی تو یہ جارج واشنگٹن تھا جسے ۱۷۷۵ء میں معتدل مزاج اور انتہا پسند امریکی انقلابیوں نے مشترکہ طور پر امریکا کی انقلابی افواج کا کمانڈر چنا تھا۔ امریکی تاریخ میں اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ یہ جنرل واشنگٹن کی مستقل مزاجی، تحمل اور قوت ارادی تھی جس نے برطانوی افواج کو پے بہ پے شکستوں سے دوچار کیا اور آخرکار برطانوی افواج کے کمانڈر لارڈ کارنوالس کو ۱۷۸۱ء میں جنرل واشنگٹن کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ یہ وہی لارڈ کارنوالس ہے جس نے چند برسوں بعد امریکا میں اپنی شکست کا داغ، ہندوستان میں ٹیپو سلطان کے خون سے دھویا۔

لارڈ کارنوالس کی شکست کے بعد ۱۷۸۲ء میں جنرل واشنگٹن کی کمان میں جنگ لڑنے والے سپاہیوں اور بعض امریکی انقلابیوں کی جانب سے یہ مہم چلائی گئی کہ جنرل جارج واشنگٹن کو امریکا کا 'بادشاہ' بنایا جائے اور اس کی تاج پوشی کی جائے۔ جنرل واشنگٹن کو اس تجویز کا علم ہوا تو اس کا طیش قابلِ دید تھا۔ اس نے اس تجویز کو سختی سے رد کیا اور ۱۷۸۳ء میں امریکی کانگریس کے سامنے فوج کی کمان سے استعفیٰ دے کر واپس اپنی زمینوں پر چلا گیا۔ یہ جنرل واشنگٹن کا ذاتی فیصلہ

تھا لیکن امریکی قوم نے اسے عام شہری کے طور پر زندگی گزارنے کی اجازت نہ دی۔ ۱۷۸۷ء میں جب فلاڈلفیا میں آئینی کنونشن منعقد ہوا تو اس میں شرکت کے لیے جنرل واشنگٹن کو دعوت دی گئی، وہ وہاں پہنچا تو گلی کوچوں میں اس کے نام کی گونج تھی۔ بارہ امریکی ریاستوں کے ۵۵ نمائندوں نے جنرل واشنگٹن کو متفقہ طور پر اپنا صدر نامزد کیا۔ فلاڈلفیا میں ہونے والے جس کنونشن میں جنرل جارج واشنگٹن کو متفقہ طور پر صدر امریکا منتخب کیا گیا تھا، اسی کنونشن نے ستمبر ۱۷۸۷ء میں ایک نیا آئین منظور کیا۔ جنرل جارج واشنگٹن جسے دو برس پہلے متفقہ طور پر صدر نامزد کیا گیا تھا، اس نے ۳۰ راپریل ۱۷۸۹ء کو امریکا کے پہلے صدر کے طور پر حلف اٹھایا۔ یہ وہی جنرل جارج واشنگٹن ہے جس کے زمانے میں 'اعلانِ آزادی' میں کہا گیا کہ:

'ہم ان حقائق کو بدیہی سمجھتے ہیں کہ تمام انسان یکساں حیثیت لے کر پیدا ہوئے اور خالق نے انہیں بعض ایسے حقوق دے دیے جو قطعاً چھینے نہیں جا سکتے۔ ان حقوق میں زندگی، آزادی اور سعیِ راحت شامل ہیں۔ ان ہی حقوق کے حصول کے لیے انسانوں کے درمیان حکومتیں بنتی ہیں۔ وہ اپنے تمام جائز اختیارات محکوموں کی رضامندی سے حاصل کرتی ہیں۔ جب حکومت کی کوئی شکل ان مقاصد کے لیے تباہی کا باعث بن جاتی ہے تو لوگوں کا حق ہے کہ اسے بدل دیں یا ختم کر دیں اور اس کی جگہ نئی حکومت قائم کر لیں.....'

جارج واشنگٹن یقیناً ایک جرنیل تھا، لیکن انقلابی فوج کا۔ اس نے انقلاب امریکا کی کامیابی کے بعد اپنی قوم سے اس کا ثمر طلب کرنا تو دور کی بات ہے، بادشاہ بننے سے انکار کر دیا تھا، تمام اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کرنے کی بجائے 'جنرل' کے عہدے سے استعفیٰ دیا تھا اور اپنی زمینوں پر کاشت کرنے چلا گیا تھا......اور جب وہ پہلا صدر امریکا نامزد اور منتخب ہوا ہے، تو یہ اس کے ساتھی جرنیلوں کا نہیں، امریکا کی بارہ ریاستوں کے نمائندگان کا متفقہ فیصلہ تھا۔

ایک ایسے جرنیل کا موازنہ افریقہ، لاطینی امریکا یا ایشیا کے ایسے جرنیلوں سے کرنا، جنہوں نے قومی آزادی کی جنگ نہیں لڑی، یا جو منتخب حکومتوں کا تختہ الٹ کر اور آئین کو منسوخ یا معطل کر کے سربراہ مملکت بنے۔ کتنا منصفانہ اور دانشورانہ موازنہ ہے؟ اس بارے میں فیصلہ عوام پر چھوڑ

دینا چاہیے۔

جہاں تک جنرل ڈیگال کا تعلق ہے تو دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں انہوں نے جرمن قبضے سے فرانس کو آزاد کرانے کی خاطر سر ہتھیلی پر رکھ لیا تھا۔ دو لاکھ فرانسیسی سپاہی جنگی قیدی ہو چکے تھے۔ فرانس کا بڑا حصہ ہٹلر کی فوجوں کے قبضے میں تھا، ایسے وقت میں جنرل ڈیگال لندن پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہاں سے انہوں نے ریڈیو نشریات کے ذریعے 'آزادئ فرانس کی تحریک' کا آغاز کیا جو بہت جلد فرانس میں ایک مضبوط زیر زمین تحریک میں بدل گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر جرمن افواج کی شکست کے بعد یہ جنرل ڈیگال تھے جنہوں نے ۹۵ فی صد فرانسیسی عوام کی خواہش کے مطابق نئے فرانسیسی آئین کی تیاری میں اپنا کردار ادا کیا۔ نئی آئین ساز اسمبلی کو سات مہینے کے اندر نیا آئین مرتب کرنے اور اسے عوام سے منظور کرانے کی ذمہ داری سونپی گئی، اس آئین ساز اسمبلی نے جنرل ڈیگال کو عبوری حکومت کا سربراہ مقرر کیا۔ اس عہدے سے جنرل ڈیگال نے جنوری ۱۹۴۶ء میں ہی استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اپنی سیاسی پارٹی بنائی جس نے ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کی ۱۲۰/نشستیں حاصل کیں اور پھر ایک لمبی سیاسی جدوجہد کے بعد وہ ۱۹۵۸ء میں فرنس کے صدر منتخب ہوئے۔

جنرل ڈیگال نے بھی قومی آزادی کی جنگ میں سرگرم حصہ لیا، سیاسی جدوجہد کی، ان کا افریقہ، ایشیا یا لاطینی امریکا کے کسی ایسے طالع آزما سے موازنہ کرنا جو منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر، آئین اور جمہوری اداروں کو ختم کر کے برسرِ اقتدار آیا ہو۔ کس حد تک درست ہے؟ اس کا فیصلہ بھی میرے خیال میں عوام کی فہم و دانش پر چھوڑ دینا چاہیے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جنرل ڈیگال فرانسیسی فوج اور قدامت پرستوں کے نمائندے تھے۔ ان کے زمانہ صدارت میں الجزائر کی جنگ آزادی عروج پر تھی اور فرانسیسی پولیس اور فوج اس تحریک کو وحشیانہ طور پر کچل رہی تھی اور پیرس میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ کیا جا رہا تھا۔ ان دنوں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے فرانسیسی دانشور، ادیب اور دوسرے روشن خیال عناصر اپنی حکومت کے اس استعماری رویے کے خلاف احتجاج اور مظاہرے کر رہے تھے۔ ۱۲۱/ دانشوروں اور ادیبوں نے اپنی حکومت کے خلاف ایک اعلان نامے پر دستخط کیے تھے، ان میں سے بیشتر گرفتار کر لیے گئے تھے لیکن اس مزاحمتی تحریک کا رہنما ژاں پال سارتر اور اس کی ساتھی سیمون

دی بودار آزاد تھے۔ پیرس کی سڑکوں پر الجزائر کی تحریک آزادی کو کچلنے والے فرانسیسی فوجیوں کے گروہ سارتر اور اس کے ساتھیوں کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے۔ گلیوں میں 'سارتر غدار ہے'، 'سارتر کو پھانسی دو' کے نعرے لگ رہے تھے۔ وارنٹ جاری ہو چکے تھے لیکن کسی نہ کسی بہانے سارتر کی گرفتاری ٹل رہی تھی۔ ایسے زمانے میں جنرل ڈیگال سے پوچھا گیا آپ غدار سارتر کو گرفتار کیوں نہیں کرتے؟ جنرل ڈیگال نے یہ مطالبہ کرنے والے کو حیرت سے دیکھا اور فرانس کے عظیم فلسفی، ادیب اور دانشور والٹیر کو حوالہ بناتے ہوئے کہا:

'سارتر فرانس ہے...... میں فرانس کی گرفتاری کا حکم کیسے دے سکتا ہوں۔'

تیسری دنیا میں بھی اے کاش جنرل جارج واشنگٹن ایسے صدر ہوتے جو 'شاہ امریکا' بنائے جانے کی تجویز کو حقارت سے ٹھکرا دیتے۔ ہمارے یہاں بھی کوئی جنرل ڈیگال ہوتا جو اپنی حکومت کے خلاف تحریک چلانے والے ادیب کو ملک کا ضمیر ٹھہراتا اور یہ سوال کرتا کہ میں ملک کے ضمیر کو کیسے گرفتار کر سکتا ہوں؟ جرنیل تو ایک طرف رہے، کاش ہمارے یہاں ایسے دانشور اور ادیب پائے جاتے جو اپنی بات کے حق میں دلیل لاتے ہوئے دیانت داری سے کام لیتے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۱۵/اگست ۲۰۰۱ء

صرف جی حضوری ہے!

بیسویں ویں صدی کے عظیم فلسفی برٹرینڈ رسل نے ویت نام میں امریکا کے جنگی جرائم کے خلاف نومبر ۱۹۶۰ء میں ایک بین الاقوامی ٹریبیونل تشکیل دیا تھا جس میں فرانس کے فلسفی ژاں پال سارتر کے علاوہ پاکستان کے معروف وکیل جناب محمود علی قصوری بھی شامل تھے۔ رسل مغرب کے ان اولین لوگوں میں تھے جنہوں نے ویت نام جنگ کے خلاف سب سے پہلے صدائے احتجاج بلند کی۔ برٹرینڈ رسل نے امریکی ضمیر سے اپیل کرتے ہوئے کہا تھا 'امریکا کے شہریو! امریکا ایسی انقلابی روایات کا مالک ہے جو ابتدائی زمانے میں انسانی آزادیوں اور سماجی مساوات کی جدوجہد میں سچی تھیں۔ یہ روایات ان چند لوگوں نے کچل دی ہیں جو آج امریکا پر حکومت کر رہے ہیں۔ آپ میں سے اکثر کو شاید اس کا مکمل علم نہ ہو کہ آپ کے ملک پر ان صنعت کاروں کا کس حد تک اختیار ہے جن کے ذریعے آج ریاست ہائے متحدہ دنیا بھر کے قدرتی وسائل کے ۶۰ فیصد حصے پر قابض ہے حالانکہ اس کی آبادی دنیا بھر کی آبادی کی صرف چھ فیصد ہے۔ میں آپ کو آپ کے ہی رہنماؤں کے ان الفاظ پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں جن کے ذریعے وہ کبھی کبھی اس لوٹ کھسوٹ کو بیان کر دیتے ہیں جو انہوں نے روا رکھی ہے۔ ۱۷ فروری ۱۹۵۰ء کو نیویارک ٹائمز نے لکھا 'ہند چینی ایک ایسا علاقہ ہے جس کے لیے ایک بڑا جوا کھیلا جاسکتا ہے۔ شمال میں ٹین، مینگانیز، کوئلہ، عمارتی لکڑی، چاول، ربڑ، چائے، کالی مرچ اور کھالیں ہیں جو برآمد کی جاسکتی ہیں۔ دوسری طرف جنگ عظیم سے پہلے بھی ہند چینی ہر سال ۳۰ کروڑ ڈالر کا نفع دیتا تھا۔' صرف ایک سال بعد آپ کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے ایک وزیر نے کہا 'ہم نے جنوب مشرقی ایشیا کے وسائل کو ابھی جزوی طور پر استعمال کیا ہے۔ تاہم جنوب مشرقی ایشیا، دنیا بھر کے خام ربڑ کا ۹۰

فیصد، ٹین کا ۶۰ فیصد اور ناریل کے تیل کا ۸۰ فیصد فراہم کرتا رہا ہے۔ شکر، چائے، کاٹن، تمباکو، پھل، مصالحے، گوند، پٹرول، خام لوہا اس علاقے میں بڑی مقدار میں موجود ہیں۔' اور ۱۹۵۳ء میں جب فرانسیسی، امریکی امداد کے سہارے ویت نام میں لڑ رہے تھے تو صدر آئزن ہاور نے بیان دیا:

'آیئے فرض کریں کہ ہم ہندچینی کھو بیٹھتے ہیں۔ اگر ہندچینی ہاتھ سے نکل جائے تو ٹین اور ٹنگ اسٹن جس کی ہمیں اس قدر ضرورت ہے، آنا بند ہو جائیں گے۔ ہم اس خوف ناک حادثے کو روکنے کے لیے آسان اور سستے طریقے کی تلاش میں ہیں جس سے ہندچینی اور جنوب مشرقی ایشیا کی دولت حسبِ منشا حاصل کرنے کی صلاحیت ہمارے ہاتھ سے نہ جاتی رہے۔'

برٹرینڈ رسل نے اس وقت کے امریکی عوام سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا 'اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ویت نام میں جنگ اس لیے لڑی جا رہی ہے کہ اس علاقے کی دولت پر امریکی سرمایہ داروں کے مستقل قبضے کی حفاظت کی جا سکے۔ جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اسلحہ بنانے والی صنعتوں کو ٹھیکوں کے ذریعے بے پناہ روپیہ دیا جاتا ہے اور ان صنعتوں کے ڈائریکٹروں میں خود وہی جرنیل شامل ہوتے ہیں جو ہتھیار کے خریدار ہوتے ہیں تو یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ فوج اور بڑے صنعت کاروں نے نفع کی خاطر آپس میں اتحاد کر رکھا ہے۔ میں آپ سے اس بات پر غور کرنے کی اپیل کرتا ہوں کہ امریکی حکومت نے ویت نامی عوام کے ساتھ کیا کچھ کیا ہے۔ کیا آپ اپنے دل کی گہرائیوں سے ویتنام پر زہریلی کیمیاوی دواؤں، گیس، جیلی گیسولین اور فاسفورس کے بموں کا استعمال صحیح ثابت کر سکتے ہیں؟ یہ گیسیں اور مادے زہریلے ہیں اور مہلک ہیں۔ نیپام اور فاسفورس بم اپنے شکار کو جلا کر ابلتے ہوئے گوشت کا ڈھیر بنا دیتے ہیں۔ آپ کی فوج نے 'لیزی ڈاگ' قسم کے ہتھیار بھی استعمال کیے ہیں، یہ ایسا بم ہے جس میں بلیڈ جیسے لوہے کے دس ہزار دھاردار ٹکڑے بھرے ہوتے ہوتے ہیں۔ یہ انتہائی تیز دھار کے ٹکڑے بم پھٹتے ہی نہتے دیہاتیوں کے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ شمالی ویت نام کے صرف ایک صوبے میں جو انتہائی گنجان آباد ہے، تیرہ ماہ کے عرصے میں یہ تیز دھار پترے دس کروڑ کی تعداد میں پھینکے گئے ہیں۔ امریکا نے جب ویتنام کے خلاف جنگ شروع کی تو امریکی محکمہ دفاع ایک سو ساٹھ بلین ڈالر کی مالیت کی جائیداد کا مالک تھا۔ اور اب یہ مالیت دگنی ہو چکی ہے۔ امریکی محکمہ دفاع اس وقت دنیا کی سب سے بڑی تنظیم ہے جو امریکا میں تین کروڑ بیس لاکھ ایکڑ اور باہر کے ملکوں میں کروڑوں ایکڑ زمین کا

مالک ہے۔اربوں ڈالرامریکی فوج کی جیب میں ڈال دیے جاتے ہیں اور یوں امریکی زندگی کے ہر شعبے پر پینٹا گون کو معاشی بالادستی حاصل ہے۔امریکی شہریو! میں آپ کی توجہ خاص طور پر اس امر کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ ان کارپوریشنوں کے انتظامی دفتروں میں ایک ہزار چار سو سے زیادہ سابق فوجی افسر کام کرتے ہیں جن میں دوسو اکسٹھ سابق جرنیل ہیں جو اپنی گاڑیوں پر امریکی پرچم لہرانے کا حق رکھتے ہیں۔جنرل ڈائنامکس کی ملازمت میں ۱۸۷ر سابق افسر، ۲۷ جرنیل اور ایڈمرل اور ایک فوج کا سابق سکریٹری شامل ہیں۔یہ حکمران طبقہ ہے اور (صدر، نائب صدر جیسے) نام نہاد عہدوں کے لیے خواہ کوئی بھی منتخب ہو جائے یہ طبقہ ہمیشہ اقتدار پر قابض رہتا ہے، ہر صدر اس قادرِ مطلق گروہ کے مفادات کے مطابق چلنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔یوں امریکی جمہوریت زندگی اور معنی سے عاری ہو چکی ہے کیونکہ عوام ان اصل لوگوں کو، جو حقیقتاً ان پر حکومت کرتے ہیں، ہٹا نہیں سکتے۔آپ کے جرنیلوں کا ترتیب دیا ہوا یہ وسیع فوجی نظام دنیا کو اپنے تین ہزار فوجی اڈوں کے ذریعے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ چند بڑی کارپوریشنوں کے معاشی مفادات جنگی صنعت اور براہ راست فوج کے ساتھ منسلک ہیں، یہ کارپوریشنیں اس بات کا تعین کرتی ہیں کہ امریکی زندگیوں کو کس طرح داؤ پر لگایا جائے۔انہی کے احکام سے امریکا دنیا کے فاقہ کش اور بے بس عوام پر حملہ کرتا ہے اور ظلم وستم روا رکھتا ہے۔میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اپنی انسانیت اور اپنی عزتِ نفس کو یاد رکھیے۔ویت نامی عوام کے خلاف یہ جنگ درندگی ہے۔یہ ایک جارحانہ جنگِ تسخیر ہے۔امریکی جنگِ آزادی کے دوران کسی نے امریکیوں کو ان کی جدوجہد کا مقصد بتانے یا انہیں ان کی مرضی کے خلاف بھرتی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔نہ امریکی سپاہیوں کو دس ہزار میل دور کسی غیر ملک جانا پڑا تھا۔امریکا کی انقلابی جنگ میں امریکیوں نے غیر ملکی سپاہیوں (برطانوی نوآبادیاتی افواج) کے خلاف کھیتوں اور جنگلوں میں لڑائی لڑی حالانکہ ان کے بدن پر چیتھڑے تھے اور قابض فوج اس دور کی مضبوط ترین فوج تھی۔امریکیوں نے قبضہ کرنے والوں کے خلاف جنگ لڑی حالانکہ وہ بھوکے اور غریب تھے۔اس جنگِ آزادی میں امریکی انقلابیوں کو 'دہشت پسند' کہا گیا اور انہیں 'باغی' اور 'غیر منظم غول' کا نام دینے والے (برطانوی) نوآبادیاتی حاکم تھے۔'

برطانیہ کے عظیم فلسفی برٹرینڈ رسل نے آج سے ۴۰ برس پہلے ویت نام میں امریکا کی فوجی

مداخلت کے خلاف جس جرأت مندانہ موقف کو اختیار کیا تھا وہ انسانی ضمیر کی تاریخ کا ایک تابندہ باب ہے۔ انہوں نے امریکی عوام کو یہ سچ بتایا تھا کہ 'کمیونسٹ شیطانیت' کے خلاف امریکا جس 'مقدس جنگ' کا دعویٰ کررہا ہے وہ جنگ دراصل ہندچینی اور جنوب مشرقی ایشیا میں اس کے معاشی مفادات اور بالادستی کی جنگ ہے۔ آج ۲۰۰۱ء میں امریکا 'دہشت گردی کے شیطان' کو مٹانے کی ایک اور 'مقدس جنگ' لڑ رہا ہے۔ اس جنگ میں بھی جدید ترین مہلک ہتھیار استعمال ہورہے ہیں۔ چند دنوں کے اندر سینکڑوں بے گناہ افغان مرد، عورتیں اور بچے ہلاک ہوچکے ہیں۔ زمینی کارروائی کے بعد جو کچھ افغانستان میں ہوسکتا ہے اس کا تصور بھی محال ہے۔ افغانستان ایک ایسے خطے میں واقع ہے جس کے چاروں طرف وہ ملک آباد ہیں جو قدرتی وسائل کے اعتبار سے ۱۹۶۰ء کے ہندچینی اور جنوب مشرقی ایشیائی ممالک سے کہیں زیادہ مالا مال ہیں۔ ۱۲را کتوبر کو صدر بش نے یہ واضح کردیا ہے کہ فوجی مشن مکمل ہونے کے بعد بھی امریکا افغانستان میں رہے گا۔ یہ بات بھی صاف لفظوں میں کہہ دی گئی ہے کہ جنگ دو برس یا اس سے بھی زیادہ جاری رہ سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دنیا کو یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ موجودہ جنگ کو روایتی ہتھیاروں تک محدود رکھنے کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

دکھ اس بات کا ہے کہ آج ہماری دنیا فکری طور پر مفلس ہوچکی ہے۔ برٹرینڈ رسل، کمیونزم کے مخالف تھے لیکن انہوں نے نظریاتی وابستگیوں کو بالائے طاق رکھ کر اصولوں کی بنیاد پر ویت نام میں امریکی مداخلت کی بھرپور مخالفت کی۔ آج اس پائے کے اصول پسند فلسفی اور دانشور سے ہم محروم ہیں۔ آج نہ برطانیہ میں برٹرینڈ رسل ہے، نہ فرانس میں نوبل انعام کو ٹھکرانے والا سارتر ہے اور نہ پاکستان میں ان دونوں کا ساتھی کوئی محمود علی قصوری ہے۔ یہاں اب اگر کچھ ہے تو صرف جی حضوری ہے!

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۱۷را کتوبر ۲۰۰۱ء

بول اے امریکا بول!

ٹیگور کا 'کابلی والا' کابل کی گلیوں میں کب کا مارا جا چکا، کابل کے خربوزے جو مغل بادشاہ بابر کو بہت محبوب تھے ان میں بارود کی بو ہے اور قندھار سے آنے والے انار بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ایسے دنوں میں مجھے چالیس برس پرانا ایک خونیں واقعہ یاد آیا۔ یہ سانحہ پیرس میں پیش آیا تھا، وہی پیرس جس کے درمیان سے دریائے سین گزرتا ہے اور جہاں انقلاب فرانس ایسا عہد آفریں واقعہ رونما ہوا تھا۔ اسی پیرس اور دریائے سین نے ۱۷؍اکتوبر ۱۹۶۱ء کو ایک عجیب نظارہ دیکھا، لیکن ٹھہریں اس سے پہلے یہ گوش گزار کردوں کہ ان دنوں الجزائر کی جنگ آزادی اپنے عروج پر تھی۔ الجزائر شمالی افریقہ میں فرانس کی ایک نوآبادی تھی اور فرانسیسیوں نے اس کے باشندوں کو جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی کچلنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ہزاروں الجزائری مزدور، کلرک اور طالب علم، فرانس میں روزگار کی خاطر یا تعلیم حاصل کرنے کے لیے مقیم تھے۔ ان میں سے اکثریت اپنے نوآبادیاتی آقاؤں کے خلاف تھی اور اکثر الجزائر کی سرزمین پر آزادی کی جنگ لڑنے والے ہم وطنوں کے حق میں جلسے جلوس کرتی رہتی تھی۔ فرانس کے متعدد دانشوروں اور ادیبوں کا اصرار تھا کہ فرانس کو الجزائر سے نکل جانا چاہیے اور الجزائریوں کو آزادی سے جینے کا حق ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس OAS فرانس کی وہ خفیہ فوجی ایجنسی تھی جس کے خیال میں ظلم وتشدد کے ذریعے اس جدوجہد کو کچلنا فرانس کے 'قومی مفاد' میں تھا۔ ان دنوں OAS نے پیرس میں رنگ کی بنیاد پر کرفیو کے نفاذ کا اعلان کیا، اس حکم نامے کے مطابق پیرس میں رہنے والے الجزائری باشندوں سے غروب آفتاب کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے گھر سے باہر نکلنے کا حق چھین لیا گیا تھا۔ یہ ایسا اعلان تھا جس نے عام الجزائری باشندوں اور ان کے مٹھی بھر ہمدرد

فرانسیسیوں کو برافروختہ کردیا، اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے 'الجزائر نیشنل لبریشن فرنٹ' کے پرچم تلے ہزاروں مسلمان مزدوروں اور طالب علموں نے پیرس میں ایک جلوس نکالا۔ یہ جلوس کرفیو کے اس حکم نامے اور الجزائر میں فرانسیسی فوج اور پولیس کے مظالم کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔

پیرس جس کی سڑکوں سے والٹیر اور روسو گزرے، جہاں بیستائل گرایا گیا اور انقلاب فرانس نے جنم لیا، جس کے شہریوں نے اس انقلاب کے دوران 'آزادی، مساوات اور بھائی چارے' کا نعرہ لگایا تھا، اپنے بادشاہ اور ملکہ کا سر قلم کیا تھا، اسی پیرس کی سڑکوں پر آزادی سے جینے کا حق مانگنے والے الجزائری مسلمانوں پر پیرس کی پولیس نے پہلے لاٹھی چارج کیا اور جب اس مار سے بچنے کے لیے لوگوں نے بھاگنا شروع کیا تو پولیس کے سورما بھگدڑ میں گرنے والوں کو اٹھا اٹھا کر دریائے سین میں پھینکنے لگے۔ گولیاں چلا کر اور کھدیڑ کر لگ بھگ بارہ ہزار مظاہرین ایک قریبی اسٹیڈیم میں لے جائے گئے۔ اس اسٹیڈیم میں فٹ بال کھیلی جاتی تھی لیکن فرانسیسی پولیس نے اس روز مظاہرین کے خون سے ہولی کھیلی۔ نہتے لوگوں کو گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیا گیا۔ فرانسیسی حکومت کے 'پہلے بیان' کے مطابق صرف تین مظاہرین ہلاک ہوئے۔ ۱۹۹۹ء میں اس قتل عام کی نئے سرے سے تحقیقات شروع ہوئی تو حکومت نے ہلاک شدگان کی تعداد ۴۸ بتائی جبکہ عینی شاہدین اور حقوقِ انسانی کے سرگرم کارکن اس وقت سے آج تک یہی کہتے رہے ہیں کہ اس روز سینکڑوں افراد ہلاک ہوئے تھے۔ یوں کہہ لیجیے کہ وہ پیرس کا جلیانوالہ باغ تھا۔

۱۷/اکتوبر ۱۹۶۱ء کی شام جو الجزائری پیرس کی مٹی پر اپنے خون کا چھڑکاؤ کر گئے، آج ان کے اپنے رشتہ داروں کو بھی شاید ان کے نام یاد نہ ہوں لیکن 'خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا'......اب چالیس برس بعد ان بے گناہوں کے قتل عام کو فرانس کی سوشلسٹ حکومت نے برسر عام نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اسے 'ریاستی دہشت گردی' قرار دیا ہے۔ ۱۷/اکتوبر ۲۰۰۱ء کو پیرس میں ایک سرکاری تقریب ہوئی۔ اس تقریب میں پیرس کے سینٹ مائیکل برج کے قریب نیشنل پولیس ہیڈ کوارٹر کے مقابل فرانسیسی وزیر نے ایک تختی کی نقاب کشائی کی جس میں ۱۷/اکتوبر ۱۹۶۱ء کے بے گناہ الجزائری مقتولین کو یاد کیا گیا۔ یہ وہی پل ہے جس پر سے درجنوں الجزائری مظاہرین کو فرانسیسی پولیس نے دریائے سین میں پھینک کر ٹھکانے لگایا تھا، تختی جس پولیس ہیڈ

کوارٹر کے سامنے نصب کی گئی ہے، وہیں سے قاتلوں کے دستے نکلے تھے اور انہوں نے نہتوں کو نشانہ بنانے میں عار محسوس نہیں کیا تھا۔ 'اعتراف جرم' کی اس تقریب میں سینکڑوں فرانسیسی دانشوروں، ادیبوں، حقوقِ انسانی کے سرگرم کارکنوں اور طلبہ نے شرکت کی۔

اپنی نوآبادی کے باشندوں کے قتل عام کا اعتراف کرنا ایک بہت مشکل کام ہے، موجودہ فرانسیسی حکومت نے یہ کیا تو خوب کیا۔ لیکن اصل داد ان '۱۲۱'، فرانسیسی دانشوروں اور ادیبوں کو ملنی چاہیے جنہوں نے اس وقت اپنی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا جب فرانس کی فوجی خفیہ ایجنسی OAS کو ریاستی دہشت گردی کی چھوٹ تھی اور اس نے الجزائری تو دور کی بات ہے، اہم ترین فرانسیسیوں کا بھی جینا حرام کر رکھا تھا۔ یہ وہی '۱۲۱'، باضمیر فرانسیسی ہیں جنہوں نے الجزائر کی آزادی کے لیے ایک اعلان نامے پر دستخط کیے تھے اور ان میں سے بیشتر گرفتار کر لیے گئے تھے۔ وہ جو گرفتار نہیں کیے گئے ان میں ژاں پال سارتر اور سیمون دی بووا کا نام سرفہرست ہے۔ ان لوگوں کو 'غدار'، 'وطن فروش' کہا گیا، انہیں قتل کی دھمکیاں دی گئیں، جان کے خوف سے سارتر اور سیمون نے پیرس میں نیم روپوشی کے دن گزارے، جس خستہ حال بلڈنگ میں پناہ لی، اس کا OAS والوں کو علم ہوا تو اس میں بم دھماکہ کرایا گیا، جس کی ہلاکت خیزی سے یہ دونوں بال بال بچ نکلے لیکن دو منزلیں اڑ گئیں۔ ان کا پہلا قصور الجزائر کی تحریک آزادی کی حمایت میں تحریر، تقریر، جلسے جلوس اور دھرنا دینا تھا۔ دوسرا قصور یہ تھا کہ سیمون دی بووا نے ایک الجزائری وکیل غزلی حلیمی کے ساتھ مل کر ایک کتاب 'جمیلہ بوپاشا' لکھی تھی۔ یہ اس الجزائری حریت پسند لڑکی کے بارے میں تھی جسے فرانس کی خفیہ ایجنسیوں نے بدترین جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کتاب نے ساری دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیا اور فرانسیسی استعمار کا چہرہ لوگوں کے سامنے عریاں ہوگیا۔ اسی طرح سارتر نے ایک الجزائری عیسائی فرانز فینن کی کتاب کا دیباچہ لکھا، فینن کی اس کتاب اور سارتر کے اشتعال انگیز دیباچے نے فرانس میں آگ لگا دی اور ہر دوسرے چوتھے پیرس میں مظاہرے ہونے لگے۔ ان میں سے ایک مظاہرہ فرانس کی خفیہ ایجنسی OAS کے خلاف ہوا جس میں پولیس تشدد سے چھ افراد ہلاک ہوئے، ہلاک ہونے والوں میں ۱۶ ربرس کا ایک نوجوان بھی تھا۔ اس نوجوان کی ہلاکت نے لوگوں کو اتنا مشتعل کیا کہ پیرس کی تمام ٹریڈ یونینوں نے اگلے دن ہڑتال اور ہلاک شدگان کے جلوس جنازہ کا اعلان کر دیا۔ اگلے روز سارا پیرس بند تھا اور جلوس جنازہ میں ایک

اندازے کے مطابق سات لاکھ سے زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔ سارتر نے الجزائر کے فرانز فینن جیسے انقلابی اور باغی کی کتاب کے دیباچے میں لکھا: 'یورپ والو! تم اس کتاب کو اٹھاؤ اور اس میں داخل ہو جاؤ۔ اندھیرے میں چند قدم چلنے کے بعد تمہیں آگ کے گرد کچھ اجنبی نظر آئیں گے، ذرا قریب آؤ اور سنو، وہ تمہارے تجارتی مرکزوں اور ان کی حفاظت کرنے والے کرائے کے سپاہیوں کے مقدر کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔............ یہ بھی ایک پُر لطف بات ہے کہ عدم تشدد میں یقین رکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو ظالم ہیں اور نہ مظلوم۔ اچھا ٹھیک ہے، اگر آپ مظلوم نہیں تو جب وہ حکومت جو آپ کے ووٹ سے قائم ہوئی، اور جب وہ فوج جس میں آپ کے چھوٹے بھائی کسی جھجک یا ندامت کے بغیر ملازمت کر رہے ہیں، نسل کشی پر تُل گئی ہو تو آپ بلاشک وشبہ ظالم ٹھہرتے ہیں۔...... آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم نے 'نو دریافت براعظموں' میں پہنچ کر پہلے سونا نکالا، دوسری دھاتوں پر ہاتھ صاف کیا، پھر پٹرول کی باری آئی۔ ہم یہ سب چیزیں اور ان سے حاصل ہونے والی دولت اپنے ملکوں میں لے آئے، اس کے نتائج شاندار نکلے جیسا کہ ہمارے محلات، ہمارے گرجا گھروں اور ہمارے عظیم صنعتی شہروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ...... ہم استعمار کے ان جرائم میں شریک ہیں، اس لیے کہ ہم میں سے ہر ایک نے استعماری استحصال سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اے یورپ سے بھی بڑھ کر، وحشی شمالی امریکا، بول! آزادی، مساوات، انسانی برادری، محبت، وقار، حب الوطنی، تیرے پاس ان لفظوں کے سوا کیا ہے؟'

الجزائر ۱۹۶۲ء میں آزاد ہوا، اس جنگ آزادی کو کامیاب بنانے میں سارتر، سیمون اور متعدد دوسرے دانشوروں کے کردار پر لکھنے کے لیے سینکڑوں صفحے درکار ہیں۔ آج یہ سارے نام یاد آ رہے ہیں تو اس لیے کہ فرانسیسی حکومت نے چالیس برس بعد سہی الجزائریوں کے سامنے اپنے استعماری جرائم کا اعتراف تو کیا۔ آج مجھے فرانز فینن کا یہ جملہ یاد آ رہا ہے کہ: 'یورپ نے ہمارے براعظموں پر اپنا پنجہ گاڑ رکھا ہے، ہمیں اس کی انگلیاں اس وقت تک چھیلتے رہنا چاہیے جب تک کہ وہ ہمیں چھوڑ نہیں دیتا۔' میرا جی چاہتا ہے کہ میں سارتر کے اس جملے کو ایک بار پھر پوری قوت سے دہراؤں 'اے وحشی شمالی امریکا بول! آزادی، مساوات، انسانی برادری، محبت، وقار، حب الوطنی، تیرے پاس ان لفظوں کے سوا اور کیا ہے؟' میں اس روز کی منتظر ہوں جب واشنگٹن میں وائٹ ہاؤس کے بالمقابل کسی مناسب مقام پر اس تختی کی نقاب کشائی ہو جس میں کوریا، ویت نام، نکارا

گوا، چلی، عراق اور افغانستان کے بے گناہ بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کی ہلاکتوں کا اعتراف کیا گیا ہو۔ فرانس میں یہ دن چالیس برس بعد آیا لیکن تاریخ استعماری طاقتوں کو اب اپنے پیروں میں گھنگھروؤں کی طرح باندھے تیزی سے رقص کررہی ہے۔ اسی لیے مجھے یقین ہے کہ امریکا میں وہ دن جلد آئے گا جب ۷/اکتوبر ۲۰۰۱ء سے شروع ہونے والے افغان قتل عام کا اعتراف سرکاری سطح پر کیا جائے۔ غیر سرکاری سطح پر اس کے خلاف احتجاج ساری دنیا میں ہی نہیں، امریکا میں بھی ہورہا ہے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۲۴/اکتوبر ۲۰۰۱ء

جنگ، جرنیل اور فلسفی

والٹیر کا کہنا تھا کہ 'تاریخ...... انسانی جرائم، لغزشوں اور بدنصیبیوں کا روزنامچہ ہے۔' والٹیر نے اس سے آگے کی بات نہیں لکھی کہ یہ وہ روزنامچہ ہے جسے مرتب کرنے کی 'سعادت' حکمرانوں اور جرنیلوں کے حصے میں آئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے محلوں اور مورچوں میں محفوظ و مامون رہتے ہیں اور شہروں، بستیوں، ان میں بسنے والے انسانوں اور انسانی تمدن کو کبھی 'حب وطن'، کبھی 'نظریے کی بالادستی' اور کبھی 'عقیدے کی سربلندی' کے نام پر جنگ کے شعلوں میں جھونکتے رہتے ہیں۔ ان حکمرانوں اور جرنیلوں کو وہ فلسفی اور دانشور، ادیب یا شاعر ایک آنکھ نہیں بھاتے جو امن کی بات کرتے ہیں اور جنگ سے نفرت کا اظہار برملا کرتے ہیں۔ اسی صورت حال کا جائزہ بیسویں صدی کے مشہور مورخ اور دانشور ول ڈیوراں اور ایریل ڈیوراں نے اپنی مشترک کتاب The Lessons of History میں بہت خوبصورتی سے لیا ہے۔ ان دونوں قاموسی شخصیات نے دس جلدوں میں انسانی تمدن کی تاریخ لکھی ہے جس کی تاریخی حیثیت اور اہمیت اکیسویں صدی میں کم ہونے کی بجائے بڑھ جائے گی۔

ان دونوں کا کہنا ہے کہ ہر صدی میں فوجی جرنیلوں اور حکمرانوں نے جنگ کے خلاف فلسفیوں اور دانشوروں کے خیالات کا مذاق اڑایا ہے۔ ان جرنیلوں کے خیال میں تاریخ کی فوجی تعبیر یہ ہے کہ آخرکار جنگ ہی فیصلہ کن ٹھہرتی ہے۔ ان کے خیال میں چند بزدل اور سادہ لوح انسانوں کے سوا سب ہی مانتے ہیں کہ جنگ انسانی فطرت کے عین مطابق بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ ایسے لوگ سوال کرتے ہیں کہ چارلس مارٹیل کو اگر ۷۳۲ء میں طولوس کے مقام پر فتح نصیب نہ ہوتی تو آخر فرانس کو حلقہ بگوش اسلام ہونے سے کون روک سکتا تھا؟ اسی طرح ہمارے کلاسیکی ورثے کا

کیا حشر ہوتا اگر منگولوں اور تاتاریوں کے حملوں کی جنگ کے ذریعے مزاحمت نہ کی جاتی؟ مانا کہ لڑائی کے میدان میں بہت سارے نوجوان مارے جاتے ہیں لیکن جرنیلوں کا کہنا ہے کہ موٹر کار کے حادثات میں اس سے کہیں زیادہ لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ نوجوانوں کو چونکہ جلد یا بدیر موت آنی ہی ہے لہٰذا انہیں اپنے ملک کی خاطر میدان جنگ میں زخمی یا ہلاک ہوکر، ناموری کی تابناک آغوش میں جان دینے سے کیوں روکا جائے؟

ایک فلسفی جو تاریخ سے واقف ہے وہ بھی یقیناً یہی کہے گا کہ طویل عرصہ تک حالت امن میں رہنے سے کسی بھی قوم کے اعصاب مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی جنگجویانہ صلاحیتیں کھو بیٹھتی ہے۔ لہٰذا ہر قوم کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ہر وقت اپنے دفاع کے لیے تیار رہے۔ اس کے علاوہ بنیادی نوعیت کے مفادات پر آنچ آ رہی ہو تو اسے یہ حق ملنا چاہیے کہ اپنی بقا کے لیے ایسے تمام ذرائع استعمال کرے جنہیں وہ ضروری خیال کرتی ہے۔ گویا اپنی حفاظت کا مسئلہ درپیش ہو تو احکام عشرہ (Ten Commanents) کو تہہ کر کے رکھ دینا چاہیے۔

جرنیلوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ امریکا کو چاہیے کہ مغربی تمدن کو خارجی خطرات سے بچانے کا بیڑا اٹھائے، اسے اس اہم ذمہ داری کو اسی طرح نبھانا چاہیے جس طرح برطانیہ انیسویں صدی میں اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتا رہا ہے۔ یہ جرنیل بین الاقوامی سیاست کا جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا کے ساتھ ساتھ یورپ پر بھی اپنے اقتدار اور بالادستی کو قائم رکھنے کی خاطر امریکا کو مستقبل کے معاملات پر نظر رکھنی چاہیے۔ اسے خود کو اپنی جغرافیائی حدود تک محدود نہیں کرنا چاہیے اور نہ دشمن ملکوں کو اپنے اطراف گھیرا ڈال دینے کی اجازت دینی چاہیے کہ وہ اس کی منڈیوں پر اور سامانِ تجارت تک اس کی رسائی کے راستوں پر قبضہ کر لیں۔ یہ جرنیل یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ کیا امریکا کو بھی محاصرے میں گھری ہوئی کسی قوم کی طرح اپنے دشمنوں کی پیروی میں ہر ہر قدم پر امریکا ایسے آزاد ملک پر ایک آمرانہ طرز حکومت مسلط کرنے پر مجبور ہو جانا پڑے ہوگا؟ کیا یہ دانشمندی کا تقاضا نہیں کہ فی الفور اس خطرہ سے نمٹنے کا اہتمام کیا جائے اور جنگ کو دشمن کی اپنی سرحدوں میں پہنچا دیا جائے، اور امریکا کے باہر کسی اور سرزمین پر جنگ لڑی جائے۔ اگر ضرورت پڑے تو امریکی سپاہیوں اور دس لاکھ کے قریب غیر فوجی شہریوں کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا جائے تاکہ کسی قیمت پر بھی امریکا کی آزادی اور سلامتی سلب نہ ہونے پائے۔

کیااس قسم کی دوراندیشانہ حکمت عملی تاریخ کے دیے ہوئے سبق سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں؟

دل دیوراں اور ایریل دیوراں نے جہاں جرنیلوں کی زبان سے یہ سوالات اٹھائے ہیں وہیں ان کی دلیلوں کے جواب میں فلسفی سے کہلوایا ہے کہ آپ حکمرانوں اور جرنیلوں کی مسلط کردہ جنگوں کے نتائج بھی تاریخ کے دہرائے ہوئے سبق کی طرح تباہ کن ثابت ہوں گے۔فرق صرف اتنا ہوگا کہ لڑنے والی طاقتوں کی بڑھی ہوئی تعداد اور نقل وحمل کی سہولتوں اور بے پناہ مہلک ہتھیاروں کے استعمال کی بدولت، کئی گنا زیادہ تباہی ہوگی۔تاریخ سے بڑھ کر ایک اور چیز ہے یعنی کسی جگہ کسی وقت تو ہم انسانیت کے نام پر ہزار ہا قسم کی برائیوں کو للکاریں اور چین میں سو کے لگ بھگ نئے ہیروشیما کی مثالیں قائم کرنے سے گریز کریں خواہ ہمیں اس کی کتنی ہی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے۔فلسفی جرنیلوں کو ایڈمنڈ برک کی بات یاد دلاتا ہے جس نے کہا تھا 'سیاست میں فراخدلی اور وسیع القلبی ہی اصل دانشمندی ہے۔' فلسفی حکمرانوں اور جرنیلوں سے کہتا ہے کہ وہ اس خط پر بھی غور کرتے چلیں جو ایک امریکی صدر نے چین اور روس کے ارباب اقتدار کے نام لکھا تھا اور کہا تھا' آیئے ہم ایک دوسرے کے لیے اپنے اپنے ملک کے دروازے کھول دیں اور ثقافتی وفود کے تبادلوں کا انتظام کریں تاکہ ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے اور ایک دوسرے کے مسائل سے واقف ہونے کی راہ ہموار ہو۔ہمیں ہرگز یہ خوف دامن گیر نہیں کہ آپ کا معاشی نظام ہمارے معاشی نظام کی جگہ لے لے گا اور نہ آپ کو اس اندیشے میں مبتلا رہنا چاہیے کہ ہمارا نظام آپ کے نظام کو بے دخل کردے گا۔ہمیں یقین ہے کہ دونوں نظاموں کے ایک دوسرے سے تعاون کے ذریعہ ہم دونوں پرامن طور پر ساتھ ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں۔شاید ہم دونوں ہی اپنے دفاع کا معقول و مناسب انتظام کرتے ہوئے دوسری مملکتوں کے ساتھ عدم جارحیت اور دہشت گردی کے خاتمے کے معاہدوں کا بندوبست کرسکتے ہیں۔ان معاہدوں کی بدولت ایک ایسا عالمی نظام معرض وجود میں آسکے گا کہ جس میں ہر قوم کی انفرادیت اور حاکمیت جوں کی توں قائم رہے اور اگر اس پر کوئی پابندی عائد بھی ہو تو صرف ان سمجھوتوں کی روشنی میں ہو جو کسی دباؤ کے بغیر آزادانہ طے کیے جائیں۔ہم آپ سے کہتے ہیں کہ تاریخ کے معینہ راستوں سے انحراف کرتے ہوئے شائستگی اور مملکتوں کے مابین مہذب تعلقات کے فروغ کے لیے ہم نے جس عزم کا اظہار کیا ہے اس میں ہمارا ساتھ دیں۔ہم اپنی عزت وتوقیر کی خاطر پوری انسانی برادری سے یہ عہد کرتے ہیں کہ اس خطرناک کام کا بیڑا اٹھاتے ہوئے ہم پورے خلوص اور دیانت داری کا مظاہرہ کریں گے۔اگر یہ

جوا ہے اور اگر ہم یہ بازی ہار بھی جائیں تو اس کے نتائج ان متوقع نتائج سے زیادہ برے نہیں ہوسکتے جو جنگ کی روایتی حکمت عملی پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں ظہور پذیر ہوں گے، اگر آپ اور ہم کامیاب ہو جائیں تو آنے والی نسلیں احسان مندی اور ممنونیت کے جذبات کے ساتھ صدیوں تک ہمیں یاد کرتی رہیں گی۔'

یہ سن کر جرنیل کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے اور وہ یوں گویا ہوتا ہے: 'تم فلسفیوں نے تاریخ کے پڑھائے ہوئے سارے سبق بھلا دیے ہیں۔ بعض تنازعات اس قدر بنیادی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ گفت وشنید کے ذریعہ ان کا حل ناممکن ہے اور یہ بھی ہے کہ طویل مذاکرات کے دوران بھی تخریب کاری کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ کوئی عالمی نظام کسی ایسے سمجھوتے کے تحت جو دو شریف آدمیوں کے مابین طے پا رہا ہو معرض وجود میں نہیں آئے گا۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ کوئی ایک بڑی طاقت فیصلہ کن کامیابی حاصل کر لے تب وہ بڑی طاقت اس کی اہل ہو گی کہ بین الاقوامی قوانین کو منوا سکے اور اسے نافذ بھی کر سکے۔ طویل عرصہ تک امن کا دور دورہ نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ اس کی حیثیت استثنائی ہے اور جوں ہی فوجی طاقتوں کا توازن بگڑ جائے وہ درہم و برہم ہو کر رہ جائے گا۔ پس مملکتوں کے اتحاد اور امداد باہمی کی ایک ہی بنیاد ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ ان پر کوئی بیرونی حملہ آور ایک ساتھ چڑھائی کر دے۔ ہوسکتا ہے کہ دوسرے ستاروں اور سیاروں کی کسی حوصلہ مند مخلوق کے ساتھ ہماری مڈبھیڑ ہو جائے اور سیاروں کے مابین جنگ کا سلسلہ شروع ہو جائے، صرف اسی صورت میں، ہم دنیا والے سب کے سب ایک ہو جائیں گے۔'

دل دیوراں نے جرنیل اور فلسفی کے درمیان ہونے والا مکالمہ اسی جملے پر ختم کیا ہے۔ تو کیا اب ہم افغانستان اور عراق پر ہونے والی بمباری کے خاتمے کے لیے اس دن کا انتظار کریں جب کوئی بیرونی مخلوق ہماری دنیا پر حملہ آور ہو...... اور آج کے حملہ آور اپنی تمام توپوں کا رخ دوسرے سیارے سے آنے والے حملہ آوروں کی طرف موڑ دیں؟ اس دن کے انتظار سے بہتر ہے کہ طاقت پر دانش کی فتح کے لیے جدوجہد جاری رکھی جائے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۷ نومبر ۲۰۰۱ء

آخر ضمیر بھی کوئی چیز ہے

کسی اَن جانی یا جانی پہچانی طاقت کا خوف افراد اور اقوام کی تخلیقی صلاحیتوں، ان کی عزتِ نفس اور ان کے اندر سانس لینے والی اعلیٰ اقدار کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ آج تیسری دنیا کے بہت سے ملکوں اور بہ طور خاص عرب ملکوں کے حکمران اور عوام کی اکثریت ایک ایسے ہی خوف سے دوچار ہے۔ ایک سابق ڈائریکٹر سی آئی اے نے اسی اجتماعی خوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ 'افغانستان کے معاملے میں امریکا کی کامیابیوں کے حوالے سے عرب عوام کی خاموشی یہ ظاہر کرتی ہے کہ صرف خوف ہی وہ ہتھیار ہے جو دنیا بھر میں امریکا کی عزت اور تکریم کا سبب بن سکتا ہے۔'

ملایشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد نے غیر وابستہ تحریک کی حالیہ کانفرنس کے اختتامی حصے میں امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خوف کی اسی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ: 'فضائی سفر سے خوف زدہ ہیں، مختلف ملکوں سے خوف زدہ ہیں، دراز ریش ایشیائیوں سے خوف زدہ ہیں، ہوائی کمپنیوں کے مسافروں کے جوتوں سے خوف زدہ ہیں، لفافوں اور پارسلوں سے، سفید سفوف سے خوف زدہ ہیں۔'

امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خوف کی اپنی ایک جہت ہے جسے وہ پوری دنیا پر قبضے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری طرف تیسری دنیا اور بہ طور خاص عرب ملکوں کے خوف کا عالم کچھ اور ہے۔ اس بارے میں مہاتیر محمد کا کہنا تھا کہ: 'وہ ملک جو مبینہ طور سے اپنی سرزمین پر دہشت گردوں کو پناہ دے رہے ہیں، ان کے عوام بے گناہ ہوں یا نہ ہوں، خوف زدہ ہیں۔ وہ جنگ سے، بمباری کے دوران مارے جانے اور معذور ہو جانے سے، سینکڑوں میل دور بیٹھی ہوئی اور نظر نہ

آنے والی طاقتوں کی طرف سے چلائے جانے والے میزائلوں سے خوفزدہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اپنے ملکوں کی تباہی کی راہ میں وہ رکاوٹ ہیں، اس لیے وہ ہلاک کر دیے جائیں گے۔'

خوف کی یہ وہ قسم ہے جس نے تیسری دنیا کے بیشتر ملکوں کی حکومتوں اور عوام کو مفلوج کر دیا ہے۔ امریکا اپنی بے پناہ فوجی طاقت کے بل پر صرف تیسری دنیا کو ہی آنکھیں نہیں دکھا رہا، وہ ان ترقی یافتہ ملکوں کو بھی اپنے احکامات کی تابعداری پر مجبور کرنا چاہ رہا ہے، جو آزادانہ فیصلے کر رہے ہیں، جنگ کے خلاف ہیں اور جن کا خیال ہے کہ بے گناہ عراقیوں پر موت اور بربادی صرف اس لیے مسلط کی جارہی ہے کہ اول تو امریکا عراق کے تیل پر قبضہ کر کے دنیا کی واحد فوجی طاقت کے ساتھ ساتھ دنیا کی واحد صنعتی اور اقتصادی قوت بننے کا خواہش مند ہے، دوسرے وہ عراق پر قبضے کے بہانے شرق اوسط کا نقشہ تبدیل کرنے پر تُلا ہوا ہے تاکہ اپنے سیاسی، معاشی اور فوجی عزائم کی بھرپور انداز سے تکمیل کر سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عراق کو ان ملکوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دینا چاہتا ہے جو اس کے فرامین پر بے چوں و چرا عمل کرنے کے لیے تیار نہیں۔

یہ درست ہے کہ خوف کے ہتھیار سے دنیا کے تمام طاقتور افراد اور اقوام نے ہمیشہ کمزوروں کو کچل کر رکھا ہے، انہیں مسلسل خوف میں مبتلا رکھنا طاقتور اقوام یا افراد کی حکمت عملی رہی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بے انتہا خوف کے بطن سے ہی بے خوفی اور بہادری جنم لیتی ہے۔ تنگ آمد بہ جنگ آمد کا محاورہ ایسی ہی صورت حال کے لیے ایجاد ہوا ہے۔

غیر وابستہ ممالک کی سربراہی کانفرنس کے اختتام پر مہاتیر محمد سے کہا گیا کہ آپ نے اپنی افتتاحی تقریر میں غیر وابستہ ملکوں کا موقف بہت جرأت سے پیش کیا ہے جبکہ واحد عالمی طاقت امریکا، ترقی پذیر ملکوں کے سربراہوں سے جرأتمندانہ باتیں سننے کی عادی نہیں، تو کیا اس جرأت کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو خوف محسوس نہیں ہوا؟ مہاتیر محمد نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ 'اس وقت امریکا سے دنیا کا ہر شخص خوفزدہ ہے، امریکی حکمران جب اور جس کی چاہیں گردن اتار سکتے ہیں، میں بھی ان سے خوفزدہ ہوں، لیکن آخرکار ضمیر بھی کوئی چیز ہے۔'

'ضمیر' جس کا نام مہاتیر محمد نے اپنے انٹرویو میں لیا، دراصل ہر انسان کے اندر چھپا ہوا وہ ہتھیار ہے جو انسانی شعور سے پھوٹتا ہے۔ اس ہتھیار کے ذریعے وہ اپنے نفس کی ہر برائی سے لڑتا ہے اور اجتماعی معاملات میں بھی یہی ہتھیار اسے اپنے عہد کے فرعون، ہامان اور یزید سے لڑنے کا

ارادہ اور حوصلہ بخشتا ہے۔ امریکا کا جبروت اور اس کی قہاری اپنی جگہ لیکن دوسرے ملکوں کی بات جانے دیجیے، خود امریکا میں ایسے لاکھوں زندہ ضمیر موجود ہیں جو بدترین موسم میں بے گناہ عراقیوں کے لیے سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور تہذیبوں کے تصادم، صلیبی جنگ اور عیسائیت بہ مقابلہ اسلام کے مفروضوں کو اپنے ضمیر کی قوت سے رد کرتے ہیں۔

ہمارے سامنے وہ مناظر بھی ہیں جن میں ہم تین ہزار کے لگ بھگ افراد کے اس امن کارواں کو دیکھتے ہیں جو زمینی راستے کے ذریعے لندن سے بغداد پہنچا اور جس کا بغداد میں والہانہ استقبال ہوا۔ یہ امن کارواں جو تیز و تند طوفان سہتا ہوا، دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزرتا ہوا اور مختلف ملکوں کی افسر شاہی کی رکاوٹوں کو عبور کرتا ہوا بغداد پہنچا، اس کے افراد 'انسانی ڈھال' Human Sheild بننے کے لیے آئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم جنگ سے نفرت کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عراقی عوام بے گناہ ہیں، ان کی حکومت کی غلط کاریوں کی سزا انہیں نہیں ملنی چاہیے۔ ایک دہائی سے عائد اقتصادی پابندیوں نے عراقیوں کو نیم فاقہ کشی کی حالت سے دوچار کر دیا ہے۔ ایسے عالم میں ان پر جنگ جس طرح تھوپی جارہی ہے، وہ ظالمانہ اور سفاکانہ ہے۔ یہ سب لوگ اپنی زندگی سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کے ضمیر نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ عراق پہنچ کر اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دیں۔ اس امن کارواں میں شریک ہر فرد جنگ شروع ہونے کی صورت میں ان مقامات پر چلا جائے گا جو سب سے پہلے امریکی بمباری کی زد میں آئیں گے۔ یوں سمجھیے کہ جنگ شروع ہوتے ہی یہ لوگ موت کے خوف سے بالاتر ہو کر اپنے ضمیر کی آواز پر امریکی حملے کا شکار ہونے والے عراقیوں کے ساتھ جان سے گزر جائیں گے جن سے ان کا نسلی، مذہبی یا علاقائی رشتہ نہیں۔

دنیا بھر کے حکمران اپنے عوام کو 'حب وطن' اور 'قومی مفاد' کے نام پر ریاستی دہشتی گردی اور انسان دشمن کارروائیوں میں شریک کر لیتے ہیں۔ ایسے مواقع جب آتے ہیں تو بیشتر ملکوں کے باشندے اپنی حکومتوں کو غلط سمجھتے ہوئے بھی اس لیے خاموش رہتے ہیں کہ انہیں غدار قرار دیے جانے، گرفتار ہونے، انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ہاتھوں عقوبت خانوں میں بدترین تشدد کا شکار ہونے کا خوف ہوتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب بہت سے لوگ اپنے اس ذاتی خوف کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے ضمیر کی آواز کو اہمیت دیتے ہیں۔ ہمیں ایسے ہی سینکڑوں باضمیر امریکی ماہرینِ

تعلیم اور دانشوروں کی تعداد انسٹی ٹیوٹ فار پالیسی اسٹڈیز کی تحریک پر امریکی ریاست کی مخالفت کرتی نظر آتی ہے۔ یہ افراد امریکا کی ۴۵ بڑی یونیورسٹیوں سے وابستہ ہیں، جانتے ہیں کہ یہ موقف اختیار کر کے وہ اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو سکتے ہیں، دیگر مراعات سے محروم ہو سکتے ہیں، ایجنسیوں کی عذاب ناک 'تحقیقات' کا نشانہ بن سکتے ہیں، ان کے اہل خانہ کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے، اس کے باوجود وہ امریکی حکومت کے خلاف قراردادوں پر دستخط سے نہیں گھبراتے اور اپنے ضمیر کی آواز پر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ہم بعض اعلیٰ امریکی اہل کاروں کو اپنی حکومت کی جنگ جویانہ پالیسی کے خلاف بہ طور احتجاج مستعفی ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہم تیس لاکھ عیسائیوں کو روم میں ہونے والے امن مظاہرے میں شریک ہوتے دیکھتے ہیں، ہم ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دوسری متعدد بین الاقوامی تنظیموں اور اداروں کو امریکی بالادستی کے خلاف آواز بلند کرتے اور عراقیوں کی حمایت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہمیں وہ چند سر پھرے بھی نظر آتے ہیں جو اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہوائی غبارے سے سوئٹزرلینڈ کی ایک منجمد جھیل پر اترے، انہوں نے سرخ پینٹ سے جھیل کی سطح پر 'بش...... جنگ نہیں' لکھا اور واپس چلے گئے۔ یہ مختصر جملہ انہوں نے اتنا بڑا لکھا کہ اس علاقے میں ۳۵، ۴۰ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرنے والے طیاروں کے مسافر اس جملے کو پڑھ سکتے تھے۔ یہ بھی ان سر پھروں کے ضمیر کا مسئلہ تھا، وگرنہ انہیں کیا پڑی تھی کہ منجمد جھیل جس کی سطح تڑخ کر کسی لمحے بھی انہیں نگل سکتی تھی، اس پر اتریں اور گودا جما دینے والی سردی میں امریکی صدر کو جنگ سے باز رہنے کا مشورہ دیں۔

تیسری دنیا اور بہ طور خاص عرب ممالک کے باشندے یہ تمام خبریں سنتے ہیں، پڑھتے ہیں، ٹیلی وژن اسکرین پر اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عراق پر امریکی حملے سے سب سے زیادہ متاثر ہوں گے، جنہیں مسلسل یہ سنایا جا رہا ہے کہ عراق پر قبضے کے بعد امریکا ان کے علاقے کا نقشہ بدلنا چاہتا ہے، ان کی زندگیاں، ان کی زمینیں سب ہی کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ وہ عرب ملکوں کی سربراہی کانفرنس سے بہت سی توقعات وابستہ کر کے اجلاس کی کارروائی براہ راست سن اور دیکھ رہے ہیں۔ اچانک وہ لیبیا کے معمر قذافی اور سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ بن عبدالعزیز کے درمیان ہونے والی شدید جھڑپ سنتے ہیں۔ دونوں کف در دہن، پیر پٹختے ہوئے اجلاس سے باہر چلے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ٹیلی وژن سے دکھائی جانے والی براہ راست

کارروائی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب موت ان کے سروں پر تلی کھڑی ہے، وہ اپنے حکمرانوں کی دودلی اور نیم دلی کو دیکھتے ہیں، وہ تیل جس کی دولت کے سبب ان کے حکمران دنیا کے امیر ترین افراد میں شمار کیے جاتے ہیں، وہی تیل، وہی دولت عرب عوام کے حقوق کی لڑائی لڑنے کے لیے استعمال نہیں ہوتی۔ دولت کے اس انبار اور اقتدار سے محرومی کے خوف نے ان حکمرانوں کو کسی آزادانہ فیصلے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان حکمرانوں کا خوف اپنی جگہ لیکن ایک چیز ضمیر بھی تو ہوتی ہے...... پر کچھ یوں ہے کہ ضمیر اور ضمیر کی آواز سننے سے ان کے اور ہمارے حکمرانوں کے کان بہرے ہو چکے ہیں۔ وہ جو مسلم اُمّہ کی سربراہی کا دعویٰ کرتے نہیں تھکتے، اپنے ناجائز اور غاصبانہ اقتدار کی خاطر غیروں کے قدموں میں فرش راہ ہو چکے۔ بلند چوٹیوں پر فتح کے پھریرے لہرانے کے دعویدار، ملکی آزادی، وقار اور انا کی دھجیاں سمیٹ کر قبائے اقتدار سیتے ہیں، اسے اپنے تن پر سجاتے ہیں اور ہر ہر لمحہ اس پیوند لگی قبائے اقتدار سے محرومی کے خوف میں غلامی کی ہر شرط تسلیم کرتے جاتے ہیں۔ اپنے ان حکمرانوں کو ہم دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اقتدار کا ہما یقیناً بہت خوش رنگ اور خوب صورت پرندہ ہے لیکن ہر دل کے اندر ضمیر نامی ایک پرندہ بھی رہتا ہے، تو کیا اقتدار کا ہما اور ضمیر کا پرندہ ایک قلب اور ایک قالب میں نہیں رہ سکتے؟ ہمارے حکمرانوں کے قالب سے ضمیر کا پرندہ کیا واقعی پرواز کر چکا؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے بارے میں وہ تو کیا غور کریں گے، ہمیں ضرور سوچنا چاہیے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۵ مارچ ۲۰۰۲ء

ایٹمی اسلحہ اور زمینی حقائق

گزشتہ کئی مہینوں سے پاکستان اور ہندوستان کے لگ بھگ دس لاکھ فوجی ایک دوسرے کا نشانہ لیے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے ہیں۔ ساری دنیا ایٹمی طاقت بن بیٹھنے والے ان دونوں ملکوں کی ایک دوسرے کو دی جانے والی دھمکیوں سے ہراساں ہے۔ فلسطین اور افغانستان کے معاملات بڑی حد تک پس پشت چلے گئے ہیں اور دنیا کی بڑی طاقتوں کے اعلیٰ ترین سرکاری اہلکار 'ہٹو بچو' کی آوازوں کی گونج میں، صبح شام دِلّی اور اسلام آباد دوڑے چلے آرہے ہیں۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ انہیں اچانک برصغیر سے عشق ہوگیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں ملکوں نے پہلے تو ایٹمی طاقت بننے میں بلا جواز پھرتی دکھائی اور جب یہ صلاحیت دونوں کو حاصل ہوگئی تو اب دونوں ایک دوسرے کو ایٹم بم مار دینے کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ یہ ایسا غیر ذمہ دارانہ رویہ ہے جس سے ساری دنیا پریشان اور ناراض ہے۔

ایک طرف دونوں حکومتوں کا یہ جنگ جویانہ رویہ ہے، دوسری طرف دونوں حکومتوں نے اپنے عوام کی فلاح و بہبود کو یکسر فراموش کر رکھا ہے۔ نتیجے میں دونوں طرف کے شہری بیروزگاری، بے تحاشہ بڑھتی ہوئی آبادی، جہالت، ظلم اور ناانصافی کی دلدل میں دھنستے چلے جارہے ہیں۔ دونوں طرف مذہب کے نام پر سیاست کرنے والی جماعتوں اور طاقت کے سرچشمے پر قابض عناصر نے عوام کے شعور میں اضافے کی بجائے انہیں کچھ زیادہ تنگ دل، تنگ نظر اور جنگی جنون کا ایندھن بنا دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ زمینی حقائق کو نظر میں رکھ کر خارجہ پالیسی مرتب کرنے کی بجائے جذباتی نعروں اور کھوکھلے دعوؤں سے عوام کو بہلایا جارہا ہے۔ اربوں کھربوں روپے کی وہ رقم جو عوامی بہبود کے لیے استعمال ہوسکتی تھی، اسے بے دریغ اسلحے کی خریداری، ایٹم بم کی تعداد میں

اضافے اور ڈلیوری سسٹم کو بہتر سے بہتر بنانے پر خرچ کیا جا رہا ہے۔

ایک پاکستانی ماہر عمرانیات کے مطابق اگر جنوبی ایشیا کے ممالک سائنس اور ٹیکنالوجی کو انسانی فلاح و بہبود کے لیے بروئے کار لاتے تو یہاں کے لوگوں کو ترقی و خوشحالی کی نعمت حاصل ہوتی۔ اس کے برعکس ارباب اختیار نے جنگ جوئی کی ایسی پالیسیاں اختیار کیں جن سے وسیع پیمانے پر تباہی و ہلاکت خیزی کے سامان فراہم ہوئے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اس قدر قربانیوں کے باوجود دونوں ممالک کے عوام کو سلامتی اور تحفظ کی ضمانت نہیں ملی اور اب چند برسوں سے ان کے سروں پر ایٹمی جنگ کی تلوار بھی لٹک رہی ہے اور بین الاقوامی سطح پر ان ممالک کو عزت و وقار حاصل ہونے کی بجائے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اگر اب بھی ان حقائق کا ادراک نہ کیا گیا تو آئندہ نسلوں کو بھی اس کج فہمی کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ پاکستان کی رواں ایٹمی پالیسیوں کے جواز میں جو کچھ بھی کہا جاتا ہے اس سے قطع نظر امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں ممالک کو نہ فوجی لحاظ سے استحکام حاصل ہوا ہے اور نہ دونوں کے باہمی تعلقات جو روز اول سے بغض وعناد کا شکار ہیں، ان میں بہتری اور اصلاح کے کوئی آثار نمودار ہوئے ہیں۔ کارگل کے بعد سے فضا مزید زہر آلود ہوگئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح ہے لیکن پاکستان ان کو قطعاً خاطر میں نہیں لایا اور کارگل پر چڑھ دوڑا۔ کارگل کے جواب میں ہندوستان نے بین الاقوامی سرحد پار کر کے پاکستان کے خلاف فوجی کارروائی کا اہتمام کرلیا تھا، حالانکہ وہ یہ جانتا تھا کہ پاکستان کے پاس ایٹمی اسلحہ اور دور مار میزائل موجود ہیں۔ کارگل کا یہ واقعہ 'ایٹمی حصار' کے علمبرداروں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان نے جن متوقع فوائد کی بنیاد پر ایٹمی ہتھیار بنائے تھے ان میں سے کسی کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکا۔ ایٹمی اسلحہ سازی کے حق میں وکالت کرنے والوں کا دعویٰ تھا کہ ایٹمی ہتھیاروں کی بدولت روایتی فوجی اخراجات میں کمی آجائے گی۔ اس دعوے کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد دونوں ممالک کے فوجی اخراجات میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

مشکل دراصل یہ ہے کہ دنیا میں وہ افراد اور اقوام بہت کم ہیں جو تاریخ سے اور دوسروں کے تجربوں سے کچھ سیکھیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے حکمران بھی دوسرے ملکوں سے کچھ سیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سوویت یونین جیسی عظیم عالمی طاقت کا انجام دیکھنے کے بعد

جنوبی ایشیا کے ان ملکوں اور بہ طور خاص پاکستان کو اپنے بے پناہ دفاعی اخراجات کے حوالے سے بہت کچھ سوچنا چاہیے تھا۔ یہ بھلا کون فراموش کرسکتا ہے کہ سوویت یونین کے پاس ہزاروں ایٹمی ہتھیار تھے، اس کے روایتی ہتھیاروں کے انبار سے ساری دنیا ڈرتی تھی۔ وہ روایتی اور ایٹمی اسلحے کی تیاری کی دوڑ میں امریکا سے مقابلہ کرتا رہا، عوام کی معاشی بدحالی اور ملک کی تباہ ہوتی ہوئی معیشت کے بارے میں سوویت حکمرانوں نے کچھ نہیں سوچا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قومی پیداوار کے اعتبار سے اس کے فوجی اخراجات امریکا کے مقابلے میں تین گنا بڑھ گئے۔ سوویت معیشت کے لیے اس بوجھ کو برداشت کرنا ممکن ہی نہیں رہا، آخر کار وہ زمیں بوس ہوگئی اور ایک عظیم طاقت ایک درجن سے زیادہ ریاستوں میں تقسیم ہوکر قصۂ پارینہ ہوگئی۔

پاکستان محدود وسائل رکھنے والا ایک ملک ہے۔ اس وقت وہ ۳۶ رارب ڈالر کے بیرونی قرضوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کے اندرونی قرضے بھی کھربوں تک پہنچ چکے ہیں۔ اس کے دفاعی اخراجات میں ہر سال جس طرح اضافہ ہورہا ہے، وہ ہوشربا ہے۔ ایٹمی میزائلوں کی دوڑ اور ہندوستان سے اس کی سنگین سرحدی کشیدگی نے صرف چند مہینوں کے اندر اس کے دفاعی اخراجات میں اربوں روپے کا اضافہ کیا ہے۔ 'قومی سلامتی' کے نام پر ہونے والے یہ اخراجات اگر واقعی قوم کی سلامتی کا سبب ہوں تو ان پر کسی فاتر العقل کو ہی اعتراض ہوسکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ناقابلِ برداشت غیر پیداواری اخراجات کی بناء پر ہم تیزی سے اس مرحلے کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کے بعد حالات کسی کے قابو میں نہیں رہیں گے۔

یہ زیادہ نہیں چند برس پرانی بات ہے کہ سوویت یونین کی تحلیل کے بعد اس کی تین ذیلی ریاستوں کو وراثت میں ایٹمی ہتھیار ملے تھے لیکن ان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ان کی دیکھ بھال اور نگرانی کے اخراجات برداشت کرسکتیں چنانچہ انہوں نے این پی ٹی پر دستخط کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ یوکرین کی حالت اس قدر دگرگوں تھی کہ اس نے اپنے ایٹمی اسلحہ خانے سے نجات حاصل کرنے کے اخراجات بھی امریکا سے وصول کیے۔ یہی حالت روس کی ہے۔ اس کے لیے ایٹمی ہتھیاروں کے ذخائر پریشان کن بوجھ بن چکے ہیں چنانچہ وہ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے سابقہ 'حریف اول'، امریکا سے امدادی رقوم حاصل کرتا رہتا ہے اور ابھی چند دنوں پہلے ایک بار پھر اس نے امریکا سے ایٹمی ہتھیاروں میں کمی کے معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔

بدقسمتی سے جنوبی ایشیا میں ان معاملات اور واقعات سے سبق سیکھے بغیر ایٹمی اور روایتی اسلحے

کے حصول کی دوڑ ابھی تک پورے جوش و خروش سے جاری ہے جس کا منطقی نتیجہ بھی کچھ ایسا ہی برآمد ہوسکتا ہے جس کا ذکر سابق سوویت یونین کے حوالے سے سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ تاہم اگر خوش امیدی سے کام لیا جائے تو پھر توقع کی جاسکتی ہے کہ کوئی قوم جو جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو چکی ہو اچانک ہوش مندی، معقولیت اور دور اندیشی سے کام لینا شروع کردے اور تباہی و بربادی کی بجائے امن، سلامتی اور خوشحالی کی راہ اختیار کرے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جنوبی افریقہ اور برازیل کو مختلف حالات میں ایسے ہی معقول فیصلے کرنے کی سعادت ملی۔ جنوبی افریقہ نے ۱۹۹۱ء میں اپنے ہتھیار تلف کیے کیونکہ اسے احساس ہوگیا تھا کہ ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح ہونے کے باوجود وہاں نسل پرستی پر مبنی نظام برقرار نہیں رہ سکے گا جس کی بدولت وہ بین الاقوامی برادری میں یکہ و تنہا رہ گیا تھا۔ نسل پرست حکومت کو یہ بھی خدشہ تھا کہ جس دن وہاں سفید فام باشندوں کا اقتدار ختم ہوا تو ایٹمی ہتھیار سیاہ فام افریقی حکومت کے قبضہ میں چلے جائیں گے۔

ارجنٹائن اور برازیل کے پاس ایٹمی صلاحیت تھی لیکن انہوں نے ایک باہمی سمجھوتے کے تحت اپنی ایٹمی تنصیبات کو انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے معائنے کے لیے کھول دیا اور ایٹمی اسلحہ سازی کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ یاد رہے کہ دونوں ممالک کی ایٹمی پالیسیوں میں یہ تبدیلی فوجی اقتدار کے خاتمے اور جمہوریت کے آغاز پر عمل میں آئی۔

پاکستان میں عام انتخابات امکانی طور پر اکتوبر میں ہونے والے ہیں۔ ہم امید کرسکتے ہیں کہ ان انتخابات کے نتیجے میں ایک ایسی باشعور اور سچے مفہوم میں محب وطن حکومت برسر اقتدار آئے جو عوام کو جھوٹے دعووں سے بہلانے کی بجائے، اس کے سامنے حقائق کو پیش کرے اور یہ بتائے کہ صرف وہی قومیں اپنی سلامتی کا دفاع کرسکتی ہیں جو اقتصادی طور پر مستحکم اور معاشی طور پر خوشحال ہوں اور اس کے لیے لازمی ہے کہ ملکی وسائل کو دفاع سے زیادہ عوام کے حالات بہتر بنانے، غربت ختم کرنے اور انہیں فوری انصاف فراہم کرنے پر خرچ کیا جائے۔ عوام سے بڑی طاقت دنیا میں آج تک ایجاد نہیں ہوئی۔ اگر عوام خوشحال اور مطمئن ہیں تو پاکستان کو دنیا کی کوئی طاقت سرنگوں ہونے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ یہ تو ہم دیکھ چکے ہیں کہ 'ایٹمی طاقت' ہونے کے باوجود ہم گزشتہ چند مہینوں کے دوران دنیا کے مختلف ملکوں سے 'ڈکٹیشن' لینے پر مجبور ہوئے۔

'اردو نیوز'، جدّہ

۱۱ر جون ۲۰۰۲ء

دس بھکشوؤں کا دعائیہ امن سفر

انسان ہزاروں برس سے ایک دوسرے سے لڑتا آیا ہے، ان لڑائیوں اور جنگوں میں ان گنت انسان مارے گئے، شہر لوٹے اور جلا کر خاکستر کیے گئے لیکن ۱۹۴۵ء میں ۶ /اور ۹ /اگست کو جاپان کے دو شہر جس سفاکی سے موت کے گھاٹ اتارے گئے، اس نے ساری دنیا کو ایک ایسی نیوکلیائی تباہی کے خوف میں مبتلا کر دیا جس کی ہلاکت خیزی کی نظیر نہیں ملتی۔

دوسری جنگ عظیم میں امریکا نے دو ایٹم بم اس لیے استعمال نہیں کیے کہ وہ جاپان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ امریکی حکمرانوں کا اصل مقصد اس نئے ہتھیار کی ہلاکت خیزی کا اندازہ لگانا تھا......اور یہی نیا ہتھیار تھا جس نے امریکا کو چشم زدن میں دنیا کی نمبر ایک عظیم عالمی طاقت بنا دیا۔ اس کے بعد سوویت یونین اور چند دوسرے ملکوں نے اس کی پیروی کی۔ ۱۹۹۸ء میں اس 'نیوکلیائی کلب' کی رکنیت ہندوستان اور پاکستان نے بھی حاصل کر لی ہے۔ ان دونوں ملکوں کا 'ایٹمی طاقت' بن جانا اس وقت بہت عجیب لگتا ہے جب یہ دونوں ملک عالمی سطح پر انسانی ترقی اور خوشحالی کے حوالے سے غریب نظر آتے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو سنگین علاقائی تنازعہ موجود ہے، اور وجود میں آنے کے پہلے دن سے اب تک دونوں نے جس طرح ایک دوسرے کی دشمنی پر کمر باندھی ہوئی ہے، اس کے بعد ان دونوں ملکوں کے ایٹمی ہتھیار پوری انسانیت کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہیں۔ ان دنوں اس خطے میں جنگ کے بادل جس طرح اُمڈ کر آتے رہے اور ان دونوں ملکوں کی فوجیں اس لمحے بھی جس طور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی ہیں، اس سے ساری دنیا خوفزدہ ہے۔

یہی وہ ماحول ہے جس نے مہاتما بدھ کے ماننے والے اور عدم تشدد کو اپنا ایمان جاننے والے بدھ بھکشوؤں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ پاکستان آئیں اور یہاں سے اپنے اس دعائیہ امن سفر کا آغاز کریں جس کی منزل ہندوستان ہے۔ اس کے لیے انہوں نے ٦/اگست کا دن منتخب کیا۔ یہ وہ دن ہے جب امریکی بمبار طیارے نے ہیروشیما کی شہری آبادی پر بے سان و گمان ایٹم بم گرایا تھا۔

امن کے اس دعائیہ سفر کی رہنمائی جاپانی بھکشو تراسوا جونسی کر رہے ہیں جبکہ روس، یوکرائین، قازقستان اور کرغستان کے بھکشوان کے ساتھ ہیں۔ امن کے لیے آواز بلند کرنے والے یہ بھکشو اس سے پہلے بھی جنگ زدہ علاقوں میں جاتے رہے ہیں اور امن قائم کرنے کی کوششوں میں شریک رہے ہیں۔ ان بھکشوؤں نے خلیج کی جنگ، چیچنیا کی لڑائی اور غزہ کے مغربی کنارے پر بیت اللحم کے نیٹی ویٹی چرچ کے محاصرے کے موقع پر احتجاجی مظاہرے کیے اور دھرنا دیا ہے۔ مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے ان دس بدھ بھکشوؤں نے پاکستان کی مذہبی اور ثقافتی روایات کے احترام کے طور پر اسلام آباد میں بری امام کی درگاہ پر حاضری دی۔ اور پھر مرگلہ کی پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے ٦/اگست کو اپنے سفر کا آغاز ٹیکسلا کے آثار سے کیا۔ آج کا ٹیکسلا جو کسی زمانے میں تکشلا کہلاتا تھا، بدھ مذہب، علم و ادب اور ثقافتی روایات کا شاید سب سے بڑا مرکز تھا۔ قدیم مگدھ اور جدید بہار میں نالندہ کی عظیم بودھ علمی اور ادبی درس گاہ کے بعد دوسرا نمبر تکشلا کا تھا۔ اسی تکشلا سے یہ دس بودھ بھکشو امن کے دعائیہ سفر پر پیدل روانہ ہوئے اور اب تین ماہ تک امن کے یہ مسافر پشاور سے گندھارا تہذیب کے آثار کی زیارت کرتے ہوئے سوات جائیں گے، وہاں سے وہ لاہور آئیں گے اور واہگہ سے سرحد عبور کرتے ہوئے امرتسر کا رخ کریں گے۔ دریائے بیاس اور پھر دریائے جمنا کے کناروں پر چلتے ہوئے، متھرا سے ہوتے ہوئے وہ اجین اور سانچی پہنچیں گے جہاں بودھوں کی ایک قدیم یادگار اشوک اسٹوپا پہنچ کر ان کے اس دعائیہ امن سفر کا اختتام ہوگا۔

ان بودھ بھکشوؤں کا کہنا ہے کہ ’سرد جنگ کے خاتمے کے بعد کے دس برسوں نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے، اس دوران دنیا میں جتنے بھی مسلح تصادم ہوئے وہ کسی بھی بنیادی تنازعے یا مسئلے کو ختم نہ کر سکے بلکہ اس نوعیت کے تصادم مختلف تہذیبوں کے درمیان خلیج کو گہرا اور چوڑا کرنے کا

سبب بنے ہیں۔ اس کا نتیجہ شدید نوعیت کی مذہبی انتہا پسندی کی صورت میں سامنے آیا ہے۔
ہمارے اس امن مارچ کا مقصد پاکستان اور ہندوستان کے عوام کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کے لوگوں کو یاددلانا ہے کہ گیارہ ستمبر کے بعد جو حالیہ بحران (پاک ہند تنازعہ) ایک بہت بڑا چیلنج بن کر سامنے آیا ہے، اس کا مرکز وہ خطہ ہے جو کبھی امن کے اصولوں پر مبنی اس عظیم تہذیب کا گہوارہ تھا جو مہاتما بدھ کے آدرش پر یقین رکھتی تھی'۔

ان جاپانی بھکشوؤں کی امن یاترا کے حوالے سے مجھے جاپان کی ڈاکٹر ماریکو کٹیانو یاد آئیں، انہوں نے اوساکا یونیورسٹی سے مذاہب عالم پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے، ہندوستان اور پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے تو وہ لاہور میں تھیں۔ وہ خود اور ان کا خاندان ناگاساکی پر ہونے والے ایٹمی حملے کا شکار ہوا تھا۔ انہوں نے پاکستانی عوام کے نام ایک کھلے خط میں لکھا:

> میں نے ایٹم بم کے اثرات دیکھے ہیں۔ انہیں اپنے بدن پر محسوس کیا ہے۔ ناگاساکی پر اترنے والی قیامت کا شکار ہونے والی عورتوں میں سے ایک میری نانی بھی تھیں۔ مجھے اپنے مسخ شدہ چہرے پر اپنی نانی اور ان جیسی سینکڑوں عورتوں کے زخموں کی جلن محسوس ہوتی ہے۔ میری ایک آنکھ بصارت سے محروم ہے اور میرا بایاں ہاتھ مردہ ہے۔ میں نے اسی مسخ شدہ بدن کے ساتھ جنم لیا۔ انسانیت نے مجھے ورثے میں یہی کچھ دیا۔ میری ماں بھی معذور تھی کیونکہ اسے ناگاساکی میں ایٹمی تابکاری کا شکار ہونے والی عورت نے جنم دیا تھا۔
>
> کوئی بھی صحیح الدماغ شخص یہ کیسے مان سکتا ہے کہ ایٹم بم قومی سلامتی کی ضمانت دے سکتا ہے۔ یا کسی ٹک ٹک کرتے ہوئے ٹائم بم کو سینے سے لگائے بیٹھے رہنا سلامتی اور تحفظ کی علامت ہے؟ (چہ نوبل کے لوگ اس کا درست جواب دے سکتے ہیں) کیا ہر لحہ ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑے رہنے کا مطلب ملکی تحفظ ہے؟
>
> ہمارے لیے ماضی کو فراموش کر دینا کس قدر آسان ہے۔ نئی نسل اپنے اجداد کی غلطیوں سے سبق سیکھنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ نازیوں نے

یہودیوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا اس سے یہودیوں نے کچھ نہیں سیکھا اور وہی سلوک فلسطینیوں کے ساتھ شروع کر دیا۔ آج بوسنیا میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو قیامت ٹوٹی اس سے دنیا نے کچھ نہیں سیکھا کیونکہ آج بھی ایٹمی دھماکے کیے جا رہے ہیں۔ البتہ جاپان نے ایک سبق ضرور سیکھا۔ اس نے ایٹمی دوڑ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ جاپان نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ ہم نے ایٹمی تابکاری کی ہولنا کی دیکھی ہے، برداشت کی ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور ہمسایوں کو جھلتے ہوئے دیکھا۔ ہمارے گھر ریت کی مانند بکھر گئے۔ کسی پاکستانی یا ہندوستانی شہری نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے اندھے بچوں کو نہیں دیکھا۔ وہاں آج بھی معذور بچے جنم لیتے ہیں۔ یہ معصوم جانیں کس جرم کی سزا کاٹ رہی ہیں؟

میری دعا ہے کہ ایسا وقت کبھی نہ آئے کہ کوئی پاکستانی یا ہندوستانی اپنے نومولود بچے کو پہلی مرتبہ گود میں اٹھائے اور دیکھے کہ جہاں اس کی آنکھیں ہونا چاہیے تھیں وہاں صرف دو سوراخ ہیں۔ خدا نہ کرے کہ آپ کے بچے بے نور آنکھوں، مردہ ہاتھوں اور مسخ چہروں کے ساتھ اس دنیا میں آئیں۔

ڈاکٹر ماریکو کٹیانو کے اس طویل خط کی ایک ایک سطر دکھ میں ڈوبی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمیں دانش کے وہ نکتے تعلیم کرتی ہے جن کا گہرا رشتہ امن سے اور انسانوں کی خوشی سے ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کی سوا ارب کی آبادی جن سنگین مسائل سے دوچار ہے، ان کو نظر میں رکھتے ہوئے دونوں ملکوں کے جنگجو عناصر کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہمارے برصغیر کا شمار دنیا کے پس ماندہ ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ ہمیں ناخواندگی، بیماری، بیروزگاری، غربت اور ناانصافی سے لڑنے کے لیے تمام وسائل کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس برصغیر کے بیشتر وسائل جنگ کی تیاری اور ہتھیاروں کی خریداری پر صرف ہوتے ہیں۔ آزادی کے وقت جس پاکستان کی

صرف پانچ فی صد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتی تھی، اب اس کے انتہائی غربت کے شکار شہریوں کا تناسب ۴۰ فی صد ہو چکا ہے۔ ہندوستان کا حال بھی ہم سے بہتر نہیں۔ایک ایسے زمانے میں ہمیں ان بدھ بھکشوؤں کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے اس خطے کے عوام میں امن کی اہمیت کواجاگر کرنے کے لیے اپنے چین آرام کی قربانی دی ہے اور اب ۹۰ دن تک وہ کہیں شدید گرمی اور کہیں موسلا دھار بارشوں کو جھیلتے ہوئے پیدل سفر کریں گے۔ پاکستان اور ہندوستان کی مختلف بستیوں، قصبوں اور شہروں سے گزریں گے، وہاں کے لوگوں سے ملتے ہوئے، انہیں کچھ حیران اور کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہوئے یہ بھکشو ہیروشیما اور ناگاساکی کے ہلاک شدگان کی یاد میں ہمارے لیے اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے؟ وہ برصغیر کے لوگوں کو امن کی اہمیت سمجھانے آئے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے عوام سے زیادہ امن کی اہمیت کوئی نہیں جانتا، جنگ ان کے کھیتوں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، ان کے گھروں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیتی ہے، ان کے پیاروں کو ان سے جدا کر دیتی ہے، امن کی اہمیت سمجھنے اور سمجھانے کا معاملہ دونوں طرف کی حکمران اشرافیہ کا ہے۔ کاش ان دس بودھ بھکشوؤں کا دعائیہ امن سفر دونوں طرف کی اشرافیہ کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو سکے۔

'اردو نیوز'، جدّہ

۶/اگست،۲۰۰۲ء

مقتولین کے سوگ میں امتیاز کیوں؟

آج ۱۱؍ستمبر ۲۰۰۲ء ہے۔

آج کے دن جنرل پرویز مشرف اپنے محسن و مربی صدر جارج ڈبلیو بش اور دیگر بہت سے سربراہانِ مملکت کے ساتھ نیویارک میں زیروگراؤنڈ پر ۵۰ سے زیادہ ملکوں کے لگ بھگ ۳۵۰۰ بے گناہ باشندوں کی ہلاکت کا سوگ منائیں گے۔ یہ ہلاک شدگان جن میں عیسائی، یہودی، مسلمان، ہندو، سکھ، بودھ، اور ملحد سب ہی تھے، دہشت گردی کے ایک واقعے میں بےقصور و بے خطا مارے گئے۔ ان کے ماتم داران کا جس قدر بھی سوگ منائیں وہ کم ہے لیکن جنرل پرویز مشرف کو ان کی یاد میں کچھ زیادہ ہی شمعیں جلانی چاہئیں۔ نہ یہ واقعہ ہوتا، نہ جنرل پرویز مشرف کا نام امریکی صدر کے وردِ زباں ہوتا اور نہ پاکستان میں جمہوریت اپنی بحالی سے مایوس ہوتی۔ مجھے تو اندیشہ اس بات کا ہے کہ جنرل صاحب زیروگراؤنڈ پر جب سر جھکا کر ان بے گناہ ہلاک شدگان کی ماتم داری کریں گے تو کسی دل جلے کی روح پکار کر یہ نہ کہہ دے کہ 'میرا مرنا، ان کے گھر شادی ہوئی'۔

ان بے گناہوں کی ہلاکت پر یہ غم و ماتم بجا، ساری دنیا کے انسان دوست اور امن پسند ان کا غم مناتے ہیں لیکن اسے کیا کہیے کہ اس زاری و بین میں اور شور و شین میں مجھے دوسری جنگِ عظیم سے اب تک کے وہ ہزاروں اور لاکھوں بے گناہ مقتولین یاد آتے ہیں جنہوں نے پھل تراشنے اور سبزی کاٹنے کی چھری کے سوا، ہاتھ میں کبھی کوئی ہتھیار نہ اٹھایا تھا اور پھر بھی وہ امریکا کی ریاستی دہشت گردی کے قتیل ہوئے۔

مجھے ہیروشیما اور ناگاساکی کے وہ بچے اور بوڑھے، مرد اور عورتیں یاد آتے ہیں جن کے

بدن موم کی طرح بہہ گئے، جن کی ہڈیاں لکڑیوں کی طرح سوختہ ہوئیں۔ مجھ سے کوریا اور ویت نام کے وہ لاکھوں کسان، کلرک، مزدور اور محنت کش بھلائے نہیں جاتے جو کھیتوں کھلیانوں میں، جنگلوں اور شہروں میں نیپام اور کلسٹر بموں کا نشانہ بنے، جنہیں جنگ کی آگ میں مکئی کے دانوں کی طرح بھونا گیا اور پھر بھلا دیا گیا۔ کانگو، پیرو، گوئٹے مالا، گریناڈا، لیبیا، ایل سلواڈور، سوڈان، نکاراگوا، پناما، کہاں کے مقتولین کو یاد رکھوں اور کن کو بھول جاؤں جو امریکی بمباری کا نشانہ بنے۔

آج ۱۱رستمبر ۲۰۰۲ء کو مجھے ۱۱رستمبر ۱۹۷۳ء کا وہ دن یاد آتا ہے جب امریکی سرپرستی میں جنرل پنوشے نے صدر آلندے کے محل کا محاصرہ کیا، ایک منتخب صدر قتل ہوا اور چلی کے سینکڑوں ہزاروں جمہوریت پسند ٹینکوں کے نیچے کچلے گئے، گولیوں سے اڑائے گئے۔ جب پابلو نرودا ایسے عظیم ادیب کے گھر میں جنرل پنوشے کے سپاہی گھسے اور انہوں نے اس ادیب کی کتابیں سنگینوں میں پروئیں، جب سان تیاگو کے اسٹیڈیم میں چلی کے مقبول اور مشہور موسیقار وکٹر جارا نے آمریت کی شان میں گیت گانے اور گٹار بجانے سے انکار کیا تو اس کی انگلیاں قصائی کے بغدے سے اڑا دی گئیں۔ یہ وہی چلی ہے جس میں جمہوریت، امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کی نگرانی میں قتل کی کی گئی جس نے کہا تھا کہ 'ہم کیوں خاموش تماشائی بنے یہ دیکھتے رہیں کہ اس ملک (چلی) کے عوام کی غیر ذمہ داری سے یہاں کمیونسٹ حکومت کریں۔'

ایڈیو آرڈو گالیانو کا شمار لاطینی امریکا کے صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے، اس نے ۱۱رستمبر ۲۰۰۱ء کے سانحے کے چند دن بعد لکھا کہ 'ہنری کسنجر نے بن لادن سے کہیں زیادہ دہشت گردی کی ہے۔ اس نے انڈونیشیا، کمبوڈیا، ایران، جنوبی افریقہ، بنگلہ دیش اور جنوبی امریکا کے بیشتر ملکوں میں ریاستی دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے۔'

اور مجھے تو گوئٹے مالا کے وہ دو لاکھ بے گناہ شہری بھی یاد آتے ہیں جنہیں کسی 'مسلمان دہشت گرد' نے نہیں، امریکا کی مختلف حکومتوں نے فوجی حکمرانوں کے ہاتھ ختم کرایا تھا۔ مجھے وہ سارے بے گناہ فلسطینی شہری یاد آتے ہیں جو صابرہ اور شتیلا کیمپ سے لے کر آج تک غزہ کی پٹی اور مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی سپاہیوں کے ہاتھوں ہلاک کیے جارہے ہیں لیکن جن کی ہلاکتوں کے پروانے پر 'دستخط' امریکی حکمرانوں کے ہوتے ہیں۔ اور عراق کے لاکھوں بے گناہ شہریوں کی ہلاکت پر نوحہ کون کرے گا، جو خلیج کی جنگ میں ہلاک ہوئے اور جن میں سے لاکھوں بچے عراق پر

عائد پابندیوں کے نتیجے میں ناکافی خوراک اور دواؤں کے نہ ملنے کی وجہ سے موت کا نوالہ بنے۔
اور اب اسی عراق کے آسمان، ایک بار پھر امریکی آتش بازی سے دہک اٹھے ہیں اور ہلاکت نے عراق کی بستیوں پر اپنے پنکھ پھیلائے ہیں۔

افغانستان جسے پہلے سوویت یونین کے خلاف 'جہاد' کے نام پر امریکیوں نے تباہ و برباد کیا اور ۱۱رستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد اس کے کوچہ و بازار میں موت کا وحشیانہ رقص ہوا۔ وہ افغانستان جو پہلے ہی خانہ جنگی سے جاں بہ لب تھا، ٹوئن ٹاور کے ملبے پر سے صدقہ ہوا۔ اس کی نہتی بستیاں اور اس کی بے ضرر براتیں بھی امریکی چاند ماری سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ تورا بورا کے غار، مزار شریف کا مقتل، دشت لیلیٰ، قلعۂ جنگی میں ہتھیار ڈالنے کے بعد طالبان کا قتل عام، کنٹینروں میں سینکڑوں کی تعداد میں قید کیے جانے والے وہ افغانی جنہیں دَم واپسیں ایک گھونٹ پانی نہ مل سکا اور ایک امریکی جریدے کے مطابق وہ ایک دوسرے کے پسینے سے پیاس بجھاتے ہوئے ختم ہوئے۔ ہم میں سے بہت سے طالبان کے نقطۂ نظر اور ان کی حکمت عملی سے یکسر اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے لیے شمعیں کیوں نہ جلائیں، ان کے ماتم دار کیوں نہ ہوں کہ وہ انسان تھے اور ان تمام حقوق کا اطلاق ان پر بھی ہوتا تھا جن سے انسانی حقوق کے منشور کا آغاز ہوتا ہے اور جس کے باب اول کی پہلی شق کی رُو سے اقوام متحدہ کے وجود کا مقصد یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر امن و آشتی ہو اور امن کو درپیش خطرات کے خلاف اجتماعی طور پر اقدامات کیے جائیں۔ حقوقِ انسانی کے عالمی منشور کی تیسری شق یاد آتی ہے جس میں لکھا ہوا ہے کہ ہر شخص کو زندہ رہنے، آزاد رہنے اور ذاتی تحفظ کا پیدائشی حق ہے۔

مجھے میثاق تہران یاد آتا ہے جس کی شق نمبر ۱۰ میں حقوقِ انسانی کی نفی کرنے والی کسی بھی جارحانہ کارروائی اور مسلح تصادم کی شدید مذمت کی گئی ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ ایسی کسی بھی صورت حال سے یا اس سے پیدا ہونے والے ردعمل کے نتیجے میں دنیا بھر کے انسان عذاب ناک تکلیفیں سہتے ہیں، چنانچہ اس میثاق پر دستخط کرنے والے تمام ممالک اور ان کی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ ایسی کسی کارروائی میں ملوث نہ ہوں اور دوسروں کو بھی اس سے باز رکھیں۔

اس کے علاوہ اور کیا کچھ یاد نہیں آتا۔ اقوام متحدہ کے وجود میں آنے سے دہائیوں پہلے ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء میں ہیگ میں ہونے والی وہ کانفرنسیں یاد آتی ہیں جن میں یہ طے کرنے کی

کوشش کی گئی تھی کہ کوئی سے بھی دو متحارب فریق، جنگ کے دوران کن آداب پر عمل کریں گے اور کن حدود و قیود کا خیال رکھیں گے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران مغربی اقوام ایک دوسرے کے خلاف صف آراء تھیں تو جنگ میں جائز و ناجائز معاملات کے بارے میں کسی تحریری معاہدے کی عدم موجودگی کے بغیر بھی تمام متحارب قوتوں نے ایک دوسرے کی شہری آبادی کے جانی نقصان کے بارے میں خاص خیال رکھا۔ بمباری کے دوران یہ بات ہمیشہ ہوابازوں کے سامنے رہی کہ تہذیب وتمدن کے خزانے برباد نہ ہوں، پیرس کا آئفل ٹاور زمین بوس نہ ہو، ٹرافالگر اسکوائر میں نیلسن کا مجسمہ سر اٹھائے کھڑا رہے اور روم کے ہزاروں برس پرانے کھنڈرات کو نقصان نہ پہنچے۔ میلان، ماسکو، لندن، برلن اور بون میں سینکڑوں برس پر محیط یورپی مصوری کا عظیم خزانہ محفوظ رہے۔

بیسویں صدی کے مہذب امریکا کو دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ یاد نہیں رہتا کہ اس کی لڑائی شہنشاہ جاپان کی فوجوں سے ہے، چنانچہ وہ انہیں شکست دینے کی بجائے جاپان کے دو شہروں کو مکمل طور پر نیست و نابود کر دیتا ہے، اس طرح دنیا کے مہلک ترین ہتھیار کو آزمانے کا شوق بھی پورا ہو جاتا ہے اور جاپان کی حکومت بھی گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ اسی طرح شمالی ویتنام پر اگر نئے بم آزمائے جا سکتے ہیں تو کیوں نہ آزمائے جائیں؟ زرد فام اقوام سے تعلق رکھنے والے شہری اگر کیڑے مکوڑوں کی طرح مرتے ہیں، اگر نیپام فاسفورس بموں سے جھلستے ہیں تو کیا ہرج ہے؟ زرد فام اقوام کے مردوں کی آنکھوں سنگینوں سے کیوں نہ نکالی جائیں، ان کی حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچے کیوں نہ سنگینوں میں پروئے جائیں، ان کے اسپتال، اسکول، یتیم خانے، سینیٹوریم، شہری پناہ گاہیں اور دیہات کیوں نہ فضائی حملوں کی زد میں آئیں؟ عراق پر اور افغانستان پر شب و روز بمباری ہو تو شہری آبادی کا خیال کیوں رکھا جائے، عبادت گاہوں کا احترام کیوں کیا جائے اور ان کی آبادیوں پر اتنے بم کیوں نہ برسائے جائیں کہ جب بستیوں پر قبضہ ہو تو وہاں اپنے مالکوں کو رونے والے وفادار کتوں، اپنے مسمار شدہ گھروں کو ڈھونڈنے والی بلیوں اور لاشوں پر منڈلانے والے مردار خور پرندوں کے علاوہ کوئی ذی حیات نہ پایا جائے۔

آج ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۲ء کو نیویارک کے گراؤنڈ زیرو پر محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر ٹریڈ ٹاور کے مقتولین پر آنسو بہائیں گے۔ میں بھی ان بے گناہوں کی ماتم دار ہوں لیکن میں

مقتولین کی قومیت، شہریت، عقیدے اور علاقے میں امتیاز نہیں کرتی۔ میرے آنسو ہیروشیما سے ہرات، مائی لائی سے مزار شریف، کابل سے کرکوک اور ہنوئی سے ہلمند تک ان تمام بے گناہ مقتولین کے لیے ہیں جو امریکا کی سرکاری دہشت گردی کی بھینٹ چڑھے۔

مقتولین کی ماتم داری میں امتیاز کیا جائے تو پھر دہشت گرد آپ کی اپنی آستینوں میں پروان چڑھتے ہیں۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۱۱ر ستمبر ۲۰۰۲ء

چچا سام کیا چاہتا ہے

اب سے تقریباً ایک برس پہلے امریکا کے مشہور اور متنازعہ فیہ دانشور، ادیب، ماہر لسانیات اور سیاسی تجزیہ نگار نوم چومسکی نے برصغیر کا دورہ کیا۔ وہ ہندوستان گئے، پاکستان بھی آئے۔ اس دورے کو اخبارات اور ٹیلی وژن میں نمایاں جگہ ملی۔ نوم چومسکی کی بین الاقوامی شہرت کا آغاز ایک ماہر لسانیات کے طور پر ہوا لیکن ۷۰ء کی دہائی سے انہوں نے بین الاقوامی سیاست میں امریکی مداخلت، شہری اور انسانی حقوق اور دنیا بھر کی مظلوم اقوام کے لیے انصاف کے حصول جیسے اہم موضوعات پر امریکی حکمرانوں سے کھل کر اختلاف کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں انہوں نے کمبوڈیا کے بارے میں امریکی پالیسیوں پر تنقید کی، پھر آہستہ آہستہ ان کی آواز بلند ہوتی گئی اور جلد ہی وہ تیسری دنیا کی مظلوم اقوام کے حمایتی بن کر سامنے آئے۔ امریکی حکومت کی انسان دشمن پالیسیوں پر ان کی تنقید کا لہجہ سخت سے سخت ترین ہوتا گیا۔ خلیج کی جنگ میں امریکی حکومت کے سامراجی رویوں اور اس کے بعد امریکی دباؤ کے تحت اقوام متحدہ کی جانب سے عراق پر عائد کی جانے والی ظالمانہ پابندیوں پر انہوں نے شدت سے اعتراض کیا۔

دسمبر ۲۰۰۱ء میں نوم چومسکی نے برصغیر کا دورہ کیا تو ان کے اس دورے کو بہت اہمیت دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ساری دنیا ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے سانحے سے دہشت زدہ تھی، امریکا نے دہشت گردی کے اس واقعے کو ساری دنیا پر اپنی بالادستی کے لیے استعمال کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر افغانستان کے نہتے اور بے گناہ عوام پر امریکی طیاروں کی بے محابا بمباری جاری تھی اور امریکا اور اس کے اتحادیوں کی افواج افغان شہروں اور دیہاتوں میں کارروائیاں کر رہی تھیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب بین الاقوامی پریس میں نوم چومسکی، ارون دھتی

رائے اور ایڈورسعید کے امریکا مخالف مضامین شائع ہو رہے تھے اور افغانستان کے مظلوم عوام کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔

نوم چومسکی ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے۔۱۹۵۵ء سے وہ امریکا کے ایک مشہور اور معتبر تعلیمی ادارے MIT سے وابستہ ہیں۔اس امریکی یونیورسٹی سے وابستہ ہونے کے باوجود انہوں نے امریکی حکمرانوں سے اختلاف کرنے اور اسرائیل کی صیہونی پالیسیوں اور فلسطین دشمن رویوں پر شدید تنقید کرنے کا کوئی بھی موقعہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

نوم چومسکی کے درجنوں مضامین دنیا کے معتبر اخبارات اور رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔انہوں نے جمہوریت اور بین الاقوامی سطح پر امریکا کی ریاستی دہشت گردی جیسے اہم اور حساس موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔اردو میں ابھی تک ان کی کسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا لیکن اب ان کی ایک مختصر سی کتاب 'What Uncle Sam Really Wants' اسلم خواجہ نے 'چچا سام کیا چاہتا ہے' کے عنوان سے ترجمہ کی ہے جسے ڈاکٹر آصف فرخی نے اپنے ادارے 'دنیازاد' سے شائع کر کے اردو پڑھنے والوں کے لیے ایک اہم تصنیف فراہم کی ہے۔

نوم چومسکی نے یوں تو بہت سی کتابیں لکھی ہیں لیکن ان کی اس مختصر کتاب کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی اور سنہ ۲۰۰۰ء تک انگریزی میں اس کتاب کے بارہ ایڈیشن چھپ چکے تھے اور اس کی ۱۶۶،۰۰۰ کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔اس کتاب کے اب تک دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

ایک مبصر نے نوم چومسکی کی تحریروں کے بارے میں لکھا ہے کہ 'نوم چومسکی طاقت (Power) کے تاریک رُخ کو بڑی بے رحمی کے ساتھ واضح کرتا ہے۔سیاست جو کچھ ہے، نوم چومسکی بس وہیں نہیں، وہ آپ کو وہاں لے جاتا ہے، جہاں قدم دھرنے کی ہمت کم ہی لوگ کرتے ہیں۔'

اس کے بارے میں آرتھر نائمین اور سینڈی نائمین نے لکھا ہے کہ 'دنیا اگر زیادہ معقول جگہ ہوتی تو انصاف کے حصول کے لیے اپنی ان تھک کوششوں پر نوم چومسکی کو امن کا نوبل انعام مل چکا ہوتا مگر نوبل امن انعام دینے والی کمیٹی یہ اعزاز ہنری کسنجر جیسے لوگوں کو دے دیتی ہے۔'

'چچا سام کیا چاہتا ہے' ایک ایسی کتاب ہے جس میں دنیا پر بلا شرکت غیرے اقتدار حاصل

کرنے اور اس بالادستی کو ہمیشہ کے لیے اپنے قبضے میں رکھنے کی خاطر امریکی حکومت کے ظالمانہ، غیر انسانی اور غیر جمہوری رویوں پر کھل کر بحث کی گئی ہے۔نوم چومسکی نے اپنی اس کتاب میں ویتنام اور مشرق بعید کے دوسرے ملکوں، افریقہ، لاطینی امریکا، ایشیا اور شرق اوسط کے مختلف ملکوں کے بارے میں امریکی پالیسیوں کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھا ہے کہ آیئے ہم لاطینی امریکا پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور انسانی حقوق کے تناظر میں اپنی بات کی ابتدا کرتے ہیں۔لاطینی امریکا میں انسانی حقوق کے ایک اہم ماہر لارس شولز کی تحقیق یہ ظاہر کرتی ہے کہ 'امریکا کی جانب سے لاطینی امریکا کی ان حکومتوں کو بے تحاشہ امداد دی گئی جو اپنے شہریوں پر جبر و تشدد کر رہی تھیں' اس امداد کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ ان ملکوں کو اس امداد کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔اس کا تعلق اس بات سے تھا کہ وہ امریکی مفادات کا تحفظ کرنے پر رضا مند ہیں یا نہیں۔

ماہر اقتصادیات ایڈورڈ ہرمین نے بین الاقوامی سطح پر تشدد اور امریکی امداد کے درمیان قریبی تعلقات کا انکشاف کیا ہے۔نوم چومسکی، ایڈورڈ ہرمین کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ لاطینی امریکا میں معیار زندگی کو بہتر بنانے کی صدر کینیڈی کی پالیسی کو بڑھاوا دیا گیا۔اس پالیسی کے تحت جس نوعیت کی ترقی پر زور دیا گیا، وہ امریکی سرمایہ کاروں کی ضروریات کے مطابق تھی۔ اس 'ترقیاتی پروگرام' کے تحت گائے کے گوشت کی پیداوار میں اضافہ تو ضرور ہوا لیکن اس کی طلب میں کمی ہوگئی۔

نوم چومسکی لکھتا ہے کہ ترقی کا یہ امریکی نسخہ عام طور پر ایسا 'معاشی معجزہ' کر دکھاتا ہے جس کے تحت مجموعی پیداوار میں تو یقیناً اضافہ ہو جاتا ہے لیکن ملکی آبادی کی اکثریت کو بھوکا رہنا پڑتا ہے۔ایسی پالیسیوں پر عمل درآمد کے نتیجے میں لازمی طور سے عوامی مزاحمت پیدا ہوتی ہے جسے جبر و تشدد کے ذریعے کچل دیا جاتا ہے۔پہلا قدم یہ اٹھایا جاتا ہے کہ عوامی مزاحمت کو پولیس کے ذریعے کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن جب اس کام میں پولیس ناکام ہو جاتی ہے تو اس ملک کی فوج کے جرنیلوں سے رابطہ کیا جاتا ہے اور آخری حل کے طور پر حکومت کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے۔

نوم چومسکی اس طرف بہ طور خاص اشارہ کرتا ہے کہ امریکی حکومتیں تیسری دنیا کی فوجوں اور ان کے جرنیلوں سے ہمیشہ بہتر اور قریبی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔یہ پالیسی اس لیے اختیار کی جاتی ہے کہ اگر کسی ملک کی حکومت سے امریکا کے تعلقات خراب ہو جائیں اور وہ

امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے کام نہ کرے تو پھر اس ملک کی فوج کے ذریعے 'ناپسندیدہ حکومت' کا تختہ الٹ دیا جائے۔ اسی طریقۂ کار کے تحت ۱۹۷۳ء میں چلی اور ۱۹۶۵ء میں انڈونیشیا کی فوجوں نے اپنی اپنی حکومتوں کا تختہ الٹا اور فوجی 'انقلاب' کے خلاف ہونے والی عوامی مزاحمت کو پوری قوت سے کچل دیا گیا۔ اس سارے عمل کو امریکی حکومت کی آشیرواد حاصل تھی۔ نوم چومسکی یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ امریکا حالانکہ چلی اور انڈونیشیا کی اس وقت کی حکومتوں کا سخت مخالف تھا، اس کے باوجود امریکا مخالف ان حکومتوں کو امریکی فوجی امداد فراخ دلی سے دی جارہی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ امریکی اعلیٰ حکام اس فوجی امداد کے پردے میں چلی اور انڈونیشیا کی فوجوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہے تھے اور جرنیلوں سے وہ رابطے استوار کررہے تھے جو بعد میں ان ملکوں کی حکومتوں کا تختہ الٹنے کے کام آئے۔ یہی وہ جرنیل تھے جنہوں نے اقتدار پر قبضے کے بعد امریکی مفادات کے مکمل تحفظ کے کام کیا۔ نوم چومسکی اپنی اس مختصر کتاب میں لکھتا ہے کہ '۱۹۸۰ء کی دہائی میں امریکا کی جانب سے ایران کو اسرائیل کے ذریعے اسلحہ فراہم کرنے کے پیچھے بھی یہی سبب کارفرما تھا۔ اسی طرح وہ ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جب برازیل کی جمہوری حکومت اپنے ملک کو امریکی اثرات سے فاصلے پر رکھنے کے لیے زیادہ سرگرم ہوئی تو کینیڈی انتظامیہ نے ۱۹۶۴ء کے دوران برازیل میں فوجی بغاوت کے لیے راہ ہموار کی۔ امریکا نے اس قدر پُرجوش انداز میں برازیل کی فوجی بغاوت کی حمایت کی کہ برازیلی جرنیل قابو سے باہر ہوگئے اور انہوں نے تشدد اور جبر کے وہ طریقے اختیار کیے جو نازی طریقے کہلاتے ہیں۔ نوم چومسکی کا کہنا ہے کہ برازیل کے فوجی جرنیلوں کی امریکا نے جس طور پشت پناہی کی اس کے نتیجے میں ارجنٹائن اور چلی کے خطے میں ۶۰ء کی دہائی کے وسط سے لے کر ۱۹۸۰ء کی دہائی تک ایسے واقعات کے تسلسل نے جنم لیا جو لاطینی امریکا میں 'خونیں دور'، کے طور پر مشہور ہے۔ ان ملکوں کی افواج کی پس پردہ اور کھلے بندوں حمایت کے نتیجے میں ان ملکوں کے عوام کو جس بے دردی سے کچلا گیا اور ان کے جمہوری اور انسانی حقوق جس طرح پامال ہوئے اس کی تمام تر ذمہ داری امریکا کی مفاد پرستی پر مبنی خارجہ پالیسی کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوم چومسکی یہ لکھتا ہے کہ 'میں سمجھتا ہوں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد برسر اقتدار آنے والے ہر امریکی صدر کو قانونی طور پر معزول کرنے کا ٹھوس جواز موجود ہے۔ یہ تمام امریکی صدور یا تو براہ راست جنگی مجرم تھے یا جنگی جرائم میں شریک تھے۔

'چچا سام کیا چاہتا ہے' ایک ایسی کتاب ہے جس کا ہر صفحہ تیسری دنیا کے عوام کی طرف سے امریکا کے خلاف فردِ جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کو لکھتے ہوئے نوم چومسکی نے خفیہ امریکی دستاویزات، منرو ڈاکٹرائن اور دوسری اہم امریکی کتابوں کو سامنے رکھا ہے، ان کے حوالے دیے ہیں اور اپنے ہر الزام کو درست ثابت کرنے کے لیے حقائق کا اور اعداد و شمار کا سہارا لیا ہے۔ کہنے کو یہ ۸۸ صفحات پر مشتمل ایک 'کمزور' سی کتاب ہے لیکن اس کے صفحوں پر تیسری دنیا کے مظلوم عوام کا مقدمہ نوم چومسکی نے نہایت قوت اور مہارت سے لڑا ہے۔ اس کی ایسی ہی تحریروں نے اسے بیسویں صدی کے اہم اور باضمیر دانشوروں کی صفِ اول میں جگہ دلائی ہے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۱۹ر نومبر ۲۰۰۲ء

ایک چڑیا کا خیال آیا

آج اپنی بات ایک نوتصنیف کہانی سے شروع کرنے کا جی چاہ رہا ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک ننھی سی چڑیا تھی، وہ اپنی دھن میں مگن بادشاہ کے محل پر سے اڑتی ہوئی جا رہی تھی کہ اس نے ایک بہروپیے کو دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ بہروپیے نے وزیر اعظم، سپہ سالار اور قاضی کے ساتھ ساز باز کر کے ملک کے اصل بادشاہ کو قتل کر دیا ہے اور اب اسے دفن کر کے، اس کا لباس اور تاج پہن کر تخت پر بیٹھ گیا ہے، دربار میں کسی کو خبر نہیں اور جنہیں خبر ہے انہیں تلوار سے، تیر سے اور تفنگ سے ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ ننھی سی چڑیا سے یہ ظلم دیکھا نہ گیا، وہ محل پر سے اڑان بھرتی ہوئی نکلی اور ایک شاخ سے دوسری شاخ، ایک باغ سے دوسرے باغ اور ایک بستی سے دوسری بستی تک بادشاہ کے قتل کی خبر دیتی ہوئی اڑتی چلی گئی۔ یہ خبر رعایا کے کانوں تک پہنچی تو لوگوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ بہروپیے کو بھی خبر ہوئی، اس نے وزیر اعظم اور سپہ سالار سے کہا کہ اس نا ہنجار چڑیا کی گردن اڑا دی جائے۔ اسی وقت قاضی نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور اس ننھی سی جان کا خون اپنی گردن پر کیوں لیتے ہیں۔ اس کی زبان کٹوا دیجیے، نہ زبان ہوگی، نہ یہ بات اوروں تک پہنچے گی، اور ہاں یہ سزا اسے رعایا کے سامنے دیجیے اور اعلان کروا دیجیے کہ جو اس نا ہنجار چڑیا کی طرح جھوٹ بولے گا، اس کی زبان نہیں گردن اڑا دی جائے گی۔

بہروپیے نے قاضی کے اس مشورے پر صاد کیا، ایک میدان میں رعایا کو اکٹھا کیا گیا، بہروپیا بھی شاہی لباس اور تاج سر پر سجا کر آیا، دربار لگا اور ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر قلم تراش سے چڑیا کی ننھی سی زبان اڑا دی۔ رعایا مطمئن ہوگئی کہ جھوٹی چڑیا اپنے انجام کو پہنچی اور بہروپیا بادشاہ، سازشی وزیر اعظم، سپہ سالار اور قاضی، سکون سے اپنے اپنے محل میں سکھ کی نیند سوئے لیکن

صبح جب ان سب کی آنکھ کھلی تو ہر طرف بادشاہ کے قتل کی خبر اس چڑیا کی آواز میں گونج رہی تھی جس کی زبان ایک روز پہلے قلم تراش سے اڑائی جا چکی تھی۔

بہروپیے بادشاہ سے جھوٹے قاضی تک سب ہی حیران پریشان تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ پوچھ گچھ سے معلوم ہوا کہ کٹی ہوئی زبان والی چڑیا جب درد سے نڈھال اڑی تو وہ جہاں جہاں سے گزری وہاں اس کی لہولہان چونچ سے زمین پر گرنے والے خون کے ہر قطرے سے ایک نئی زبان اُگ آئی اور اب یہ وہی سینکڑوں ہزاروں زبانیں تھیں جو باغوں میں، بازاروں میں، گلیوں میں اور گزرگاہوں میں رعایا کو سچ سنا رہی تھیں۔ یہ کہانی میرے ذہن میں اس وقت آئی جب میں لاہور میں 'سافما' (South Asian Free Media Association) کے تیسرے سالانہ اجلاس میں بیٹھی ہوئی تھی حکومت نے پریس آرڈیننس ۲۰۰۲ء کے عنوان سے پاکستانی ذرائع ابلاغ عامہ پر جو 'احسانات' کیے، ان پر ہونے والی دھواں دھار بحثیں سنتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ میڈیا سے وابستہ افراد اس چڑیا کے لہو سے اُگنے والی زبانیں ہیں۔ آمریت سچ بولنے والی کسی ایک زبان کو کاٹ دیتی ہے تو اس کی جگہ سچ بولنے والی سو زبانیں اُگ آتی ہیں۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ برصغیر کی صحافت جس نے تاج برطانیہ کے چنگل سے برصغیر کی رہائی میں ایک نہایت اہم اور بنیادی کردار ادا کیا، اس کا آغاز ایک برطانوی نژاد شخص کے ہاتھوں ہوا۔ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد بنگال ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں آ چکا تھا اور بنگال کی دولت کا رخ لندن کی طرف ہو چکا تھا۔ بہت سے برطانوی مہم جُو اس زمانے میں کمپنی کی فوج میں ملازمت یا تجارت کی غرض سے کلکتے کا رُخ کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک James Hicky تھا، وہ تجارت کی غرض سے ۱۷۷۵ء میں کلکتہ پہنچا اور صرف ایک سال اندر اپنی جمع پونجی لٹا کر دیوالیہ ہو گیا۔ اس کے قرض خواہوں نے اپنا روپیہ واپس نہ ملنے کا انتقام اس طرح لیا کہ ہکی کو جیل پہنچا کر دم لیا۔ ہکی کے کہنے کے مطابق تجارت میں اسے جو نقصان ہوا اس کی ذمہ داری ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ افسران کی تھی جو رشوت ستانی اور بدعنوانی میں طاق ہو چکے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ان بدعنوانیوں کا پردہ چاک کرنا چاہیے، چنانچہ جیسے ہی وہ رہا ہوا، اس نے ۲۹ مارچ ۱۷۸۰ء کو ایک ہفت روزہ رسالہ Hicky's Bengal Gazette جاری کیا۔ اس گزٹ نے بنگال سے برطانیہ تک ایک تہلکہ مچا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہکی نے گورنر جنرل (انتظامیہ)، چیف جسٹس

(عدلیہ) اور فرسٹ بشپ (چرچ) کی تمام بدمعاملگیوں کو اپنے گزٹ میں افشا کر دیا تھا۔

یہ ایک الگ کہانی ہے کہ اس کے بعد ہکّی پر کیا گزری مختصراً یہ کہ اس کے گزٹ کا ۱۷۸۲ء میں اس وقت خاتمہ ہو گیا جب اسے ۱۹ مہینوں کے لیے دوبارہ جیل بھیج دیا گیا اور پریس بہ حق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ 'ہکّی گزٹ' انگریزی میں شائع ہوتا تھا اور اس کی زندگی بہ مشکل دو برس کی تھی لیکن اس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ برصغیر میں اسی گزٹ نے بے باک صحافت کی بنیاد رکھی اور ۱۹۴۷ء تک انگریزی، بنگلہ، اردو، ہندی اور دوسری زبانوں کے اخبارات نے اسی کی پیروی میں تحریکِ آزادی کے ہراول دستے کا شاندار کارنامہ سرانجام دیا۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے بنگلہ اخبار HITWADA 'ہتواد' کے ایڈیٹر اے ڈی منی نے یہ لکھا کہ......

> 'تحریکِ آزادی کے کامیاب ہونے میں صحافت کی اعانت کا اس مناسب اور موزوں انداز میں اعتراف نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق تھی۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ تحریکِ آزادی کو صحافت سے بہت تقویت پہنچی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آزادی کی جدوجہد کو صحافت کی جانب سے جو گہری دوستانہ اور حوصلہ افزا مدد ملی، وہ اگر میسر نہ ہوتی تو یہ تحریک کتنی تیزی سے آگے بڑھتی۔ لیکن اتنا تو قیاس کیا ہی جاسکتا ہے کہ ہماری جدوجہد آزادی کے دوران صحافت اگر مطیع و فرماں بردار ہوتی، تو تحریک کی ناقابلِ مزاحمت منطق کا ردعمل اس وقت کے حکمرانوں کی طرف سے اس قدر تیزی سے حاصل نہ ہوا ہوتا جیسا کہ درحقیقت ہوا۔ اس حقیقت نے کہ اخباروں نے قوم پرستی کی تحریک کے سرچشمے کا کردار ادا کیا، بہ حیثیت مجموعی صحافت کے پیشے پر، اور ملک میں اس کے کردار پر، نہ مٹنے والے نقوش ثبت کر دیے۔'

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی قوموں کی آزادی اور ملکوں کی خودمختاری کو قائم رکھنے میں صحافت کا عمل دخل روز بہ روز بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اب ایک عرصے سے صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ یہ چوتھا ستون جو پہلے صرف لکھے اور چھپے ہوئے حروف کا نام تھا، الیکٹرانک میڈیا کے وردِ مسعود کے بعد 'میڈیا' کے نام نامی سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس ستون کی

بنیادوں میں سچ لکھنے والے ان گنت جی داروں کا لہو ہے۔

تیسری دنیا کے بیشتر ملکوں میں 'میڈیا' نامی اس ستون کو ریاست کے دوسرے ستون کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے اور اس میں دڑاڑیں ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں کیا فوجی اور کیا جمہوری حکومتیں سب ہی نے 'حسب توفیق' اور 'حسب استطاعت' اس چوتھے ستون کو زمیں بوس کرنے کی اپنی سی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ ایک طرف انتظامیہ کی یہ کوششیں ہیں دوسری طرف وہ قبیلہ ہے جو اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہے۔ اس قبیلے کے افراد اپنے ناتواں شانوں پر نہ صرف اس ستون کا سارا بوجھ اٹھائے کھڑے ہیں بلکہ کچھ نے اس کے محافظوں کا کردار بھی سنبھال رکھا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس ستون کو نقصان پہنچانے والوں سے اپنی بساط بھر لڑتے ہیں۔ حکومت کے سیاہ پریس قوانین کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، لکھتے ہیں، جلسے کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں۔ ریاست سے انفرادی طور پر لڑنا ممکن نہیں اس لیے انھوں نے ابتدا سے اپنی انجمنیں بنا رکھی ہیں۔ یہ سب انجمنیں مل کر حکومت سے اپنے حقوق کے لیے لڑتی ہیں اور خود ان کے درمیان اگر کالی بھیڑیں موجود ہوں تو ان کا مقابلہ بھی جم کر کرتی ہیں۔ 'سافما' South Asian Free Media Association ایک ایسی ہی انجمن ہے، اس کے قیام کی ضرورت چند برس پہلے محسوس کی گئی۔ سوچا گیا کہ پاکستانی میڈیا کی آزادی اب علاقے کے دوسرے ملکوں میں میڈیا کی آزادی سے جڑی ہوئی ہے اس لیے کہ سب کے مسئلے تقریباً یکساں ہیں، چنانچہ 'سیف ما، وجود میں آئی۔

اس روز 'میڈیا کی آزادی اور طرز حکمرانی' کے موضوع پر دوروزہ قومی کانفرنس کے آغاز میں 'سافما، کے بنیادی رکن اور اس وقت کے سکریٹری جنرل امتیاز عالم نے یہ کہا کہ 'پریس کی آزادی، جاننے کا حق، اظہار رائے کی آزادی، معلومات تک آزادانہ رسائی اور اس کی ترسیل ہی، حقیقی جمہوریت کے امتیازی نشانات ہیں۔ حقوق انسانی جس طرح باہمی طور پر مربوط اور ناقابلِ تقسیم ہیں، اسی طرح میڈیا کی آزادی، جمہوریت اور بہتر طرزِ حکمرانی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔' میڈیا کی آزادی کا جمہوریت سے جو ناقابلِ تنسیخ رشتہ ہے، وہ روح اور بدن کے رشتے کی مانند ہے، ایک کے بغیر دوسرے کی زندگی ممکن نہیں۔ یہ بات اگر اربابِ اختیار کی سمجھ میں آجائے تو ہر فوجی یا جمہوری حکومت میڈیا کی گردن مروڑنے کا خیال بھی ذہن میں نہ لائے۔

بات اتنی سی ہے کہ برطانیہ کی براہ راست غلامی میں لگ بھگ ایک صدی گزارنے کے بعد آئینی طور پر ۱۹۴۷ء میں جب ہم آزاد ہوئے، تب بھی ہماری روح مکمل طور پر آزاد نہ ہوسکی۔ ہمارے پاس کوئی آئین موجود نہ تھا اس لیے ہم نے برطانوی عہد غلامی کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو عملاً مکمل طور پر اپنالیا۔ اس ایکٹ کے تحت پریس پر جو پابندیاں عائد تھیں، آزاد پاکستان میں بھی پریس پر وہی قدغن رہی، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ملک آزاد ہوگیا، مگر پریس کے پیروں میں غلامی کی زنجیریں رہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ملک کی آزادی کے ساتھ ہی ایسے تمام قوانین کو ختم کر دیا جاتا جو غیر ملکی آقاؤں نے اپنے ناجائز تسلط کو قائم رکھنے کے لیے تشکیل دیے تھے لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔ ہمارے نئے گندم گوں آقاؤں نے عوام اور پریس کو ان محدود حقوق سے بھی محروم کر دیا جو نوآبادیاتی دور میں انھیں حاصل تھے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے دورِ آمریت کا پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس ۱۹۶۳ء اس کی ایک بدترین مثال ہے۔ آزادی کے بعد ہر حکومت نے پریس کی آزادی کو محدود کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ سرکاری اشتہارات اور نیوز پرنٹ کوٹے کے ذریعے اخبارات کو مالی طور پر براہ راست حکومت کا دست نگر بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اخبارات، رسائل اور جرائد کے لیے ایسا طریقۂ کار وضع کیا گیا جس کے بعد صرف حکومت کے حامی کسی فرد یا ادارے کو ہی ڈیکلریشن حاصل کرنے کا 'شرف' حاصل ہوسکتا تھا۔ پاکستانی پریس نے اظہار رائے کی آزادی کے لیے ایک طویل جدوجہد کی ہے، اس جدوجہد کے دوران کئی اخبارات اور رسائل بند ہوئے، بہت سے صحافیوں نے جیل کاٹی، کوڑے کھائے۔ تاہم ملک میں محدود جمہوریت کی بحالی، بین الاقوامی سیاست میں تبدیلی اور صحافیوں کی مسلسل جدوجہد کی بناء پر مختلف پاکستانی حکومتوں کو اس بات پر مجبور ہونا پڑا کہ وہ پریس کو نسبتاً آزاد فضا فراہم کریں۔ ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ایک بار پھر جمہوریت کا خاتمہ ہوا اور ملک میں فوجی آمریت قائم ہوئی۔ اس حکومت نے پریس کو آزاد رکھنے کا ایک بار نہیں، بار بار اعلان کیا لیکن اس کے ساتھ ہی نئے پریس قوانین بنانے کا اعلان کر دیا گیا۔ مالکان اخبار اور مدیران کی انجمنوں اے پی این ایس اور سی پی این ای نے ان قوانین کے سلسلے میں دو برس تک حکومت سے مذاکرات کیے۔ جس کے نتیجے میں لگ بھگ سال بھر پہلے پریس قوانین کی اصلاحات کے حوالے سے ان دونوں انجمنوں اور حکومت کے درمیان اتفاق رائے پیدا ہوا۔ ان قوانین کا ایک مجوزہ مسودہ تیار کیا گیا، چنانچہ اس

شعبے سے تعلق رکھنے والوں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن ۱۰/۱اکتوبر ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات سے پہلے جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے ایک آرڈیننس کے ذریعے نئے پریس قوانین کا اعلان کردیا۔ ان قوانین کا مسودہ اس مجوزہ مسودے سے مختلف ہے جس پر مالکان اور مدیران کی انجمنوں اور حکومت میں اتفاق رائے ہوا تھا۔ فوجی حکومت نے یک طرفہ طور پر جن قوانین کو نافذ کیا ہے وہ جنرل ایوب خان کے دور کی پابندیوں سے کچھ مختلف نہیں بلکہ بعض حالات میں وہ زیادہ شدید ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں میڈیا سے متعلق جو نئے قوانین جاری ہوئے ان کے مطابق پریس کونسل کا قیام لازمی ٹھہرا۔ ہتک عزت کا قانون صحافیوں کے گلے میں پھندے سے کم نہیں، اطلاعات تک آزادانہ رسائی پر پابندی عائد کردی گئی اور نئے ڈیکلریشن کے اجراء میں نئی دشواریاں پیدا کردی گئیں۔ یہ وہ قوانین ہیں جن کے ذریعے آزادئ اظہار کے حق کا احترام کرنے کی بجائے اس حق کو سلب کرنے اور ملک کے آئین کی روح سے واضح انحراف کی کوشش کی گئی ہے۔

میں بھی 'سافما' کی اس دوروزہ کانفرنس میں شریک تھی، اس کے شرکاء نے ان قوانین میں ترامیم کے بارے میں سفارشات پر مشتمل جو مسودہ تیار کیا، اس میں اس بات پر اصرار کیا گیا ہے کہ یہ قوانین چونکہ ماورائے آئین ہیں اس لیے ان کی قطعاً کوئی آئینی اور قانونی حیثیت نہیں ہے۔ ان میں سے بعض قوانین تو ۱۰/۱اکتوبر ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات کے بعد اس وقت جاری کیے گئے جبکہ نئی پارلیمنٹ کا افتتاح ہونے والا تھا۔ ان قوانین کو متعارف کرانے کے لیے حکومت کی طرف سے جس جلد بازی کا مظاہرہ کیا گیا اس کا آئینی، اخلاقی یا ضرورتاً کوئی جواز موجود نہیں تھا۔ لاہور کی اس دوروزہ کانفرنس میں ان نئے قوانین پر جو بحث مباحثہ ہوا، اس کو سن کر مجھے یہ محسوس ہوتا رہا جیسے جنرل مشرف کی حکومت کسی سنسر افسر کو مقرر کرنے کی بجائے ہر ہر مرحلے پر خود صحافیوں کو ایک سنسر افسر میں تبدیل کر دینا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے جب رپورٹر سے لے کر سب ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر، صفحے کے نگراں اور مدیر سب ہی کسی ایک خبر یا کسی کالم یا مضمون کی اشاعت پر نئے defemation قانون کے تحت لائق تعزیر ٹھہرائے جائیں گے، تو پھر اخبار کی ہر سطر پر ہر صحافی کی 'احتیاط' دیدنی ہوگی۔

اس صورت حال نے صحافیوں، مدیروں اور اخبار کے مالکوں کو ایک بحران سے دوچار کردیا ہے۔ اسی بحران پر بحث مباحثے اور حکومت سے بات چیت کے لیے 'سافما' نے لاہور میں قومی

کانفرنس منعقد کی تھی۔ دو دن تک ملک کے چاروں صوبے اور دارالحکومت سے تعلق رکھنے والے صحافیوں اور میڈیا کے دوسرے شعبوں سے وابستہ ماہرین نے پریس آرڈیننس ۲۰۰۲ء میں مجوزہ تبدیلیوں کے بارے میں ایک مسودہ تیار کیا جس میں پریس کونسل کے قیام، ہتک عزت کے قانون، اطلاعات کی آزادی، رسائل و جرائد کے رجسٹریشن اور الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی سے متعلق قوانین کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس مسودے میں اس بات پر اصرار کیا گیا ہے کہ آزادی اظہار پر پابندیاں عائد کرنے والے تمام قوانین، سماج کو فائدہ پہنچانے کی بجائے، شدید نقصان کا سبب بنیں گے۔ اس کانفرنس کے اختتام پر یہ بھی کہا گیا کہ آزادیٔ اظہار کا معاملہ صرف میڈیا سے متعلق لوگوں کا نہیں، یہ پاکستانی عوام کا بنیادی انسانی حق ہے، اس لیے ملک کے تمام شہریوں کو آزادیٔ اظہار کے حق کی حفاظت کے لیے یکجا ہوکر آواز بلند کرنی چاہیے اور جدوجہد کرنی چاہیے۔ یہ باتیں جس وقت کی جارہی تھیں تو مجھے بار بار اس چڑیا کا خیال آتا رہا، بہروپیے بادشاہ اور اس کے ساتھی قاضی، سپہ سالار اور وزیراعظم نے جس کی زبان کٹوادی تھی اور جس کے زخم سے گرنے والی خون کی ہر بوند سے ایک نئی زبان اُگ آئی تھی اور سچ بولتی رہی تھی۔ حکمرانوں اور حکومتوں کو یہ بات کبھی یاد نہیں رہتی کہ سچ کا قتل، کہیں زیادہ شدت سے سچ کے سیلاب کو جنم دیتا ہے جس میں بادشاہتیں اور حکومتیں بہہ جاتی ہیں۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۲۵ دسمبر، ۲۰۰۲ء

زبان ظلم کے خلاف ایک مؤثر ہتھیار

ایٹم بم اور اسی قبیل کی دوسری مہلک اور بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والی اشیا کو 'ہتھیار' کہا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں زبان بھی ایک موثر ہتھیار کی حیثیت رکھتی ہے۔ دو وضع کے ان ہتھیاروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ غلیل سے لے کر غوری میزائل تک تمام ہتھیار ہلاک اور زخمی کرتے ہیں جبکہ زبان اکثر ظلم کے خلاف ایک موثر ہتھیار کے طور پر کام آتی ہے۔ اس کی بالکل سامنے کی مثال سقراط کی ہے۔ اس کے خیالات اور خطبات سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایتھنز کی شہری ریاست نے اسے زہر کا پیالہ پلایا اور اپنے حسابوں اس کی آواز خاموش کر دی لیکن آج ڈھائی ہزار برس بعد بھی اس کے خیالات دنیا کی تمام بڑی اور چھوٹی زبانوں میں موجود ہیں، اس کے سچے الفاظ کی فصلیں ہر زمین اور ہر زمانے میں لہلہاتی رہی ہیں اور اس بات کا اظہار کرتی رہی ہیں کہ ذہنوں کو مسخر کرنے کے لیے زبان سے بڑا اور موثر ہتھیار دنیا میں پایا نہیں جاتا۔

دس لاکھ سال یا شاید اس سے بھی پہلے جب ہم گروہ در گروہ جنگلوں میں رہتے تھے تو ہم نے بولنے کا آغاز کیا تھا۔ پہلے ہم بھی دوسرے جانوروں کی طرح محض آوازیں نکالتے ہوں گے لیکن جیسے جیسے ہماری ضرورتیں پیچیدہ ہوتی گئیں، ہم ان آوازوں کو ایک ترتیب اور تفہیم دیتے گئے اور اب دنیا کے مختلف خطوں میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہزاروں برس سے فطرت ہمارے وجود میں آتے ہی سماعت کے ذریعے زبان کا بیج ہمارے ذہن کی زرخیز فضا میں بو دیتی ہے، یہ بیج دو سے تین برس کی عمر کے دوران پہلا پھول لے آتا ہے اور پھر عمر، تجربے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ہماری زبان کی پھلواری ہری بھری ہوتی جاتی ہے۔ بلوغت کے بعد جب ہم سماجی تضادات اور ان سے ابھرنے والے ردِّعمل کا اظہار کرتے ہیں تو زبان آپس میں صرف بول چال اور تبادلۂ خیال کا

ہی ذریعہ نہیں رہتی، یہ ایک اوزار اور ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ہے۔ تاریخ میں انسان نے زبان کو گروہی، صنفی، علاقائی یا مذہبی بالادستی اور مخصوص مفادات کے لیے استعمال کیا ہے۔ رجز اور جنگی نغمے اپنی ایک مخصوص زبان رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ رزمیہ شاعری لوگوں کو ہتھیار اٹھانے اور دشمن کو ہلاک کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ کسی خاص مذہب کے پھیلاؤ یا وطن کی آزادی کے حصول کے لیے بھی نثر اور شاعری کو ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ انقلابی گیت آج بھی ہمارے دلوں کو گرماتے ہیں۔ 'زبان' آج سے نہیں ہزاروں برس سے سماج میں تبدیلی لانے کا ایک نہایت اہم اور موثر ذریعہ رہی ہے، اسی لیے تاریخ میں باضمیر شاعر، ادیب اور مورخ، مقتدر طبقات کے لیے ایک ناپسندیدہ عنصر رہے ہیں۔ قدیم مصری ادب کی تاریخ اٹھا کر پڑھیے تو اس میں ہمیں ایسے کئی ادیب نظر آئیں گے جنھوں نے زبان کا باغیانہ استعمال کیا اور ساری عمر قید خانوں میں گزار دی اور کچھ ایسے بھی تھے جو اس زمانے کے فرعون کے حکم سے قتل کیے گئے۔

'زبان' کے استعمال اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کے لیے چند دنوں پہلے ایک کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا۔ اس سہ روزہ کانفرنس کا اہتمام لاہور کے ایک اشاعتی ادارے 'سیمرغ' نے کیا تھا۔ 'سیمرغ' ایک ادبی، تحقیقی اور اشاعتی ادارہ ہے۔ اس ادارے کی جانب سے جہاں اہم ادبی اور علمی موضوعات پر کتابیں منظر عام پر آئی ہیں، وہیں اس نے عرب دنیا کی مشہور دانشور اور محقق فاطمہ مرنیسی کی کئی کتابوں اور مقالات کا ترجمہ اردو میں شائع کیا ہے۔ 'سیمرغ' نے 'زبان کی سیاست' کے عنوان سے جس کانفرنس کا اہتمام کیا تھا، اس میں چاروں صوبوں کے دانشوروں اور اہل قلم نے شرکت کی۔ ان سب افراد نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے یہ بیان کیا کہ زبان کو سیاست، ثقافت، مذہب اور عسکریت، فنون لطیفہ کے فروغ اور بالادست طبقات کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے کس کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

زبان صرف ظلم کے خلاف لڑنے کے لیے ہی نہیں، ظلم کو فروغ دینے اور جھوٹ کو پھیلانے کے لیے بھی استعمال ہوئی ہے لیکن زبان کو غلط طور پر برتنے کا رویہ آخر کار پسپا ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں تفصیل سے گریز کرتے ہوئے یہ دیکھنا چاہیے کہ 'زبان' کو ادیبوں نے سچ کے فروغ کے لیے کس کس طرح استعمال کیا ہے اس کا اندازہ تقریباً ۴۰۰۰ برس پرانی اس مصری کہانی سے لگایا جاسکتا ہے جو بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں کھدائی کے دوران برآمد ہوئی تھی۔ یہ

کہانی ایک کسان کی زبانی بیان کی گئی ہے اور اس میں وہ ملک کے 'منتظم اعلیٰ' سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

'اے منتظم اعلیٰ! میرے آقا! آدمیوں کی ترازو، ان کی زبان ہوتی ہے اور پلڑوں سے (وزن میں) کمی کا پتہ چلتا ہے، سو جسے سزا ملنی چاہیے اسے سزا دے۔ کوئی تیری راست روی کا ثانی نہیں ہوگا۔ جہاں تک جھوٹ کا سوال ہے (اس کا معاملہ تمام ہوا) کیونکہ سچ اس کے مقابلے میں آ گیا ہے۔ اگر جھوٹ چلتا پھرتا ہے تو یہ راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ یہ (جھوٹ) کشتی میں سوار ہو کر پار نہیں لگ سکتا۔ (جھوٹ) آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جو اس جھوٹ کے ذریعے دولت مند بنتا ہے اس کی اولاد نہیں ہوتی۔ زمین پر اس کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو اس جھوٹ کے ساتھ جہاز میں سفر کرتا ہے وہ خشکی پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور اس کا جہاز اس کے شہر میں لنگر انداز نہیں ہو سکتا۔ جانبداری مت کر۔ اپنے دل کا کہا مت سن۔ جسے تُو جانتا ہے اس سے اپنا منہ مت چھپا۔ جسے تُو نے دیکھ لیا ہے اس سے آنکھیں اندھی مت کر، جو تجھ سے فریاد کرے اسے ٹھکرا مت۔ یہ کاہلی چھوڑ تاکہ سب لوگوں میں تیری یہ ضرب المثل دوہرائی جائے (کہ) 'جو تیری مدد کرتا ہے تُو اس کی مدد کر' تاکہ آدمی اپنے جائز مؤقف کی خاطر تجھ سے فریاد کر سکے۔ کاہل آدمی کی کوئی (گزری ہوئی) کل نہیں ہوتی، جو سچائی کی طرف سے بہرا بن جائے اس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ لالچی انسان کے لیے خوشی کا کوئی دن نہیں ہوتا۔ جو (آج) معزز ہے وہ کل مفلسی کا شکار ہو سکتا ہے اور مفلس فریادی بن جائے گا۔'

چار ہزار برس پرانی اس کہانی کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ 'زبان' اس وقت بھی اپنی بات کہنے اور حق کا اظہار کرنے کے لیے کس طور ایک موثر ہتھیار کے مانند استعمال کی جاتی تھی۔ اور اس وقت کے 'منتظم اعلیٰ' بھی آج کے 'چیف ایگزیکٹو' جتنا ہی اقتدار اور اسی جیسی شانِ بے نیازی رکھتے تھے۔

ادیب، مورخ اور محقق زبان کو جس سلیقے اور صفائی سے استعمال کرتے ہیں، اس نے بالادست طبقات یا بااثر گروہوں اور تنظیموں کو ہمیشہ خوفزدہ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں لکھنے والے زیرِ عتاب رہتے ہیں۔ کہنے کو اکیسویں صدی شروع ہو چکی ہے اور کچھ لوگ اسے انسانی حقوق کے عروج کی صدی قرار دینے پر مصر رہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صدی بھی ابھی تک ان لوگوں کے لیے کوئی نوید لے کر نہیں آئی جو مظلوم طبقات کی آواز کو اپنی تخلیقات میں زبان دیتے ہیں۔

۲۰۰۲ء کے دوران بہ طور خاص چین، ایران اور پیرو میں ادیبوں کو سرکاری عتاب کا سامنا کرنا پڑا اوران کی بڑی تعداد قید خانوں کو بھیجی گئی اور انہیں طویل مدت کی سزائیں سنائی گئیں۔ اس بارے میں ادیبوں کی ایک عالمی تنظیم کا کہنا ہے کہ ۲۰۰۱ء کی نسبت ۲۰۰۲ء میں زیادہ ادیب اور دانشور سرکاری طور پر معتوب ٹھہرے۔ تنظیم کا کہنا ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کا دہشت گردی پر مبنی وہ واقعہ ہے جو نیویارک شہر میں پیش آیا اور جس نے ساری دنیا کی سیاست کو سر کے بل کھڑا کردیا۔

ادیبوں کی اس بین الاقوامی تنظیم کے سربراہ کا کہنا ہے کہ بیشتر ملکوں میں ادیب کی آزادی ایک خواب سے کہیں زیادہ سراب ثابت ہوئی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ۲۰۰۲ء کے ابتدائی چھ مہینوں کے دوران ۱۲۶ر ادیب اور صحافی اپنی اپنی حکومت کے ہاتھوں گرفتار ہوئے یا جیل بھیجے گئے۔ ۱۶ر قتل کیے گئے، ۱۵ر کا اب تک پتہ نہیں چل سکا کہ انہیں آسمان کھا گئی یا زمین نگل گئی۔ ۱۶۷ر لکھنے والوں کو مختصر مدت کے لیے جیل بھیجا گیا۔ سب سے زیادہ تشویش کا اظہار چینی ادیب یوشون کانگ کے لیے کیا گیا جنہیں ۱۹۹۲ء میں ۱۹ر برس کی قید سنائی گئی۔ اسی طرح ایران میں بھی لکھنے والوں کی صورت حال خاصی خراب ہے۔ نہایت اہم ایرانی ادیب سیماک فرزند کو ۲۰۰۲ء میں ۱۱ر برس کی قید سنائی گئی۔ سیماک فرزند کی عمر ۲۷ سال ہے، وہ دل کے مریض ہیں لیکن حکام نے انہیں طبی سہولتیں مہیا کرنے سے انکار کردیا ہے اور ان کے قریبی لوگوں کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اسی طرح پیرو کے مشہور دانشور اور ماہر عمرانیات ریویرا گوریرو کو ۲۰ سال کیے لیے قید کردیا گیا ہے۔

زبان کے موثر استعمال اور اس کے ذریعے لوگوں کو سوچنے، سمجھنے اور سماج کو بدلنے پر اُکسانے والے ادیبوں کے حصے میں زہر کا پیالہ سقراط کے زمانے میں بھی آتا تھا اور آج بھی ان کی زباں بندی حکومتوں کے لیے نہایت اہم ٹھہرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادیب اور دانشور، کبھی سرکار اور دربار میں بار نہیں پاتے جو زبان کو بالا دست طبقات کے خلاف ایک کاری ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

'اردو نیوز'، جدّہ

۳۰ جنوری ۲۰۰۳ء

میں شرمندہ ہوں

پتھر کے دور سے اب تک کروڑوں برس پرانی زمین نے بلا مبالغہ ہزاروں نہیں لاکھوں لڑائیاں سہیں اور جنگی جنون کے ان گنت مظاہرے دیکھے لیکن ۱۵ر فروری ۲۰۰۳ء کو ایسا پہلی مرتبہ ہوا کہ ہماری دھرتی نے جنگ پر جانے والے گھوڑوں کی ٹاپوں، میدان جنگ کی طرف بڑھنے والوں کے بوٹوں کی دھمک اور محاذ کی طرف بڑھتے ہوئے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ کی بجائے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے سینکڑوں شہروں میں دو کروڑ سے زیادہ انسانی قدموں کی چاپ سنی۔ ان میں عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے، عیسائی، یہودی، ہندو، مسلمان، دنیا دار اور دین دار تھے، ان میں دائیں اور بائیں بازو والے، کمیونسٹ اور اینٹی کمیونسٹ، کالے اور گورے، سب ہی شامل تھے۔ باپ چھوٹے بچوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے، مائیں شیر خوار بچوں کو سینے سے لگائے ہوئے، کوئی انگریزی، کوئی فرانسیسی، کوئی ہسپانوی، کوئی عبرانی بولتا ہوا، کسی کے لبوں پر اطالوی اور کسی کی زبان عربی۔ کون سی نسل تھی جو دنیا کے ۶۰ سے زیادہ ملکوں کے ان ایک کروڑ مظاہرین میں شامل نہ تھی اور کون سے عقیدہ، کون سا قبیلہ تھا جو ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر جنگی جنون کے سامنے بند باندھنے نہیں نکلا تھا۔

ان لوگوں کو ہمارا سلام جو شدید ترین سردی میں اپنے گرم اور نرم بستروں کو چھوڑ کر عراقی باشندوں کے ساتھ یک جہتی اور امریکا کی ریاستی دہشت گردی کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے کے لیے نکلے۔ ان معذوروں، بوڑھوں، پنشن یافتہ فوجیوں، مراعات یافتہ نوجوانوں، پیٹ بھروں اور فاقہ مستوں کو ہمارا سلام جو امریکا، برطانیہ اور ان دونوں ملکوں کے حلیفوں کے استعماری عزائم کی راہ میں مزاحم ہونے کے لیے نکلے۔

دنیا کے چھ براعظموں کے ان کروڑوں انسانوں کو ہمارا سلام جو اپنے زندہ ضمیر کے ساتھ اپنی بے ضمیر حکومتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے نکلے۔

آپ نے، میں نے اور ہم سب نے اپنے اپنے گھروں کی پُر آسائش فضا میں لندن کے کوچہ و بازار کو دیکھا جہاں لوگ عراقیوں کی غم گساری کے لیے جوق در جوق اُمڈ آئے تھے۔ یہ دنیا کی قدیم ترین جمہوریت کے شہری تھے۔ جن کی حکومت آج امریکی جنگی جنون کی سب سے بڑی حامی ہے۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعے نے ان لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا، ان میں سے کوئی بھی صدام حسین کا حامی نہیں، لیکن جب عراقیوں کی جان پر بن آئی تو وہ 'امن...... امن، پکارتے ہوئے نکلے۔ لندن میں مظاہرے کا اہتمام کرنے والوں نے کہا تھا کہ ہم پانچ لاکھ کی تعداد میں لوگوں کو جمع کر پائیں گے۔ اس اعلان کو سن کر لندن کی ۱۰۔ ڈاؤننگ اسٹریٹ سے اس ملک کے وزیراعظم نے طنزاً کہا کہ جنگ مخالف مظاہروں میں اتنے لوگ بھی شریک نہیں ہوں گے جتنے لوگوں کو صدام حسین نے عراق میں قتل کرایا ہے۔ یہ سننا تھا کہ چند برس پہلے ٹونی بلیئر کو بھاری اکثریت سے کامیاب کرانے والے برطانوی یوں اُمڈے کہ لندن کی وسعت کم پڑ گئی۔ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ اس روز گیارہ سو برس پرانی جمہوریت کے امانت دار شہر میں بیس لاکھ انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا اور اپنے ہی منتخب کردہ وزیراعظم سے یہ کہتا تھا کہ ہم نے تمہیں اس لیے وزیراعظم نہیں بنایا تھا کہ تم ہمیں امریکی ریاست کی غلامی میں دے دو، نہتے اور بے گناہ عراقیوں پر جنگ مسلط کر دو۔

آپ نے، میں نے اور ہم سب نے روم کی وسیع و عریض سڑکیں اور چوک دیکھے جہاں جنگ پسند اطالوی حکومت کے خلاف اس کے اپنے لوگ اس شان سے نکلے کہ مجمع تیس لاکھ سے زیادہ کا تھا، یہ لوگ اپنی جنگ پسند حکومت کو امریکی حمایت سے باز رکھنے اور عراقیوں کے لیے امن مانگنے نکلے تھے۔ یہ وہی روم ہے جس کی سفاکی تاریخ میں مشہور رہی ہے۔ جہاں نیرو جیسا ظالم بادشاہ پیدا ہوا جو اپنے ہی شہر کو جلتا دیکھ کر بانسری بجاتا تھا۔ جہاں انسان بھوکے شیروں سے لڑائے جاتے تھے اور جہاں بیسویں صدی کے نصف میں ایک ظالم و سفاک ڈکٹیٹر مسولینی نے حکومت کی تھی۔ اسی روم میں وادیٔ دجلہ و فرات میں رہنے والوں کے لیے جان کی امان مانگی جا رہی تھی۔

آپ نے، میں نے اور ہم سب نے آسٹریلیا اور یورپ کے ان تمام ملکوں کے شہریوں کو

لاکھوں کی تعداد میں جنگ کے خلاف مظاہرے کرتے دیکھا، جن کی حکومتیں امریکا کی ریاستی دہشت گردی کی طرفدار ہیں۔ ہم نے امن کے لیے ان کا جوش وخروش بھی دیکھا اور جنگ کے خلاف ان کے غم وغصے کے عینی گواہ بھی بنے۔ آپ نے، میں نے اور ہم سب نے لندن کے میئر، برطانوی اراکین پارلیمنٹ، ہالی ووڈ کے اداکاروں اور اداکاراؤں، امریکی دانشوروں، اطالوی ادیبوں اور ہسپانوی شاعروں کو ان مظاہروں کی قیادت کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے، میں نے اور ہم سب نے تل ابیب کی سڑکوں پر فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر امن کے لیے مظاہرے کرتے ہوئے دیکھا جبکہ عین اسی وقت اسرائیلی حکومت کے ٹینک غزہ کے علاقے میں فلسطینیوں کے گھر گرا رہے تھے۔ آپ نے، میں نے اور ہم سب نے ان امن مظاہروں میں یہ بھی دیکھا کہ بعض شہروں میں عورتوں کی تعداد مرد مظاہرین سے زیادہ تھی، رات کے اندھیرے میں روشن شمعیں لے کر چلنے والے بچے اپنی بساط سے کہیں زیادہ چل رہے تھے، اور معذوروں کو اپنی بیماری اور تھکن یاد نہیں رہی تھی۔

اب یہ امن مظاہرے ختم ہو چکے ہیں، لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے ہیں، انہوں نے اپنی اپنی منتخب حکومتوں کو اپنی رائے سے آگاہ کر دیا ہے اور اس دن کے انتظار میں ہیں کہ عوامی جذبات کے خلاف کام کرنے والی حکومتوں کے خلاف ووٹ ڈالنے کا دن کب آئے اور کب وہ اپنی امن دشمن حکومتوں کا حساب چکائیں۔

میں بھی بسنت منا چکی اور اب اس کی تھکن اتارنے کے لیے وہ کرکٹ میچ دیکھ رہی ہوں جو عالمی کپ کے لیے ہو رہے ہیں۔ چائے کی ایک پیالی اور کافی کے مگ سے اٹھتی ہوئی خوشبودار بھاپ کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہی ہوں، اس کا لطف لے رہی ہوں۔ اچانک مجھے یاد آتا ہے کہ اس دنیا کی شہری تو میں بھی ہوں۔ امن قائم رکھنے کی اور امریکی استعمار کا مقابلہ کرنے کی تھوڑی سی ذمہ داری تو مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے...... اور تب شرمندگی کی ایک لہر مجھ پر سے گزر جاتی ہے۔

میں شرمندہ ہوں ان لاکھوں عراقی بچوں سے جو گزشتہ بارہ برس میں پابندیوں کے سبب بھوک اور پیاس سے بلبلاتے رہے، دواؤں کے لیے ترستے رہے اور اپنی ماؤں کے ہاتھوں میں دم توڑ گئے۔ میں ان عراقی شہریوں سے شرمندہ ہوں، جنہوں نے سالہا سال سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور الم ناک موت، ایک بھیانک جنگ کی صورت میں جن کا مقدر ہے۔ میں عراق کی

ان فضاؤں سے شرمندہ ہوں جن میں ہر لمحہ امریکی بمبار طیارے گشت کرتے ہیں اور کوئی روز جاتا ہے کہ وہ سرزمین دجلہ وفرات پر بموں کے قالین بچھائیں گے۔ میں شرمندہ ہوں عروس البلاد، شہر بغداد سے جسے ہلاکو خان کی فوجوں نے تاراج کیا اور اب اکیسویں صدی کے ہلاکوؤں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والا ہے۔

میں شکر گزار ہوں ان برطانوی باشندوں کی جو ۲۰ لاکھ کی تعداد میں لندن کی سڑکوں پر نکل آئے اور جنہوں نے اپنے منتخب وزیراعظم کی یہ دلیل ہرگز نہیں سنی کہ امریکا کا ساتھ دینا برطانیہ کے مفاد میں ہے اور چونکہ میرے لیے سب سے پہلے برطانیہ ہے، اس لیے میں امریکا کے ساتھ ہوں۔ میں برطانوی عوام کی شکر گزار ہوں کہ 'سب سے پہلے برطانیہ' کے نعرے کو آپ نے ٹھکرا دیا، افسوس کہ ہم 'سب سے پہلے پاکستان' کا نعرہ لگانے والوں کے خلاف ہزار کی تعداد میں بھی سڑکوں پر نہیں نکل سکے اور ان کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے میل بھر کا فاصلہ بھی طے نہیں کر سکے۔

میں شکر گزار ہوں روم کے ان ۳۰ لاکھ شہریوں کی، جو اپنی منتخب حکومت کے راستے پر چلنے کی بجائے، امن کی راہ پر چلے اور انسانی تاریخ کا سب سے بڑا مظاہرہ اس سرزمین کے لیے کیا جس پر شاید صرف ہزار اطالویوں نے کبھی قدم بھی رکھا ہو۔ میں شکر گزار ہوں تل ابیب کے ان ہزاروں یہودیوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی جنہوں نے اپنی حکومت کی خواہش کے بالکل برعکس عمل کرتے ہوئے عربوں کے حق میں اور اپنی حکومت اور امریکی حکومت کے خلاف مظاہرہ کیا اور نعرے لگائے۔ میں شکر گزار ہوں آسٹریلوی باشندوں کی جنہوں نے اپنے وزیراعظم کے اس جملے 'ہمیں اقوام متحدہ سے زیادہ امریکی مفاد عزیز ہے' کا اس قدر برا مانا کہ دو کلومیٹر لمبا جلوس نکالا اور یہ جواب دیا کہ آسٹریلیا اور امریکا کی دوستی اپنی جگہ لیکن عراق کے خلاف امریکی جارحیت کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کی جائے گی۔ میں آسٹریلیا کی سینیٹ کو سلام کرتی ہوں جس نے ۱۰۲ سال کی تاریخ میں اپنے وزیراعظم کے خلاف پہلی مرتبہ عدم اعتماد کی قرارداد منظور کی۔

میں نیویارک اور ہالی ووڈ، لندن، پیرس، برلن، ملبورن، سڈنی، تل ابیب اور دنیا بھر کے سینکڑوں شہروں اور شہریوں سے شرمندہ ہوں۔ عراقیوں کے لیے جو کچھ آپ نے کیا، وہ ہم نہ کر سکے۔ ہمارے یہاں آسٹریلیا کی طرح ابھی سینیٹ موجود نہیں، اس وقت تو ہم اس کے قیام

کے لیے گھوڑوں کی تجارت کر رہے ہیں، لیکن قومی اسمبلی تو موجود ہے، اگر وہاں عراق کے مسئلے پر آج امریکا کے خلاف کوئی تحریک پیش ہو، تو وہ یقیناً منظور نہ کی جاسکے گی۔

مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے حریت پسند لوگوں کے سامنے میں یہ اعتراف کرنا چاہتی ہوں کہ تم حق و انصاف کی خاطر سڑکوں پر آئے اور تم نے انسان ہونے کا حق ادا کر دیا، لیکن ہم اب تک وہ کچھ نہ کر سکے، جو ہم پر فرض تھا۔ کراچی اور لاہور، پشاور اور کوئٹہ کی سڑکوں پر اگر لاکھوں لوگ امن کا مطالبہ کرتے ہوئے اور امریکی استعمار کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے نہیں نکلے تو اس میں ان لوگوں کی غلطی نہیں، میری خطا ہے۔

میں جو ادیب ہونے کا، صحافی اور کالم نویس ہونے کا دعویٰ رکھتی ہوں، میرے قلم میں وہ طاقت نہیں جو میرے لوگوں کو متحرک کر سکے۔ غلطی پاکستانی عوام کی نہیں، ان سیاستدانوں کی ہے جن کے دل عوام کے ساتھ نہیں دھڑکتے اور جو امتحان کی گھڑی میں، ضمیر کا سودا کر لینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ قصور پاکستانیوں کا نہیں، پاکستانی حکمرانوں کا ہے جو چند ارب ڈالر کو اپنا قومی مفاد قرار دیتے ہیں اور لوگوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ حق اور انصاف کا ساتھ نہ دے کر ہم امریکا اور اس کے حلیفوں سے بہت مال بٹور سکتے ہیں۔ میرے وطن کے لوگ عراقی عوام کے ساتھ ہیں۔ امریکی جارحیت کے خلاف ہیں۔ جنگ سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ مجھ ایسے نام نہاد ادیبوں، صحافیوں، دانشوروں، سیاسی اور مذہبی رہنماؤں اور حکمرانوں کا قصور ہے جو اپنے عوام کو دوسروں کے سامنے شرمندہ کرتے ہیں۔

میں اپنے حصے کی شرمندگی قبول کرتی ہوں اور برملا یہ کہتی ہوں کہ میرے ملک کے چند فی صد مفاد پرستوں کے علاوہ ہر پاکستانی عراق پر امریکی حملے کے خلاف ہے۔ وہ حق کے ساتھ ہے اور سچ کا سودا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۱۹ رفروری ۲۰۰۳ء

دنیا کے تمام غریب ملکوں کا مقدمہ

غیر وابستہ تحریک جسے غیر جانبدار ملکوں کی تحریک بھی کہا جاتا ہے، عالمی سیاست میں اہمیت اور وزن رکھتی ہے۔ یہ ایک طرح تیسری دنیا کے ملکوں کی نمائندگی کرتی ہے اور اب اس کی رکنیت دنیا کے ۱۱۶ ملکوں کے پاس ہے۔ ایک زمانے میں ہندوستان کے پنڈت جواہر لعل نہرو، مصر کے صدر جمال ناصر، انڈونیشیا کے جنرل سوئیکارنو اور کیوبا کے فیڈل کاسترو اس تحریک کے روح رواں تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پنڈت نہرو، جمال ناصر، احمد سوائیکارنو سب ہی راہئ ملک عدم ہوئے اور ان کی جگہ نئے رہنماؤں نے لے لی جن میں اس وقت سب سے اہم نام ملائیشیا کے مہاتیر محمد کا ہے۔ فیڈل کاسترو جو ۱۹۵۹ء میں ایک آمرانہ حکومت کا تختہ الٹ کر برسر اقتدار آئے تھے، اب تک کیوبا پر حکومت کر رہے ہیں اور اس دوران وہ امریکا کی عالمی بالادستی کے خلاف اہم ترین کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ غیر وابستہ تحریک کی تازہ ترین کانفرنس جو چند دنوں پہلے کوالالمپور میں ختم ہوئی اکیسویں صدی میں اس تحریک کی پہلی کانفرنس ہے۔ اس کانفرنس کے دوران مہاتیر محمد اور فیڈل کاسترو اپنے بے باک موقف اور اپنی دوٹوک باتوں کے سبب کانفرنس پر چھائے رہے۔

یہ کانفرنس ایک ایسے موقعہ پر منعقد ہوئی جب ایک مہیب جنگ کسی وقت بھی شروع ہوسکتی ہے۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں پر بعض مغربی حکومتوں اور یورپی عوام کا شدید دباؤ بن چکا ہے کہ عراق کے خلاف جنگ کا ہتھیار نہ آزمایا جائے۔ جنگ مخالف مظاہرے امریکا میں بھی ہو رہے ہیں اور عراق میں وہ یورپی باشندے بھی مسلسل پہنچ رہے ہیں جو ممکنہ امریکی حملوں کے خلاف ایسے مقامات پر رہنا چاہتے ہیں جہاں امریکی میزائل گرنے کا سب سے زیادہ خطرہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ 'Human Shield' یا 'انسانی ڈھال' بن کر عراق کے بے گناہ باشندوں کے لیے

اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں۔

امریکا اور اس کے اتحادیوں نے عراق کے خلاف جس زور شور سے طبل جنگ بجایا ہے، اس فضا میں غیر وابستہ تحریک کے رکن ممالک کے اس اجلاس نے بہت اہمیت اختیار کرلی تھی۔ اس کی میزبانی اس مرتبہ ملائیشیا کے حصے میں آئی اور اس کے مہاتیر محمد نے غیر وابستہ ملکوں اور تیسری دنیا کے تمام غریب ملکوں کا مقدمہ کھل کر لڑا۔ انہوں نے یہ کہنے میں کسی قسم کی الجھن محسوس نہیں کی کہ غیر وابستہ تحریک کے ۱۱۶ رممالک جنگ کے خلاف ہیں، چاہے وہ انفرادی طور پر لڑی جائے یا اسے اجتماعی رنگ دیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ غیر جانبدار تحریک کے جنگ مخالف فیصلے کو امریکی دانشور اور دنیا بھر کے باضمیر لوگ لازمی طور پر وزن دیں گے۔ ان سے جب یہ کہا گیا کہ غیر جانبدار سربراہی کانفرنس کے افتتاحی خطاب میں انہوں نے غیر جانبدار ملکوں کا موقف بڑی جرأت سے پیش کیا ہے جبکہ سپر پاور کی حیثیت رکھنے والا امریکا ترقی پذیر ممالک کے سربراہوں کی جرأت مندانہ باتیں سننے کا عادی نہیں، تو کیا اس جرأت کا اظہار کرکے وہ خوفزدہ نہیں ہیں؟ اس کے جواب میں ڈاکٹر مہاتیر محمد نے کہا کہ اس وقت دنیا کا ہر آدمی امریکی حکومت سے خوفزدہ ہے، وہ جب اور جس کی چاہے گردن اڑا سکتی ہے لیکن تیسری دنیا کے عوام کے حقوق کی آواز اٹھانا ضروری ہے۔

کوالالمپور میں ہونے والی اس غیر وابستہ تحریک نے اقوام متحدہ کی منظوری کے بغیر عراق کے خلاف جنگ کو مسترد کردیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی عراق پر زور دیا ہے کہ وہ اسلحہ انسپکٹروں سے بھرپور تعاون کرے۔ غیر وابستہ تحریک کے اراکین نے مشترکہ اعلامیے میں کہا ہے کہ عراق کے خلاف جنگ سے پورا خطہ متاثر ہوگا۔ جس کے سیاسی، معاشی اور انسانی اثرات پوری دنیا کے ملکوں پر مرتب ہوں گے۔ ہم موجودہ صورت حال میں بحران کا پُرامن حل چاہتے ہیں۔ غیر وابستہ تحریک نے عراق کے خلاف جنگ سے بچنے کے لیے کی جانے والی تمام کوششوں کا خیر مقدم کیا اور کسی بھی یک طرفہ کارروائی کی بجائے عالمی امن کے لیے سلامتی کے کردار کو تسلیم کرنے کی بات کی۔ مشترکہ اعلامیہ میں صدر بش کی طرف سے عراق، ایران اور شمالی کوریا کو برائی کا محور قرار دینے کی بھی مذمت کی گئی اور کہا گیا کہ یہ ان ریاستوں کو ہدف بنانا ہے۔ ۱۱۶ رملکوں کی اس تنظیم نے کہا کہ امریکا دہشت گردی کے خلاف مہم کو عراق کے خلاف دھمکیوں کے لیے استعمال کررہا ہے۔ غیر وابستہ تحریک کے کسی بھی رکن کے خلاف دہشت گردی کے خاتمے کے نام پر طاقت کے استعمال کی

شدید مخالفت کی گئی اور کہا گیا کہ ایسا کوئی بھی اقدام نفسیاتی اور سیاسی دہشت گردی کے مترادف ہوگا۔ مشترکہ اعلامیہ میں غریب ملکوں بالخصوص افریقی ممالک کو قرضوں میں سہولتیں مہیا کرنے پر اصرار کیا گیا اور کہا گیا کہ ترقی پذیر ملکوں سے غربت کے خاتمے کے لیے قرضوں کی ادائیگی کے لیے مزید وقت دیا جائے تا کہ وہ اقتصادی بحالی کے لیے اقدامات کر سکیں۔ قرضوں کی ادائیگی میں عارضی رعایت کے بدلے ان ملکوں پر کوئی دوسرا بوجھ بھی نہیں ڈالنا چاہیے۔ اس اعلامیہ میں ترقی پذیر ملکوں کی عالمی منڈیوں تک رسائی نہ ہونے اور عالمگیریت کے اس دور میں عدم شرکت پر بھی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے برابری کی بنیاد پر عالمی اقتصادی آرڈر کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

یوں تو اس کانفرنس میں رکن ملکوں کے تقریباً تمام ہی وزرائے اعظم اور صدور نے تقریریں کیں لیکن کیوبا کے صدر فیڈل کاسترو کی شعلہ بیانی لوگوں کو عرصے تک یاد رہے گی۔

دنیا کے طاقتور ممالک نے ماضی میں جن ملکوں کو اپنی نوآبادی بنالیا تھا اور جن ممالک کی دولت کو وہ صدیوں تک لوٹتے رہے تھے، وہ ممالک آج غیر ترقی پذیر ممالک کہلاتے ہیں۔ اس وقت مکمل آزادی جیسی کوئی نعمت انہیں نہیں ہے۔ مساویانہ سلوک اور قومی سلامتی وتحفظ ان کا خواب ہے۔ تیسری دنیا کے ان ممالک میں کوئی بھی ملک سلامتی کونسل کا ویٹو پاور رکھنے والا رکن نہیں ہے۔ اس بات کا امکان بھی نہیں کہ ان میں سے کسی ملک کو عالمی مالیاتی اداروں کے فیصلوں میں شامل کیا جائے گا۔ ان میں سے کوئی بھی ملک بہترین ٹیلنٹ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا، ان میں سے کوئی بھی ملک سرمائے کی اڑان سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ ترقی یافتہ اور خودغرض ممالک جس انداز سے اسراف اور فضول خرچی کر رہے ہیں اس سے پیدا ہونے والی تباہی اور نقصان سے ترقی پذیر اور غیر ترقی پذیر ممالک اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے ہیں۔

۱۹۴۰ء کے عشرے میں قتل عام کے بعد ہم سے ایک ایسی دنیا کا وعدہ کیا گیا تھا جہاں امن ہوگا، جہاں امیر اور غریب کے درمیان تفاوت میں کمی واقع ہوگی اور جہاں انتہائی ترقی یافتہ ممالک کم ترقی یافتہ ممالک کو مدد فراہم کریں گے۔ یہ سب کچھ سفید جھوٹ تھا۔ ہم پر ایک نا قابل برداشت اور نا قابل عمل ورلڈ آرڈر مسلط کر دیا گیا۔ دنیا کو اندھے راستے کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ تیل اور گیس کے جو ذخیرے گزشتہ ۳۰۰ ملین برسوں میں اکٹھے ہوئے تھے وہ آئندہ ۱۵۰ برس تک بمشکل ہی کافی ہوں گے۔ ان ذخیروں کو اس قلیل عرصے میں ختم کر دیا جائے گا۔

صرف ایک سو برس میں دنیا کی آبادی ۵ء۱ بلین سے بڑھ کر ۶ بلین ہو چکی ہے۔اتنی بڑی آبادی کا مکمل انحصار توانائی کے ان وسائل اور ذرائع پر ہوگا جنہیں ابھی تلاش کیا جانا ہے۔غربت اپنے پھیلاؤ کو شدت سے جاری رکھے ہوئے ہے جبکہ نئی اور پرانی بیماریوں نے تمام اقوام کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔زمینیں برباد ہورہی ہیں اور ان کی زرخیزی میں کمی واقع ہوتی جارہی ہے، آب و ہوا میں تبدیلی آرہی ہے، ہوا، پینے کا پانی کمیاب ہے اور سمندروں میں آلودگی بڑھتی جارہی ہے۔ایک ایسی تشویش ناک صورت حال میں تیسری دنیا کے ممالک کی جانب سے بار بار یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ موجودہ اقتصادی بدحالی کے زمانے میں وہ امریکا کا ۵ء۲ کھرب ڈالر کا قرضہ ادا نہیں کرسکتے ہیں جبکہ دوسری طرف تباہ کن ہتھیاروں پر ایک کھرب ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں۔ایسا کیوں ہے؟ یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ تقریباً اتنی ہی رقم کمرشل تشہیر پر خرچ کی جاتی ہے۔آج بنی نوع انسان کو بنی نوع انسان کے پاگل پن کی وجہ سے دنیا کے معدوم ہونے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔اس خطرے سے لڑنے کا کام تیسری دنیا کے عوام کو ہی کرنا گا جو دنیا میں واضح اکثریت رکھتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ تباہی ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔جدید نظریات اور آگاہی کے ذریعے عالمی اور امریکی رائے عامہ کو متحرک کرنا ان کی ذمہ داری اور ضرورت ہے کیونکہ صرف اسی طرح دنیا کو تباہی سے بچایا جاسکتا ہے۔

امریکا کسی بدمست ہاتھی کی طرح دنیا کو روند دینا چاہتا ہے۔عراق اس کا پہلا نشانہ ہے، اس کے بعد وہ کس طرف بڑھے گا؟ اس بارے میں زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ایک ایسے خطرناک مرحلے پر غیر وابستہ تحریک کی یہ سربراہ کانفرنس اور اس میں اختیار کیا جانے والا موقف تیسری دنیا کی تمام اقوام کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۲۶ فروری ۲۰۰۳ء

عوامی طاقت بمقابلہ فوجی طاقت

۱۵رفروری ۲۰۰۳ء کا دن اکیسویں صدی کی تاریخ میں ایک یادگار دن کے طور پر یاد کیا جائے گا۔ اس روز دنیا بھر کے اور بہ طور خاص یورپ اور امریکا کے ۶۰۰ سے زیادہ شہروں میں امریکا کی جنگجویانہ پالیسیوں کے خلاف تین کروڑ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، نسلی، مذہبی، صنفی، علاقائی اور لسانی حد بندیوں کو مٹاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے جنگ کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ انہوں نے عیسائی، یہودی، ہندو اور مسلمان ہونے کی بجائے انسان ہونے کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے 'حبِ وطن'، 'قومی مفاد' اور 'تہذیبوں کے تصادم' جیسے تمام معاملات ونظریات کو رَد کرتے ہوئے جنگ پسند امریکی انتظامیہ کو یہ بتا دیا کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا کے عوام اب کسی نئی جنگ کو برداشت نہیں کریں گے۔

اس روز تمام دنیا میں ہونے والے امن مظاہروں کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے۔ یورپ کے شہروں میں روزانہ جنگ مخالف مظاہرے ہو رہے ہیں، اب اسلامی ملکوں میں بھی بڑے پیمانے پر امن مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، پاکستان میں بھی روزانہ مظاہرے ہو رہے ہیں، کراچی اور پنڈی میں دو بڑے مظاہرے ہو چکے ہیں جس سے پاکستانی رائے عامہ کا رُخ پہچانا جا سکتا ہے۔ امریکی اور برطانوی یونیورسٹیوں کے طلبہ بھی سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ امریکا میں ٹیلی فون، ای میل اور فیکس کے ذریعے دس لاکھ سے زیادہ شہریوں نے ایک مخصوص وقت پر امریکی انتظامیہ کو جنگ مخالف پیغامات بھیج کر واشنگٹن کے سرکاری محکموں کا ٹیلی کمیونیکیشن نظام درہم برہم کر دیا اور دنیا کو یہ دکھا دیا کہ اگر سڑک پر ایک شخص بھی نعرے لگاتا ہوا نہ نکلے، تب بھی حکومتوں کو یہ بتایا جا سکتا ہے کہ گھروں میں بیٹھے ہوئے لاکھوں لوگ ان کی پالیسیوں سے شدید

اختلاف رکھتے ہیں۔

برطانیہ میں ٹونی بلیئر کی حکومت اپنی جنگ پسند پالیسی کی بناء پر شدید بحران کا شکار ہے۔ برطانوی وزیراعظم نے جس طرح امریکی صدر کی عراق پالیسی پر صاد کیا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کے ملک میں ان پر شدید تنقید ہو رہی ہے، لاکھوں افراد جنگ مخالف مظاہرے کر رہے ہیں۔ برطانوی وزراء کی طرف سے استعفوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ اور کہا جا رہا ہے کہ اگر برطانوی وزیراعظم نے اقوام متحدہ کی منظوری کے بغیر عراق کے خلاف امریکی حملے میں شرکت کی تو کئی وزیر اپنے اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں گے۔ ٹونی بلیئر حکمران لیبر پارٹی کے سربراہ ہیں لیکن انہیں اپنی جماعت کی طرف سے بغاوت کا سامنا ہے۔ ۱۱ر دن پہلے عراق پر حملے کے سلسلے میں برطانوی دارالعوام میں جو رائے شماری ہوئی تھی اس میں ٹونی بلیئر کی مخالفت میں ان کی پارٹی کے ۱۲۲ ر اراکین نے ووٹ ڈالے تھے لیکن یہ مخالفت بڑھتی جا رہی ہے اور لیبر پارٹی کے باغی اراکین کا کہنا ہے کہ عراق پر حملے کے سلسلے میں دوبارہ جو رائے شماری ہوگی، اس میں ۲۰۰ سے زیادہ لیبر ممبر پارلیمنٹ اپنے وزیراعظم کے خلاف ووٹ ڈالیں گے۔

امریکا میں بھی صدر بش کی جنگ جوئی کے خلاف امریکی رائے عامہ تیزی سے ہموار ہو رہی ہے۔ وہ لوگ جو پہلے عراق پر حملے کے حق میں تھے اب اس حملے کی مخالفت کر رہے ہیں اور اسے امریکی مفادات کے خلاف سمجھ رہے ہیں۔ امریکی رائے عامہ اور سربرآوردہ اخبارات کے بدلتے ہوئے مزاج کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ اتوار کو نیویارک ٹائم نے لکھا کہ وہ بین الاقوامی حمایت کے بغیر عراق سے جنگ کے خلاف ہے جبکہ واشنگٹن پوسٹ کا کہنا تھا کہ 'بین الاقوامی یکجہتی برقرار رکھنے کی خاطر امریکا کو چاہیے کہ عراق کو غیر مسلح کرنے کے لیے مزید چند ہفتوں کا وقت دیا جائے۔' عراق کے خلاف جنگ کے بارے میں امریکیوں کی بڑھتی ہوئی تشویش کا اظہار ان بڑے اخبارات کے اداریوں سے ہوتا ہے۔

'نیویارک ٹائمز' نے اپنے اداریے میں لکھا کہ 'ہمیں یقین ہے کہ طویل عرصہ سے جاری اسلحے کے معائنہ کے کام کو تیز کرنا ایک بہتر اقدام ہوگا۔ لیکن دیگر امریکیوں کی طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ راہیں مسدود ہو رہی ہیں۔ صدر جارج بش نے 'اپنی ذات' کو تنہا کر لیا ہے اور اگر وسیع بین الاقوامی حمایت کے بغیر عراق پر حملے کے بارے میں ہاں یا نہیں کا سوال اٹھتا ہے تو ہمارا

جواب نفی میں ہے۔'نیویارک ٹائمز کا کہنا تھا کہ'اگر صدر بش نے عراق کے ساتھ معاملات کو زیادہ بہتر انداز میں چلایا ہوتا تو اس وقت معائنہ کے اس بڑے اور مشکل کام میں اقوام متحدہ کی حمایت حاصل کرلی ہوتی اور اعلان فتح کے ساتھ زیادہ تر فوجیں واپس جا رہی ہوتیں۔' ٹائمز کا کہنا ہے کہ صدام حکومت کی تبدیلی پر اصرار کی وجہ سے واشنگٹن کے لیے اپنے مقصد کا حصول کہیں زیادہ دشوار ہوگیا ہے۔

اسی طرح 'واشنگٹن پوسٹ' کو یہ لکھنے پر مجبور ہونا پڑا کہ'صدر بش ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکے ہیں جس کے بعد جنگ یا ایک ناقابلِ قیاس امریکی پسپائی کے علاوہ ان کی حکومت کے سامنے کوئی راستہ نہیں بچا ہے۔ ہم ان قوموں کی تشویش میں شریک ہیں جنھوں نے عراق پر طویل تنازعے کے نقصانات کی بات کی ہے۔ یہ وہ نقصان ہے جس کے لیے بش حکومت کی ناقص اور بعض اوقات جارحانہ سفارت کاری کو موردِ الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے۔'

صدر بش اور ان کے 'عقاب' صفت ساتھی چند ہفتوں پہلے اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ انہیں خود اپنے گھر میں اس نوع کی نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک طرف دنیا بھر کے عوام کی مخالفت ہے، دوسری طرف خود امریکی اور یورپی عوام ہیں جن کی اکثریت جنگ کو رَد کر رہی ہے۔ ۸ مارچ کو خواتین کے عالمی دن کے موقعہ پر خواتین نے بہ طور خاص امریکا مخالف امن مظاہرے کیے۔ حد تو یہ ہے کہ وائٹ ہاؤس کے سامنے ایک مظاہرہ ہوا جس کے شرکاء کے شانوں پر امریکی پرچم میں لپٹا ہوا ایک علامتی تابوت تھا۔ سول نافرمانی کے اس مظاہرے میں شریک عورتوں اور مردوں میں سے ۲۵ گرفتار بھی کیے گئے۔ یہ صورت حال اس بات کا اشارہ ہے کہ عراق کے خلاف جنگ کا آغاز کرنے سے پہلے ہی امریکا اور اس کے اتحادی یہ جنگ ہار گئے ہیں۔ وہ یہ جنگ اس لیے ہار گئے ہیں کہ پہلی مرتبہ عالمی سطح پر عوام کی طاقت دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت سے کسی خوف و خطر کے بغیر ٹکرائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا اس وقت ایک بدمست ہاتھی کی طرح ہے جو ساری دنیا کو روند دینا چاہتا ہے۔ اس کے اسی رعونت آمیز اور متکبرانہ رویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیوبا کے صدر فیڈل کاسترو نے کوالالمپور میں اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہم جس دور میں رہ رہے ہیں وہ انتہائی مشکل دور ہے۔ حالیہ مہینوں میں ہم نے ایک سے زیادہ مرتبہ دھمکی آمیز الفاظ اور بیانات سنے ہیں۔ ویسٹ پوائنٹ کے گریجویشن کرنے والے کیڈٹس سے خطاب

کرتے ہوئے یکم جون ۲۰۰۲ء کو امریکا کے صدر نے کہا تھا 'ہمارے تحفظ کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ ہم اس فوج (جس کی قیادت تم کرنے جارہے ہو) کو ایسی فوج میں تبدیل کردیں جو ایک لمحے کے نوٹس پر دنیا کے کسی بھی تاریک گوشے میں حملہ کرنے کے لیے تیار ہوجائے'......اس روز امریکی صدر نے قبل از وقت حملے کا تصور پیش کیا جو اس سے پہلے دنیا کی تاریخ میں کسی نے پیش نہیں کیا تھا۔ چند ماہ بعد عراق کے خلاف غیر ضروری لیکن تقریباً یقینی فوجی ایکشن کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا 'اگر ہم پر جنگ مسلط کی جاتی ہے تو ہم پوری قوت اور امریکی فوج کی پوری طاقت کے ساتھ یہ جنگ لڑیں گے۔'

یہ بیان کسی چھوٹے اور کمزور ملک کی طرف سے نہیں دیا گیا تھا بلکہ کرۂ ارض کے آج تک کے سب سے امیر اور فوجی قوت کے لحاظ سے طاقتور ترین ملک کی طرف سے دیا گیا تھا۔ جس کے پاس نیوکلیئر ہتھیار ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں اور جو ان ایٹمی اور دوسرے روایتی اور بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے ذریعے دنیا کو کئی مرتبہ تباہ و برباد کرسکتا ہے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس کا ہمیں سامنا ہے۔ 'دنیا کے تاریک گوشے' کی بات کرکے امریکی صدر نے اپنے عزائم کا اظہار کیا اور ہمیں یہ ماننا چاہیے کہ اس سے قبل کسی نے بھی اس سے بہتر توضیح نہیں کی تھی، نہ کسی نے اس طرح کی نفرت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ۱۹۴۰ء کے عشرے میں قتل عام کے بعد ہم سے ایک ایسی دنیا کا وعدہ کیا گیا تھا جہاں امن ہوگا، جہاں امیر اور غریب کے درمیان تفاوت میں کمی واقع ہوگی اور جہاں انتہائی ترقی یافتہ ممالک کم ترقی یافتہ ملکوں کو مدد فراہم کریں گے۔ یہ سب کچھ سفید جھوٹ تھا۔ ہم پر ایک ناقابل برداشت اور ناقابل عمل ورلڈ آرڈر مسلط کردیا گیا ہے اور دنیا کو اندھے راستے کی طرف دھکیلا جارہا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کی جانب سے بار بار یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ موجودہ اقتصادی بدحالی کے زمانے میں وہ امریکا کا ڈھائی کھرب ڈالر کا قرضہ ادا نہیں کرسکتے ہیں جبکہ دوسری طرف امریکا ان تباہ کن ہتھیاروں کی تیاری پر سالانہ ایک کھرب ڈالر خرچ کررہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ آج بنی نوع انساں کو کچھ انسانوں کے پاگل پن کی وجہ سے دنیا کے معدوم ہونے کا خطرہ پیدا ہوچکا ہے۔ اس خطرے سے لڑنے کا کام ہم کو ہی کرنا پڑے گا ہم جو دنیا میں واضح اکثریت رکھتے ہیں۔ دنیا بھر کیا عوام جانتے ہیں کہ تباہی ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جدید نظریات اور آگاہی کے ذریعے انہیں عالمی اور

امریکی رائے عامہ کو متحرک کرنا ہے کیونکہ صرف عوام ہی دنیا کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔

آج کا سچ یہی ہے کہ عالمی اور امریکی رائے عامہ متحرک ہو چکی ہے اور دنیا کو تباہی سے بچانے کے لیے فوجی طاقت سے ٹکرا گئی ہے۔ آج نہیں تو کل یہ بات ثابت ہو کر رہے گی کہ عوامی طاقت بالآخر فوجی طاقت کو شکست دے دیتی ہے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۱۲/مارچ ۲۰۰۳ء

ایسی فتح سے گریز کیجیے

اقوام متحدہ اورامریکی حکومت کے درمیان جو تضاد پیدا ہوا ہے وہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا ہے۔ یہ سطور جب آپ کی نظروں سے گزر رہی ہوں گی اس وقت تک امریکا غالباً یہ فیصلہ کر چکا ہوگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس وقت تک دنیا کو یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہ عراق کے بحران کے حل کے لیے سفارت کاری کو مزید وقت دے رہا ہے یا یہ اعلان کر رہا ہے کہ سفارت کاری کا عمل ناکام ہو چکا ہے اور اب تنازعے کا فیصلہ میدان جنگ میں ہوگا۔ امریکا چند دنوں کے اندر اگر جنگ کا فیصلہ کر لیتا ہے تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ اس کی نظروں میں اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

عراق امریکا کے لیے لقمہ تر ہے۔ وہ چند دنوں کے اندر اس ملک کو فتح کر سکتا ہے۔ فوجی اعتبار سے ایک انتہائی کمزور ملک کے خلاف ہولناک فوجی کارروائی کے ذریعے امریکا جو مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ پوری دنیا پر عیاں ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ہفتے دنیا کے دو ہزار آٹھ سو شہروں میں کروڑوں لوگوں نے امریکا کے خلاف اور امن کی حمایت میں زبردست مظاہرے کیے ہیں۔ خود امریکا کے بڑے بڑے شہروں میں احتجاجی جلوس نکالے گئے جن میں بلاشبہ لاکھوں امریکیوں نے شرکت کی اور اپنی حکومت کی جارحانہ پالیسیوں کے خلاف اپنی نفرت کا کھل کر اظہار کیا۔ تیل اور ہتھیار کے تاجر طاقت اور جارحیت کے ذریعے توانائی کے وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ عراق پر حملہ اس جانب پہلا قدم ہے۔ عالمی رائے عامہ کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ عراق پر امریکی فوجی جارحیت کو اگر آج نہ روکا گیا تو کل امریکی حکومت پوری دنیا پر طاقت کے ذریعے پر اپنی پسند کے فیصلے مسلط کرتے ہوئے اپنی بالادستی قائم کرے گی۔ جنگ کے خلاف مزاحمت ضمیر کا مسئلہ ہی نہیں

بلکہ اقوام عالم کی بقا کا معاملہ بھی ہے۔ دنیا کے ہر ملک کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ امریکا کی غلامی میں رہنے کے لیے تیار ہے یا نہیں؟ بہت سے ملکوں کے حکمران اپنے اقتدار کی خاطر امریکا کی غلامی کرنے پر رضامند نظر آتے ہیں لیکن ان ملکوں کے عوام کو یہ ذلت اور تضحیک گوارا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ، اسپین اور پاکستان سمیت متعدد ملکوں کے عوام اپنی اپنی حکومتوں پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ کھل کر امریکا کی مخالفت کریں۔ عوام کا دباؤ اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ ٹونی بلیئر برطانوی عوام اور پارلیمنٹ کی حمایت سے محروم ہو چکے ہیں اور پاکستان کی حکومت بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ وہ عراق کے تنازعہ کے پُرامن حل کی خواہاں ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اسلامی ملکوں کی تنظیم او آئی سی امریکا کی حمایت سے انکار کر چکی ہے۔ یورپی یونین امریکا کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں اور غیر وابستہ ملکوں کی تنظیم کے سربراہی اجلاس میں اتفاق رائے سے عراق کے خلاف امریکا کے ممکنہ حملے کی مخالفت میں قرارداد منظور ہو چکی ہے۔ اس موقع پر مجھے کیوبا کے صدر فیڈل کاسترو کی وہ تقریر یاد آتی ہے جو انہوں نے ۱۲/اکتوبر ۱۹۷۹ء کو اقوام متحدہ میں غیر وابستہ ملکوں کی تنظیم کے سربراہ کی حیثیت سے کی تھی۔ آج سے ۲۴ برس پہلے انہوں نے اقوام متحدہ کے مستقبل اور عالمی امن کے حوالے سے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ آج حرف بہ حرف درست ثابت ہو رہے ہیں۔ انہوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ہم امن چاہتے ہیں تو اس کے لیے وسائل کی فراہمی ضروری ہے۔ اگر ترقیاتی کاموں کے لیے وسائل نہیں ہوں گے تو امن بھی نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگ کہیں کہ ہم بہت مانگ رہے ہیں لیکن میرے خیال میں ہمارا مطالبہ اب بھی بہت کم ہے۔ تازہ اعداد و شمار (۱۹۷۹ء) کے مطابق دنیا اس وقت فوجی اخراجات پر ہر سال تین سو بلین ڈالر سے زیادہ خرچ کر رہی ہے۔ تین سو بلین ڈالر سے آپ ایک سال میں چھ لاکھ اسکول بنا سکتے ہیں جو چالیس کروڑ بچوں کو تعلیم دے سکیں، تیس کروڑ لوگوں کے لیے چھ کروڑ آرام دہ مکانات تعمیر کر سکتے ہیں، ایک کروڑ ۸۰ لاکھ بستروں پر مشتمل تیس ہزار ہسپتال بنا سکتے ہیں۔ بیس ہزار فیکٹریاں شروع کر سکتے ہیں جو دو کروڑ مزدوروں کو ملازمتیں دے سکیں یا آپ آب پاشی کا ایک ایسا نظام شروع کر سکتے ہیں جو پندرہ کروڑ ہیکٹر زمین کو سیراب کر سکے اور موزوں ٹیکنالوجی کے ساتھ ایک ارب عوام کو خوراک مہیا کر سکے۔ یہ ہے وہ ناقابل یقین حد تک خطیر رقم جو انسانیت ہر سال اپنی فوجوں

اور جنگی ساز و سامان پر خرچ کرتی ہے۔

اب سے ۲۴ برس پہلے فیڈل کاسترو نے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے کہا تھا کہ کچھ لوگ ہمارے مطالبے کو خلافِ عقل کہیں گے لیکن اصل عقل دشمنی ہمارے دور میں دنیا کے اس پاگل پن میں ہے، اس خطرے میں ہے جو ساری انسانیت کو درپیش ہے۔ ان تمام عظیم الشان وسائل کو منظم کرنے اور تقسیم کرنے کی بھاری ذمہ داری مکمل طور پر اقوام متحدہ کو سونپی جانی چاہیے۔ یہ فنڈ بین الاقوامی برادری کو تمام ممالک کے درمیان قطعی برابری کے اصول پر اور بغیر کسی سیاسی شرائط کے تقسیم کرنے چاہئیں، یہ فیصلے کہ کس ملک کو کتنی رقم یا کتنا عطیہ کس وقت دیا جائے اس کا حق صرف اور صرف اقوام متحدہ کو حاصل ہونا چاہیے۔ کیوبا کے صدر کا کہنا تھا کہ یہ وہ حقوق ہیں جو ہم آپ سے تحفے کے طور پر نہیں مانگتے۔ آپ سب کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر ان مسائل کا حل نہیں نکالا گیا تو آنے والی تباہی کا ہم سب مساوی طور سے شکار ہوں گے۔ انہوں نے یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ کچھ لوگ ننگے پیر چلنے پر اس لیے مجبور ہیں کہ دوسرے قیمتی کاروں میں سفر کر سکیں؟ کچھ لوگ کیوں صرف ۳۵ سال تک زندہ رہ سکیں جبکہ دوسرے ستر سال تک زندہ رہیں؟ کچھ لوگ کیوں اندوہناک غربت میں مبتلا رہیں؟ کیا اس لیے کہ دوسروں کے پاس بے حساب دولت جمع ہو سکے؟ انہوں نے دنیا کے ان بچوں کی طرف سے بھی آواز بلند کی تھی جن کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نصیب نہیں۔ وہ ان بیماروں کی طرف سے بولے تھے جو دوا سے محروم ہیں۔ اور ان کی طرف سے بھی انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی تھی جن سے جینے کا حق اور انسانی وقار چھین لیا گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ کچھ ملک سمندر کے کنارے واقع ہیں جبکہ دوسرے نہیں ہیں۔ کچھ کے پاس توانائی کے ذخیرے ہیں، دوسروں کے پاس نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں کے پاس زمین کی بہتات ہے جس پر وہ خوراک پیدا کر سکتے ہیں، دوسرے اس سے محروم ہیں۔ کچھ ملک مشینریوں اور فیکٹریوں سے اس طرح بھرے ہوئے ہیں کہ ان سے خارج ہونے والی گیسوں سے زہر آلود فضا میں سانس تک لینا دشوار ہے اور دوسروں کے پاس صرف بھوک سے مرجھائے ہوئے ہاتھ ہیں جو ان کی روزانہ کی روٹی کمانے کا واحد ذریعہ ہیں۔

یہ بات اس تقریر میں واضح طور پر کہی گئی تھی کہ کچھ ملکوں کے پاس وسائل کی بہتات ہے جبکہ دوسروں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسے ملکوں کا مقدر کیا ہے؟ کیا بھوکوں مرنا؟ کیا ہمیشہ ہمیشہ

کے لیے غریب رہنا؟ ان کا کہنا تھا کہ اگر یہ ہے تو پھر یہ تہذیب کا ڈھونگ کیوں ہے؟ انسان کا ضمیر کہاں ہے؟ اقوام متحدہ کا وجود کیوں ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیا کا وجود کیوں ہے؟

۱۲/اکتوبر ۱۹۷۹ء کے اس دن فیڈل کاسترو کا کہنا تھا کہ آپ دنیا کے ان تمام کروڑوں انسانوں کی طرف سے بات نہیں کر سکتے جو بھوک سے مر رہے ہیں، یا قابل علاج بیماریوں کا شکار ہیں۔ آپ جو پیٹ بھرے ہیں آپ کو اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ امیر ملکوں کے ہاتھوں غریب ملکوں کے استحصال کو ختم کرنا ہوگا۔ اس روز انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ 'مجھے معلوم ہے کہ بہت سے غریب ملکوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو استحصال کرتے ہیں اور وہ بھی ہیں جن کا استحصال کیا جاتا ہے۔ علمی بحثیں بہت ہو چکیں! ہمیں اب ٹھوس عمل چاہیے! بہت ہو گئیں ایسے تصوراتی بین الاقوامی نظام کی باتیں جنہیں کوئی نہیں سمجھتا۔ اب ہمیں ایک حقیقی، سچ مچ کے نظام کی باتیں کرنا ہوں گی جو سب کی سمجھ میں آنے والی ہوں! میں یہاں انقلاب کے پیامبر کی حیثیت سے نہیں آیا ہوں۔ میں یہاں یہ مطالبہ کرنے یا یہ خواہش کرنے نہیں آیا ہوں کہ دنیا تباہ ہو جائے۔ میں یہاں قوموں اور امداد باہمی کی بات کرنے آیا ہوں اور میں یہ انتباہ کرنے آیا ہوں کہ اگر ہم نے امن پسندی اور سمجھداری سے موجودہ ناانصافیوں اور عدم برابریوں کے خاتمے کا حل نہیں نکالا تو مستقبل میں قیامت برپا ہوگی۔ بین الاقوامی میدان میں ہتھیاروں کے شور، دھمکیوں کی زبان اور تکبر آمیز برتاؤ کو ختم ہونا چاہیے۔ یہ خواب نہیں دیکھا جا سکتا کہ دنیا کے مسائل نیوکلیر ہتھیاروں سے حل ہو سکتے ہیں۔ بم بھوکوں، بیماریوں اور ان پڑھ لوگوں کے لیے موت تو لا سکتے ہیں، لیکن بھوک، بیماری اور جہالت کو ختم نہیں کر سکتے۔ آیئے ہم ہتھیاروں کو خیرباد کہیں، اور مہذب طریقے سے اپنے آپ کو اپنے زمانے کے بے پناہ مسائل کے حل کے لیے آمادہ کریں۔ یہ ہے وہ ذمہ داری، وہ مقدس فرض جو دنیا بھر میں سیاسی بڑوں کو ادا کرنا ہے۔'

۲۴ برس پہلے غیر وابستہ ملکوں کی تنظیم کے سربراہ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ 'میں انتباہ کرنے آیا ہوں کہ اگر ہم نے امن پسندی اور سمجھداری سے موجودہ ناانصافیوں اور عدم برابریوں کے خاتمے کا حل نہیں نکالا تو مستقبل میں قیامت برپا ہوگی۔'

فیڈل کاسترو کا ۲۴ برس پرانا یہ جملہ آج ایک ناقابلِ تردید سچ کی طرح ہمارے سامنے

ہے۔ یہ بات آج سب پر عیاں ہو چکی ہے کہ عراق پر امریکی حملہ دنیا میں قیامت برپا کر دے گا۔ دنیا کے محروم اور مظلوم عوام کو یقین ہو جائے گا کہ اب طاقت کے زور پر دنیا میں ناانصافی اور عدم برابری کا نظام قائم رکھا جائے گا۔ امریکی بم دنیا کے عوام کی جائز بغاوتوں کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ یہ حشر برپا ہوا تو وہ ملک سب سے زیادہ نقصان میں رہیں گے جن کے پاس کھونے کے لیے سب سے زیادہ ہے۔ یورپ کی دانش یہ حقیقت سمجھ چکی ہے اور اسی لیے اس نے خود کو امریکا سے الگ کر لیا ہے۔ ہم سب کو صدر امریکا سے یہ کہنا ہے کہ جناب بش! آپ صدام حکومت کو ختم کر سکتے ہیں لیکن اس کے بعد دنیا میں آپ کے ملک کے خلاف جو بغاوت ہوگی اس میں سب سے زیادہ نقصان آپ ہی کا ہوگا کیونکہ کھونے کے لیے سب سے زیادہ آپ کے ملک امریکا کے پاس ہے۔ ہم جو تیسری دنیا کے عوام ہیں، آپ سے بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسی فتح سے گریز کیجیے جو آپ کی قوم کی مکمل شکست کا پیش خیمہ بننے والی ہے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۱۹/ مارچ ۲۰۰۳ء

عراقیوں کی شاندار فتح

بغداد، برباد ہوا۔ اس کی جگمگاتی ہوئی عمارتیں زمیں بوس ہوئیں۔ اس کے روشن بازاروں نے دبیز دھوئیں کی چادر اوڑھ لی، اس کے گھروں پر موت نے اپنا سایہ ڈالا اور اس کے بے گناہ شہریوں نے خاک پر بستر بچھایا۔

یہ وہ منظر ہیں جنہیں ان دنوں آپ صبح و شام ٹیلی وژن اسکرین پر دیکھتے ہیں۔ آسمان سے برستی ہوئی آگ اور زمین پر رینگتے ہوئے تباہی کے اژدھے سب ہی کو نظر آ رہے ہیں۔ ساری دنیا کے مبصرین اس صورت حال پر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے تبصرہ اور تجزیہ کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی چند لمحوں کے لیے ان کی جھلکیاں بھی ٹیلی وژن اسکرین پر نظر آ جاتی ہیں جو عراقی عوام سے یک جہتی اور ہمدردی اور دنیا کے انسان دشمن حکمرانوں سے نفرت کے اظہار کے لیے شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کے سینکڑوں شہروں کی سڑکوں پر لاکھوں کی تعداد میں نکلے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ سامنے کا معاملہ ہے۔ میں اس بارے میں آپ سے کوئی نئی بات نہیں کہہ سکتی اور نہ آپ کے علم میں اضافہ کر سکتی ہوں۔ میں آپ سے اس ہفت رنگ پرندے کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں جسے ہم 'ضمیر' کے نام سے جانتے ہیں۔ انسان میں شعور بیدار ہو اور اسے نیک و بد میں تمیز کرنے کا سلیقہ آ جائے تو سات رنگوں والا یہ پرندہ اس کے وجود میں جنم لیتا ہے، پروان چڑھتا ہے۔ کبھی یہ کسی ان پڑھ کے سینے میں ٹھونگیں مارتا ہے اور 'بن منصور......بن منصور' کا ورد کرتا ہے۔ کبھی یہ کسی دانش مند اور دانش جُو کے سینے میں گنگناتا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی راہ اختیار کرے جس پر چل کر یا سقراط بنتے ہیں یا سرمد۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے راستے پر چل نکلے کہ سر

دے کر سرداری حاصل کر لے، فرات کے کنارے حسین کے قافلے پر پانی بند کرنے والے حُر کے سینے میں یہ ہفت رنگ پرندہ سوتے سوتے اٹھ بیٹھتا ہے، چہچہانے لگتا ہے۔ اور وہ جو شبِ عاشور یزیدی افواج میں سربلند و سردار تھا، روزِ عاشورا یڑ لگا کر حسین کے لشکر میں آجاتا ہے۔ شانے پر رکھا ہوا سر، اسے ایک بوجھ محسوس ہوتا ہے سو وہ اس بارِ گراں کو شانوں سے اتار دیتا ہے اور تاریخ میں اس کا نام کربلا کے اولین شہیدوں میں لکھا جاتا ہے۔

فرات کے کنارے آج ایک اور کربلا برپا ہے۔ ایک ایسی کربلا جس کے یزید ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور جس کے حُر بھی شمال و جنوب اور مشرق و مغرب میں سانس لیتے ہیں۔ ایک ایسی کربلا جس کے یزیدی لشکر کے خلاف اس کے ہم شہر اور ہم مذہب تو لاکھوں کی تعداد میں نکل آئے ہیں لیکن جس کربلا میں مارے جانے والے بے گناہ عراقیوں کے ہم مذہبوں کی آواز نحیف و نزار ہے۔ ایک ایسی کربلا جس کا یزید اپنی صبح کا آغاز بائبل سے کرتا ہے اور اسی بائبل کی صبح سے شام تک تلاوت کرنے والا عیسائیوں کا سب سے بڑا مذہبی رہنما کیتھولک چرچ کے مقدس ترین شہر میں کھڑے ہو کر بائبل سے ہی یہ جملہ دہراتا ہے کہ: 'وہ جو تلوار کھینچتے ہیں، وہ سب تلوار سے ہی ہلاک کیے جائیں گے۔'

امریکی صدر بش جنہوں نے افغانستان کو جرمِ بے گناہی کی سزا دیتے ہوئے 'صلیبی جنگ' کا اعلان کیا تھا اور اگلے روز اپنی زبان کی اس 'لغزش' پر معذرت کر لی تھی۔ ان کا مذہبی سربراہ جو صلیب گلے میں لٹکا کر اور عصا نما صلیب ہاتھ میں لے کر چلتا ہے، اس نے عراق پر حملے کے آغاز کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ: 'امریکی حملے نے انسانیت کے مقدر کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔'

پوپ جان پال دوم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ گزشتہ اتوار کو ویٹکن سٹی کے مرکزی چوک میں جمع ہونے والے چالیس ہزار عیسائی معتقدین سے انہوں نے کہا کہ 'وہ لوگ جو امریکی بمباری کا شکار ہو رہے ہیں، میں ان کے لیے غم زدہ ہوں۔ ان کے لیے دعا کرتا ہوں اور خود کو ان سے روحانی طور پر قریب تر محسوس کرتا ہوں۔' عراق میں مارے جانے والے، ہلاک ہونے اور در بہ در ہونے والے مسلمانوں کے لیے عیسائیوں کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا نے اپنے چالیس ہزار معتقدین کے ساتھ رحم کی اور امن کی دعا کی، مقدس مریم سے ان بے گناہوں کے لیے امان طلب کی۔ حملہ آور عیسائی لشکر کے لیے ہدایت اور ان کے قلب منقلب ہونے کی دعا کی۔

اس کرۂ ارض پر سات ہزار برس کی انسانی تاریخ میں ایسا پہلی مرتبہ ہو رہا ہے کہ کسی جنگ میں لوگ عقیدے، رنگ، نسل اور علاقے کی بنیاد پر تقسیم نہیں ہوئے، 'حب وطن' کے نام پر لاکھوں افراد بے وقوف نہیں بنے۔ انہوں نے تاریخ اور جغرافیہ دونوں کی تقسیم کو رد کر دیا۔

امریکا جس نے اکیسویں صدی کو ابتدا سے خون میں نہلا دیا ہے، وہاں جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی مظاہرے شروع ہو گئے تھے اور عراق پر ہونے والی بے محابا بمباری کے ساتھ ساتھ ان مظاہروں میں شدت آ رہی ہے۔ ہزاروں وہاں گرفتار ہو رہے ہیں۔ اپنی پولیس سے متصادم ہو رہے ہیں، سول نافرمانی کا اعلان کر رہے ہیں۔ امریکی صدر نے پہلے افغانستان اور پھر عراق پر جنگ مسلط کرتے ہوئے اس جنگ کا رشتہ ٹریڈ ٹاورز کی تباہی و بربادی سے جوڑا تھا۔ اس بات سے انکار کرتے ہوئے ٹریڈ ٹاورز میں ہلاک ہونے والوں کے ورثا کی تنظیم نے نیویارک میں مظاہرہ کیا اور یہ کہا کہ اس ظلم کو ہمارے نام پر مت کرو۔ ہم بے گناہ عراقیوں کے ساتھ ہیں۔ ہم جنگ کے خلاف ہیں۔

امریکا کے اعلیٰ سفارت کاروں کے استعفے آ رہے ہیں۔ کل امریکی دفتر خارجہ کے ایک اعلیٰ افسر کا یہ بیان شائع ہوا کہ 'میں نے بغداد پر بمباری شروع ہونے سے گیارہ دن پہلے استعفیٰ دے دیا تھا اور گیارہ دن بعد جمعہ کے روز جب میں نے بغداد پر بمباری کے بعد شعلے اٹھتے دیکھے تو میں سمجھ گیا کہ یہ امریکی تاریخ کے شرمناک ترین لمحات ہیں، بمباری سے لاکھوں معصوم افراد کو دہشت زدہ کیا جا رہا ہے۔ استعفیٰ کے بعد سے میں الجھن میں تھا کہ میرا فیصلہ درست تھا یا نہیں لیکن اس بمباری کو دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ وزارتِ خارجہ سے استعفیٰ دینے کا میرا فیصلہ درست تھا، میرے استعفیٰ کی دو وجوہ نہایت اہم تھیں۔ پہلا سبب یہ تھا کہ امریکی صدر جارج بش حملے کا جواز پیش کرنے کے سلسلے میں امریکی عوام اور عالمی برادری کو مطمئن کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ ایک امریکی کے طور پر میں یہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ میں صدر کی ناکامی اور قابل مواخذہ پالیسی کے بارے میں بات کروں۔ صدارتی پالیسی کے بارے میں گزشتہ سال سے ہی شکوک وشبہات نے میرے ذہن میں سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ گزشتہ برس ۷ ستمبر کو نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والے ایک مضمون نے مجھے چونکا دیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ وائٹ ہاؤس کے چیف آف اسٹاف کا کہنا ہے کہ امریکی انتظامیہ 'لیبر ڈے' تک انتظار کرے گی اور پھر عوام کو عراق

کے خلاف جنگ کی ضرورت کے بارے میں آگاہ کرے گی کیونکہ مارکیٹنگ کے نقطۂ نظر سے آپ کوئی چیز اگست کے مہینے میں متعارف نہیں کرا سکتے۔ جنگ کے تصور کو کسی شے کی فروخت کے ہم پلہ قرار دینے سے میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اسی طرح میں اخبارات میں سرکاری بیانات پڑھتا رہا اور جنگ کے بارے میں سرکاری دلائل سنتا رہا مگر میں کسی بھی دلیل سے متاثر نہیں ہوا، میں نے سمجھ لیا کہ جنگ کے بارے میں دلائل نہیں پیش کیے جا رہے بلکہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ اس گندے اور بدترین پروپیگنڈے میں دو اصلاحات 'حکومت کی تبدیلی' اور 'عراقی عوام کی آزادی' کا تواتر سے استعمال کیا گیا۔ منطق، دلیل، اور معقولیت سے خالی اس پروپیگنڈے کا یہ نتیجہ نکلا کہ بغداد سے پیرس تک اس جنگ کی مخالفت ہونے لگی اور مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ اس شرمناک، بیہودہ اور واہیات پروپیگنڈے کے ذریعے نہ صرف ساری دنیا بلکہ امریکی عوام کو بھی بے وقوف بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد امریکی سرکاری ملازمت کرنا میرے ضمیر کے خلاف تھا۔'

وزارت خارجہ کے اس افسر سے پہلے بھی گزشتہ ۳۰ دنوں کے درمیان ایک نہیں، بارہ سے زیادہ اعلیٰ امریکی افسر اور دوسرے ملکوں میں تعینات امریکی سفیر استعفیٰ دے چکے ہیں۔ یہ استعفے بھی ضمیر کے کچوکوں سے مجبور ہو کر دیے گئے لیکن ان میں سے بیشتر میں یہی کہا گیا کہ وہ 'ذاتی وجوہ' کی بناء پر استعفے دے رہے ہیں۔ لیکن اب جبکہ بغداد پر ہونے والی بمباری امریکا کی باون ریاستوں کے لاکھوں گھروں کے اندر نظر آ رہی ہے۔ جب مہیب دھماکوں سے ڈر کر روتے ہوئے بچے، پناہ کی تلاش میں نکلنے والے بوڑھے، اپنے بچوں کی پارہ پارہ لاشیں گودوں میں سمیٹے ہوئے اور ان پر بین کرتی ہوئی ماؤں کی آواز امریکا کی ہر ریاست کے ہر گھر میں گونج رہی ہے، تو لاکھوں امریکیوں کے لیے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ گھروں میں بیٹھے رہیں اور اپنی 'بہادر افواج کی فتوحات' کے لیے دعائیں مانگیں۔ اب متعدد سرکاری افسروں کے اعصاب ٹوٹ رہے ہیں اور وہ اپنے ہاتھوں پر ان بے گناہوں کا خون دیکھتے ہیں، جن سے وہ ہزاروں میل کے فاصلے پر ہیں۔

میں جانتی ہوں کہ چند دنوں یا ہفتوں کے بعد صدر امریکا اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے 'بدی' پر اپنی 'شاندار فتح' کا اعلان کریں گے لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ان کی شکست کا اعلان ہو چکا۔ پوری دنیا کے عوام جنگ سے شدید نفرت کا اظہار کر کے امریکا کو اپنے شہروں اور دیہاتوں میں شکست دے چکے ہیں۔ امریکی باشندوں نے صدر امریکا اور ان کی افواج کو عراق

کے شہروں میں، دجلہ وفرات کے کنارے اور کربلا کے میدان میں نہیں کیلی فورنیا، نیویارک، سان فرانسسکو، ٹیکساس اور دوسرے امریکی شہروں میں شکست دے دی ہے۔ ضمیر کالفت رنگ پرندہ ان گنت امریکیوں کے سینوں میں زندہ ہے، امریکی صدر اور ان کے جنگجو ساتھیوں کی اس سے بڑی شکست ممکن نہ تھی۔ ان کا میمنہ اور میسرہ محفوظ رہے تو کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ اپنے قلب میں شکست کھا گئے ہیں اور یہی مظلوم عراقیوں کی شاندار جیت ہے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۲۶ مارچ ۲۰۰۳ء

آپ جنگل کے بادشاہ نہیں

زمین پر دور دور تک بچھا ہوا سبزہ ہے اور اس کے حاشیوں پر پیڑوں کے جھنڈ ہیں، پودے اور جھاڑیاں ہیں، سبزے پر ہرن چوکڑیاں بھر رہے ہیں۔ کبھی کوئی گردن موڑ کر ادھر ادھر دیکھتا ہے اور پھر گھاس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ سکون اور عافیت کا ایک عالم ہے جو اس منظر پر طاری ہے۔ اچانک پیڑوں کے جھنڈ میں ہلچل سی مچتی ہے۔ جنگل کا بادشاہ پودوں کو روندتا ہوا نکلتا ہے اور ہرنوں اور ہرنیوں کی ڈار پر دھاڑتے ہوئے جا گرتا ہے۔ نازک پیروں والے ہرن موت کو سر پر دیکھ کر لمحے بھر کے لیے مفلوج سے ہو جاتے ہیں لیکن پھر جان بچانے کے لیے ایک طرف کو دوڑ پڑتے ہیں۔ اس ایک لمحے کے دوران شیر نے کسی ایک ہرن کو چھاپ لیا ہے، اس کا نرخرہ چبا لیا ہے اور اب سکون سے اسے کھانے میں مصروف ہے۔ ہرنوں کی جان بچا کر بھاگتی ہوئی ڈار مڑ کر اپنے بادشاہ کے 'ناشتے' کی طرف دیکھتی ہے اور شکر ادا کرتی ہے کہ وہ سب محفوظ رہے۔ کچھ دور جا کر وہ رک جاتی ہے اور سہمے سہمے انداز میں ایک بار پھر گھاس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے، بس ترچھی نگاہوں سے بادشاہ سلامت کو دیکھتی جاتی ہے۔ وہ بندر جو پیڑوں کی نچلی شاخوں پر تھے اچک کر سب سے بلند شاخوں پر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے ہرن کے کھائے جانے کا نظارہ کرتے ہیں۔ خرگوش اور دوسرے چھوٹے جانور بھی ایک طرف کو دبک جاتے ہیں اور اس بات کی احتیاط کرتے ہیں کہ بادشاہ سلامت کی نظر میں نہ آئیں، بس دبکے ہوئے اپنے ساتھی کی چیر پھاڑ دیکھتے رہیں اور اس بات پر مطمئن رہیں کہ یہ افتاد ان کے نہیں، کسی اور کے سر آئی۔

ایسے کئی منظر ہم میں سے اکثر نے نیشنل جیوگرافک کے مختلف پروگراموں میں دیکھے ہیں۔ اور اب دنیا کے بادشاہ امریکا بہادر جس طور عراق اور عراقیوں کے شکار پر نکلے ہیں اسے دنیا کے

مختلف نیوز چینلوں سے دیکھ رہے ہیں۔عراق میں جنگ کے جتنے محاذ کھلے ہوئے ہیں، وہ سب کے سب ہمارے گھروں میں اپنی جھلک دکھا رہے ہیں۔

امریکا نے اس حملے سے کئی مہینوں پہلے عراق کے خلاف بیانات اور دھمکیوں کا ایک سرگرم محاذ کھول دیا تھا اور اس محاذ پر صدر امریکا سے لے کر پہلے اور دوسرے درجے کے امریکی اہل کاروں کی آتش بیانی قابلِ دید وشنید تھی۔اس وقت یہ خیال کیا جارہا تھا کہ یہ حملہ جب بھی شروع ہوگا دنیا عراقیوں کے اس شکار کا نظارہ دم سادھ کر کرے گی اور عراقی فوج بھی کسی خاص مزاحمت کے بغیر اتحادی افواج کی قوتِ قاہرہ کے سامنے چند دنوں میں ہی ہتھیار ڈال دے گی۔

تاہم جو کچھ بھی ہوا وہ اندازوں کے بالکل برعکس ہوا، امریکا کے تکبر اور اس کی نخوت نے سب سے پہلے اس کے پرانے اتحادیوں فرانس اور جرمنی کو ناراض کیا۔جنگِ عظیم دوم کے بعد جس جرمنی کی تعمیرِ نو پر خطیر امریکی سرمایہ خرچ ہوا تھا اس نے پہلے دن سے عراق پر امریکی حملے کی مخالفت اور مزاحمت کی۔اس کا کہنا تھا کہ اقوام متحدہ کی طرف سے منظوری اور اسلحہ انسپکٹروں کی کسی حتمی رپورٹ آنے سے پہلے عراق پر حملہ ناجائز اور غیر قانونی ہوگا، اسی طرح فرانس اور روس نے بھی امریکا اور اس کے اتحادیوں کی شدید مخالفت کی۔مسلمان ملکوں کی حکومتوں میں سے چند کے سوا کسی نے اس امریکی رویے کی مخالفت، مزاحمت یا مذمت نہیں کی بلکہ مسلمان ملکوں کی حکومتوں نے امریکا کو عراق پر حملے کے لیے مختلف نوعیت کی سہولتیں فراہم کیں۔یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ایسے ۱۵ ملکوں کے نام امریکا نے ظاہر نہیں کیے اور یہ کہا کہ اس طرح ہم اپنی دوست حکومتوں کو مشکل میں مبتلا کر دیں گے۔کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک نام پاکستان کا بھی ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیشتر مسلمان ملکوں اور اسپین، پرتگال اور آسٹریلیا جیسے ملکوں نے جنگل کے ان چرندوں یا پرندوں کا سا رویہ اختیار کیا جو وہ اپنے کسی ساتھی کو شیر کا نوالہ بنتے دیکھ کر اختیار کرتے ہیں۔اس کے برعکس ۱۵ فروری سے آج تک دنیا کے تقریباً تمام ملکوں کے باشندوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنی حکومتوں اور اپنے حکمرانوں کے برعکس بہادر اور باضمیر ہیں۔انہوں نے علاقے، نسل، رنگ، مذہب کی تفریق کے بغیر عراقیوں کی حمایت اور امریکا کی شدید مذمت کی۔یہ سلسلہ جو ۱۵ فروری کو شروع ہوا تھا اس میں روز بہ روز شدت آتی جارہی ہے۔حد تو یہ ہے کہ اسرائیل کے دارالحکومت تل ابیب میں چند دنوں پہلے یومِ ارض کے موقعہ پر ایک بڑا مظاہرہ ہوا جس میں بیس ہزار سے زیادہ افراد شریک تھے اور وہ عراق کے لیے جسم و جاں کی قربانی کا عہد

کرر ہے تھے۔ اگر ساری دنیا میں نکلنے والے مظاہرین کی تعداد کو جمع کیا جائے تو بلا جھجک یہ کہا جاسکتا ہے کہ عراقیوں کی حمایت میں نکلنے والوں کی کل تعداد بیس کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ یہ نظارہ چشم فلک نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا جب لوگ ہندو، مسلمان، عیسائی اور یہودی ہوکر نہیں 'انسان' ہوکر سوچیں اور امریکا کو یہ بتادیں کہ وہ دنیا کو ایسا جنگل نہ سمجھے جہاں حیوان رہتے ہیں اور جنہیں اگر اپنی جان کا خوف نہ ہوتو وہ منہ دوسری طرف کر کے کسی ایک قوم کو امریکا کا نوالہ بنتے ہوئے دیکھتے رہیں گے۔

یہ سہرا بیسویں صدی کے عظیم دانشور اور فلسفی برٹرینڈ رسل کے سر ہے کہ اس نے ویت نام کی جنگ کو ساری دنیا کے ضمیر کا مسئلہ بنادیا تھا اور یہ اسی کی کوششیں اور کاوشیں تھیں جو آج ثمر لا رہی ہیں، انسانی ضمیر ایک طرح سوچ رہا ہے اور ایک جیسے ردعمل کا اظہار کر رہا ہے۔

امریکا اور اس کے اتحادیوں کے لیے جہاں یہ ایک حیران کن مظہر ہے، وہیں عراقیوں کی شدید مزاحمت نے بھی انہیں حیران و پریشان کردیا ہے۔ صدر امریکا اور ان کے اتحادیوں کا خیال تھا کہ عراق ان کے لیے تر نوالہ ثابت ہوگا اور اتحادی فوجیں جیسے ہی عراق کا رُخ کریں گی، ہر شہر ان کے لیے اپنے دروازے کھول دے گا اور عراقیوں کی اکثریت، جو ایک آمر کی زیادتیں سہتی رہی ہے، ہار پھول کے ساتھ ان کا استقبال کرے گی۔ بہ طور خاص عراقی کُرد جو صدام حکومت کے ظلم و جبر کا مسلسل نشانہ رہے ہیں، وہ تو سب سے آگے بڑھ کر ان کو خوش آمدید کہیں گے۔ امریکا کی یہ خوش فہمی نقش برآب ثابت ہوئی۔ نہتے عراقی شہری جس شاندار انداز میں امریکی افواج کی مزاحمت کرر ہے ہیں، اپنی پرانی اور عام سی بندوقوں سے امریکی ہیلی کاپٹر گرا رہے ہیں، گرینیڈ سے ٹینک اڑا رہے ہیں، ٹرک امریکی فوجیوں پر چڑھا رہے ہیں اور سینے سے بم باندھ کر جدید ترین اسلحہ گاڑیوں کے پرخچے اڑا رہے ہیں اور خود بھی نیست و نابود ہو رہے ہیں۔ ان واقعات کا امریکیوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ۶۰ کی دہائی میں اتنے ہی بے بس اور نہتے ویت نامیوں سے امریکیوں کا سامنا ہوا تھا اور ان میں سے ایک ایک شہری اور دیہاتی نے جدید ترین اسلحے سے لیس امریکی فوج کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے اور آخر کار اسے پسپا ہونا پڑا تھا۔ عراقیوں نے بھی یہ ثابت کردیا ہے کہ بے پناہ اور خونیں مزاحمت کے بغیر امریکا عراق کے کسی چھوٹے شہر پر بھی قبضہ نہیں کرسکتا، بغداد تو بہت دور کی بات ہے۔

اس جنگ نے دنیا کے بادشاہ کو بہت سے نئے سبق سکھائے ہیں، بشرطیکہ وہ کچھ سیکھنے کے

لیے تیار ہو۔ اس جنگ نے دنیا بھر کے عوام کو ہی نہیں دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، اداکاروں اور مذہبی پیشواؤں کو بھی مظلوم کے لیے مزاحمت کے پرچم تلے اکٹھا کر دیا ہے۔ کہاں تو صدر امریکا اسے 'صلیبی جنگ' بنانے پر تُلے ہوئے تھے اور کہاں عیسائیوں کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا پوپ جان پال دوم نے دنیا بھر کے عیسائیوں کو امریکیوں کے خلاف تحریک چلانے کا حکم دیا ہے۔ اس جنگ کو ناحق اور خونیں قرار دے کر برطانوی وزیر خارجہ کے عہدے سے مستعفی ہونے والے رابن کک نے کہا ہے کہ امریکا اور برطانیہ، عراق پر اس ناجائز حملے کے ذریعے عالم اسلام اور عرب دنیا میں مغرب کے خلاف نفرتوں کے بیج بو رہے ہیں۔ یہ خبر بھی آئی ہے کہ دو برطانوی فوجیوں کو حراست میں لے کر برطانیہ روانہ کر دیا گیا ہے جہاں ان کا کورٹ مارشل ہوگا۔ ان دونوں برطانوی فوجیوں نے یہ کہہ کر جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا کہ نہتے شہریوں پر گولی چلانا جنگ نہیں ہے اور وہ اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کام نہیں کر سکتے۔ پاکستان آئے ہوئے ایک برطانوی سوشلسٹ رہنما نے لاہور میں پیپلز پارٹی کے اراکین کی جانب سے دیے جانے والے عشائیے میں دوٹوک انداز میں کہا کہ امریکا عراق میں نہ اسلام کے خلاف لڑ رہا ہے، نہ یہ تیل پر قبضے کی لڑائی ہے، یہ جنگ دراصل پوری دنیا میں 'امریکن ورلڈ آرڈر' منوانے کی جنگ ہے۔ ایلسن ووڈ نے کہا کہ 'یہ جنگ مظلوم عراقیوں کے خلاف پاگل جارج بش کی جنگ ہے جس کا پوری دنیا کو فوری طور پر نوٹس لینا چاہیے۔ یہ مذاہب یا تہذیبوں کی جنگ ہوتی تو یورپ، برطانیہ، امریکا، اسپین اور اسرائیل میں امریکی جارحیت کے خلاف مظاہرے نہ ہو رہے ہوتے۔'

مظلوم عراقیوں کی امریکی افواج کے سامنے شدید مزاحمت اور ساری دنیا کے عوام کی جانب سے ہونے والے بے پناہ مظاہرے امریکا اور اس کے اتحادیوں کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ......

'حضور! ہم دنیا کے عوام ہیں' ہم ان ملکوں کے حکمران نہیں جن کی ٹانگیں آپ کے سامنے کانپتی ہیں اور کیوں نہ کانپیں کہ ان کا اقتدار صرف آپ کے دم قدم سے قائم ہے۔ آپ جنگل کے بادشاہ نہیں اور ہم سبزہ زاروں میں کانپتے تھرتھراتے ہوئے ہرن اور پیڑوں کی بلند شاخوں پر جا بیٹھنے والے بندر نہیں۔ ہم انسان ہیں اور ہم ہر غیر انسان کی راہ میں یک جان اور یک آواز ہو کر مزاحم ہوں گے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۲؍اپریل ۲۰۰۳ء

مسٹر بش! آپ شاید بھول گئے ہیں

تاریخ کے صفحوں پر فاتحین کے، حکمرانوں اور بادشاہوں کے بے شمار غصے محفوظ ہیں۔ انہیں جب غصہ آتا ہے تو وہ دشمن کے سپاہیوں، شہریوں، جانوروں اور حد تو یہ ہے کہ دریاؤں اور سمندروں سے نفرت کرتے ہیں، انہیں اپنے انتقام کا نشانہ بناتے ہیں۔

دارایوش اول کے بیٹے اور سائرس اعظم کے نواسے شہنشاہ فارس کیخسرو کا ایک ایسا ہی غصہ تاریخ کے صفحوں پر محفوظ ہے۔ یونان و فارس ایک دوسرے سے جنگ آزما ہیں بلکہ درست بات تو یہ ہے کہ فارس، یونان پر حملہ آور ہوا ہے۔ شہنشاہ کیخسرو اپنے لشکر جرار اور سینکڑوں جنگی بحری جہازوں کے ساتھ آبنائے دانیال پر دستک دے رہا ہے۔ جھاگ اڑاتا ہوا سمندر کیخسرو کے متعدد جہازوں کے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ہزارہا ایرانی سپاہی یونانی دشمنوں کی تلواروں کی بجائے طوفانی لہروں کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ کیخسرو کے لیے یہ منظر ناقابلِ برداشت ہے۔ سمندر کو یہ ہمت کیسے ہوئی کہ وہ شہنشاہِ بر و بحر کے جہازوں کو غرق کر دے۔ سپاہیوں کو حکم ہوتا ہے کہ وہ سمندر کو اس 'گستاخی' پر دُرّے ماریں، چنانچہ ایرانی سپاہی لہروں کو ایک ہزار دُرّے مارتے ہیں۔ کیخسرو کی غضب ناکی اس پر بھی کم نہیں ہوتی، تب سمندر میں منوں وزنی زنجیریں ڈال دی جاتی ہیں اور شہنشاہ فارس کا دل ٹھنڈا ہوتا ہے کہ اس نے سمندر کو پابہ زنجیر کر دیا۔ یہ ایک بادشاہ کا وہ غصہ ہے جو سمندری لہروں پر نکلا۔

یاسائے چنگیزی کے سائے میں چنگیز خان دنیا فتح کرنے نکلتا ہے تو راستے میں آنے والے ہر شہر کے تمام شہری قتل کر دیے جاتے ہیں، سب کے سر اتار لیے جاتے ہیں اور ہر مفتوحہ شہر کی سرحد پر مقتولین کے سروں کے بلند و بالا مینار تعمیر کیے جاتے ہیں جو صدیوں بعد بھی اس راہ سے

گزرنے والے قافلوں کو چنگیز خانی قہر کی کہانی سناتے ہیں۔ جیمز اے مشنر نے افغانستان کے بارے میں اپنے ناول 'کاروان' میں ایسے ہی ایک قلۂ سر کا ذکر کیا ہے اور میں نے وکٹوریہ البرٹ یا لندن کے کسی دوسرے آرٹ کلکشن میں ایک ایسے ہی قلۂ سر کی مغل مینا طور دیکھی ہے۔ چنگیز کا ذکر نکلا ہے تو اس کے 'غصے' کا ایک اور منظر ملاحظہ کیجیے۔ افغانستان میں وادیٔ بامیان کے شہر ضحاک کو فتح کرنے کے لیے وہ اپنے پوتے کو روانہ کرتا ہے۔ چہیتا پوتا شہر ضحاک کی فصیلوں کے نیچے لڑتا ہوا مارا جاتا ہے۔ چنگیز خان کو خبر ہوتی ہے تو پوتے کا انتقام شہر سے یوں لیا جاتا ہے کہ فتح کے بعد شہر کا ہر ذی روح ہلاک کیا جاتا ہے۔ عورتیں، بچے، مرد، خچر، کتے، بلیاں، اڑتے ہوئے پرندے، حاملہ عورتوں اور گابھن بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ چاک کر کے وہ بچے نکال لیے جاتے ہیں جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے لیکن ذی روح ہیں اس لیے نیزوں میں پروئے جاتے ہیں۔

اپنے عہد کی عظیم الشان سلطنت روما کا ایک غلام اسپارٹکس بغاوت کرتا ہے اور باغی غلاموں اور بدحال کسانوں کی فوج بنا کر سلطنت روما سے لڑتا ہے تو چار برس تک رومن جرنیل اور سپاہی اسپارٹکس کے نام سے کانپتے ہیں۔ اور جب آخر کار رومن ایمپائر اس بغاوت کو کچل دیتی ہے تو ہر باغی کو نشانِ عبرت کے طور پر مصلوب کیا جاتا ہے۔ روم سے سلطنت کے دوسرے علاقوں میں جانے والی سب سے چوڑی شاہراہ پر ایک مخصوص فاصلے سے صلیبیں کھڑی کی جاتی ہیں اور ۲۴۷۲ باغیوں کے ہاتھوں اور پیروں میں میخیں ٹھونک کر انہیں قطرہ قطرہ مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس شاہراہ پر یہ صلیبیں سالہا سال انسانی پنجروں کا بوجھ اٹھائے کھڑی رہتی ہیں اور ہر گزرنے والے کارواں کے دل پر سلطنت روما کی ہیبت قائم کرتی ہیں۔

یہ حکمرانوں اور بادشاہوں کے غیظ و غضب کے نمونے ہیں لیکن ایک غصہ عوام کو آتا ہے۔ یہ غصہ انہیں آتا ہے جن کے پاس ہتھیار نہیں ہوتے، جو نوالوں کو ترستے ہیں، جن کے چہرے زرد اور جن کے ہاتھوں پر رگیں ابھری ہوئی ہیں۔ عوام کو اگر غصہ آ جائے تو پھر افواج قاہرہ بھی ان کے سامنے نہیں ٹھہرتیں۔ کیخسرو کی فوجوں سے مٹھی بھر یونانیوں نے اس طرح جم کر اور ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ تاریخ نے آخری فیصلہ کیخسرو کے خلاف دیا اور اسے اپنی فوجوں کو سمیٹ کر واپس اپنی سلطنت کا رُخ کرنا پڑا۔ اسی طرح چنگیز کا ساری دنیا فتح کرنے کا خواب ادھورا رہا اور جن سلطنتوں اور قوموں

کواس نے فتح کیا تھا، ان کے مذہب اور ثقافت نے اس کے پوتوں پر دتوں کو اپنا مطیع بنالیا، یوں فاتح مفتوحین کا شکار ہو گئے۔ اسپارٹکس اور اس کے ساتھیوں کے خاتمے کے بعد، سلطنت روما پر وہ دن بھی آئے کہ روم کا شہر مسمار کر دیا گیا۔ صرف ظلم و جبر برداشت کرنے والے غلاموں نے ہی نہیں، کھیت مزدوروں، لگان کے بوجھ سے نیم جاں کسانوں اور وحشی قبیلوں نے متحد ہو کر اس عظیم الشان سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ کھیل آج سے نہیں ہزاروں برس سے ہو رہا ہے کہ فاتح آخر کار پسپا ہوتے ہیں اور ان کی پسپائی لاکھوں کی فوج اور جدید ہتھیاروں کی مرہون منت نہیں ہوتی، یہ عوامی غصہ ہوتا ہے جو آتش فشاں کی طرح پھٹتا ہے اور عظیم الشان سلطنتوں کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

ان دنوں ہم صدر امریکا کا وہ غصہ دیکھ رہے ہیں جو آگ بن کر عراقیوں پر برس رہا ہے۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ کسی مظلوم، کسی معصوم کو کہیں پناہ نہیں ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم عراقی عوام کا غصہ بھی دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے گھروں میں جہاد جاسم اور نور الشمری کی تصویریں دیکھی جارہی ہیں۔ خوابوں اور تمناؤں سے چھلکتی ہوئی دونو جوان عورتیں، ان میں سے ایک چند مہینوں بعد ماں بننے والی تھی۔ اپنے بچے کے بارے میں اس نے کتنے خواب دیکھے ہوں گے، اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی تمنا کی ہوگی لیکن پھر ایک روز اسے امریکی حملہ آوروں پر، ان کی درندگی اور سفاکی پر غصہ آجاتا ہے۔ وہ اور اس کی دوست بارود سے بھری ہوئی گاڑی ان سپاہیوں سے ٹکرا دیتی ہیں جو اس کے ملک کو فتح کرنے آئے تھے۔ یوں وہ خود ریزہ ریزہ ہو کر اپنے دشمنوں کے چیتھڑے اڑا دیتی ہیں۔

ہم ان فلسطینیوں کو کیسے بھول سکتے ہیں جو مسلح اور جارح صیہونیوں سے غلیل، گوپھن اور پتھروں سے لڑ رہے ہیں۔ بلڈوزر ان کے گھر گرا رہے ہیں، اور وہ اپنی مسلسل جدوجہد سے صیہونیوں کی معیشت کی رفتار سست کر رہے ہیں۔ ان پر ہونے والا ظلم خود اسرائیلیوں میں بہت سوں کو ان کا دوست بنا رہا ہے اور ان کا غصہ اسرائیل کی ریاست کو ساری دنیا میں بدنام کر رہا ہے۔

عراق اس وقت دنیا ہی نہیں بلکہ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی اور ہیبت ناک فوجی طاقت کے غصے کا شکار ہے۔ امریکا کو طیش اس بات پر ہے کہ اس کے احکامات کیوں نہیں مانے گئے، ہر عراقی اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال کر خود ہی امریکی فوجیوں کے حضور

کیوں نہ حاضر ہوا۔

جارج امریکی حکمرانوں کا غصہ ایک طرف لیکن عراقیوں کو بھی غصہ آ رہا ہے، ان کے اندر آتش فشاں ابل رہا ہے۔ دنیا کی دوسری کمزور قوموں کو غصہ آ رہا ہے، ویتنام کی مثالیں دی جا رہی ہیں جہاں سے امریکی افواج ذلیل و رسوا ہو کر اور ہزار ہا تابوت اپنے کاندھوں پر اٹھا کر نکلی تھیں۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ اب امریکا کو اسی طرح عراق سے نکلنا ہوگا، تابوت امریکا جانے لگے ہیں، یہ رفتار ابھی بڑھے گی۔ اور پھر اس وقت تک بڑھتی جائے گی جب تک امریکا عراق سے اپنی فوجیں نہیں ہٹا لیتا۔ عارضی فتح بالآخر مستقل شکست میں تبدیل ہو جائے گی۔

امریکا نے عراق پر یہ جنگ آج نہیں آج سے بارہ سال پہلے مسلط کی تھی، خلیج کی جنگ میں عراق کو پہلے ہتھیاروں سے تہس نہس کیا گیا اور پھر اقوام متحدہ کی مدد سے اس پر اقتصادی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اس ملک کے لوگ بھوکوں مرنے لگے، اس کے بچے پیٹ بھر کر دودھ کو ترس گئے، اس کے ہسپتالوں میں دوائیں نایاب ہو گئیں، اس کو ہتھیار خریدنے اور بنانے کی اجازت نہ تھی، اس کے طیارے فضا میں بلند نہیں ہو سکتے تھے، اس کے اسلحہ خانوں پر پہرے تھے، تباہ کن ہتھیاروں کی تیاری کے الزامات لگا کر اس پر اسلحہ انسپکٹر مسلط کیے گئے اور اب ہاتھ پیر بندھی ہوئی ایک کمزور، بے بس اور تقریباً نہتی قوم پر دنیا کی طاقتور ترین قوم نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ حملہ کر دیا ہے اور صبح و شام اس کی بستیوں پر بم برس رہے ہیں۔

اروندھتی رائے نے اپنے ایک تازہ مضمون میں طنزاً یہ لکھا ہے کہ صدر بش بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ اتحادی افواج عراق کو آزاد کر کے دم لیں گی، شاید اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ عراق میں لاشوں کے ڈھیر لگا کر عراقیوں کی روحیں آزاد کرائی جائیں گی۔ اروندھتی رائے نے اپنے اس مضمون میں ایک بہت اہم نکتہ اٹھایا ہے کہ سرکار آپ عراق پر یہ کہہ کر حملہ آور ہوئے ہیں کہ اس نے مہلک پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار چھپا رکھے ہیں۔ اگر آپ کا یہ الزام درست ہے تو پھر صدام حسین نے اب تک اتنے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیوں کیا ہے؟ اروندھتی نے صدر بش سے یہ بھی پوچھا ہے کہ اگر عراقی فوج واشنگٹن پر حملہ آور ہوئی ہوتی اور ایسی ہی بھیانک تباہی پھیلاتی تو کیا صدر بش اپنے ایٹمی اور کیمیاوی ہتھیار استعمال کرنے کے بارے میں اتنے ہی تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کرتے؟

برصغیر کی جانب سے اٹھائے جانے والے یہ سوال امریکی انتظامیہ اور امریکی دانشوروں سے جواب کے طلب گار ہیں۔ ویتنام کی جنگ کے دوران ویتنامی اپنی ہی بستیوں کے تحفظ کے لیے لڑ رہے تھے، انہوں نے ویتنام سے امریکا جا کر کسی امریکی بستی یا ویرانے کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ ان کی خطا یہ تھی کہ انہوں نے دنیا کی عظیم طاقت کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس 'خطا' کی سزا میں امریکی صدر اور زیر دفاع بار بار ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کے بارے میں سوچتے تھے۔ کیسا دلچسپ مذاق ہے کہ جب آپ کمزور قوموں پر حملہ کریں تو انہیں نیست و نابود کر دینے اور اپنی 'بڑائی' کے ڈنکے بجانے کے لیے ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں اور جب ایک کمزور قوم کے شہروں کو آپ تہس نہس کر دیں تو آپ کو انسان اور انسانی حقوق یاد نہ آئیں، لیکن اگر آپ کے چند چاکلیٹ ہیرو، فوجی وردی میں مارے جائیں یا گرفتار ہو جائیں تو آپ کو قیدیوں کے حقوق اور جینوا کنونشن یاد آ جائیں۔ مسٹر جارج ڈبلیو بش! آپ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ کمزور کو غصہ آتا ہے تو وہ طیش بارود بن کر انسانی سینوں میں بھر جاتا ہے اور جب بہت سے انسان حساب بے باق کرنے پر آ جائیں تو سلطنت روم زمیں بوس ہو جاتی ہے اور کچنر وکو بے نیل و مرام واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ امریکی حکمرانوں اور ان کے اتحادیوں کو کسی بھی عارضی فتح کا جشن منانے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ابھی تو صرف جہاد جاسم اور نور الشمری جیسے چند لوگوں کو غصہ آیا ہے لیکن جب تمام عراقیوں اور دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کے سینے غصے اور نفرت سے بھری ہوئی بارودی سرنگیں بن جائیں گے تو پھر آپ کو جائے پناہ کہاں ملے گی؟

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۷؍اپریل ۲۰۰۳ء

عالمی ضمیر: ایک عظیم طاقت

عراق کی جنگ اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے جنگ کہنا زیادتی ہے، اس لیے کہ جنگ وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی تنازعہ ہوتا ہے۔ مہلک ہتھیاروں کی موجودگی اور تیاری کا الزام لگا کر امریکا نے اس معاملے کو تنازعہ کا نام دیا اور بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی اور اقوام متحدہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ان ہتھیاروں کی تباہی کے نام پر عراق کے خلاف غیر اخلاقی اور غیر قانونی جارحیت کا ارتکاب کیا۔ امریکا نے خلیج کی جنگ کے بعد سے اقتصادی اور فوجی پابندیوں کی شکل میں گزشتہ بارہ برس سے عراق پر ایک ایسی جنگ مسلط کر رکھی تھی جس نے عراق کے اقتصادی، معاشی اور شہری سہولتوں کے نظام کو تہ و بالا کر دیا۔ اس ملک میں پائی جانے والی طبی سہولتوں کا خاتمہ ہو گیا، سرجری کے آلات اور جان بچانے والی دوائیں تو دور کی بات ہے، ہسپتال معمولی دواؤں سے خالی ہو گئے۔ بچے پھول کی طرح ہوتے ہیں، عراقی بچے ان پابندیوں کی دھوپ سے کمہلا کر رہ گئے۔ اقوام متحدہ کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۲ برس کی مدت میں ۵ سے ۷ لاکھ عراقی بچے ناکافی غذا اور دواؤں کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہوئے۔ کئی برس پہلے اس وقت کی امریکی وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے بہت بے اعتنائی سے کہا تھا کہ عراق جس نوعیت کے مہلک اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار تیار کر رہا ہے، ان کی روک تھام کے لیے یہ ایک معمولی قیمت ہے جو ادا ہوئی ہے۔ میڈلین البرائٹ سے کون کہتا کہ کسی ماں کے دل سے پوچھیے کہ اس کے بچے کی جان کی قیمت کیا ہے؟ تو وہ اس کی زندگی کے عوض اپنی جان دے دینے پر آمادہ ہو جائے گی۔ لیکن حکمرانوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ اس لیے اس موضوع پر بحث بیکار ہے کہ عراق کے نہتے، بے گناہ اور ایک آمر کی

سفاکیوں کا نشانہ بننے والے عوام کا کیا قصور تھا کہ ان کے شہر خون میں نہلا دیے گئے، ان کے گھر ڈھا دیے گئے اور ان کے پیارے خاک میں سلا دیے گئے۔

اب گفتگو اس موضوع پر ہونی چاہیے کہ عراق کے تباہ و برباد عوام جس بے بسی سے دوچار ہیں اور تیسری دنیا کے عوام امریکا کی بھیانک اور مہیب فوجی اور اقتصادی طاقت کے سامنے جس قدر کمزور ہیں، اس کا کیا ہو۔ اکثر حلقوں میں یہ بات بہت شد و مد سے کہی جا رہی ہے کہ دنیا کے کروڑوں عوام نے نسل، رنگ، عقیدے اور علاقے کی تفریق کے بغیر یک زبان اور یک آواز ہو کر عراقی عوام کے حق میں اور امریکی جارحیت کے خلاف آواز اٹھائی بہت اچھا کیا لیکن سینکڑوں شہروں میں نکلنے والے ان کروڑوں لوگوں کے احتجاج کے باوجود امریکا اور اس کے اتحادیوں پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوا اور انھوں نے وہی کیا جو وہ کرنے کے لیے نکلے تھے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ حکمرانوں سے عوام کا ٹکرانا محض دل کی تسکین کے لیے تو ہو سکتا ہے لیکن اس کے مثبت اثرات ملکی یا بین الاقوامی سیاست پر مرتب نہیں ہوتے۔

میں اس نقطۂ نظر سے اختلاف رکھتی ہوں اس لیے کہ صرف میرے خیال میں ہی نہیں، تاریخ نے یہ ثابت کیا ہے کہ عوام اگر متحد ہو جائیں تو دنیا کی افواجِ قاہرہ کو پسپا ہوتے بنتی ہے۔ اس حوالے سے انیسویں اور بیسویں صدی کی بعض لڑائیوں پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ماسکو سے نپولین بونا پارٹ کی افواج کی پسپائی، اسی طرح سینٹ پیٹر گراڈ کا برسوں جاری رہنے والا محاصرہ اور اس شہر کی شدید عوامی مزاحمت نے آخرکار جرمن افواج کو دوسری جنگ عظیم کے دوران پسپا ہونے پر مجبور کیا، ویتنام سے امریکی اور الجزائر سے فرانسیسی افواج کی واپسی، یہ تمام معاملات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ نہتے اور بھوکے عوام کی طاقت، ہزاروں اور لاکھوں سپاہیوں اور جدید اسلحے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ دور کیوں جائیے، برصغیر میں بیسویں صدی کے دوران مہاتما گاندھی کی سربراہی میں جس عوامی طاقت کا مظاہرہ جنگ آزادی میں ہوا، اس نے آخرکار برطانیہ کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان سے باعزت واپسی کا راستہ تلاش کرے۔

عراق پر امریکا اور اس کے اتحادیوں کی جارحیت کے نتیجے میں ایک ایسا مظہر سامنے آیا ہے، جو دنیا کی چھ سات ہزار سالہ تاریخ میں ہمیں کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ دنیا میں ایسا پہلی مرتبہ ہوا کہ

گنتی کے چند ملکوں کو چھوڑ کر دنیا کے تمام ملکوں کی حکومتیں امریکا کے سامنے سپر انداز تھیں اور پوری دنیا کے بیشتر ملکوں کے عوام اپنی حکومتوں کی خواہش کے برخلاف اس ننگی جارحیت کی شدت سے مذمت کر رہے تھے اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں عراقی عوام کے ساتھ تھے۔

عراق پر امریکی حملے کے دوران ہم نے پہلی مرتبہ اس 'انسان' کو دیکھا جو دنیا کے ہر براعظم، ہر ملک اور ہر شہر میں اس ننگی جارحیت کے خلاف اور عراقی عوام کی حمایت میں نکلا۔ دنیا میں پہلی مرتبہ 'حب وطن' اور 'قومی سلامتی' کے دل آویز ناموں سے حکومتیں اپنے لوگوں کو بہلا نہیں سکیں۔ حد تو یہ ہے کہ اس جارحیت کے خلاف امریکا میں جتنے پُر شور مظاہرے ہوئے اس کی نظیر امریکی تاریخ میں نہیں ملتی۔ امریکی پولیس نے ان مظاہرین کو گرفتار کرنے اور انہیں منتشر کرنے کے لیے جس سختی سے کام لیا اور امریکی شہریوں کو جس بے دردی سے مارا پیٹا اور سڑکوں پر گھسیٹا گیا، انہیں جتنی بڑی تعداد میں گرفتار کیا گیا، ایسا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہوا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سقوطِ بغداد کے بعد ساری دنیا میں امریکا کے خلاف ہونے والے احتجاج ٹھنڈا پڑ جائے گا اور جنگ مخالف عناصر پسپائی اختیار کریں گے لیکن دنیا اور بہ طور خاص یورپ اور امریکا کی جنگ مخالف تنظیموں نے اس خیال کی تردید کر دی ہے۔ جنگ مخالف تنظیمیں نئی قوت اور نئی حکمت عملی کے ساتھ امریکی جارحیت کے خلاف سڑکوں پر نکل آئی ہیں۔ امریکا نے مختلف ملکوں کی معیشت پر قبضے کے جو طریقے ایجاد کیے ہیں، گلوبلائزیشن اور ڈبلیوٹی او کے نام پر تیسری دنیا کے ملکوں کو جس طرح بے بس کیا جا رہا ہے، ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف جس طور امریکی مفادات کے محافظ کا کردار ادا کر رہے ہیں اس کے خلاف صرف یورپ اور لاطینی امریکا میں ہی نہیں خود واشنگٹن میں پیر کے روز زبردست مظاہرہ ہوا ہے۔ یہ مظاہرین عراق پر امریکی جارحیت اور دنیا بھر کے عوام کو اقتصادی غلامی میں لینے کی امریکی پالیسی کے خلاف ہیں۔

دنیا بھر کے اربوں انسان، ظلم، جبر، ناانصافی کے خلاف متحد ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ امریکی عراق کو یا کسی بھی کمزور ملک کی زمین کو فتح کر سکتے ہیں، اس کا جغرافیہ بدل سکتے ہیں، اس کے شہریوں کو قید کر سکتے ہیں، اس کی عمارتوں کو آگ لگا سکتے ہیں لیکن وہ عالمی انسانی سوچ اور ضمیر کو فتح نہیں کر سکتے، اس کا جغرافیہ نہیں بدل سکتے، روحِ عصر کو قید نہیں کر سکتے، اعلیٰ انسانی اقدار

کو زمین بوس نہیں کر سکتے، عظیم تہذیبی روایات کو خاکستر نہیں کر سکتے۔

عراق پر جارحیت اور پھر شام، ایران، شمالی کوریا کو دھمکی، دیگر ملکوں کو ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ بتانا کہ وہ کبھی بھی امریکی جارحیت کا نشانہ بن سکتے ہیں، دنیا کی تمام قوموں کو یہ پیغام دینا کہ امریکا واحد عالمی طاقت ہے اور ہر ملک، ہر قوم کو روند سکتا ہے۔ یہ تمام رویے انتہائی اشتعال انگیز ہیں۔ چند امریکی دانشوروں اور ادیبوں نے یہ کہا کہ ہمیں اپنے امریکی ہونے پر شرم آتی ہے تو کیا غلط کہا۔ لیکن اس نفرت انگیز اور انسان دشمن امریکی حکمت عملی کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ امریکی حکمرانوں نے پوری دنیا کے امن دوست اور انصاف پسند انسانوں کو مزاحمت پر آمادہ کر دیا ہے۔ انسانوں کی اس مزاحمت میں اضافہ ہوگا، کمی نہیں ہوگی اس لیے کہ دنیا میں غرور اور تکبر کی، ظلم اور ناانصافی کی قیمت ہر فرعون کو ادا کرنی پڑی ہے۔ امریکی جارحیت کے نتیجے میں عالمی ضمیر ایک عظیم طاقت بن کر ابھرا ہے۔ اس طاقت کے پاس افواج اور اسلحہ نہیں، اس قوت کے پاس دنیا کے خزانے نہیں لیکن اس کے پاس آزاد رہنے اور اپنی آزادی کا احترام کرانے کی وہ شدید خواہش ہے جو نامعلوم زمانوں سے آج تک انسانوں کے سینے میں زندہ رہی ہے۔ یہ خواہش پہلے افراد یا گروہوں کی صورت دنیا بھر میں منتشر تھی، ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ آزادی کی یہ آرزو ایک وقت میں ساری دنیا کے بے بس اور محکوم لوگوں کے سینوں میں جاگی ہے۔ دنیا کے تمام آمروں، جابروں اور حکمرانوں کو اس آرزو سے خوفزدہ ہونا چاہیے۔

'اردو نیوز'، جدہ

۱۷/اپریل ۲۰۰۳ء

ستمگر ستمبر کی دوسری سالگرہ

ہماری معروف افسانہ نگار نیلم احمد بشیر ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کی خونیں صبح نیویارک میں تھیں، انہوں نے اس المناک واقعے کی چشم دید روداد اپنی کتاب 'ستمگر ستمبر' میں بہت دردمندی سے لکھی ہے جو گزشتہ برس شائع ہوئی اور ادبی حلقوں میں زیرِ بحث رہی۔ اسی ستمگر ستمبر کی دوسری سالگرہ سر پر آ گئی۔

دو برس پہلے دنیا کے اربوں انسانوں نے ٹیلی وژن پر نیویارک کی دو بلند و بالا عمارتوں سے طیاروں کو ٹکراتے ہوئے، ان عمارتوں کو خاک کا ڈھیر ہوتے ہوئے اور ان میں موجود انسانوں کو ساٹھ، ستر اور اسّی منزل سے چھلانگ لگاتے ہوئے، راکھ ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ دل دہلا دینے والے ایسے مناظر تھے جن کے ناظرین شاید کبھی بھی انہیں اپنے حافظے سے نہ کھرچ سکیں۔

سوویت یونین کی تحلیل کے بعد دنیا یک قطبی ہو چکی ہے، امریکا اس میں واحد عظیم طاقت کی حیثیت رکھتا ہے، کچھ عناصر اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ افغانستان میں سوویت فوجوں کو پھنسا کر اور سوویت معیشت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا کر انہوں نے اس عالمی طاقت کو انجام تک پہنچانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ دنیا کے یک قطبی ہو جانے کے بعد شاید کبھی انہیں یہ احساس بھی ہوا ہو کہ عالمی طاقت کا توازن صرف امریکا کے حق میں کر کے انہوں نے تیسری دنیا کا اور بہ طور خاص کمزور اور غریب ملکوں کا کس قدر نقصان کیا ہے۔ کس طرح انہوں نے متعدد ملکوں کے ہاتھ پیر باندھ کر انہیں امریکا کے سامنے لقمۂ تر کی طرح پھینک دیا ہے۔

خیر یہ ایک علیحدہ اور لمبی بحث ہے جسے میں آئندہ کے لیے اٹھا رکھتی ہوں، اس وقت مجھے وہ لوگ یاد آ رہے ہیں جو ٹوئن ٹاورز کی تباہی کے نتیجے میں لقمۂ اجل ہوئے۔ یہ لوگ دنیا کے مختلف ملکوں اور عقیدوں سے تعلق رکھتے تھے۔ دنیا بھر کے پس ماندہ اور کچلے ہوئے انسانوں کو مزید کچلنے

کی پالیسیاں وضع کرنے ،فرعونِ بے سامان کی طرح دنیا کے تمام وسائل پر قبضہ کرنے ،اسے اپنے تصرف میں لانے اور دنیا کی تمام کمزور قوموں کو اپنے اشارۂ ابرو پر چلنے کے لیے مجبور کرنے والے امریکا کی پالیسیاں وضع کرنے والے کسی بھی سرکاری ادارے کا دفتر ان عمارتوں میں نہیں تھا۔ امریکا کے بادشاہ اور بادشاہ گران عمارتوں میں فروکش نہیں ہوتے تھے۔لیکن وہ لوگ جن کے دلوں میں امریکی حکمرانوں کی ناانصافیوں اور ظالمانہ رویوں کے خلاف آتش انتقام بھڑک رہی تھی، انہوں نے اپنے طیش کی آگ سے ان عمارتوں کو خاکستر کر دیا جو امریکی معیشت اور دولت کی علامت خیال کی جاتی تھیں۔ایک پرانا محاورہ ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔وہ یہاں بھی صادق آیا اور سینکڑوں ایشیائی ،افریقی ،لاطینی امریکی اور یورپی باشندے بھی اس غصے کا شکار ہوئے۔وہ لوگ جو اس سانحے میں بے گناہ مارے گئے جن میں سے درجنوں پاکستانی تھے ،جن میں ایک نامور پاکستانی ماہر تعلیم ڈاکٹر عارف شاہ جیلانی مرحوم کا نواسہ بھی تھا اور نہ جانے کتنے دوسرے تھے ،ان سب کا سوگ منانے والوں کے زخم ان دنوں میں ہرے ہو جائیں گے۔میری دلی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔

ان سب کا غم برحق لیکن یہ الم ناک واقعہ بہت سے سوالات اٹھاتا ہے۔ان سوالوں کے جواب دنیا بھر کے دانشور گزشتہ دو برس سے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ان دو برسوں میں پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ گیا ہے۔دنیا وہ نہیں رہی جو ۱۰ ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو تھی ۔امریکا اور تیسری دنیا کے درمیان ایک ٹھوس دیوار کھڑی ہوگئی ہے۔یہ نفرت ،دہشت اور خوف کی دیوار ہے، سب ،سب سے نفرت کر رہے ہیں ،سب سب سے خوفزدہ ہیں۔اس دوران امریکی حکمران ان دو عمارتوں کی تباہی کو امریکا پر 'براہ راست حملہ' قرار دے کر افغانستان کو تاراج کر چکے اور سات ہزار برس پرانی عراقی تہذیب پامال کر دی گئی اور بغداد ،موصل ،بصرہ اور دوسرے عراقی شہر کھنڈر ہو گئے۔ایک مہذب اور متمدن قوم کے بچے اور بوڑھے ،عورتیں اور مرد قطار لگا کر خیرات لینے پر مجبور کر دیے گئے۔فلسطین میں امن کی ہر راہ مسدود کر دی گئی۔تیسری دنیا میں ان آمروں کی پشت پناہی کی گئی جو امریکی ایجنڈے پر عمل کرنے کی قیمت یہ وصول کرتے ہیں کہ اپنے یہاں جمہوریت کا جنازہ نکال دیتے ہیں ،عوامی امنگوں کو پنپنے نہیں دیتے اور سچی جمہوریت کے نام پر شخصی حکمرانی کی بساط بچھاتے ہیں۔

۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کی دوسری سالگرہ کے موقعہ پر ہمیں تیسری دنیا کے ان دانشوروں کے ذہنوں میں جھانکنا چاہیے جنہوں نے اس واقعے کے فوراً بعد اس کے نتائج و عواقب پر کھل کر لکھا۔ ترکی کے ایک مشہور و معروف ادیب اورحان پامک نے ان دو امریکی عمارتوں کے قتال کے ۳۷ دن بعد ایک مضمون لکھا جو دنیا کی کئی زبانوں میں شائع ہوا، وہ ترکی، یورپ اور امریکا میں پڑھا گیا۔ آصف فرخی نے اس کا اردو ترجمہ کیا، اورحان پامک نے جس وقت یہ مضمون لکھا اس وقت امریکی ذرائع ابلاغ جنگی جنون کو بھڑکا رہے تھے اور افغانستان پر امریکی جارحیت اپنے عروج پر تھی۔ اورحان نے لکھا تھا 'امریکا میں آج ایسے لوگ بھی ہیں جو بغیر کسی شرط کے، فوجی حملوں کی حمایت کرتے ہیں تاکہ امریکا کی دفاعی قوت کا مظاہرہ کیا جاسکے اور دہشت گردوں کو 'سبق' سکھایا جاسکے۔ کچھ لوگ بڑی خوش طبعی کے ساتھ ٹی وی پر گفتگو کرتے ہیں کہ امریکی جہاز کہاں بم گرائیں، گویا وہ ویڈیو گیم کھیل رہے ہوں۔ ان مبصرین کو احساس ہونا چاہیے کہ جنگ میں شرکت کرنے کے فیصلے اگر اضطراری طور پر کیے جائیں اور تمام معاملات پر سوچ بچار کے بغیر کیے جائیں تو یہ اس مخاصمت کو بڑھاوا دیں گے جو اسلامی ملکوں اور فلاکت زدہ خطوں میں رہنے والے لاکھوں کروڑوں لوگ مغرب کے لیے محسوس کرتے ہیں...... وہ لوگ جو ایسی حالت میں رہتے ہیں جس سے ذلت اور کمتری کا احساس جنم لیتا ہے۔ یہ وہ کچل دینے والی ذلت ہے جو تیسری دنیا کے ممالک میں وبا بن کر چھا گئی ہے۔

'تاریخ کے کسی دور میں امیر اور غریب کے درمیان خلیج اتنی وسیع نہیں رہی۔ یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ امیر ملکوں کی دولت ان کا اپنا کارنامہ ہے اور اس سے دنیا کے غریب ملکوں کا سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ مگر تاریخ کے کسی بھی دور میں امراء کی زندگیوں کو اس قدر پُراثر طریقے سے دنیا بھر کے غریبوں کی توجہ کا مرکز نہیں بنایا گیا جس طرح ٹیلی وژن اور ہالی ووڈ کی فلموں نے کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بادشاہوں کی زندگی کے قصے غریبوں کی تفریح ہیں۔ لیکن اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ کسی بھی دور میں دنیا کے امیر اور طاقتور معاشرے اتنے نمایاں طور پر 'درست، حق بجانب اور منطقی' ہونے پر مُصر بھی نہیں رہے۔ آج کسی بھی غریب، غیر جمہوری اسلامی ملک کا عام شہری یا سرکاری ملازم جو تیسری دنیا کے کسی ملک یا سابق سوشلسٹ جمہوریہ میں دو وقت کی روزی روٹی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے، اس بات سے آگاہ ہے کہ دنیا کی دولت میں اس کا حصہ کس قدر

موہوم ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ جن حالات میں زندہ ہے، وہ کسی 'مغرب والے' کے مقابلے میں زیادہ دُرشت اور تباہ کن ہیں اور یہ کہ اسے مختصر تر زندگی کی سزا دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس بھی ہے کہ اس کی غربت کسی حد تک اس کی یا اس کے باپ دادا کی حماقت اور ناکارہ پن کا قصور ہے۔ مغرب کی دنیا میں ذلت کے اس مغلوب کن جذبے کا شاید ہی کسی کو احساس ہو جس سے دنیا کی بیش تر آبادی گزرتی ہے۔ لوگوں کو اپنی عقل سلیم کھوئے بغیر اور دہشت گردوں، شدت پسند قوم پرستوں یا کٹر پنتھیوں کے دام میں الجھے بغیر اس احساس پر حاوی آنا ہے۔ مغرب کو آج جس مشکل کا سامنا ہے وہ صرف یہی دریافت کرنا نہیں ہے کہ کون سا دہشت گرد بم بنا رہا ہے، کس خیمے، کس غار یا کس شہر کی کس گلی میں بم بنایا جا رہا ہے بلکہ ان کو اس غریب اور ٹھکرائی ہوئی اور غلطیوں کی سزاوار اکثریت کو سمجھنا بھی ہے جو مغربی دنیا میں نہیں رہتی۔'

عالمی شہرت یافتہ اور نوبل انعام پانے والے ادیب نجیب محفوظ نے گیارہ ستمبر کے حوالے سے لکھا کہ:

> تنہا طاقت سلامتی کی ضمانت نہیں ہے۔ کوئی خواہ نوع انسانی کی تاریخ میں اعلیٰ ترین ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ فقید المثال ہتھیاروں کا مالک کیوں نہ ہو جن میں ایٹمی، جراثیمی، کیمیاوی اور ایسے دیگر ہتھیار شامل ہوں جن کے بارے میں ہم نے اب تک کچھ نہیں سنا ہے، پھر بھی وہ ایک خوف ناک اور انجانے ہتھیار کا شکار ہو سکتا ہے۔

موجودہ معاملے میں جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، دہشت گردوں کو محض تیز چاقوؤں کی ضرورت تھی۔ صرف اس حقیقت سے اس امر کا واضح طور پر اظہار ہو جاتا ہے کہ خالی خولی فوجی طاقت کس قدر ناکافی ہے۔

'سلامتی کی واحد ضمانت انصاف ہے۔ اگر امریکا دنیا کے رہ نما کی حیثیت سے زیادہ منصفانہ رویہ اختیار کرتا تو کوئی اس کو تباہ کرنے کا منصوبہ نہ بناتا۔ ان حملوں کا صرف ایک مطلب ہے: اور وہ یہ کہ آج کی دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ امریکی طاقت کو ان کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ بے شک امریکا کی طاقت دہشت گرد تنظیموں کا خاتمہ کر سکتی ہے یا کسی بھی منحرف کو کچل سکتی ہے۔ لیکن جب تک ناانصافی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک تشدد اور

خانہ جنگی کا خاتمہ بھی نہیں ہوگا۔ جیسا کہ ایک پرانی عرب کہاوت میں کہا گیا ہے کہ حکمرانی کی روح انصاف ہے۔ امریکا کو اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ نہ صرف ایسے جرائم کے مرتکب برے لوگوں کا خاتمہ کرے بلکہ دنیا میں ناانصافی کے اسباب کا بھی خاتمہ کرے۔'

نجیب محفوظ، اورحان پامک، ارون دھتی رائے، نوم چومسکی، رابرٹ فسک اور بہت سے دوسرے دانشور، ادیب اور مدبر پچھلے دو برس سے امریکی حکمرانوں سے چیخ چیخ کر جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس کی کوئی شنوائی نہیں ہو رہی، اسی لیے ہم سب کو اور بہ طور خاص واحد عالمی طاقت کو خوفزدہ رہنا چاہیے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۱۰ر ستمبر ۲۰۰۳ء

امن کی ثقافت

اقوام متحدہ کی جانب سے ۲۱ ستمبر کا دن امن کی ضرورت کو اجاگر کرنے کے حوالے سے منایا جاتا ہے۔ دنیا کے وہ تمام خطے جہاں دنیا کے خطرناک ترین تنازعات موجود ہیں وہاں اس دن کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ پاکستان، ہندوستان، سری لنکا، افغانستان، عراق، فلسطین اور افریقہ کے کئی ملک نسلی، مذہبی اور علاقائی بنیادوں پر خونیں تصادم اور غیر ملکی تسلط کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ان علاقوں کے رہنے والے ریاستی اور گروہی دہشت گردی کا شکار ہیں۔ امن ان کے لیے قہوہ خانوں، ادبی محفلوں اور کانفرنسوں میں کی جانے والی ماہرانہ اور دانش ورانہ گفتگو نہیں، ان کی روزمرہ ضرورت ہے۔ ان کی اور ان کے خاندان کی سلامتی، رات کی نیند اور دن کا چین، روزگار، خوشیاں، تہذیبی اور ثقافتی ورثے کا تحفظ، سب ہی کچھ امن سے جڑا ہوا ہے۔

ریاستی اور گروہی دہشت گردی اور تصادم کا شکار رہنے والوں کے لیے تازہ ہوا بھی ایک عیاشی ہے، اس لیے کہ ان کی فضاؤں میں بارود کی بُو ہے۔ وہ اور ان کے پیارے، ان کے کھیت اور ان کے باغ اس دھوپ کو ترستے ہیں جو توپ کے گولوں، رائفل کی گولیوں اور میزائلوں کی برسات سے چھلنی نہ ہو، ان کے دریاؤں اور شہروں میں لاشیں دور دراز سے بہتی ہوئی آتی ہیں، ان کے لیے وہ چاندنی نایاب ہے جس میں وہ کسی دہشت، کسی اندیشے کے بغیر اپنے گھر کے آنگن میں سو سکیں، دشمن سمجھ کر مار دیے جانے کے خوف کے بغیر دریا کے کنارے ٹہل سکیں اور اپنے گھر کے دریچے سے چاند کو تکتے ہوئے خواب دیکھ سکیں، کسی کے چہرے کو چاند چہرہ کہہ سکیں۔

ایسے تمام ملکوں اور علاقوں میں رہنے والوں کے لیے امن صرف ۲۱ ستمبر کا دن نہیں، وہ ہر ایسے دن کو 'یوم امن' کے طور پر مناتے ہیں جب انہیں بمباری سے بچنے کے لیے کسی دیوار کی آڑ

میں چھپنا نہ پڑے اور جب کسی پیارے کے مارے جانے کی خبر نہ آئی ہو۔ اس وقت مجھے سری لنکا یاد آیا۔ جس زمانے میں وہاں گولی چلنے یا بم پھٹنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، میں نے ان دنوں میں سبزے سے ڈھکے ہوئے اس جزیرے کو دیکھا ہے اور اس میں دن گزارے ہیں۔ اب سالہا سال سے اس شہر، اس کے قصبے، جنگل اور باغ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ وہاں کے لوگ امن کی جتنی بھی خواہش کریں وہ کم ہے۔ ناروے کی حکومت نے تامل ٹائیگرز اور سری لنکا کی حکومت کے درمیان جو امن مذاکرات کیے تھے، وہ کامیاب رہے اور فروری ۲۰۰۲ء سے دونوں طرف کی توپیں خاموش ہیں اور بیس برس کے طویل عرصے کے بعد سری لنکا کے لوگوں کو سکون کا سانس لینے کا موقع ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مرتبہ سری لنکا والوں نے بدھسٹ، ہندو، کرسچین اور مسلمان کی تخصیص کے بغیر سولہ (۱۶) دن کا تہوار منایا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ جنگ کا دیوتا خوش رہے تو امن قائم رہتا ہے، اسی لیے بعض لوگ کا ٹارا کما قصبے میں بیس برس بعد آئے اور انہوں نے جنگ کے دیوتا کو بھاری چڑھاوے چڑھائے۔ یہ قصبہ جنگ کے دیوتا کے نام سے منسوب ہے اور وہاں ہونے والی سولہ روزہ تقریبات چند دنوں پہلے ختم ہوئی ہیں۔ اس دوران آگ میں بھونی جانے والی گرما گرم ریت اور انگاروں پر ہزاروں لوگ ننگے پیر چلے اور انہوں نے دیوتا کو ناریل نذر کیے۔

امن کے لیے لوگ کیا نہیں کرتے۔ سری لنکا کے رہنے والے اپنے مذہبی عقائد کے مطابق یہ سب کچھ اس لیے کر رہے تھے کہ وہ ہر قیمت پر چین اور سکون سے رہنا چاہتے ہیں۔ یہ عام سے لوگ جو کسان ہیں، کلرک ہیں، قلی، مزدور اور خوانچے والے ہیں ان کے لیے امن کا مطلب یہ ہے کہ ان کی جھونپڑیاں، ان کے کچے مکان، ان کے کھیت اور ان کے کارخانے، ان کا روزگار محفوظ رہے۔ ان کے گھر والے مارے نہ جائیں، غائب نہ ہو جائیں، ان کے نابالغ بچے کندھے پر بندوق لٹکا کر گولیاں کھانے اور بارودی سرنگوں کا نوالہ بننے نہ چلے جائیں۔

امن کا مفہوم، ہم نہیں وہ جانتے ہیں جو افغانستان اور عراق جو امریکی حکمرانوں کی سفاکی اور ہوس ملک گیری کا نشانہ بنے، فلسطینی جنہیں اسرائیلی صیہونی روزانہ شکار کرتے ہیں یا اور بہت سے دوسرے جو نسلی، مذہبی یا گروہی اقلیت ہیں۔

امن کی ثقافت کو سال میں صرف ایک روز 'یومِ امن' منا کر نہیں رائج کیا جا سکتا۔ اس کی

بنیادی وجہ یہ ہے کہ ریاستی دہشت گردی ہو یا گروہی دہشت گردی،ملکوں کے درمیان ہونے والی جنگیں ہوں یا علاقائی تصادم اور لڑائیاں، یہ سب معاملات کچھ لوگوں، قوموں یا گروہوں کے مفادات کے لیے سودمند ہوتے ہیں۔ اسلحے کی صنعت میں جن کمپنیوں کا سرمایہ لگا ہوا ہے ان کی یہی خواہش رہتی ہے کہ دنیا میں کبھی گھنٹہ گھڑی کو بھی امن قائم نہ ہو اور ان کے کارخانے شب و روز ہتھیار تیار کرتے رہیں جنہیں بیچ کر وہ ارب پتی سے کھرب پتی ہوسکیں۔ اسی طرح جنگوں سے ملکوں کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ گزشتہ دو برسوں میں افغانستان اور عراق پر امریکا کی چڑھائی کا بنیادی سبب تیل تھا،عراق میں براہ راست تیل کے کنوؤں پر قبضہ مقصود تھا اور افغانستان پر تسلط وسط ایشیا کے تیل اور دیگر معدنی وسائل سے مالا مال ریاستوں کو زیر اثر لانے کے لیے ضروری تھا۔ اسی طرح ہمارے سامنے ویتنام کی جنگ کی مثال ہے جہاں امریکا نے اپنی اتنی بھاری فوجی نفری جنگ میں جھونک دی تھی کہ ہلاک ہونے والے فوجیوں کی تعداد، پچاس ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ وہاں بھی معاملہ تانبا، جست، گرم مصالحے اور دیگر معدنی ذخائر کا تھا۔

اسی طرح وہ گروہ جو علاقائی لڑائیوں میں کبھی قوم پرستی اور کبھی عقیدہ پرستی کے نام پر آویزش کو جنم دیتے ہیں یا دہشت گردی میں ملوث ہوتے ہیں ان کا مسئلہ بھی قوت اور طاقت کے ذریعے کوئی مافیا قائم کرنا یا کسی علاقے پر اقتدار قائم کرنا ہوتا ہے۔

ایک ایسی صورت حال میں یہ سوچنا محض احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے کہ اگر کچھ لوگ امن کی گردان کرتے رہیں یا امن کے نام پر کانفرنسیں اور ورکشاپ منعقد کرتے رہیں تو علاقے یا دنیا میں امن قائم ہو جائے گا۔ دنیا میں امن صرف اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب کروڑہا انسانوں کو اس بات کا یقین آ جائے کہ انہیں مختلف نعروں کی بنیاد پر اشتعال دلا کر مختلف لڑائیوں اور مناقشوں میں الجھانے والے انہیں محض بے وقوف بنا رہے ہیں۔ یہ سمجھنے کی ضرورت امریکیوں کو بھی ہے، ایشیائیوں اور افریقیوں کو بھی کہ ان کے حکمران اپنے اپنے مفادات کی خاطر ان کی آنکھوں میں کس طرح دھول جھونک رہے ہیں اور انہیں ان جنگوں یا لڑائیوں میں ملوث کر رہے ہیں جن میں ان کے عزیز رشتے، جان سے جا رہے ہیں اور جنگ کا تمام بوجھ ان کی ملکی معیشت اور ان کی ذاتی حیثیت پر پڑ رہا ہے۔

اسی نکتے کو سمجھتے ہوئے دنیا میں اب بڑے پیمانے پر اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ

تاریخ، جغرافیے یا ریاضی کی طرح امن کو بھی ایک موضوع کے طور پر نصاب میں شامل کیا جائے۔ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کو یہ بتایا جائے کہ وہ دوسری قوموں، تہذیبوں اور عقیدوں کا احترام کریں، آزادی کی خواہش صرف اپنے لیے نہیں رکھیں، دوسری قوموں اور دوسرے گروہوں کے لیے بھی آزادی کی ضرورت کو محسوس کریں۔ بچے صرف اپنی یا اپنے لوگوں کی عزت نفس کو ہی اہم نہ جانیں بلکہ دوسروں کی عزت نفس بھی انہیں عزیز ہو۔ اگر وہ گورے ہیں تو سیاہ فام یا زرد فام اقوام سے خود کو برتر نہ جانیں۔ اسی طرح بچوں میں برداشت اور رواداری کے جذبے کے ساتھ ساتھ انہیں ابتدائی عمر سے ہی عدم تشدد کا فلسفہ پڑھایا اور بتایا جائے۔ انہیں اس بات کی تربیت دی جائے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کسی جھگڑے یا اختلاف کو گفتگو کے ذریعے افہام و تفہیم سے حل کر سکتے ہیں، تاکہ کل جب وہ بڑے ہو کر زندگی کی مختلف شعبوں میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں تو ان کے اندر کی درشتی اور بات بات پر لڑ مرنے کا رویہ قابو میں آ چکا ہو اور وہ ایک ذمہ دار شہری کے طور پر امن سے رہنے کی ضرورت کو سمجھتے ہوں۔

۱۹۹۵ء میں اقوام متحدہ کی ذیلی ادارے یونیسکو نے ایک منشور جاری کیا تھا جو امن، حقوق انسانی اور جمہوریت کی تعلیم کے بارے میں تھا۔ اس حوالے سے گزشتہ برسوں میں ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر تعلیمی اداروں میں امن اور جمہوریت کی ثقافت کو پڑھانے اور اسے کم عمر اور نوجوان ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے مسلسل کام ہوا ہے۔ ۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۰ء کو دنیا بھر کے بچوں کے لیے امن کی ثقافت اور عدم تشدد کی تعلیم کی دہائی کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے جبکہ سنہ ۲۰۰۰ء کو امن کی ثقافت کا سال قرار دیا گیا تھا۔ ۱۹۹۹ء کے ستمبر میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھی امن کی ثقافت کے ایجنڈے کو منظور کر لیا تھا۔

امن دنیا کے ہر اس فرد کی ضرورت ہے جس کا مفاد اسلحے کی تجارت، تیل کے کنوؤں پر قبضے اور کمزور اقوام کو غلام بنانے سے وابستہ نہیں ہے۔ اس بات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کے ہر فرد اور ہر قوم کے ساتھ انصاف کیا جائے، اس کے حقوق غصب نہ ہوں اور اسے اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کے ساتھ دنیا میں ترقی کے مساوی مواقع حاصل ہوں، تب ہی ہم اس بات کی توقع کر سکتے ہیں کہ دنیا میں امن کی ثقافت پروان چڑھ سکتی ہے۔

'اردو نیوز'، جدہ

۲۳ ستمبر ۲۰۰۳ء

نخوت اور تکبر

یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکا نے تیسری دنیا کے مختلف ملکوں میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے، پھیلانے اور مستحکم کرنے کے لیے ان ملکوں میں آمریت، ملوکیت اور مطلق العنانیت کی پشت پناہی کی ہے۔ سابق شہنشاہ ایران ہوں یا پاکستان کی جمہوری حکومتوں کا تختہ الٹ کر برسر اقتدار آنے والے جرنیل، پول پوٹ کی حکومت ہو یا صدام حسین کی، جنرل پنوشے کا اقتدار ہو یا مارکوس کا، امریکا نے ان ملکوں میں جمہوریت کی بات کرنے والی سیاسی جماعتوں کا ساتھ دینے کے بجائے انہیں کچلنے والی قوتوں کی سرپرستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ایک بڑی جمہوریت ہونے کے باوجود ان ملکوں میں عوامی سطح پر امریکا سے نفرت کی جاتی ہے۔ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کے سانحے کے بعد متعدد امریکی دانشور اور سیاسی تجزیہ نگار بار بار اس الم ناک حقیقت کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکا نے ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے نہتے شہریوں پر ایٹمی حملے کے بعد دنیا بھر میں ریاستی دہشت گردی کا جو ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع کیا ہے، اس نے امریکی حکومت کے ساتھ ساتھ امریکیوں اور امریکی اداروں کو بھی نفرت کا نشانہ بنا دیا ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک خطرناک بات ہے اس لیے کہ اس بناء پر امریکی قوم کا اثر و رسوخ مسلسل سمٹ رہا ہے اور یہ رویہ امریکا کے مفادات پر نہایت منفی طور سے اثرات مرتب کر رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ امریکا کو دنیا بھر کے مسائل و معاملات میں چوہدری کا کردار ترک کر دینا چاہیے اور اپنی سرحدوں سے باہر کے معاملات کو اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد بنانے کی بجائے امریکی سرحدوں سے اندر دیکھنا چاہیے۔ اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ آخر دنیا بھر میں امریکا سے نفرت کیوں کی جاتی ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ امریکا عالمی سطح پر جس

نوعیت کی مہم جوئی کے واقعات میں ملوث ہے، اگر وہ اس سے کنارہ کرلے تو امریکی خزانے کی قوت امریکی اقتصادیات اور معیشت کو بے پناہ تقویت پہنچا سکتی ہے۔ تاہم اس بارے میں ایک زاویہ نظریہ، یہ بھی ہے کہ اپنی سرحدوں سے پرے، امریکا کی تمام مہم جوئی کا رشتہ اس کی اقتصادیات اور معیشت سے جڑا ہوا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ امریکا میں اسلحے کی صنعت اور اس صنعت سے متعلق دیگر بھاری صنعتیں اس لیے پھل پھول رہی ہیں کہ امریکا مختلف تنازعات کو ہوا دے کر اپنی ان صنعتوں کو فروغ دیتا رہا۔ افغانستان اور عراق پر امریکا کے وحشیانہ حملے نے ان ملکوں کو تہس نہس کر دیا اور اب ان کی 'تعمیرِ نو' کے نام پر امریکی تعمیراتی کمپنیوں کو جس طرح اربوں ڈالر کے ٹھیکے مل رہے ہیں، وہ بھی اس جنگ کے ثمرات میں سے ہے جسے امریکا نے ان ملکوں پر 'دہشت گردی کے عفریت' سے نمٹنے کے نام پر مسلط کیا۔

امریکا نے فلسطینیوں کے خلاف اسرائیل کی دائیں بازو کی انتہا پسند حکومتوں کی جس طرح سرپرستی کی اور ان کی غیر انسانی پالیسیوں کو جس طور توثیق کی، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ اسرائیل میں ان لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو اپنی حکومت کے انسان دشمن اور عرب مخالف رویوں کو شدید ناپسند کرتے ہیں۔ یہ لوگ نسبتاً کمزور سیاسی طاقت ہیں۔ امریکا اگر ان کو بڑھاوا دے تو فلسطین اور اسرائیل کے درمیان جو تنازعات ہیں وہ منصفانہ بنیادوں پر حل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود امریکا نے اسرائیل کی ان جمہوری اور انسان دوست قوتوں کی پشت پناہی کرنا تو دور کی بات ہے، کبھی ان کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی۔

اس تمام پس منظر کو ذہن میں رکھیے تو امریکی صدر جارج بش کا ٦ نومبر ٢٠٠٣ء کا بیان حیران کردینے والا تھا۔ اس بیان میں انہوں نے نہ صرف ایران اور شام بلکہ اپنے پرانے دوست اور معتمد حلیف مصر کو بھی مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے ملکوں میں جمہوریت کو اختیار کریں۔

ان کا کہنا تھا کہ گزشتہ ٦٠ برس سے مغربی اقوام مشرق وسطیٰ میں جمہوریت اور آزادی کو مستحکم کرنے سے صرف نظر کرتی رہی ہیں۔ ہمارے (مغرب کے) اس رویے نے ہماری حفاظت کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کی قیمت پر استحکام کو خریدا نہیں جاسکتا۔ صدرِ امریکا نے مراکش، بحرین، کویت اور سعودی عرب میں ہونے والی مثبت تبدیلیوں اور جمہوری روایت سے جڑنے کی کوشش کو سراہا۔ ان کا کہنا تھا کہ مشرق وسطیٰ کے لاکھوں مردوں،

عورتوں اور بچوں کا ہرگز یہ مقدر نہیں ہے کہ وہ اور ان کی نسلیں آزادی سے محروم رہیں، استبدادی حکومتوں کے سائے میں سانس لیں اور محرومیوں کی زندگی گزاریں۔ امریکی صدر جارج بش کی زبان سے نکلے ہوئے یہ جملے پوری دنیا میں توجہ اور حیرت سے سنے گئے۔ لوگوں نے ان جملوں پر توجہ اس لیے دی کہ یہ امریکی خارجہ پالیسی میں ایک بنیادی تبدیلی کا اشارہ تھے۔ ساری دنیا کے لوگوں کو اس تقریر پر حیرت اس لیے ہوئی کہ دنیا بھر کے دانشور، سیاسی تجزیہ نگار اور ادیب گزشتہ چھ دہائیوں سے یہی بات امریکی حکومت سے ایک بار نہیں سینکڑوں بار کہتے رہے ہیں۔

امریکا نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے نہتے شہریوں کو جس قدر بیدردی سے ایٹمی حملے کا نشانہ بنایا، اس کے بعد سے اس کے تکبر میں مسلسل اضافہ ہوا ہے اور اس نے آزادی کے اصولوں اور قوموں کے وقار کو حقارت سے اپنے قدموں تلے روندا ہے۔ اس تناظر میں امریکی صدر کا یہ بیان دنیا کے لوگوں کو محض 'لیپا پوتی' اور عراق کی نہایت مشکل صورت حال سے کسی طور بچ نکلنے کا ایک طریقہ محسوس ہو رہا ہے۔ کیسی دلچسپ بات ہے کہ جس وقت صدر بش یہ تقریر واشنگٹن میں کر رہے تھے، عین اسی وقت شہری حقوق کے مشہور سیاہ فام امریکی رہنما جیسی جیکسن تھائی لینڈ کے دارالحکومت بنکاک میں امن کی ایک مہم کا آغاز کرتے ہوئے صدر امریکا کو ان کی نخوت اور تکبر یاد دلا رہے تھے۔ جیسی جیکسن نے عراق پر حملے سے پہلے بھی یہ بات بہ اصرار کہی تھی اور اب ایک بار پھر اسے دہرایا کہ امریکا جیسی عالمی طاقت کے لیے یہ جنگ مختصر تو ہوسکتی ہے لیکن اس نے ریاستی تشدد کے جس عمل کا آغاز کیا ہے وہ رکے گا نہیں، بڑھتا ہی جائے گا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کا فلسفہ آخرکار ہر شخص کو اندھا بنا دیتا ہے اور ہر شخص دانتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس بارے میں کسی کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا کہ مشرق وسطیٰ کے لوگوں کے لیے امریکی صدر کے دل میں اچانک جو 'نرم گوشہ' پیدا ہو گیا ہے یا جن ہنگامی بنیادوں پر وہ ان کے لیے شہری آزادیوں اور جمہوریت کو ضروری سمجھنے لگے ہیں، اس کی حقیقی وجہ یہی ہے کہ جب تک دوسروں کی آنکھ ضائع ہوتی رہے اور جب تک دوسروں کے دانت ٹوٹتے رہیں، اس وقت تک امریکی حکومتیں جیسی جیکسن کے بقول تکبر و نخوت کا مظاہرہ کرتی ہیں لیکن اب جس رفتار سے امریکی سپاہیوں کے تابوت امریکا پہنچ رہے ہیں اور امریکی صدر کی مقبولیت میں جس طرح کمی آ رہی ہے، اس کے بعد صدر بش کو اپنی حکمت عملی میں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ ٦ نومبر کو صدر امریکا نے اپنی

خارجہ پالیسی میں یوٹرن اسی ضرورت کے تحت لیا ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں ہی کیوں، تیسری دنیا کے تمام ملکوں میں جمہوریت ہونی چاہیے اور وہاں کے لوگوں کو بنیادی انسانی حقوق اور شہری آزادیوں سے لطف اندوز ہونا چاہیے، صرف مشرق وسطیٰ میں ہی نہیں، تیسری دنیا کے تمام ملکوں میں فوجی آمریتوں اور مطلق العنان حکومتوں کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ لیکن امریکی صدر نے صرف مشرق وسطیٰ کے چند ملکوں کے لیے 'آزادی' اور 'جمہوریت' کو نسخۂ شفا کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری دنیا میں کسی بھی سنجیدہ اور ایماندار حلقے کی طرف سے ان کے اس بیان کی پذیرائی نہیں ہوئی اور خود امریکا کے اندر اس 'شاندار بیان' کے باوجود وہ شدید تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

مشرق وسطیٰ کی حکومتوں کو جب وہ یہ 'ہدایت' دیتے ہیں کہ انہیں فوراً جمہوریت اور شہری آزادیوں کا شربت حوالشافی کہہ کر حلق سے نیچے اتار لینا چاہیے، تو بہت سے لوگ ان کے اس بیان میں سچ کی رمق بھی نہیں دیکھتے۔ لوگوں کا حافظہ ابھی اتنا کمزور بھی نہیں ہوا کہ وہ یہ بھول جائیں کہ اسامہ بن لادن کو جب سابق سوویت یونین کے خلاف استعمال کیا جارہا تھا تو لادن اور اسی قبیل کے دوسرے جنگجوؤں کو امریکا میں 'مجاہدین' کا درجہ دیا جاتا تھا جبکہ آج یہ تمام لوگ اور ان کی تنظیمیں دہشت گرد قرار دی جاچکی ہیں اور سب کے سروں کی قیمت کروڑوں ڈالر ہے۔ اسی طرح لوگوں کو یہ بھی یاد ہے کہ جب صدام حسین کی حکومت جمہوریت اور شہری آزادیوں کا خواب دیکھنے والے عراقیوں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنا رہی تھی، ہزارہا نہتے کرد زہریلی گیسوں سے ہلاک کیے جارہے تھے، تب صدام حسین کی پشت پر کسی اور کا نہیں، امریکا کا ہاتھ تھا۔ تیسری دنیا کے بہت سے ملکوں کے لوگوں کو صدر امریکا کا یہ تازہ ترین بیان، ہنسنے پر مجبور کرتا ہے، اس لیے کہ ان سے زیادہ کون اس بات سے واقف ہے کہ امریکی حکومتوں کو تیسری دنیا کے وہی حکمران اچھے لگتے ہیں جو اپنے لوگوں کے جمہوری اور شہری حقوق غصب کریں، ان پر ہر نوعیت کا تشدد روا رکھیں، جو عوامی دولت کو ہڑپ کر جائیں اور جن کا مقصد ہر قیمت پر اقتدار میں رہنا ہو۔ امریکی حکومتیں تیسری دنیا میں ایسے ہی حکمرانوں کی سرپرستی کرتی ہیں، اس لیے کہ وہی امریکی پالیسیوں پر بے چوں و چرا عمل کرتے ہیں۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۱۹/نومبر ۲۰۰۳ء

وائٹ ہاؤس اور شعر خوانی کی محفل

شہر برباد، بغداد سے خبریں کل بھی آ رہی تھیں اور آج بھی چلی آتی ہیں۔ خون میں بھیگی ہوئی اور خاک میں اٹی ہوئی خبریں۔ ہلاکو نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو جلا کر جب راکھ کیا، اس وقت سے آج تک مشرق کے لوگ اس سانحے کو نہ بھول سکے اور اب جب اکیسویں صدی میں بغداد پر آسمان سے عذاب اترے اور زمین سے موت کے چشمے ابلے، تو اس درد و اندوہ کا صرف مشرق نے ہی نہیں مغرب نے بھی غم منایا۔

ہندوستان میں بغداد کی اس نئی تباہی پر صلاح الدین پرویز نے ناول لکھا، اردو میں بہت سی نظمیں تخلیق ہوئیں، عربی سے بہت سی شاعری ترجمہ کی گئی۔ نثر اور شاعری کا، تخلیق اور ترجمے کا ایک مجموعہ 'میں بغداد ہوں' حال میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ یہ مجموعہ جسے آصف فرخی نے مرتب کیا، مشرق و مغرب کی تخلیقی تحریروں اور اخباری کالموں کا ایک عمدہ انتخاب ہے۔ اس انتخاب کا آغاز شیخ سعدی کے فارسی نوحے سے ہوا ہے جو انہوں نے بغداد کی تاراجی پر تحریر کیا تھا اور اختتام ۱۹۹۱ء میں بغداد پر مسلط کی جانے والی ہلاکت کے بارے میں شائع ہونے والی میری ایک تحریر 'اے عروس البلاد...... اے شہر برباد' پر ہوا ہے۔ 'میں بغداد ہوں' میں جہاں مصر کے نوبل انعام یافتہ ادیب نجیب محفوظ کی تحریر ہے، وہیں عراق کی شہرۂ آفاق شاعرہ نازک الملائکہ کی نظمیں بھی ہیں۔ اس میں ہندوستان کی بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب ارون دھتی رائے کا مضمون 'درندے کا خاکہ'، جان لی کیرے کی تحریر 'امریکا پاگل ہوگیا ہے' کے علاوہ نارمن میلر، گنٹر گراس اور مارگریٹ ایٹ وڈ کے مضامین بھی شامل ہیں۔ یہ تمام تحریریں امریکا کی ریاستی دہشت گردی کے خلاف دنیا کے بڑے اور نامور ادیبوں کا شدید احتجاج ہیں۔

ایک طرف دنیا بھر کے ادیب، شاعر اور صحافی عراق کے نہتے شہریوں پر اس بہیمانہ حملے کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے، ادھر امریکی صدر جارج بش کی بیگم صاحبہ نے حسب معمول وائٹ ہاؤس میں شعر خوانی کی ایک محفل کا اہتمام کر ڈالا۔ لیکن یہ محفل اپنے منعقد ہونے سے پہلے ہی منسوخ کردی گئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکی حکام کو اس بات کی سن گن مل گئی تھی کہ جن امریکی شاعروں کو شعر خوانی کی اس محفل میں مدعو کیا گیا ہے، وہ اس میں عراقی عوام کے حق میں نظمیں سنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس محفل کے منسوخ ہونے کی خبر، کوئی معمولی بات نہ تھی۔ 'میں بغداد ہوں' میں اس محفل کے بارے میں ایک برطانوی صحافی سارہ لیفٹ کی لکھی ہوئی وہ رپورٹ شائع ہوئی ہے جو لندن کے اخبار 'گارجین' میں چھپی تھی۔ شعر خوانی کی اس محفل کو منسوخ ہوئے لگ بھگ ایک برس کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس کے بارے میں سارہ لیفٹ کی رپورٹ آج بھی پہلے دن کی طرح تازہ ہے اور اس بات کا اشارہ دیتی ہے کہ دنیا بھر کے باضمیر شاعر اور ادیب ایک طرح سوچتے اور لکھتے ہیں۔

سارہ لیفٹ نے لکھا کہ شعر خوانی کی یہ محفل اس وقت منسوخ کردی گئی جب کئی امریکی شاعروں نے اس تقریب میں عراق کے خلاف اپنی نظمیں سنانے کا ارادہ کیا۔ یہ ان ادبی تقاریب میں سے ایک تھی جو خاتونِ اول، لارا بش منعقد کیا کرتی ہیں۔ امریکا کی خاتون اول ماضی میں لائبریرین رہی ہیں اور انہوں نے نفسیات اور بچوں کی نشو ونما کو اپنی مخصوص دلچسپی کے مسائل قرار دیا ہے۔ وائٹ ہاؤس میں منعقد کی جانے والی ان ادبی محفلوں میں اہم امریکی ادیبوں کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے اور ان نشستوں میں ادب اور معاشرے پر ان کے اثرات کے بارے میں بحث اور مکالمہ بھی ہوتا ہے۔

واشنگٹن میں مقیم امریکی شاعر سام ہیمل کو جب اس تقریب کا دعوت نامہ ملا تو انہوں نے کہا کہ 'ایک طرح کی متلی کی سی کیفیت' ان پر حاوی ہوگئی اور انہوں نے تقریب میں شرکت سے انکار کر دیا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنے حرفِ انکار کی ترویج کی اور دوسرے شاعروں کو اس میں شریک کرنا چاہا۔ انہوں نے دوسرے شاعروں کو ای میل کے ذریعے دعوت دی کہ جنگ کے خلاف نظمیں لکھیں اور ان میں سے جو بھی وائٹ ہاؤس کی تقریب میں شریک ہو، وہاں جنگ

کے خلاف نظمیں پڑھے۔

وائٹ ہاؤس کو یہ خبر ملی تو اس نے یہ تقریب ہی منسوخ کر دی کہ کہیں شاعروں کو احتجاج کا موقع نہ مل جائے۔ مسز بش کی ترجمان نے بیان دیا کہ 'مسز بش جہاں تمام امریکیوں کے اس حق کا احترام کرتی ہیں کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کر سکیں، وہیں ان کی (یعنی مسز بش کی) بھی اپنی ایک رائے ہے اور وہ یہ سمجھتی ہیں کہ ایک ادبی تقریب کو سیاسی فورم میں تبدیل کر دینا مناسب نہ ہوگا۔'

سام ہیمل نے، جو اشاعتی ادارے 'کاپر کینین پریس' کے بانی بھی ہیں، اپنے طور پر تہیہ کیا کہ جس روز یہ محفل منعقد ہو اس دن کو جنگ کے خلاف شاعری کا دن بنا دیں۔ ان کی درخواست کے جواب میں سینکڑوں، ہزاروں شاعروں نے اپنی نظمیں اور بیانات ارسال کیے جن کو ایک ویب سائٹ پر جاری کر دیا گیا، ان میں ڈبلیو ایس مرون، گیلوے کنیل، ارسلا لے گون، ایڈرین رچ اور لارنس فرلنگیٹی جیسے سربر آوردہ شاعر شامل ہیں۔ اس ویب سائٹ پر اپنے تعارفی خط میں ہیمل نے لکھا: 'مجھے اس بات پر یقین ہے کہ اخلاقی طور پر ایسے دیوالیہ اور بے ضمیر تصورات کا واحد باضابطہ جواب یہی ہے کہ جنگ کے خلاف شاعروں کو اور اس ادبی تحریک کو دوبارہ منظم کیا جائے جو ویت نام کی جنگ کے خلاف وجود میں آئی تھی۔'

اسی انداز میں کینیڈا کے شاعر ٹاڈ سوئفٹ نے ایک 'E Book' صرف ہفتے بھر میں مرتب کر ڈالی جس کا اجرا عین اسی دن کیا گیا جب سلامتی کونسل میں اسلحے کے معائنہ کاروں کی رپورٹ پیش کی گئی۔ سوئفٹ کے مجموعے 'جنگ کے خلاف ۱۰۰ شاعر' کو اتنی عالم گیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ خود حیران رہ گئے۔

وائٹ ہاؤس نے ہیمل کے احتجاج پر ایک اور ہی عذر پیش کیا۔ ہیمل نے اخبار 'سی ایٹل ٹائمز' کے نمائندے سے کہا کہ 'کس احمق نے سوچا تھا کہ ہیمل مسز بش کی چائے کی دعوت کے لیے مناسب مہمان ثابت ہوگا؟ اس بلاوے پر کسی نہ کسی کی نوکری جائے گی!'

وائٹ ہاؤس نے شعر خوانی کی یہ تقریب ملتوی کی تو امریکا کے ان سر پھرے شاعروں نے اس التوا کو بھی ایک تحریک میں تبدیل کر دیا۔ ہیمل سے شروع ہونے والی اس تحریک پر پورے ملک میں جنگ کے خلاف شعر خوانی کی محفلیں منعقد کی گئیں۔ امریکا میں ہونے والے ہر اہم ثقافتی واقعے کی طرح یہ احتجاج بھی پوری دنیا میں پھیل گیا اور شعر خوانی ہوئی، مشاعرے منعقد کیے گئے۔

خود امریکا میں بڑے بڑے اجتماعات ہوئے۔ نیویارک کے لنکن سینٹر میں ایسے ایک اجتماع کو یہ دلچسپ نام دیا گیا کہ: 'وہ نظمیں جو وائٹ ہاؤس کے قابل نہیں تھیں......'

اس تقریب کے بارے میں کہا گیا کہ حالیہ برسوں میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اتنے غیر معمولی اور متنوع شاعر ایک ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ ان میں سے بیشتر ادیب 'ضمیر کے اس بیان' کے دستخط کنندہ تھے جو نیویارک ٹائمز میں دو صفحے کے اشتہار کے طور پر شائع ہوا اور جس کا آغاز یوں ہے......

'مبادا یہ کہا جائے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کی حکومت نے جس وقت ایک بے حد و حساب جنگ کا آغاز کیا اور بندش کے نئے اور سخت اقدامات کیے تو اس وقت امریکی عوام نے کچھ نہیں کیا......'

امریکا کے شہر پورٹ لینڈ میں معروف ادیبہ ارسلا کے لے گوئن (Ursula K. Le Guin) کی رہنمائی میں 'عراق سے جنگ کے خلاف درخواست' کانگریس کے مقامی رکن کو پیش کی گئی۔ اس درخواست پر دنیا بھر سے ڈھائی سو کے قریب ادیبوں نے دستخط کیے جن میں بڑی تعداد سائنس فکشن اور فینٹسی کے اسلوب میں لکھنے والوں کی ہے۔

ارسلا لے گوئن سائنس فکشن کے ساتھ ساتھ سماجی وابستگی کے لیے بھی مشہور ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں نراج کے مارے ہوئے سماجی ڈھانچوں، صنفی امتیاز اور حقیقت کی نمائندگی کے مسائل سے دلچسپی لی ہے۔ ارسلا لے گوئن سے کسی نامہ نگار نے سوال کیا کہ احتجاج کا کیا کوئی فائدہ بھی ہوتا ہے، تو انہوں نے جواب دیا: 'ایک یہی چیز تو ہے جو ہم کر سکتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے ہمیں کرتے رہنا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ آخر نازی اتنے بھیانک مظالم کیسے کر سکے؟ جرمن عوام نے ان کو کس طرح پیش آنے دیا؟ آپ اپنے چاروں طرف دیکھیے، جواب مل جائے گا۔'

ان تمام واقعات کے نتیجے میں شاعری، عالمی سماج میں ایک قوت بن کر ازسرِنو سامنے آئی۔ ممکن ہے کہ کوئی پوچھے کہ اس کی ادبی حیثیت کیا ہے۔ اس کا تذکرہ امریکی صحافی ڈیوڈ اُلن کی رپورٹ میں ملتا ہے جو 'لاس اینجلز ٹائمز' میں شائع ہوئی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا کہ شاعری کے بارے میں سوچنے کے ہمیشہ سے دو طریقے رہے ہیں۔ یا تو آپ یہ یقین کر لیں، جیسا کہ ڈبلیو ایچ آڈن نے دوسری عالمی جنگ کے آغاز پر لکھا تھا کہ Poetry makes nothing happen

یا پھر شیلے سے اتفاق کریں کہ شاعر 'دنیا کے غیر تسلیم شدہ قانون ساز ہیں۔' بات جس زاویے سے بھی درست ہو، یہ مسئلہ مرکزی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ امریکی شاعروں کی برادری، عراق سے جنگ کی مخالفت میں ایک غیر متوقع مگر بہت نمایاں قوت کے طور پر ابھری ہے۔ امریکی شاعروں اور ادیبوں نے کتابوں کی دکانوں، گرجا گھروں، اجلاس گاہوں اور کتب خانوں میں شعر خوانی کی ۵۰ سے زیادہ تقریبات کا اہتمام کیا۔ امریکی شاعروں کی سیاسی رائے زنی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مسز لارا بش کے ترجمان نے کہا کہ یہ تقریب تو شاعری کے جشن کے طور پر منعقد کی گئی تھی۔

شاعر اور افسانہ نگار گریس پیلی نے جو 'ادب اور احتجاج' کی ایسی ایک تقریب میں شامل رہی ہیں، یہ کہا کہ شاعروں کے مطابق یہ تصور کہ شاعری کو قطعاً غیر سیاسی ہونا چاہیے مسز بش کی کم فہمی ہے۔ 'اگر مسز بش نے یہ بات کسی اور ملک میں کہی ہوتی تو ہر اخبار ان پر ہنس رہا ہوتا۔ شاعر اسی دنیا میں رہتے ہیں اور ان کی تحریروں میں اس کی عکاسی ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر آپ سیاست کو مسترد کرتے ہیں تو یہ بھی ایک سیاسی بیان ہے۔'

پاکستان اور ہندوستان میں کیا اردو، کیا ہندی، کیا بنگلہ، کیا سندھی اور کیا پنجابی اور دوسری زبانیں اپنی بڑی شاعری اور بڑے شاعروں پر ناز کرتی ہیں۔ برصغیر میں جنگ آزادی کو متحرک کرنے میں شاعری نے ایک بڑا کردار ادا کیا۔ اس برصغیر کے رہنے والوں کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ صرف ہمارے یہاں ہی جوش ملیح آبادی، سردار جعفری، کیفی اعظمی، فیض احمد فیض، حبیب جالب اور شیخ ایاز ایسے آتش نوا شاعر نہیں پیدا ہوتے، ایسے شاعر امریکا میں بھی پائے جاتے ہیں جو وائٹ ہاؤس میں شعر خوانی کی دعوت کو ٹھکرا دیتے ہیں اور اپنے ضمیر کی آواز کو شعر کا آہنگ دے کر رنگ، نسل، مذہب اور علاقے کی تفریق کے بغیر مظلوم انسانوں اور محکوم بستیوں کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔

'اردو نیوز'، جدّہ

۱۵ر جنوری ۲۰۰۴ء

ہم تاریخ کو تقسیم نہیں کر سکتے

جناب اٹل بہاری باجپائی کا تعلق برصغیر کی اس نسل سے ہے جس نے اپنے بچپن میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ذکر سنا، جس کے کانوں میں اس کے شہیدوں اور قیدیوں کے نام گونجے۔ اس نسل کی یاد داشت میں بہادر شاہ ظفر، بخت خان، اودھ کی حضرت محل، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے، راجہ کنور سنگھ، امر سنگھ، نانا فرنویس، علامہ فضل حق خیرآبادی، مولانا جعفر تھانیسری، علمائے صادق پور اور ان کے علاوہ بنگال سے شمال سرحدی علاقوں کے ان گنت نام محفوظ ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو مذہب، مسلک اور علاقے کی تفریق کے بغیر فرنگی استعمار سے لڑے، ہزاروں پھانسی چڑھے، توپ دم ہوئے، کالا پانی بھیجے گئے، جو بچ رہے انہوں نے انگریز سے اپنے سیاسی اختلاف کی قیمت غربت، افلاس اور کسمپرسی کی صورت میں ادا کی۔ اس جنگِ آزادی کے پہلے دو شہید ایشوری پانڈے اور منگل پانڈے ہیں جنہوں نے سینے پر گولی مغل بادشاہ کے اقتدار کے لیے کھائی تھی اور یہ نہیں سوچا تھا کہ اپنی جان وہ ایک مسلمان کے لیے دے رہے ہیں۔ باجپائی صاحب اپنی تاریخ سے بہ خوبی آشنا ہیں اسی لیے سارک سربراہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے ۱۸۵۷ء کو یاد کیا اور یہ کہا کہ ۲۰۰۷ء میں پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش انگریزوں سے جنگ آزادی کا ڈیڑھ سو سالہ جشن مشترک طور پر منا سکتے ہیں۔ اپنی اس تقریر میں انہوں نے کہا......

> ’تاریخ ہماری یادیں تازہ کر سکتی ہے، ہمیں سکھا سکتی ہے، ہمیں خبردار کر سکتی ہے۔ ہمیں تاریخ کا قیدی نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں اب ایک اجتماعی نقطۂ نظر کے ساتھ آگے کی طرف دیکھنا ہے۔ کچھ بہت پرانی بات نہیں جب میں نے جزائر انڈمان (المعروف بہ کالا پانی) کا دورہ کیا۔ نوآبادیاتی دور میں

سیاسی قیدی وہاں رکھے جاتے تھے۔ وہاں کی جیل میں مجھے اپنے شہیدوں اور جنگ آزادی لڑنے والوں کے ناموں کی تختیاں نظر آئیں۔ یہ ان لوگوں کے نام تھے جن کا تعلق اس پورے خطے سے تھا جو آج جنوبی ایشیا کہلاتا ہے اور جو اب تین ملکوں میں منقسم ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے رنگ، نسل، مذہب اور علاقائی تفریق کو بالائے طاق رکھ کر ایک مشترک نوآبادیاتی غاصب کے خلاف ۱۸۵۷ء میں آزادی کی پہلی جنگ لڑی تھی۔ یہ بات ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہم میں سے بہت سے ایک مشترک تاریخ رکھتے ہیں جو ہماری حالیہ تقسیم سے پہلے کی ہے۔ دو برس بعد ہم اس شاندار بغاوت کی ایک سو پچاسویں سالگرہ کے سال میں قدم رکھیں گے۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش اس سالگرہ کا مشترک جشن منا سکتے ہیں، ایک مشترک دشمن کے خلاف مشترک جدوجہد کا جشن۔'

میرا خیال تھا کہ باجپائی صاحب کی اس تجویز کی اصل پذیرائی علمائے دیوبند کے پاکستانی وارثوں کی جانب سے ہوگی۔ یہ علمائے دیوبند تھے جنہوں نے جزائر انڈمان المعروف بہ کالا پانی میں عذاب ناک جلاوطنی گزاری تھی اور آج بھی علامہ فضل حق خیرآبادی سمیت ہمارے نہ جانے کتنے علماء وہاں دفن ہیں۔ مفتی محمود مرحوم کے فرزند ارجمند مولانا فضل الرحمٰن اس بارے میں خاموش رہے لیکن ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ جناب قاضی حسین احمد کو باجپائی صاحب کی یہ بات نہایت ناگوار گزری۔ انہوں نے فرمایا کہ اس تجویز کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان ایک قوم ہے اور سب نے مل کر فرنگی کے خلاف جنگ آزادی لڑی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ 'باجپائی صاحب نے اس طرح ایک مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ اگر جنگ آزادی کی تقریبات مل کر منانی ہیں تو پھر بہادر شاہ ظفر کو لانا پڑے گا اس لیے کہ پورے برصغیر کی مشترکہ اقدار کے وارث تو وہی ہو سکتے ہیں یا ان کی نسل کا بچ جانے والا کوئی فرد۔'

قاضی صاحب عموماً معاملات کے بارے میں بہت تیزی سے ردِّعمل دیتے ہیں۔ باجپائی صاحب کی اس تجویز پر بھی انہوں نے اپنے فوری جذبات کا اظہار کیا اور یہ فراموش کر گئے کہ ہم جغرافیہ تقسیم کر سکتے ہیں لیکن تاریخ کو تقسیم نہیں کر سکتے۔ یہ قاضی صاحب کی مجبوری ہے کہ وہ اس

حقیقت کو 'برداشت' کریں کہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ پر سے اپنی جان نثار کرنے والوں میں ہندو منصب داروں کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے۔ اس طرح یہ برداشت کرنا بھی ان کی مجبوری ہے کہ سراج الدولہ پر انگریز مورخین نے جب 'بلیک ہول' کا بہتان باندھا تو یہ بنگالی ہندو مورخین تھے، جنہوں نے روز اول سے اس الزام کا جواب دیا اور یہ ثابت کیا کہ یہ ایک قوم پرست ہندوستانی کو بدنام کرنے کی سازش کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تاریخ اتنی ظالم ہے کہ وہ سلطان ٹیپو کے حوالے سے بھی اس کے وفادار ہندو منصب داروں کے نام محفوظ رکھتی ہے اور اقبال جنگ آزادی میں غداروں کے نام جب گنواتے ہیں تو 'جعفر از بنگال صادق از دکن' لکھتے ہیں۔ فرنگی استعمار سے ابتدائی لڑائی ۱۷۵۷ء کے بنگال میں شروع ہوئی تھی، اس وقت سے ۱۸۵۷ء تک اور اس کے بعد بھی یہ جنگ مشترک بنیادوں پر لڑی گئی۔ اس لڑائی میں مسلمان، ہندو، سکھ، مرہٹہ، پارسی اور حد تو یہ ہے کہ عیسائی ہو جانے والے کئی افراد بھی شامل تھے۔ غدر پارٹی کے اراکین کے نام پڑھیے تو اس میں بنگال، بہار، مدراس، اودھ، پنجاب، سندھ، شمال سرحدی علاقے اور گوا کے رہنے والوں کے نام نظر آتے ہیں۔ ان میں کوئی تامل بولتا تھا، کسی کی زبان بنگلہ، اردو، مراٹھی اور پنجابی تھی، کوئی سید اور برہمن تھا، کوئی اچھوت اور جولاہا تھا۔ لیکن 'آزادی' کی سرکار میں پہنچ کر سب ہی ایک تھے۔

قاضی صاحب کا یہ کہنا کہ 'اس تجویز کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان ایک قوم ہے اور سب نے مل کر فرنگی کے جنگ آزادی لڑی تھی' ایک ایسی بات ہے کہ جس کے بعد ہندوستان میں چھپنے والی کتابیں تو چھوڑیے، پاکستان میں مولانا غلام رسول مہر، رئیس احمد جعفری، محمد ایوب قادری اور نہ جانے کتنے جید عالم و فاضل افراد نے جنگ آزادی کے بارے میں جو کچھ تاریخی ثبوت وشواہد کی روشنی میں لکھا ہے اسے قاضی صاحب کیسے جھٹلائیں گے؟ قاضی صاحب کی نظر سے شاید مولانا محمد جعفر تھانیسری کی کتاب 'تواریخ عجیب' (کالا پانی) کی یہ سطریں نہیں گزریں جو انہوں نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں لکھی تھیں کہ 'غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بیسیوں راجے مہاراجے، نواب اور زمیندار، مولوی، مفتی، قاضی، ڈپٹی کلکٹر، منصف، صدر امین، صدر الصدور، رسالہ دار، صوبیدار، جمعدار وغیرہ وغیرہ وہاں قید ہیں۔' یہ راجے مہاراجے، یہ ڈپٹی کلکٹر کون تھے؟ ان میں سے بہت سے ہندو تھے۔ راجہ کنور سنگھ جنہوں نے ۸۰ برس کی عمر میں مغل ہندوستان کے

لیے لڑائی لڑی تھی، وہ اور ان کے بھائی، بھتیجے، ساتھی سب ہی راجپوت سردار تھے۔ اس وقت مجھے ہندوستان سے چھپنے والی کتاب 'شہیدانِ آزادی' یاد آئی۔ اس کی لگ بھگ پندرہ سو صفحوں پر مشتمل تین جلدیں میری نظر سے گزری ہیں۔ ان جلدوں میں آزاد ہند فوج کے صرف ان شہیدوں کا ذکر ہے جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندوستان کی سرزمین پر اور ہندوستان سے باہر جدوجہد کی اور مارے گئے۔ ان میں کراچی سے کلکتہ تک کے لوگوں کے نام ہیں۔ مسلمانوں کے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے جو اس کتاب میں نظر آتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ کتاب قاضی صاحب کی نگاہوں سے بھی گزرے اس لیے کہ ۱۸۵۷ء تو بہت پرانی بات ہے، اس کتاب میں جن شہیدوں کے نام اور حالاتِ زندگی دیے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر ۱۹۴۰ء کی دہائی میں اپنی جان سے گئے۔

قاضی صاحب اپنی سیاست اور سیادت کے لیے برصغیر میں بیسویں صدی کی تاریخ پر جتنی چاہیں چھری چلائیں لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو بخش دیں تو اچھا ہے۔ ہندوستان سے بہت سی ایسی خبریں آتی ہیں جن میں بعض انتہا پسند کبھی تاج محل کو کسی ہندو سمراٹ کی یادگار بتاتے ہیں اور کبھی قطب مینار پر دعویٰ کر دیتے ہیں۔ ایسی خبریں آتی ہیں تو ہم ان پر ہنستے ہیں۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء جیسے معاملات پر ہماری جانب سے ایسے بیانات پڑھ کر ہندوستان والے بھی ہماری عقل پر ماتم کریں گے۔

یوں بھی ایسی بات کہنا سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، تیتو میر اور بیسویں صدی میں دادا اشفاق تک سب کی جدوجہد پر اور تمام شہیدوں کے خون پر خطِ تنسیخ پھیر دینے کے مترادف ہے۔ وہ لوگ جو مسلمان، ہندو یا سکھ کی تفریق کے بغیر فرنگی کی غلامی سے نجات کے لیے جان سے گزر جاتے تھے جو 'مرا رنگ دے بسنتی چولا' اور 'دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے' گاتے ہوئے پھانسی چڑھ جاتے تھے، ان سب کے نام تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان کے نام کھرچے نہیں جاسکتے، مٹائے نہیں جاسکتے۔ ہمارے سامنے تازہ ترین مثال جنوبی افریقہ کی ہے جہاں عیسائیوں، ہندوؤں، مسلمانوں اور بعض سفید فام افراد نے مل کر نسلی امتیاز اور سفید فام حکومت کے خلاف جدوجہد کی، آزادی حاصل کی اور آج وہ اس جدوجہد کو اپنا مشترک تاریخی ورثہ قرار دیتے ہیں۔

اس تقریر پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے قاضی حسین احمد سے کہیں زیادہ بلیغ بات

جمعیت علمائے اسلام کے حافظ حسین احمد نے کہی ہے کہ باجپائی صاحب نے خطے پر امریکی دباؤ کے خلاف مشترک جدوجہد کے لیے ایک لطیف اشارہ دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں نے فرنگی کے خلاف جنگ لڑی تھی، اسی طرح ہم بھی امریکا کی بالادستی کے خلاف مل کر جنگ کریں۔

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حالات کا دھارا قوموں کو جب لے کر چلتا ہے تو اس کی تندی کے آگے بڑی بڑی سلطنتوں کا زور نہیں چلتا۔ ہم سب کی بھلائی اسی میں ہے کہ لوگوں کو تاریخی حقائق توڑ مروڑ کر نہ بتائے جائیں۔ ہمیں اپنے لوگوں کو یقیناً یہ بتانا چاہیے کہ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں کن انتہا پسندوں نے چلائی تھیں لیکن ہمیں غیر متعصب، وسیع المشرب اور آزادی کے متوالوں کو مذہب، مسلک، زبان اور علاقے کی بنیادوں پر تقسیم کر کے نہیں دیکھنا چاہیے، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں اپنی جانیں نہ دی ہوتیں تو آج محترم قاضی حسین احمد اور ان کے مکرم ساتھیوں کو پاکستان کی پارلیمنٹ کی رکنیت کا اعزاز بھی حاصل نہ ہوتا۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۷ جنوری ۲۰۰۴ء

ایک دوسری دنیا کی تعمیر

اب سے ایک مہینے بعد عراق پر امریکی حملے کا ایک برس مکمل ہو جائے گا۔ اس ایک برس کے دوران دجلہ کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ گیا، بہت سے انسان جان سے گئے، بہت سی عمارتیں نابود ہو چکیں اور تاریخی اعتبار سے قدیم ترین پس منظر رکھنے والا علاقہ جسے انسانی تہذیب کا گہوارہ کہا جاتا ہے، اس کا وقار خاک میں مل گیا۔ ان الم ناک معاملات کے ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ افغانستان اور پھر عراق پر حیلے بہانے سے امریکا اور اس کے اتحادیوں کی فوج کشی نے دنیا بھر کے انصاف پسند اور انسان دوست لوگوں کو ایک برادری میں بدل دیا۔

آج ۲۱ جنوری کو ہندوستان کے ساحلی شہر بمبئی میں مشترک انسانی مسائل و معاملات پر ہونے والا ورلڈ سوشل فورم اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے، یہ فورم اسی عالمی برادری کا ایک مظہر ہے۔ اس فورم کا ایک حصہ پاکستان سوشل فورم بھی ہے جس کے سینکڑوں اراکین نے بمبئی میں ہونے والے اس اجلاس میں شرکت کی۔ پاکستان سوشل فورم سے تعلق کی بنا پر مجھے بھی بمبئی کے اس اجلاس میں شرکت کرنا تھی لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر بمبئی کا سفر کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے میں بمبئی کی اس ہنگامہ خیز کانفرنس میں شریک نہ ہو سکی۔ اس کے قلق کے ساتھ ہی اس بات کی خوشی ہے کہ اس بین الاقوامی کانفرنس میں پاکستانیوں اور بہ طور خاص سندھ کے مندوبین کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس اجلاس کی ابھی تک جو خبریں اور تصویریں آئی ہیں وہ بہت حوصلہ افزا ہیں۔

ورلڈ سوشل فورم اس وقت وجود میں آیا تھا جب ڈیوس میں ورلڈ اکنامک فورم کا اجلاس ہوا، اس میں ترقی یافتہ ملکوں کی حکومتوں اور دنیا کی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے علاوہ آئی ایم ایف، ورلڈ

بنک اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے اعلیٰ اہل کاروں نے شرکت کی تھی۔ یہاں یہ عرض کرتی چلوں کہ یہ تینوں ادارے مغربی حکومتوں اور مغربی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے 'پیدل سپاہی' کہے جاتے ہیں۔ اس ورلڈ اکنامک فورم کے عزائم کا راستہ روکنے کے لیے کچھ دانش وروں، ادیبوں، صحافیوں، مزدور رہنماؤں اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے ورلڈ سوشل فورم قائم کیا اور یہ اعلان کیا کہ اس میں دنیا کے وہ باشندے جو 'ایک دوسری دنیا' تعمیر کرنے کے حق میں ہیں، اس فورم میں شامل ہوسکتے ہیں اور اپنے خیالات کا آزادانہ اظہار کرسکتے ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں ورلڈ سوشل فورم کا پہلا اجلاس ہوا۔ ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۳ء میں اس کی سالانہ کانفرنسیں عالمگیریت مخالف جذبات کے اظہار کا ایک موثر اور طاقتور ذریعہ بن گئیں۔ ان کانفرنسوں کے شرکاء نے افغانستان کے نہتے شہریوں پر امریکی لشکر کشی اور اس کے بعد عراق پر غاصبانہ قبضے کے خلاف امریکا اور اس کے اتحادیوں کو 'مشکل وقت' دکھایا۔ نئے سوالات اٹھائے اور 'انصاف' اور 'دہشت گردی' جیسے معاملات کے بارے میں کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ورلڈ سوشل فورم کے بطن سے ایشیائی سوشل فورم نے جنم لیا، حیدرآباد دکن اور بھوپال میں اس کے اجلاس ہوئے، بھوپال اعلان نامہ جاری کیا گیا اور اس میں یہ طے ہوا کہ اس تنظیم کا چوتھا اجلاس بمبئی میں ہوگا۔

بمبئی...... جہازیوں کی بغاوت اور پُرشور مزدور تحریکوں کا شہر ہے۔ یہاں جوش ملیح آبادی، ساحرلدھیانوی، مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور دوسرے متعدد اہم شاعروں نے انقلابی شاعری کی ہے۔ اس شہر میں لتا منگیشکر رہتی ہیں۔ سہراب مودی، پرتھوی راج، راج کپور اور سنیل دت نے اس شہر کو ایک پہچان دی ہے۔ یہ ایک زندہ، متحرک اور دھڑکتا ہوا شہر ہے۔ میں نے ۱۹۷۶ء میں اس شہر کو دیکھا ہے۔ چند دن قرۃ العین حیدر کی مہمان رہی ہوں، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سلمیٰ صدیقی اور مرحوم اعجاز صدیقی کی مہمان نوازی کا مجھے اعزاز حاصل رہا ہے۔

اس شہر میں ساری دنیا کے ۱۳۰ ملکوں سے لگ بھگ ایک لاکھ لوگ آئے اور انہوں نے دنیا کی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں اور اقتصادی اداروں کے خلاف بین الاقوامی محاذ قائم کرنے کا اعلان کیا۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں نے امریکی صدر بش کو عالمی امن کے لیے خطرہ قرار دیا اور یہ کہا کہ امریکی صدر نے اپنی پسندیدہ تجارتی کمپنیوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے امریکی قوانین میں تبدیلیاں کی ہیں۔ اس کانفرنس کے شرکاء میں سے ایک سابق امریکی اٹارنی جنرل رمزے کلارک

بھی تھے۔انہوں نے عراق پر اپنے ملک کے حملے کو دہشت گردی قرار دیا اور کہا کہ اگر ہمیں دنیا کو بچانا ہے تو صدر بش کو اقتدار سے ہٹانا ہوگا۔اس کانفرنس میں ایک ہزار سے زیادہ امریکی شہریوں نے بھی شرکت کی اور اپنی حکومت کی جنگ جوئی اور جارحانہ حکمت عملی کی مخالفت کی۔ایک لاکھ افراد پر مشتمل اس عظیم الشان کانفرنس کا اہتمام ہندوستان کی متعدد ٹریڈ یونینوں نے مشترک طور پر کیا تھا۔

اس فورم میں ارون دھتی رائے بھی شریک تھیں۔وہ اپنی جرأت اظہار اور بے باکی کے لیے کیا ہندوستان اور کیا پاکستان، ساری دنیا میں مشہور ہیں۔بمبئی میں ہونے والے ورلڈ سوشل کے چوتھے اجلاس میں بھی ارون دھتی رائے نے باغیانہ شان کے ساتھ تقریر کی۔ان کا کہنا تھا کہ امریکی صدر کا حشر بھی سابق عراقی صدر صدام حسین جیسا ہونا چاہیے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ عراق کی تعمیر نو کے نام پر بڑے بڑے ٹھیکے لینے والے امریکی سرمایہ دار عراق کے نئے آقا بن بیٹھے ہیں، اس ملک پر قبضہ کرنے والوں کے ساتھ ان کمپنیوں اور ان کے مالک سرمایہ داروں کے خلاف تحریک بھی ضروری ہوگئی ہے۔انہوں نے یقین ظاہر کیا کہ دنیا بھر کے تمام انسان دوست متحد ہوکر ان امریکی کمپنیوں کو بند کرانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔انہوں نے کہا کہ امریکی کمپنی بیچ ٹیل کو عراق کے لیے اربوں ڈالر کے ٹھیکے دیے گئے ہیں۔اس کمپنی کے ایک ڈائریکٹر جارج شلٹز نے جو امریکا کے وزیر خارجہ رہ چکے ہیں صدر بش کو عراق پر حملے کا مشورہ دیا تھا۔ارون دھتی رائے نے کہا کہ عالمگیریت کے خلاف جدوجہد کو زیادہ جارحانہ ہونا چاہیے اور امریکا کے تمام حامیوں بالخصوص جنگ عراق سے کثیر مالی فوائد حاصل کرنے والے تجارتی اداروں کو بند کرانے کے لیے پُر جوش تحریک چلانی چاہیے۔صدام حسین کے ساتھ کیا سلوک کیا جانا چاہیے؟اس بارے میں ارون دھتی رائے نے صرف اس کانفرنس میں ہی نہیں، چند مہینوں پہلے اینتھنی آرنو کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی کہا تھا کہ یہ سوال دوزُخا ہے۔اس کی بجائے یہ پوچھیں کہ ہم جارج بش اور ٹونی بلیئر کا کیا کریں؟ کیا ہم بس کھڑے دیکھتے رہیں جب کہ وہ بمباری کرتے رہیں، لوگوں کو ہلاک کرتے رہیں، نیست و نابود کرتے رہیں؟ ماضی میں امریکا اور برطانیہ کی حکومتوں نے صدام حسین کی بدترین زیادتیوں کی حمایت کی ہے۔اس وقت اگر آپ نے پابندیاں اٹھالی ہوتیں تو عراقی معاشرے میں شاید اتنی قوت آ گئی ہوتی کہ وہ اپنے آمر کو اتار پھینکنے، اور اگر استحصال، فرقہ واریت

اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر ہمیں اس قدر تشویش ہے تو پھر ہم اپنی توجہ کیوں نہ ان ملکوں کی جانب بھی کریں جن میں کولمبیا، ترکی، سعودی عرب، مصر، وسطی ایشیا کے ممالک، اسرائیل، روس، چین، ہندوستان، پاکستان، برما اور ظاہر ہے کہ امریکا بھی شامل ہے۔ آج دنیا کے لیے سب سے بڑا خطرہ صدام حسین نہیں، جارج بش ہیں، جن کے ساتھ ان کے 'نئے وزیر خارجہ' ٹونی بلیئر شانے سے شانہ ملا کے کھڑے ہیں۔ امریکی صدر بش یہ کہتے ہیں کہ یہ جنگ 'دفاعی' ہے اور عراق پر حملہ نہ کرنا 'خودکشی' کے مترادف ہوگا۔ یہ بات بالکل اسی طرح کی ہے جیسے ایک ہاتھی دور سے دوڑتا ہوا آئے کہ اسے ایک چیونٹی کو کچل کر ہلاک کرنا ہے...... اور پھر ہاتھی یہ کہے کہ ایسا اس نے اپنے 'دفاع' میں کیا تھا، اور یہ کہ چیونٹی کو زندہ چھوڑ دینا خودکشی کے مترادف ہوتا۔

اپنے اس انٹرویو میں اروندھتی رائے نے ویتنام کی جنگ کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب امریکا نے جنوبی ویت نام پر حملہ کیا تھا اور دیہاتوں پر بمباری کی تھی تو ہزاروں لوگ مر گئے تھے اور ہزاروں اس پر مجبور ہو گئے تھے کہ شہروں کی طرف بھاگ کر آئیں اور خیمہ بستیوں میں پناہ گزین ہو جائیں، اس وقت سیموئیل ہنٹنگٹن نے اس کو 'شہری آبادی میں اضافے' (Urbanization) کا عمل قرار دیا تھا۔ ان سے سوال کیا گیا کہ بعض امریکی اخبارات کا خیال ہے کہ دنیا کو 'نئی امریکی سلطنت' کا عادی ہو جانا چاہیے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ اروندھتی رائے نے اس سوال کا جواب تلخی سے دیتے ہوئے کہا تھا کہ کوئی بھی اس امریکی سلطنت یا سامراج کا عادی نہیں ہو جائے گا...... کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ یہ سامراج اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب تک وہ اپنی قوت کو مستحکم رکھ سکتا ہے جب تک وہ قتل عام اور بے دخلی کے منشور پر عمل درآمد کرتا رہے۔ یہ چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ لوگ ان کے عادی ہو جائیں، چاہے امریکا جتنی بھی کوشش کر کے دیکھ لے۔ آپ یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ آپ کو مار دیا جائے گا مگر آپ اس 'نئی سلطنت' کے تصور کے عادی نہیں ہو سکتے۔ امریکی بالادستی کو قائم رکھنے اور جاری رکھنے کی یہ جنگ خوں ریز ہوگی۔ دنیا ساکت نہیں ہے۔ امریکی سامراج کا سفر اتنا آسان نہیں ہوگا۔ دنیا کے لوگ سڑکوں پر بھیڑ لگا کر شہنشاہ سلامت پر گلاب کے پھول نچھاور کرنے کے لیے نہیں کھڑے ہوں گے۔

آرنوو نے ان سے پوچھا تھا کہ ۱۵ر فروری ۲۰۰۳ء کو دنیا بھر میں ایک کروڑ سے زیادہ لوگوں

نے جنگ مخالف مظاہرے کیے، جن میں ان ملکوں کے لاکھوں عوام بھی شامل ہیں جو عراق کے خلاف اس جنگ میں پیش پیش ہیں۔ آپ کے خیال میں اتنے بڑے مظاہرے کیوں دیکھنے میں آئے ہیں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ارون دھتی رائے نے کہا تھا کہ میرے خیال میں اس کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ امریکا کے چہرے پر سے نقاب اتر گیا ہے۔ خون آشام مداخلت اور ناقابلِ معافی ریشہ دوانیوں کی خفیہ تاریخ اب گلی محلوں کی گفتگو بن گئی ہے۔ نقطے جوڑ لیے گئے ہیں اور درندے کا خاکہ ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔

۱۵رفروری ۲۰۰۳ء کو دیے جانے والے اس انٹرویو کے گیارہ مہینے بعد ۱۶رجنوری ۲۰۰۴ء کو ارون دھتی رائے نے بمبئی کے ورلڈ سوشل فورم میں بھی اپنے جذبات کا اظہار اسی شدت سے کیا۔ انہیں اور دنیا کے بعض دوسرے اہم شہریوں کو نہ سن سکنے کا قلق ہے، لیکن میرے لیے یہ خیال بھی ولولہ خیز ہے کہ میرے شہر سے چند سو میل کے فاصلے پر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور بمبئی جس کے اور میرے شہر کراچی کے درمیان بحیرہ عرب مشترک ہے، اسی شہر میں ایک لاکھ افراد امریکی سامراج اور دنیا بھر میں ہونے والے ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے سڑکوں پر چل رہے تھے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۲۵ جنوری ۲۰۰۴ء

موت کا کلوز اپ

سویڈن کے شہر اسٹاک ہوم میں ۲۶ جنوری ۲۰۰۴ء کو ایک کانفرنس کا آغاز ہوا جس کی صدارت اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کوفی عنان نے کی اور اس کانفرنس کا اختتام اس وقت ہو رہا ہے جب یہ سطریں لکھی جارہی ہیں۔ گزشتہ پچاس برس میں نسل کشی کے موضوع پر یہ پہلی بین الاقوامی کانفرنس تھی جو منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کوفی عنان نے کہا کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں یوگوسلاویہ اور روانڈا میں جس بھیانک پیمانے پر نسل کشی ہوئی، اسے روکا جاسکتا تھا اگر بین الاقوامی برادری اس قتل عام کی خاموش تماشائی نہ بنی رہتی اور اس نے بروقت اقدام کیا ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ 'نسل کشی کو روکنے اور اس کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اقدامات کرنا بین الاقوامی برادری کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ انہوں نے یوگوسلاویہ کی تقسیم کے موقعہ پر ہونے والی بھیانک خونیں نسل کشی کو عالمی ضمیر کے لیے 'شرم ناک ترین' قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ ۱۹۹۴ء میں روانڈا کے اندر دس لاکھ سے زیادہ ہوتو اور تستی قبائل کے لوگ 'نسلی صفائی' کے دوران قتل کیے گئے۔ اس وقت وہاں اقوام متحدہ کی امن فوج موجود تھی لیکن بجائے اس کے کہ ہم اس فوج کی تعداد میں اضافہ کرتے اور اسے اس قتل عام کو روکنے کے لیے استعمال کرتے، ہم نے جائے وقوعہ سے امن فوج واپس بلالی۔ یہی کچھ ہم نے یوگوسلاویہ کے علاقے سربیرینکا میں کیا جہاں سات ہزار مسلمان مرد اور لڑکے 'نسلی صفائی' کے ایک منصوبے کے تحت قتل کیے گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ سب سے بڑا قتل عام تھا جو یورپ کی سرزمین پر ہوا۔

اس بین الاقوامی کانفرنس میں یوں تو متعدد ملکوں نے شرکت کی لیکن یورپ سے صرف سویڈن کے وزیر اعظم اس میں شریک ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ

ہم اس بات کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ نسل کشی کے ایسے سنگین واقعات نہیں ہوں گے۔ سویڈن کے وزیراعظم اور کانفرنس کے بعض دوسرے شرکاء کا کہنا تھا کہ مستقبل میں نسل کشی کے ایسے ہولناک واقعات کو ہم صرف اسی صورت میں ظہور پذیر ہونے سے روک سکتے ہیں جب بین الاقوامی سطح پر قوموں کے درمیان اس سلسلے میں شعور اجاگر کیا جائے اور نسل کشی، قتل عام اور نسلی صفائی میں ملوث افراد کو اس بات کا یقین ہو کہ ان کے قابل نفرت جرائم پر انہیں معاف نہیں کیا جائے گا اور انہیں بھیانک سزاؤں کا سامنا کرنا ہوگا۔

۹۰ء کی دہائی کے دوران روانڈا اور یوگوسلاویہ میں جو کچھ ہوا یا اس سے پہلے برصغیر کی تقسیم کے وقت مذہبی بنیادوں پر دونوں طرف کے لوگوں نے جو قتل عام کیا، سابق مشرقی پاکستان اور پچھلے دنوں ہندوستان کے گجرات اور دنیا کے دوسرے خطوں میں انسان نے انسان پر جو ظلم کیے وہ ناقابل یقین ہیں۔

میں روانڈا اور یوگوسلاویہ کے علاقے سریبرینکا میں ہونے والی نسل کشی کے بارے میں ۹۰ء کی دہائی کے دوران کئی مرتبہ لکھ چکی ہوں۔ آج جب نسل کشی کے خلاف ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کی تفصیلات نگاہ سے گزریں تو اپنی ایک پرانی تحریر یاد آئی جو آج کے کالم میں آپ کی نذر ہے:

میں نے لکھا تھا کہ 'اس عمارت کے دروازے قبضوں سے جھول رہے ہیں' کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے ہیں اور دیواریں چھلنی ہیں۔ یہ ایک اسکول کی عمارت ہے، ایک ایسی عمارت جو شہر کا محاصرہ کرنے والوں کی زد میں ہے اور جو موسم سرما ختم ہونے کے بعد چند ہفتوں پہلے کھلی ہے۔ اس عمارت میں آنے والے بچوں میں سے ۹۰ فیصد نے اپنے قریبی رشتہ داروں کی موت دیکھی ہے، یہاں پڑھنے والے بیشتر بچے، ماں اور باپ یا دونوں میں سے کسی ایک رشتے سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان ننھے بچوں کو ان کی زبان کے ابتدائی حروف سکھائے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی تربیت بھی دی جا رہی ہے کہ پہلی گولی کی آواز سنتے ہی وہ فوراً زمین پر لیٹ جائیں اور کسی چیز کی آڑ لینے کی کوشش کریں پھر اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہلیں جب تک گولیوں کی آواز بند نہ ہو جائے۔ یہ بچے بوسنیائی دارالحکومت سرائیوو کے بچے ہیں۔

بوسنیا...... مغربی حکومتوں کی منافقتوں اور ان کے جھوٹے وعدوں کا مدفن۔ بوسنیا...... مسلم

اُمّہ کی بے حسی کا شاہکار۔ سرائیوو...... ایک جہنم یا بلغراد سے شائع ہونے والے ایک کثیر الاشاعت اخبار کی رپورٹر ناتکا بوتورووچ کے بقول جہنم کا آخری حلقہ۔ آج تک بننے والا سب سے بڑا اجتماعی کیمپ جہاں لوگوں اور عمارتوں کو ایک ہی طرح سے توڑا مروڑا جا تا رہا ہے۔ پیٹ بھر کھانے اور پانی کے بغیر، روشنی اور گرمی کے بغیر، اپنے پیاروں کی خیر خبر سے محروم، بیماروں اور زخمیوں کے لیے پریشان، مرنے والوں کے لیے سوگوار، سرائیوو کے باسی محض اپنی بقا کے جذبے کے سہارے جی رہے ہیں۔

سرائیوو کے بارے میں جہاں ایک طرف مغرب کی حکومتوں کی شرمناک لاتعلقی ہے وہیں مختلف مغربی ملکوں سے تعلق رکھنے والے صحافیوں، ادیبوں، موسیقاروں اور اداکاروں کی دلیری اور باضمیری ہے جس کے سبب انہوں نے سرائیوو کا مقدمہ انصاف اور ایمانداری سے ساری دنیا کے سامنے پیش کیا اور جنہوں نے سارے عالم کو یہ بتایا کہ حقوق انسانی اور جمہوریت کے بلند آہنگ دعوے کرنے والے ان کے حکمران کیسے بالشتیے اور بھنگے ہیں۔

گزشتہ ڈیڑھ برس کے دوران سرائیوو کے محصور شہریوں سے یک جہتی کے اظہار کے طور پر کئی موسیقاروں اور اداکاروں نے اپنے پروگرام اس جنگ زدہ شہر کی کھنڈر عمارتوں میں پیش کیے۔ ان ہی میں سے ایک مغربی موسیقار مارک پونتھس ہے۔ وہ اپنا کنسرٹ پیش کرنے پیرس سے سرائیوو گیا اور جب واپس فرانس پہنچا تو اس نے لکھا کہ پہاڑیوں نے شہر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ان کا حلقہ متواتر تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ پہاڑیاں موت اگلتے ہوئے بڑے بڑے جبڑوں کی طرح ہیں۔ یہ جہنم کے جبڑے ہیں۔ دو برس تک باہر نکلنے کے کسی راستے سے محروم شہر میں رہنا ایک ایسی بات ہے جس کا تصور کرنا بھی دشوار ہے۔ گلیوں میں جو چند کتے دکھائی دیتے ہیں وہ بھی مسلسل فائرنگ سے سہمے ہوئے ہیں۔ یہ شہر، ویت نام کے شہر ڈئین بیئن پھو کی تکرار ہے، اس سے ۱۰۰ ار گنا زیادہ شدید۔

'مارک پونتھس نے سرائیوو میں پیش آنے والے ایک واقعے کو ٹی وی پر دیکھا جس میں اس تباہ شدہ شہر کی ایک جھلک تھی اور اس سائیکل سوار سات سالہ بچے کی لاش تھی جسے پہاڑی سے آنے والی کسی آوارہ گولی نے خاک میں سلا دیا تھا۔ اس واقعے کی فلم دیکھ کر اس نے پرنم آنکھیں خشک کیں اور مغرب کے حکمرانوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا: 'مسٹر کلنٹن! مسٹر متراں! مسٹر میجر!

آپ کے ہاتھ اس ننھے لڑکے کے خون سے آلودہ ہیں۔ آپ اس بچے کی طرف نہیں بلکہ اس کے قاتل کے ساتھ ہیں۔ آپ ہی نہیں، میں بھی۔ ہم سب اس گولی چلانے والے کے پہلو میں بیٹھے ہیں اور کچھ نہ کرتے ہوئے یا ضرورت سے کم کوشش کرتے ہوئے، یا غلط قدم اٹھاتے ہوئے، ہم اس شخص کو تسلی دے رہے ہیں کہ اس ننھے لڑکے کو مار ڈالنا کوئی ایسی بری بات نہیں ہے۔ آپ کو اور مجھے اپنے اس فعل کے لیے جواب دینا پڑے گا۔ اس بچے کے خون نے پوری دنیا کو ڈھاپ لیا ہے۔ ہم سب کو یہ سوچنا اچھا لگتا ہے کہ ہم مظلوم کی طرف ہیں لیکن اپنی بے عملی سے، اپنے غلط اقدامات سے، اپنی کوتاہی سے، اپنی بزدلی سے، اپنے تسلیم ورضا سے، اپنے ذہنی بگاڑ سے ہم سب اس جرم میں شریک ہوگئے ہیں۔ ہم سب کی انگلیاں اس بندوق کی لبلبلی پر ہیں اور پھر ہم اپنے ضمیر کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں، ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا دل خون ہوا جا رہا ہے۔ ہم یہاں تک تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہمارا ضمیر ہمیں کچوکے دے رہا ہے اور امید کرتے ہیں کہ اس بات کو تسلیم کر لینے سے ہمیں نجات مل جائے گی۔'

'بوسنیا میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے اسے 'موت کا کلوز اپ' کہیے۔ اسی کلوز اپ میں ہم نے سوروں اور کتوں کو دیکھا جو سر کٹی لاشیں کھا رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ نوکیلے ہتھیار سے آنکھیں اپنے حلقوں سے نکال کر پھینک دی گئی ہیں۔ ہم نے انسانی بدن کے بکھرے ہوئے ٹکڑے دیکھے جو اب کسی بھی جسم کی کسی بھی چیز سے متعلق نہیں ہیں۔ ادھ کھائی کھوپڑیاں، بے ٹانگوں کے بچے اور ہم نے شیر خوار دیکھے جنہیں چھپ کر بیٹھے ہوئے کسی رائفل بردار نے گولی مار دی تھی اور ہم نے زنا بالجبر کی شکار بارہ سالہ بچی دیکھی جو کیمرے کے سامنے بیٹھی اپنی روداد سنا رہی تھی۔'

موت کے اس کلوز اپ کی تفصیل بتاتے ہوئے ایک کروٹ صحافی اور ادیب سلاوینکا درا کولیچ نے لکھا: 'مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا لیکن نظر جو آ رہا ہے، وہی ہے۔ اب ہم ایک سفید چادر دیکھ رہے ہیں جس پر سرخ دھبے پڑے ہیں۔ ہم پہلے ہی اسے ممنوع قرار دے چکے ہیں۔ سفید پر سرخ، یہ علامت موت کی ہے۔ خدایا! اس کا خون کتنا چمک دار ہے۔ میرا پورا وجود چیختا رہتا ہے۔ بس، بس، بس کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ کیمرا اس چادر میں داخل ہو جس سے اس کا چھوٹا سا بدن ڈھکا ہوا ہے۔ شہر میں اسّی ہزار بچے محبوس ہیں...... گویا سرائیوو دنیا میں بچوں کا سب سے بڑا قید خانہ ہے۔ ان میں سے پانچ ہزار بچے مار دیے گئے یا مر گئے۔ باقی بھوک اور سست رفتاری سے

اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت کے منتظر ہیں۔'

وہ صحافی، ادیب، اداکار، موسیقار، مصور اور فوٹوگرافر...... جنہوں نے جنگ زدہ سرائیوو میں وقت گزارا، اجنہوں نے حسن و جمال کو، امن و آشتی کو، معصومیت اور محبت کو اپنی آنکھوں سے مرتے ہوئے دیکھا۔ ان کی تحریریں، ان کی بنائی ہوئی تصویریں، ان کے کھینچے ہوئے فوٹوگراف، بیسویں صدی کی آخری دہائی میں مغرب و مشرق کے حکمرانوں کی اجتماعی بے ضمیری اور شقاوت کی ایسی دہشت زدہ کر دینے والی ناقابلِ یقین کہانی سناتے ہیں جسے سچ ماننے کا جی نہیں چاہتا۔ جی چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک ڈراؤنا خواب ہو جس سے آنکھ کھلے تو معلوم ہو کہ سرائیوو سلامت ہے۔ اس کے بچے ہنس رہے ہیں، اس کے باغوں میں پرندے چہک رہے ہیں، اس کے گھروں سے اشتہا انگیز کھانوں کی لپٹیں آ رہی ہیں، اس کے تھیٹر بھرے ہوئے ہیں اور اس کے نوجوان ایک دوسرے کو اپنی اپنی محبتوں کی کہانیاں سناتے ہیں۔

'خواہشیں، حقیقتوں کو بدل نہیں سکتیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم نے اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے ایک خوبصورت خطے کو اور ایک بھرے پرے شہر کو مرتے ہوئے دیکھا ہے اور پھر بھی ہم نے اس شہر کے لیے، وہاں رہنے والوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ ہمارے اجتماعی ضمیر اندھے، گونگے اور بہرے ہیں۔ ہم مغربی صحافیوں اور ادیبوں کی دردناک تحریریں پڑھتے ہیں، ان پر آنسو بہا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتے ہیں اور ربِّ ذوالجلال کے حضور سجدۂ شکر بجالاتے ہیں جس نے ہمیں سرائیوو میں پیدا نہیں کیا۔'

اپنی یہ تحریر مجھے اس وقت بے اختیار یاد آئی جب میں نسل کشی پر ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کی روداد پڑھ رہی تھی۔ میں نے خواہش کی کہ ڈھاکہ، نواکھالی، چٹا گانگ سرائیوو اور روانڈا کی اور ہندوستان کے گجرات کی کہانی دنیا میں کہیں بھی دہرائی نہ جائے۔ ایک سوچنے، محسوس کرنے اور لکھنے والے کے طور پر میں بس یہی آرزو کرسکتی ہوں۔

'اردو نیوز'، جدّہ

۲۹ جنوری ۲۰۰۴ء

دونوں کے ہاتھوں میں ایک ہی ہتھیار

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے دن ٹریڈ ٹاورز کے المناک سانحے کے بعد امریکی صدر جارج بش نے دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا اعلان کردیا۔ اس جنگ کی آڑ میں انہوں نے پہلے افغانستان پر حملہ کیا، اس کے بعد عراق نشانہ بنا اور اب بھی وہ مختلف ریاستوں کا نام لے کران کا 'دماغ درست کردینے' کا ارادہ ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

دنیا کی متعدد تنظیمیں 'دہشت گرد' قرار دی جا چکی ہیں، ان پر پابندیاں عائد ہو چکی ہیں، ان کے اثاثے ضبط ہو چکے ہیں۔ ان تنظیموں کو کچلنے والے حکمرانوں کو مسلسل شاباش اور امداد دی جارہی ہے۔ یہ کہا جارہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں وہ ہمارے قابل اعتماد حلیف ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ القاعدہ اور دیگر مبینہ دہشت گرد تنظیموں کی سرگرمیاں ماند پڑ جائیں، لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انتہاپسندی میں کمی آنے کی بجائے زیادتی ہوئی ہے۔ اس وقت دنیا کے مختلف علاقوں میں جس بڑے پیمانے پر خودکش حملے ہورہے ہیں، انہیں مغربی دنیا میں دہشت گردی سے تعبیر کیا جارہا ہے، بعض مسلمان حلقے بھی اس نوعیت کی کارروائیوں کو غیر اسلامی اور غیر انسانی قرار دیتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر ان کا بھی ہے جو عالمی سطح پر اپنوں اور غیروں کی ناانصافی، جبر اور فلاکت کا شکار ہیں۔ یہ حلقے اس نوعیت کے حملوں کو جنگ آزادی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ظلم اور جبر کے خلاف آواز بلند نہ کرنا اور ہتھیار نہ اٹھانا بھی ظالموں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف ہے۔

ان دنوں افغانستان اور پاکستان کی سرحدوں پر مبینہ دہشت گردوں کے خلاف بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی ہوئی ہے۔ اس کارروائی میں ۲۰۰ پاکستانی کمانڈو اور ۳۵/افسران شامل

تھے۔ یہ لوگ میانوالی ایئربیس سے ۷۲ کو برا ہیلی کاپٹروں کے ذریعے شمالی وزیرستان کے علاقے وانا میں اترے اور انہوں نے غیر ملکیوں کے خلاف بمباری بھی کی۔ پاکستانی ذرائع کا کہنا ہے کہ جو لوگ اس علاقے سے گرفتار ہوئے یا جن کی تلاش کی گئی وہ دہشت گردی کے مختلف واقعات میں مطلوب تھے۔

ادھر وزیرستان کے علاقے میں یہ کارروائی ہورہی تھی اور امریکی صدر اس پر جنرل پرویز مشرف کو مبارکباد اور شاباش دے رہے تھے، ادھر اسامہ بن لادن کے نائب ایمن الظواہری کا ٹیپ کیا ہوا بیان الجزیرہ ٹیلی وژن سے سنایا جارہا تھا۔ اس بیان میں انہوں نے کہا کہ ہم امریکا کے خلاف حملوں کا نیا سلسلہ شروع کرنے والے ہیں۔ اپنے اس پیغام میں انہوں نے امریکی صدر کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ملک کی سیکورٹی میں اضافہ کردیں کیونکہ القاعدہ امریکی شہروں پر گیارہ ستمبر جیسے حملے کرنے والی ہے۔ تیسری طرف یہ خبریں بھی گرم ہیں کہ امریکی اور اسرائیلی مفادات پر حملہ کرنے والے نہایت مستعدی سے بلیک مارکیٹ میں چھوٹے ایٹمی ہتھیار حاصل کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔ تاکہ بعض امریکی شہروں یا امریکی فوجی ٹھکانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکیں۔

ٹریڈ ٹاورز کی تباہی ہو یا دہشت گردی کے دوسرے واقعات، ان میں سے بیشتر عام اور بے گناہ شہریوں کی ہلاکت اور ان کی املاک کی تباہی کا سبب بنے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے بہت سے لوگ جو خود بھی کسی مظلوم گروہ سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کے سرگرم ہمدرد اور حمایتی ہیں وہ بھی یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والوں کو اس بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر نہیں کرنا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ دہشت گردی کے واقعات مظلوموں کو انصاف دلانے کی بجائے ان پر ظلم و ستم میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ غیر ملکی عناصر اپنے مفادات کی خاطر ان پر مسلط کیے جانے والے ڈکٹیٹروں کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں اور جس ملک یا علاقے سے ناانصافی پر مبنی کسی نظام کا خاتمہ عوامی جدوجہد کے ذریعے جمہوری انداز میں کیا جاسکتا تھا، وہاں اس کے خاتمے میں پچیس اور پچاس برس لگ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لوگ الجزائر، مصر اور لاطینی امریکا کے مختلف ملکوں کی مثالیں دیتے ہیں۔

دہشت گردی کی تاریخ اور دہشت گردی کیا ہے، کے موضوع پر ایک امریکی پروفیسر مارک لیوائن کی تحریر بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق 'دہشت گردی' یا 'دہشت گرد' کے لفظ

کو پہلی بار اس 'عہد دہشت' کے لیے استعمال کیا گیا تھا جسے (مارچ ۱۷۹۳ء سے جولائی ۱۷۹۴ء) فرانسیسی حکومت نے برپا کیا تھا۔ حکومت مخالف سرگرمیوں کے اظہار کے لیے 'دہشت گرد' کا لفظ ۱۸۶۶ء میں آئرلینڈ اور ۱۸۸۳ء میں روس کے حوالے سے تحریری شکل میں سامنے آیا۔ انسانوں کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ انہوں نے اپنے پڑوسیوں میں خوف پیدا کرنے اور ان کے رویوں میں تبدیلی لانے کی خاطر انہیں ہمیشہ دہشت زدہ کیا ہے۔ چین کے استعماری عہد کی ابتدا میں پہلے چینی جنرل اور عسکری حکمت عملی کے نظریات کے بانی تائی کنگ نے 'شہری جارحیت کے پھیلاؤ' کے بارے میں کہا تھا کہ اس کا مقصد اختلاف و افتراق کے بیج بونا، عوام کے حوصلے پست کرنا اور حکومت کو ناکارہ بنانا ہے۔ جدید زمانے میں تمام باضابطہ فوجوں نے 'بے ضابطہ افراد' کو اس لیے بھرتی کیا ہے کہ وہ ان کے لیے گندے کام کریں۔ قزاقوں، طالع آزما افراد اور کرائے کے سپاہیوں کو اسی کام کے لیے استعمال کیا جاتا تھا کہ وہ خود دیہاتوں اور شہروں میں گھروں کے اندر گھس کر لوٹ مار اور بدکرداری کریں اور اپنے آقاؤں کے افعال پر پردہ ڈالے رکھیں۔ (یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ روس کے مسلمان علاقوں کی سرکوبی کے لیے آئیون اول نے جن قزاقوں کو استعمال کیا تھا انہیں کو بعد میں اسے زیر بھی کرنا پڑا اور آج امریکا ان مسلمان گروہوں اور افراد کو زیر کرنے پر مجبور ہے جنہیں اس نے روس کو مغلوب کرنے کے لیے استعمال کیا تھا)۔ آج دہشت گردی کو جدید قومی ریاست کے سیاق و سباق میں دیکھنا ضروری ہے۔ دراصل غیر جمہوری ریاستوں کے عروج کا سبب یہ ہوا کہ دہشت گردی کو تباہ نہ کیا جاسکا اور ڈکٹیٹروں نے دہشت گردوں کو عوام میں بے چینی پیدا کرنے اور حکومت پر سے اعتماد اٹھانے کے لیے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرنے پر مجبور کیا۔

مارک لیوائن کا کہنا ہے کہ 'دہشت گردی' کی اصطلاح کی کوئی عالمی طور پر متفقہ تعریف نہیں ہے مگر اس میں بار بار دہرائے جانے والے چند موضوعات ہیں، جن میں مندرجہ ذیل شامل ہیں: تشدد جو سیاسی یا سماجی مقصد کے تحت ہو، خوف زدہ کرنے کی کوشش ہو اور اس عمل کا رخ شہریوں اور دوسرے ایسے لوگوں کی طرف کر دیا جائے جو لڑائی میں شریک نہیں ہیں۔ دہشت گردی سیدھے سادے تشدد سے بڑھ کر ہے، جس میں صرف دو فریقین کی ضرورت ہوتی ہے، ایک جارحیت کرنے والا یا جارح اور دوسرا اس کا شکار۔ دہشت گردی کے لیے ایک تیسرے فریق کی بھی

ضرورت پڑتی ہے جو ان تمام واقعات سے مرعوب یا خوف زدہ ہو جائے جو جارحیت کے شکار کے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔

عام طور پر دہشت گردی قرار دیے جانے والے واقعات پر بین الاقوامی انسان دوست قوانین International Humanitarian Law کے تحت پابندی عائد ہے۔ ان قوانین میں ۱۹۴۹ء کا چوتھا جنیوا کنونشن اور ۱۹۷۷ء کے دو اضافی پروٹوکول شامل ہیں۔ ان کے تحت بین الاقوامی اور اندرونِ خانہ مسلح تصادم کے دوران دہشت گردی پر پابندی عائد ہے۔ حالانکہ 'دہشت گردی' کی اصطلاح سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ یہ (انفرادی سے زیادہ) گروہی اعمال ہیں اور ان گروہوں کی جانب سے ہیں جو ریاست کا حصہ نہیں۔ لیکن دہشت گردی کی کارروائی کا ایک اہم درجہ ان کارروائیوں پر مشتمل ہے جن پر عمل درآمد یا جن کی ہدایت و منصوبہ بندی، براہ راست یا بالواسطہ طور پر ریاست کی طرف سے کی گئی ہو۔ یا پھر ریاست نے اجازت دے دی ہو، چاہے اس ریاست کی اپنی فوج یا پولیس براہ راست ملوث نہ ہو، مگر یہ بعض قاتل دستوں کو تفویض کر دی گئی ہو۔

آئی ایچ ایل سے ہٹ کر بعض دوسرے معاہدوں میں بھی جرائم کے ان درجوں کو قائم کر دیا گیا ہے جنھیں عام طور پر دہشت گردی قرار دیا جاتا ہے اور جو مسلح تصادم کے سیاق و سباق سے باہر ہیں۔ ان معاہدوں میں ۱۹۷۹ء کا 'یرغمالی بنانے کے خلاف بین الاقوامی کنونشن' اور ہوائی جہازوں کے اغوا کے خلاف کئی کنونشن شامل ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ دہشت گردی ریاستی ہو یا کسی انتہا پسند اور تشدد گروہ کی جانب سے، دنیا بھر کا عام شہری اس وقت اس لفظ سے سہا ہوا ہے۔ دہشت گردی ایک عالمی وبا کی شکل اختیار کر گئی ہے اور دنیا بھر کے عام شہری اس کے سامنے بے بس ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں اور کہاں جائیں، اپنے بچوں کو کس خطے اور کس علاقے میں لے جائیں جہاں اس وبا کے اثرات پہنچے نہ ہوں۔

افسوس کہ اب دنیا میں ایسا کوئی خطہ نہیں رہا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انسانوں اور گروہوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا رہا اور اس پر کچھ لوگوں کو اتنا غصہ آ رہا ہے کہ وہ اس خوبصورت دنیا کو تہس نہس کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف امریکی صدر ہیں اور دوسری

طرف تشدد پر اترے ہوئے انتہا پسند۔ دونوں کے ہاتھوں میں ایک ہی ہتھیار ہے اور اس ہتھیار سے بے گناہ انسان شکار کیے جا رہے ہیں۔

'اردو نیوز'، جدّہ

۲۵ فروری ۲۰۰۴ء

خونِ ناحق کی دلدل

ہمیں اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ امریکیوں نے ۶۰ء کی دہائی میں ملنے والا سبق اتنی جلدی کیوں بھلا دیا۔ وہ یہ کیسے بھول گئے کہ پستہ قامت، منحنی اور نہتے ویتنامیوں نے اپنے خون کا وہ دریا بہایا تھا جس میں امریکی کبر ونخوت کا بیڑا ڈوب ہوگیا تھا۔ بیسویں صدی میں ویتنام سے امریکی اسی طرح پسپا ہوئے تھے جس طرح نپولین کی فوجیں روس کی سرزمین سے بہ ہزار دقت وخرابی لوٹ سکی تھیں۔ اور اب اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں دنیا کی عظیم ترین قوتِ قاہرہ، عراقیوں کے خونِ ناحق کی دلدل میں غرق ہورہی ہے۔

امریکی حکمرانوں کا حافظہ اتنا خراب کیوں ہے ہمیں نہیں معلوم؟ لیکن ان کے وہ شہری جنہوں نے ویتنام کی ایک دہائی سے زیادہ پر پھیلی ہوئی جنگ میں ہزارہا تابوت وصول کیے تھے، اب عراق سے آنے والے تابوتوں سے لرزاں وترساں ہیں۔ وہ اپنے ٹیلی وژن اسکرین پر دیکھ رہے ہیں کہ ہزاروں کی تعداد میں عراقی سڑکوں پر نکلے ہوئے ہیں اور پُرتشدد مظاہرے کررہے ہیں۔ چھاپہ مار کارروائیوں اور خودکش حملوں سے امریکی سپاہیوں اور ان کے اتحادیوں کو شکار کررہے ہیں، انہیں ہلاک کررہے ہیں، یرغمال بنارہے ہیں۔ یرغمال بنائے جانے والوں کے نام ٹیلی وژن پر نشر ہورہے ہیں اور ان کے رشتہ دار انگاروں پر چل رہے ہیں۔ ہلاک کیے جانے والوں کی لاشیں سڑکوں پر گھسیٹی جارہی ہیں، جلائی جارہی ہیں، یہ سوختہ لاشیں بلندی پر لٹکائی جارہی ہیں۔

یہ وہ عراق ہے جس کی 'فتح' کا اعلان صدرِ امریکا بہ نفسِ نفیس کرچکے تھے، جس کے بارے میں انہوں نے اپنے شہریوں کو بتایا تھا کہ وہاں امریکی فوجیوں کا استقبال ہورہا ہے، اس لیے کہ وہ

عراقی عوام کے نجات دہندہ بن کر آئے ہیں، انہوں نے عراقیوں کو ایک آمر جابر سے نجات دلائی ہے۔ انہیں پھولوں کے ہار پہنائے جا رہے ہیں، ان کی آمد کی خوشی میں مٹھائیاں بانٹی جا رہی ہیں۔

امریکی شہریوں کے ذہنوں میں اپنے صدر محترم کے یہ تمام دعوے زندہ ہیں اور آج امریکی شہری یہ دیکھنے پر مجبور ہیں کہ دنیا کی جس عظیم ترین فوجی اور اقتصادی طاقت پر وہ فخر کرتے ہیں، وہی طاقت طیش میں بھرے ہوئے عراقیوں کے سامنے بے بس ہے۔ ان کے وہ فوجی جو عراقیوں کو 'تحفظ' فراہم کرنے گئے تھے، وہی اب عراقیوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ عراقی جب چاہتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں انہیں ہلاک کر دیتے ہیں، ان کے فوجی قافلوں پر چھاپہ مار حملے کرتے ہیں، ان کی بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کو پیٹرول بم مار کر سوکھی ہوئی گھاس کی طرح جلا دیتے ہیں، ہیلی کاپٹروں کو اور طیاروں کو گولیوں سے گرا لیتے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھنے اور ششدر رہ جانے والے امریکی اٹھارویں صدی کے اپنے ان بزرگوں کو بھول گئے ہیں جنہوں نے ہتھیاروں کے بغیر اس عہد کی عظیم فوجی طاقت برطانیہ سے مقابلہ کیا تھا اور آخر کار اس عظیم طاقت کو پسپا کر کے اور آزادی حاصل کر کے ہی دم لیا تھا۔ امریکی صدر اور ان کے ساتھی یہ بھول گئے ہیں کہ ایک ایسی ہی خوفناک لڑائی ان کے آبا و اجداد نے بھی لڑی تھی اور بے سروسامانی کے باوجود جیت گئے تھے۔ شاید آہستہ آہستہ انہیں یاد آ جائے کہ آزادی کے لیے لڑنے والے خوف سے آزاد ہوتے ہیں، تب ہی جیت جاتے ہیں، جان کی انہیں پروا نہیں ہوتی، اسی لیے بڑی طاقتوں کو تہس نہس کر دینا ان کے لیے آسان ہوتا ہے۔

وہ امریکی شہری جو اسے عراق کی سرزمین پر 'آزادی اور جمہوریت' کے لیے لڑی جانے والی لڑائی سمجھ رہے تھے، وہ ششدر اور حیران ہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ دوسری طرف وہ امریکی ہیں جو اس ظالمانہ حملے کے شروع ہونے سے پہلے ہی اس کے مخالف تھے۔ یہی وہ امریکی تھے جو لاکھوں کی تعداد میں سڑکوں پر نکل آئے تھے اور انہوں نے اپنے صدر اور تمام اعلیٰ اہل کاروں کے خلاف نعرے لگائے تھے، اور جنگ سے باز رہنے کا مطالبہ کیا تھا۔ یہی امریکی ان خونیں مناظر کو دیکھ کر ہاتھ مل رہے ہیں۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ عراق میں حق و انصاف کا خون کرنے جا رہے ہیں، ہم نے پہلے ہی کہا تھا کہ ویتنام سے ہونے والی پسپائی کو اتنی جلدی فراموش نہ کیجیے۔ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود آپ نے ہمارے بیٹے، بھائی، شوہر، باپ اور دوست ایک ایسی جنگ میں کیوں جھونک دیے جو قانونی اعتبار سے غلط تھی، اخلاقی بنیادوں پر

ناجائز تھی، جسے آپ نے صرف اس لیے آغاز کیا تھا کہ آپ اگلے صدارتی انتخابات ہر قیمت پر جیتنا چاہتے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ فلوجہ میں ہونے والی بارہ گھنٹے کی عارضی جنگ بندی میں کسی قسم کا اضافہ ہوگا یا نہیں لیکن ساری دنیا یہ جانتی ہے کہ اس عارضی جنگ بندی کے دوران بھی گولیاں چلتی رہیں، گاڑیاں جلتی رہیں، دھماکے ہوتے رہے اور مشتعل عراقی، حملہ آوروں کو ہلاک کرتے رہے، یرغمال بناتے رہے۔ یہ وہی فلوجہ ہے جہاں چار امریکیوں کی ہلاکت اور ان کی سوختہ لاشوں کی نمائش سے صرف چند دن پہلے عراق میں امریکی صدر کی نیابت کرنے والے امریکی جرنیل، جنرل کمٹ نے نخوت بھرے لہجے میں کہا تھا کہ 'امریکی سپاہی اپنی مسلسل پیش قدمی سے بہت خوش ہیں۔' رابرٹ فسک کا کہنا ہے کہ جنرل کمٹ کا یہ نخوت بھرا جملہ اور اس کے فوراً بعد فلوجہ میں پیش آنے والے ہولناک واقعات امریکی فوج کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔

امریکی صدر بش اور ان کے ساتھیوں نے زمینی حقائق کو تسلیم نہ کرنے کی انتہا کردی ہے، تب ہی امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے اپنے تازہ ترین انٹرویو میں یہ کہا ہے کہ عراقی جنگجوؤں کو شکست دی جائے گی اور مقتدیٰ الصدر کو گرفتار کر کے انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔ فلوجہ جس نے فاتح فوجوں کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں اور ساری دنیا سے داد لی ہے، اس کے بارے میں کولن پاول نے کہا ہے کہ امریکی میرین دستوں نے شہر کا محاصرہ کر رکھا ہے اور جلد ہی امریکی شہریوں کو یہ خوشخبری ملے گی کہ فلوجہ کو شکست ہوگئی ہے اور اس شہر پر دوبارہ ہمارا قبضہ ہوگیا ہے۔ امریکی شہریوں کو یہ 'خوش خبری' ملے یا نہ ملے، سات براعظموں کے رہنے والے اور خود امریکا میں زندگی کرنے والے، اٹھارویں صدی میں برطانیہ سے جنگ آزادی لڑنے والے امریکیوں کے سگڑ پوتے اور سگڑ پوتیاں اپنے حکمرانوں کے اس جنگی جنون پر شرمسار ہیں، دلگیر و دل فگار ہیں۔

بغداد ہمارے ناسٹلجیا کا ایک اہم شہر ہے۔ اس کی تباہی پر ہمارے یہاں بہت سی نظمیں لکھی جارہی ہیں۔ اس وقت مجھے کشور ناہید کی ایک نظم یاد آ گئی ہے، 'بصرہ کی مردہ ماں کے لیے بچے کی لوری'

'اٹھو اماں!
بچے بھوک سے چیخ رہے ہیں
چولہا کیسا

اب تو ہمارا سارا گھر ہی سلگ اٹھا ہے
دھواں بھرا ہے
اٹھو اماں!
پوچھو ان بچوں کا حال کہ جو
خندق میں چھپے تھے
پانی مانگتے مانگتے
جن کے ہونٹ ادھوری بات بنے تھے
اٹھو اماں!
لاشوں کے ڈھیر سے اٹھو
اپنی گود کے پالوں کو دفنانے اٹھو!'

عراق کو جلاتا ہوا تیل کی ہوس کا یہی ایندھن ہے جس سے اٹھتے ہوئے شعلوں کی لپک سے دہشت زدہ ہوکر، بیقرار ہوکر شاہدہ حسن نے کہا:

'خدا کے لہجے میں بات کرتے یہ چند انساں
زمیں کی تقدیر اپنے ہاتھوں میں لے جا رہے ہیں
نئی صدی کے بدن میں سرطان پل رہا ہے
زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے'

آپ اور میں اور ساری دنیا زمیں کے اس بدلتے ہوئے نقشے کو دیکھ رہی ہے اور لرزاں ہے، ظلم و جبر کے سرطان کو نئی صدی کے بدن میں پھیلتے اور پنپتے ہوئے دیکھ رہی ہے اور آنے والے دنوں سے ہراساں ہے جب چار کی بجائے چار سو اور چار ہزار سوختہ لاشیں کسی مفتوح شہر کی گلیوں میں گھسیٹی جائیں، بلندیوں پر آویزاں کی جائیں اور ان کے نیچے غیظ و غضب میں بھرے ہوئے شہری قہقہے لگا رہے ہوں۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۱۴/اپریل ۲۰۰۴ء

ایک ہزار تصویروں پر مشتمل فردِ جرم

ان ایک ہزار تصویروں نے امریکی ایوانوں اور ساری دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ یہ ایک ایسی فردِ جرم ہے جو امریکی عوام کے سامنے امریکی صحافیوں اور اخباروں نے پیش کی ہے۔

میری نگاہوں کے سامنے 'واشنگٹن پوسٹ اور بعض دوسرے اخبارات میں شائع ہونے والے عراقی قیدیوں کی تصویریں ہیں، ان تن برہنہ، پابرہنہ عراقیوں کے گلے میں چمڑے کے تسمے ہیں اور انہیں جانوروں کی طرح چلنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ ایک منحنی سی لڑکی جو امریکا کی فوجی عہدہ دار ہے، ایک قیدی کو زمین پر گھسیٹ رہی ہے۔ نوجوان لڑکوں سے جنسی زیادتی کی جارہی ہے، ان پر پیشاب کیا جارہا ہے اور انہیں شرف انسانی سے گرانے کی ہر وہ کوشش کی جارہی ہے جو صرف شیطانی ذہن ہی سوچ سکتے ہیں۔

ٹیلی وژن اسکرین پر میں امریکی صدر جارج ڈبلیو بش اور برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کی 'معذرت، سنتی ہوں جو انہوں نے غیر انسانی مظالم کا نشانہ بننے والے عراقی قیدیوں سے کی۔ میں امریکی وزیر دفاع رمزفیلڈ پر ہونے والی جرح سنتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ انسانوں کو شرفِ انسانیت سے گرا دینے والے افراد کی 'معذرت، کیا ان انسانوں کی توہین، ان کی جسمانی اور ذہنی اذیت کے صرف ایک لمحے کو بھی ان کے ذہن سے محو کرسکتی ہے؟

برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کے مشیر برائے خارجہ پالیسی رابرٹ کوپر شاید سب سے زیادہ 'باہمت، ثابت ہوئے تب ہی انہوں نے برطانوی اخبارات اور حقوق انسانی کی انجمنوں کے شدید احتجاج پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ 'ہم جب اپنے لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں تو ہم یقیناً قانون کی پاسداری کرتے ہیں، لیکن جب ہم جنگل میں ہوتے ہیں تو پھر ہم جنگل کے قانون پر ہی

عمل کرتے ہیں۔'

میں اخبارات میں شائع ہونے والی ان تصویروں اور ٹیلی وژن کی متحرک فلموں کو دیکھتی ہوں اور اپنے ان بے کس اور بے آسرا لوگوں کو یاد کرتی ہوں جو ٹونی بلیئر کے آباواجداد کے ہاتھوں قتل ہوئے اور جن کی تصویریں، جن پر ٹوٹنے والے ستم سے بیشتر دنیا آج بھی بے خبر ہے۔

مجھے ہندوستان پر قابض ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی کا آغاز کرنے والے یاد آتے ہیں۔ یہ لوگ جو اپنی سرزمین کو غیروں کے غاصبانہ قبضے سے آزاد کرانے کے لیے لڑ رہے تھے، ان پر اور ان کے شہروں پر کیا کچھ نہ گزری۔ لال قلعے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں کے قبضے کے بعد دِلّی میں شہریوں کا جس طرح قتل عام ہوا اس کی ایک جھلک لارڈ رابرٹس کی اس تحریر میں نظر آتی ہے۔ جس میں اس نے مفتوحہ دہلی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے:

'ہم لاہوری دروازے سے ہوتے ہوئے چاندنی چوک گئے تو ہمیں دِلّی مُردوں کا شہر دکھائی دیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے یہ خاموشی ٹوٹتی۔ ہم کسی زندہ انسان کی صورت نہ دیکھ سکے۔ ہر طرف مردے ہی مردے تھے۔ زمین مُردوں کا بچھونا بنی ہوئی تھی۔ چلتے وقت ہم آہستہ آہستہ باتیں کرتے۔ ڈر تھا کہ کہیں ہماری آواز سے مردے چونک نہ پڑیں۔ ایک طرف نعشوں کو کتے کھا رہے تھے اور دوسری طرف گدھ انہیں نوچ رہے تھے۔ بعض مُردوں کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کو اشارے کر رہے ہیں۔ ہماری طرح ہمارے گھوڑے بھی انہیں دیکھ کر ڈرتے تھے۔'

اور اس کے بعد قیدیوں پر جو گزری وہ کچھ یوں تھی کہ:

> 'چاندنی چوک کی کوتوالی کے سامنے ایک حوض کے تین طرف پھانسیاں دی جاتی تھیں اور ایک طرف تماشائیوں کے لیے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ تیسرے پہر ادھر بینڈ بجتا ادھر لال قلعے سے مجرموں کی قطار روانہ ہوتی۔ ان کے ہاتھ پیٹھ کی طرف بندھے ہوئے ہوتے۔ مجرموں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا جاتا۔ ان میں سے آدھے پھانسی پر لٹکا دیے جاتے اور آدھے موت کے انتظار میں کھڑے رہتے۔'

جزائر انڈمان جنہیں عرف عام میں کالا پانی کہا گیا، وہ اس دور کا 'گوانتانا مو، تھا جس کی

تفصیل مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب 'عجائب التواریخ ،المعروف بہ کالا پانی میں ملتی ہے۔ مولانا جعفر تھانیسری کراچی جیل سے ۱۸۵۸ء میں کالا پانی بھیجے گئے تھے، یہ انگریزوں کی بنائی ہوئی وہ مشہور ومعروف جیل تھی جہاں علامہ فضل حق خیرآبادی اور جنگ آزادی میں شامل دوسرے متعدد افراد نے عمر قید کاٹی اور وہیں دفن ہوئے یا وہاں کی شمشان بھومی میں جلائے گئے۔

یہ باتیں جو ہماری تاریخ کا حصہ ہیں، مجھے اس لیے یاد آرہی ہیں کہ ان کا آج کے عراق سے، ابوغریب کے زندان سے گوانتانا موسے ایک گہرا تعلق ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ استعماری قوت برطانیہ ہو، امریکا یا کوئی اور، وہ مقبوضات میں شہریوں سے اور قیدیوں سے ایک ہی طرح پیش آتے ہیں۔

ابوغریب کے زندانیوں پر جو گزری اس کے سامنے آجانے کے بعد 'واشنگٹن پوسٹ' نے یہ خبر بھی دی ہے کہ گوانتانا موکے قیدیوں سے تفتیش کے لیے حکومتِ امریکا نے تشدد کے ۲۰ مختلف طریقوں کی منظوری دی تھی۔ ایک دبلی پتلی لڑکی جس کی تصویر ساری دنیا میں دیکھی گئی جو ایک برہنہ قیدی کے گلے میں چمڑے کا تسمہ ڈالے ہوئے اسے زمین پر گھسیٹ رہی تھی، اس کے کورٹ مارشل کے احکامات آگئے ہیں۔ وہ ان سات امریکی فوجیوں میں سے ایک ہے جو قیدیوں سے شدید بدسلوکی میں ملوث تھے۔ اس فوجی خاتون افسر سبرینا ہرمین نے 'واشنگٹن پوسٹ'، کو بتایا کہ قیدیوں پر ظلم ملٹری انٹیلی جنس کے حکم پر کیا گیا۔ انٹیلی جنس حکام نے ہدایت دی تھی کہ عراقی قیدیوں کی زندگی جہنم بنادی جائے۔ سبرینا ہرمین نے مزید کہا کہ ہمیں نہ تو قیدیوں سے تفتیش کی تربیت دی گئی تھی اور نہ ہم جنیوا کنونشن سے آگاہ تھے۔

امریکی جریدے 'نیویارکر میگزین' نے ابوغریب جیل میں عراقی قیدیوں پر امریکی مظالم کے مزید شواہد پیش کیے ہیں۔ اتوار کو جریدے میں شائع ہونے والی تازہ تصاویر ایک ایسے عراقی قیدی کی ہیں جسے برہنہ کرکے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے ہیں، وہ شدید زخمی ہے اور اس کے زخموں سے خون بہتا نظر آرہا ہے۔ ایک تصویر میں دو خونخوار جرمن شیپرڈ کتے اس قیدی پر بھونک رہے ہیں اور قیدی کے چہرے سے خوف عیاں ہے۔ ایک اور تصویر میں قیدی زمین پر گرا ہوا ہے اور ایک فوجی اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر تشدد کررہا ہے۔

یہ تفصیلات جو امریکی اور یورپی اخبارات یا ٹیلی وژن چینلوں کے ذریعے دنیا کو معلوم

ہو رہی ہیں، ان کی نسلی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اس صورت حال پر برطانوی صحافی رابرٹ فسک کی تازہ ترین تحریر روشنی ڈالتی ہے۔ اس نے اپنی دادی مارگریٹ فسک کے اس 'تحفے' کا ذکر کیا ہے جو اس نے پہلی جنگ عظیم کے آغاز سے کچھ پہلے اپنے بیٹے ولیم فسک کو دیا تھا۔ یہ ایک ضخیم کتاب تھی جو 'افغان جنگ' کے بارے میں تھی اور سنہ ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ رابرٹ فسک نے لکھا ہے کہ یہ کتاب میرے والد ولیم فسک کی ملکیت تھی جو ۱۹۹۲ء میں ان کے انتقال کے بعد مجھے ملی۔ اپنی مصروفیت کے سبب بارہ برس تک وہ اس کتاب کو نہ پڑھ سکا اور اب پچھلے مہینے اس نے یہ کتاب پڑھ کر ختم کی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۹ء میں کابل کے برطانوی سفارت خانے کے عملے کے قتل کے بعد انتقام لینے کے لیے بھیجی جانے والی برطانوی رجمنٹ کے 'شاندار' کارناموں کی داستان ہے۔

رابرٹ فسک جو عراق میں برطانوی روزنامے 'انڈی پنڈنٹ' کے نامہ نگار کے طور پر متعین ہے، جس نے بیروت کی خانہ جنگی کے دنوں میں اپنی بے لاگ اور بے باک تحریروں سے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا، وہ عراق کے بارے میں بھی ایسی ہی سچی اور تلخ رپورٹیں بھیجتا رہا ہے۔ اپنی تازہ ترین تحریر میں رابرٹ فسک نے اور بھی بہت سی باتیں لکھی ہیں لیکن عراق میں قیدیوں پر تشدد کے حوالے سے اس نے لکھا ہے کہ: 'ہمیں پہلے اپنے دشمنوں سے نفرت کرنا اور انہیں حیوان تصور کرنا سکھایا جاتا ہے اور پھر ہم اپنے غیظ وغضب کا اظہار کرتے ہیں اور انتقام لیتے ہیں...... ہم ان پر تشدد کرتے اور ان کی تذلیل کرتے ہیں۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ امریکی ٹھگوں نے ابوغریب کے زنداں میں (قیدیوں کے ساتھ) روا رکھا جانے والا تشدد کہاں سے سیکھا۔ انہوں نے عراقیوں کو 'انسانی روپ میں شیطان'، 'جنونی' اور 'مکھیاں'، تصور کیا...... میرا گمان ہے کہ عراقیوں پر تشدد کرنے والے امریکی ہماری صدی (برطانوی اقتدار کی انیسویں صدی) کی پیداوار ہیں۔ اگر آپ کو یہ سکھایا جائے کہ اپنے دشمن کو غیر انسان سمجھتے ہوئے اس سے نفرت کرو، تو پھر جب بھی آپ کو موقعہ ملے گا آپ خود غیر انسان ہو جائیں گے۔'

امریکی حکومت نے اپنے آپ کو 'غیر انسان' ثابت کرنے کے لیے جس طرح ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے، اس کے نتائج ہمیں کسی ایک جگہ نہیں ساری دنیا میں نظر آ رہے ہیں۔ امریکی حکمرانوں نے ان نتائج سے اب بھی کوئی سبق نہیں سیکھا تو امریکی بالادستی کے خاتمے کے دن کچھ اور زیادہ تیزی سے قریب آ جائیں گے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۱۲ر مئی ۲۰۰۴ء

قتل کرنے والے اقلیت میں ہیں

ان دنوں بین الاقوامی سطح پر دہشت گردی اور دوسرے ملکوں پر فوج کشی کی ایسی بلند لہر اٹھی ہے جس نے ساری دنیا کو خوفزدہ کر دیا ہے۔ ہر طرف شکوک وشبہات کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ مغرب میں ہر ایشیائی کو شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے اور پاکستان سمیت دنیا کے کئی ملکوں کی خفیہ ایجنسیاں اپنے ہر شہری اور بہ طورِ خاص غیر ملکیوں کو دہشت گرد سمجھ رہی ہیں۔

ایک ایسی فضا میں جہاں یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ دنیا میں دہشت گردوں اور نہتے شہریوں کے قاتلوں کی اکثریت ہوگئی ہے۔ وہاں زندگی گزارنا اور اپنی اگلی نسلوں کے مستقبل کا تصور کرنا ایک اذیت ناک صورت حال ہے۔

یہاں سوال یہ اُٹھتا ہے کہ کیا واقعی دنیا میں ہر طرف دہشت گرد اور قاتل گھوم رہے ہیں؟ کیا امن پسند لوگ اور انسانی زندگی کا احترام کرنے والے واقعی اب اقلیت میں ہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ انسانی فطرت میں قتل وغارت شامل ہے؟ کیا ہمیں اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اپنے ہی جیسے لوگوں کو قتل کیوں کر رہے ہیں؟

ایک طرف یہ سوالات ہیں، دوسری طرف علم سیاسیات اور فلسفے سے تعلق رکھنے والے بعض ماہرین ہیں جو اس بات سے قطعاً اختلاف کرتے ہیں۔ مختلف اقوام اور تہذیبوں پر تحقیق کرنے والے ماہرین سیاسیات، فلسفی اور تاریخ داں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بیشتر انسان قتل نہیں کرتے۔ وہ تمام انسان جو اس وقت زندہ ہیں اور ہم سے پہلے گزرنے والے بیشتر انسانوں کی ایک بہت چھوٹی سے اقلیت قاتل رہی ہے۔

ہم کسی سماج میں ہونے والے قتل کے اعداد وشمار پر نظر ڈالیں یا جنگ میں ہونے والی

ہلاکتوں پر غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر انسانوں کو قتل پر آمادہ سمجھنا یا یہ فرض کر لینا کہ سب کے سب جنگ میں ذوق شوق سے شرکت کرنا چاہتے ہیں، ایک غلط مفروضہ ہے۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے فوجی عجائب خانوں یا علم البشریات کے کسی بھی میوزیم سے اس بات کا ثبوت مشکل سے ملے گا کہ کسی بھی زمانے میں دنیا کی نصف آبادی یعنی عورتیں کبھی بھی لڑاکا یا جنگجو رہی ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ بہت سی عورتوں نے قتل کئے ہیں، یہ بھی درست ہے کہ بعض سماج ایسے رہے ہیں جن میں عورتوں حتیٰ کہ بچوں نے بھی شکست خوردہ دشمنوں پر تشدد کیا ہے۔ عراق میں ابوغریب کے جیل خانے میں ایک قیدی کی گردن میں پٹہ ڈال کر اس پر تشدد کرنے والی لڑکی کو بھلا ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ بہت سی جدید فوجوں میں قتل و غارت کے لئے خواتین کی خدمات حاصل کی جارہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں آج تک خواتین کی غالب اکثریت قاتل یا جنگجو نہیں رہی ہے۔ اسی طرح ہم جب مردوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی بھی ایک نہایت قلیل تعداد جنگ میں حصہ لیتی ہے۔ جنگ میں حصہ لینے والے ان مردوں میں سے بھی بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو براہ راست قتل کرتے ہیں۔ دوبدو مقابلے میں دشمن کو ہلاک کرنے والے ایسا کرتے ہوئے ہچکچاہٹ میں مبتلا ہوتے ہیں، اور اگر وہ اپنے سامنے آنے والے دشمن کو قتل کر دیں تو اس کے بعد ضمیر کی ملامت سہتے ہیں۔ یہی عالم ان لوگوں کا ہوتا ہے جو بمبار طیارے اُڑاتے ہیں اور ہزار ہا فیٹ کی بلندی سے شہروں پر بے تحاشا بم برساتے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے والے پائیلیٹوں کی پشیمانی کا احوال آپ کی نظر سے یقیناً گزرا ہوگا۔ میدان جنگ میں دشمنوں کو ہلاک کرنے والوں کے بارے میں جو اعداد و شمار اکٹھا کیے گئے ہیں۔ ان سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو فی صد فوجی ایسے ہوتے ہیں جو کسی پشیمانی اور ضمیر کی ملامت کے بغیر دوبارہ قتل کا ارتکاب کر سکیں۔

اس بارے میں ایک فوجی افسر کا کہنا ہے کہ جنگ ایک ایسی صورت حال ہے جو کچھ ہی عرصے میں اُن ۹۸ فیصد افراد کو ذہنی طور پر کمزور کر دیتی ہے جنہوں نے جنگ میں شرکت کی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ جو دوران جنگ پاگل ہوئے ان میں سے بیشتر کسی بھی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ہی دماغی خلل، جارحیت یا دیوانگی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہ کہنا کہ انسان فطری اور پیدائشی طور پر قاتل ہوتا ہے ایک قطعاً غلط مفروضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فوجی تربیت کا بنیادی مقصد ایک عام فرد

کے اندر اس گہری مزاحمت اور ناپسندیدگی کو ختم کرنا ہوتا ہے، جو وہ قتل کے خلاف رکھتا ہے۔
ہم اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان اگر فطری طور پر قتل کرنے کا رجحان رکھتا اور اگر انسانوں کی صرف نصف آبادی بھی قتل کو ایک پسندیدہ فعل سمجھتی تو دنیا میں انسان کا وجود باقی رہنا ممکن نہ تھا۔ باپ بیٹوں کا قتل کراتے اور شوہر بیویوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتے، والدین بچوں کو ہلاک کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے اور بچے، والدین کے قتل کو بھیانک جرم نہ سمجھتے۔
اس تمام ہلاکت خیز رویہ کے برعکس دنیا کی آبادی میں سال بہ سال اور صدی بہ صدی اضافہ ہوا ہے اور انسان زندگی کی مسلسل تخلیق اور اس کی پرورش میں مصروف رہا ہے۔
اس مفروضے کو درست ثابت کرنے کے لئے ماہرین سیاسیات اور تحقیق و جستجو کرنے والوں نے اس بات کا تخمینہ لگانے کی کوشش کی کہ اب تک دنیا میں کتنے انسان پیدا ہو چکے ہیں اور اندازاً ان میں سے کتنے قاتل تھے اور کتنے قاتل نہیں تھے۔ اس تخمینے کے لئے ۱۰ لاکھ قبل مسیح سے ۲۰۰۰ء بعد مسیح تک انسانوں کی آبادی اکیانوے ۹۱ ارب فرض کی گئی۔ اس کے بعد یہ اندازہ لگایا گیا کہ جنگوں، خانہ جنگیوں اور انفرادی طور پر قتل کرنے کے واقعات کو جوڑا جائے اور اسے پچاس کروڑ فرض کر لیا جائے اور پھر دوسرے بہت سے تخمینے لگائے جائیں تو ان سب کو جمع کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ دس لاکھ سال قبل مسیح سے اب تک دنیا میں تین ارب قاتل پیدا ہوئے ہیں۔
ظاہر ہے کہ یہ درست اعداد و شمار نہیں، اس کے باوجود یہی بات سامنے آتی ہے کہ لاکھوں برس کی اس مدت میں کم از کم ۹۵ فیصد انسان ایسے تھے جنہوں نے قتل جیسے گھناؤنے جرم میں حصہ نہیں لیا تھا۔
امریکا میں قتل کی وارداتوں کا جائزہ لیا گیا تب بھی یہی بات سامنے آئی کہ وہاں ایک لاکھ انسانوں میں سے دس افراد قاتل ہوتے ہیں یعنی آبادی کا اعشاریہ صفر ایک فیصد حصہ قتل کا ارتکاب کرتا ہے۔
اس نوعیت کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تمام انسانوں میں سے بہ مشکل ایک یا زیادہ سے زیادہ دو فیصد انسان قتل کا ارتکاب کر سکے ہوں گے۔
کسی نہ کسی شکل میں مذاہب دنیا کے ہر خطے میں موجود رہے ہیں اور ان کا ہمیشہ یہی پیغام رہا ہے کہ انسانی جان ہر چیز سے زیادہ مقدس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مذہبی صحیفوں میں بندوں کو

یہی پیغام دیا گیا کہ قتل ایک گناہ عظیم ہے اور کسی بھی قیمت پر اس کا ارتکاب مت کرو۔ قدیم ترین مذہبی تعلیمات میں سے ایک یہ ہے کہ جو شخص بھی کسی ایک کی جان بچاتا ہے وہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد کی جان کی حفاظت کرتا ہے۔ جبکہ وہ شخص جو کسی ایک فرد کی جان لے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے پوری دنیا کو تباہ کر دیا ہو۔

سوشل سائنسدانوں میں ابھی تک اس مفروضے پر بحث جاری ہے کہ انسان کی جبلت میں خون ریزی اور قتل و غارت شامل ہے۔ بعض ماہرین نفسیات نے اس بارے میں متعدد تجربات کئے ہیں اور ان تجربات سے یہ بات ثابت کی ہے کہ انسان بنیادی طور پر ایک امن پسند ذی روح ہے اس نوعیت کے تجربے دل کو تقویت دیتے ہیں۔ یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ آج انسان انسان پر جو ظلم کر رہا ہے۔ ملکوں کو جس سفاکی سے تہس نہس کیا جا رہا ہے شہروں پر بارود برسایا جا رہا ہے اور حب وطن اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر انسانوں کو جس طرح تہ تیغ کیا جا رہا ہے، یہ سب کچھ آخر کار ختم ہونے والا ہے اور انسانی زندگی کا احترام دنیا کی سب سے بڑی حقیقت کے طور پر سامنے آ کر رہے گا۔

ہو سکتا ہے یہ روزِ سعید میں نہ دیکھوں لیکن میرے بعد آنے والے اسے ضرور دیکھیں گے......!

'اردو نیوز'، جدّہ

۱۶/ اگست ۲۰۰۴ء

ادب، انسان اور انسانیت

اعلیٰ ادب نے ہمیشہ ظلم، جبر، نفرت، امتیاز اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اور ادب نے ابتدا سے آج تک انسانی سماج کے اندر موجود مختلف نفرتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ ذات پات، عقیدہ، نسل، رنگ، طبقاتی اور لسانی تقسیم، فرقہ واریت اور آج اکیسویں صدی کی نئی نفرتوں کی باڑھ کے سامنے انسان دوستی، رواداری اور افہام و تفہیم کا بند ادب نے باندھا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس وقت دنیا میں چھ ہزار زبانیں ہیں۔ یہ زبانیں جو موجود ہیں، اور وہ زبانیں جو مٹ گئیں، ان کا ادب انسان کو انسان سے، فطرت اور اس کی عنایتوں سے عشق کرنا سکھاتا ہے۔ موہنجوڈرو سے برآمد ہونے والی عبارتیں جو پڑھی نہیں گئیں، جب پڑھ لی جائیں گی تو وہ یا کسی گرہستن کے گھر کا حساب ہوں گی، یا کسی محبت بھری نظم کا ٹکڑا ہوگا لیکن یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ کوئی جنگی گیت نہیں ہوگا۔ یوں بھی موہنجوڈرو سے کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہوا ہے، وہاں کے شاعر جنگی گیت کیسے لکھتے—؟ کھدائی میں برآمد ہونے والے مصریوں کے لکھے ہوئے وہ پیپرس جو چار ہزار برس پرانے ہیں ان میں بھی ہمیں نفرت کا درس نہیں ملتا، عشق کا ترانہ ہے، انصاف کی طلب گاری ہے اور دریائے نیل کی لہروں کے قصے ہیں۔

نفرت کے نقوش مٹانے کے لیے ادب کیا کردار ادا کرتا ہے؟ یہ بات کرنے سے پہلے ہمیں سماجی سائنس کی بنیاد پر یہ تعین کرنا پڑے گا کہ ان کی سماج میں ذات پات، عقیدہ، نسل، رنگ، طبقاتی اور لسانی تقسیم اور فرقہ واریت کی بنیاد پر انسانوں نے انسانوں سے جو اجتماعی یا انفرادی نفرت کی ہے، وہ کسی حد تک انتہا کو پہنچی ہے، اس انتہا کو جہاں میدان جنگ میں یا جگہوں، بازاروں اور گھروں میں انسان مختلف وجوہ کی بناء پر اپنے جیسے انسانوں کو ہلاک کرتا ہے۔ اس

حوالے سے اگر ہم Fitz, Vax, helly اور Ramsey جیسے موجودہ سماجی سائنس دانوں کی تحقیقات پر نگاہ ڈالیں تو وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ دس لاکھ سال قبل مسیح سے سنہ ۲۰۰۰ء بعد مسیح تک اکیانوے ارب انسان پیدا ہوئے۔ ان میں سے بہ مشکل ایک سے دو فی صد انسان اجتماعی یا انفرادی طور پر اس قدر شدید نفرت میں مبتلا ہوئے کہ انہوں نے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو قتل کیا۔

برصغیر کے رہنے والے یہ بات کیسے بھلا سکتے ہیں کہ گوتم بدھ نے ذات پات کی بھیانک تقسیم کے خلاف آواز بلند کی تو یہ نہیں کہا کہ ذات پات کے بھیانک نظام کے خلاف تلوار اٹھالو۔ وہ لوگوں کے دلوں میں محبت، تحمل رواداری کے بیج بوتے رہے، یہی بیج کالنگا کے میدان میں لاکھ سپاہیوں کی لاشوں کے درمیان کھڑے ہوئے اشوک کے دل میں پھوٹا تو سارے ہندوستان میں، بلخ اور بامیان میں سپاہیوں کی تلواروں کو زنگ لگتا رہا، ان کے گھروں میں رکھی ہوئی چھریاں، عورتیں سبزی کاٹنے کے لیے تیز کرتی تھیں۔ اس دنیا کی ہر زبان، ہر زمانے اور ہر زمین کے ادیب کا ذہن افق تا افق آسمان کی طرح پھیلا ہوا ہوتا ہے، تب ہی وہ اپنے دامن میں انہیں بھی سمیٹ لیتا ہے جو نفرت کرتے ہیں۔ نفرت کرنے والوں کے دلوں پر پڑے ہوئے زنگ آلود قفل کو کھولتا ہے۔

سماجی سائنس دان اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بنیادی طور پر انسان تشدد پسند اور نفرت پسند نہیں۔ اس کی ایک بہت بڑی مثال عالمی ادب ہے جو انسانوں کے دلوں میں نرمی، تحمل، راواداری اور محبتوں کے بیج بوتا ہے۔ تلسی داس، کالی داس، کبیر، میرابائی، امیر خسرو، میر، غالب، مخدوم، سردار جعفری، کیفی، جوش نے انسانوں کو قریب لانے اور دلوں کو جوڑنے کی بات کی۔ ہمارے رتن ناتھ سرشار کا 'فسانہ آزاد' ہندوستان کی مشترکہ ہند ایرانی تہذیب کا ایک عظیم الشان Mural ہے۔ اسے پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم کتنی بڑی مشترک تہذیب کے وارث ہیں، یہ جان کر دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کیسی گنجائشیں نکلتی ہیں۔ بنگلہ ادب میں ٹیگور نے تمام تقسیم سے بلند ہوکر گیتانجلی اور گورا اور کابلی والا جیسی تخلیقات دنیا کو دیں۔ سرت چندر چٹرجی، رقیہ سخاوت حسین، نذرالاسلام، علاءالدین آزاد، سید شمس الحسن، سید شمس الرحمٰن، سلینا حسین انسان دوست ادیبوں کی ایک بہت بڑی برادری ہے جس نے انسانوں کے دلوں سے نفرتوں کو دھونے کی

کوششیں کیں۔ اسی طرح پنجابی، سندھی، کشمیری، تامل، تیلگو ہماری کون سی زبان ہے جس کے لکھنے والوں نے اپنے قلم سے سوئی کا کام نہیں لیا اور سماج کی ادھڑی ہوئی بُنت کو اور دلوں کو رفو کرنے کی کوشش نہیں کی۔

برصغیر میں جب فرقہ واریت کی بنیاد پر نفرت کی کالی آندھی چلی تو ہمارے کچھ ادیبوں نے مایوسی کے عالم میں یہ اعلان کیا کہ انسان مر گیا ہے۔ عین اسی وقت کرشن چندر، منٹو، عصمت، احمد ندیم قاسمی، خوش ونت سنگھ، بھیشم ساہنی، فیض، امرتا پریتم، سردار جعفری، کیفی، مخدوم، تاباں، جوش، کملیشور، جگن ناتھ آزاد، ساحر، اور ان کے بعد آنے والے رتن سنگھ، قرۃ العین حیدر، مہندر ناتھ، جوگندر پال، جیلانی بانو اور ان گنت نامور اور گم نام ادیبوں کی تحریروں میں اس زندہ انسان کے دل کی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں یہ انسان ہمیشہ سے موجود تھا اور ہمیشہ موجود رہے گا وحشت اور بربریت کے زمانوں میں بھی ادب اور ادیب نے اس انسان کو زندہ رکھا ہے۔ ہمارے ان ادیبوں کی تحریریں، فرقہ واریت سے لڑائی لڑ رہی تھیں اور بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر رہی تھیں۔ بعد میں آنے والوں نے بھی یہ کام کیا اور آج بھی کر رہے ہیں۔ مہاشویتا دیوی، امرتا پریتم، کرشنا سوبتی، جیا مترا، شومورتی، گلزار، وبھوتی نرائن رائے، اُدے پرکاش نرائن، انوش مالویہ، سروپ دھرو، اسی طرح پاکستان میں شیخ ایاز، اختر جمال، امر جلیل اور ان گنت دوسرے نفرتوں کے خلاف لکھتے رہے ہیں۔ ہندوستان کے ادیبوں کی نئی نسل میں ہم ارون دھتی رائے کو کس طرح بھلا سکتے ہیں، جس نے کہا کہ اگر ہندوستان کے ایٹمی دھماکوں کے خلاف لکھنا اور برصغیر کے کچلے ہوئے پسے ہوئے اور غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والوں کے حق میں لکھنا غداری ہے تو سن لیا جائے کہ میں غدار ہوں۔ اور یہ غداری میں کرتی رہوں گی۔

ادیب کا قلم ہر وضع کی نفرتوں کے خلاف لڑتا ہے۔ جون اسٹوارٹ مل اور جارج برنارڈ شا نے اور اس کے بعد آنے والے بہت سے مردوں اور عورتوں نے صنفی امتیاز کو ختم کرنے اور دونوں صنفوں کے درمیان باوقار تعلق قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام سولھویں صدی سے شروع ہو گیا تھا اور بیسویں صدی میں یہ اپنے عروج کو پہنچا۔ ورجینیا وولف سے سمیون دی بووار اور دنیا بھر میں پھیلی ہوئی خواتین ادیبوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو اپنی تحریروں سے صنفی امتیاز کے بارے میں لکھ رہی ہے۔ اسی طرح دلت ادب ہے جو ذات پات کے تعصّبات کے کانٹے چن رہا ہے۔ Black

ادب ہے جو رنگ اور نسل کے تعصّبات کے خلاف نبرد آزما ہے، یہودی اور عرب ادیب ہیں جو مشرق وسطیٰ کے تنازعات کے بارے میں کسی ایک فریق کے ساتھ کھڑے ہونے کی بجائے 'انسان' کے ساتھ کھڑے ہیں۔ عراق اور افغانستان پر امریکا کے ظالمانہ اور غاصبانہ حملوں کے خلاف بھی دنیا میں متعدد ادیبوں نے لکھا اور وہ شاعر ہیں جنہوں نے خود کو Poets Against war کا نام دیا ہے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران بہت سے ادیبوں نے فاشزم کے خلاف لکھا اور پھر امریکی سامراج کی بوئی ہوئی نفرتوں کی بارودی سرنگوں کو اپنے قلم کی نوک سے صاف کیا۔ برٹرینڈ رسل، ژاں پال سارتر، فرانز فینن ہیمنگوے سے ایڈورڈ سعید، نجیب محفوظ اور پہلی اور دوسری دنیا کے متعدد ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے نفرتوں اور عصبیتوں کی آگ کو بجھانے کا کام کیا۔

جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانیت کی اصل روح ادب میں سانس لیتی ہے، وہاں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب رزمیوں سے بھی مالا مال ہے۔ یہ وہ رزمیے ہیں جن میں دشمن سے نفرت کی گئی ہے اور اسے خاک میں ملا دینے کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ ان رزمیوں کے ساتھ ہی دنیا بھر کی زبانوں میں وہ بڑا ادب بھی ہمیں رنگ دکھاتا ہے جس نے انسانی سماج کے اندر موجود مختلف نفرتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ ذات پات، عقیدہ، نسل، رنگ، طبقاتی اور لسانی تقسیم اور فرقہ واریت کے زہر کو انسانی سماج سے نچوڑنے کی کوشش کی ہے۔

ادب PHOENIX کی طرح ہے جو بدترین فرقہ واریت، مذہب، رنگ، نسل یا طبقاتی نفرت کی آگ سے جنم لیتا ہے اور انسان دوستی کا گیت گاتا ہے۔ جس طرح فطرت اپنی عنایتیں سب پر کرتی ہے، اسی طرح ادیب ان کے لیے بھی لکھتا ہے جو نفرتیں تقسیم کرتے ہیں، اور ان کے دلوں سے نفرتوں کو دھونے کی کوشش کرتا ہے۔

'اردو نیوز'، جدّہ

۲۶ را کتوبر ۲۰۰۴ء

دیوانے کا خواب

ملکی اور غیر ملکی نشریاتی چینلوں سے آنے والی خبریں خون میں بھیگی ہوئی ہیں۔ ہر طرف بارود کی بو ہے اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ ہے اور خوف سے چیختے ہوئے بچوں کی آہ و بکا ہے۔ ان میں سے ہزار ہا عمر بھر اپنے ماں باپ یا دوسرے رشتہ داروں کو تلاش نہیں کر سکیں گے۔ ان کے چاہنے والے خاک پر سوتے ہیں یا بھگدڑ میں ان سے بچھڑ گئے ہیں۔

عراق۔ سوڈان۔ فلسطین۔ افغانستان اور دوسرے بہت سے علاقوں میں رہنے والے امن کے لیے ترستے ہیں۔ امن ان کے لیے ایک ایسی رات ہے جو گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے شکستہ نہ ہو۔ اور ایک ایسا دن ہے جب وہ سبزی کے ٹھیلے سے بچوں کے لیے تھوڑا سا آلو اور ٹماٹر خرید سکیں۔ پنساری کی دوکان سے انہیں آٹا چاول۔ تیل اور نمک میسر آ سکے۔ اپنے بچوں کی اور اپنی بھوک مٹانے کے لیے۔ امن آج سے نہیں پہلے دن سے ان کی ضرورت رہا ہے۔ اس امن کے لیے وہ لاکھوں برس سے جنگلی جانوروں اور حشرات الارض سے لڑے ہیں۔ اس امن کے لیے انسان نے آگ دریافت کی تاکہ جنگلی جانوروں کے خونخوار جبڑوں سے محفوظ رہ سکے۔ اس امن کے لیے اس نے بھاری قیمت ادا کی۔

ماسکو میں جب ایک شاندار تقریب میں فیض صاحب کو لینن امن انعام دیا گیا تو انہوں نے کہا تھا کہ امن گیہوں کے کھیت، دلہن کا آنچل اور بچوں کے چہرے کی ہنسی ہے۔ تو انہوں نے کیا غلط کہا تھا۔ گیہوں کے کھیت لہلہاتے ہوں۔ اور انہیں ٹینک روند نہ رہے ہوں۔ توپوں کی گولہ باری جلا کر خاکستر نہ کر رہی ہو تو ہر گھر کے باورچی خانے میں آٹے کا کنستر بھرا رہتا ہے۔ اور ہر گھر میں تازہ روٹی کی خوشبو مہکتی ہے۔ سرحدوں پر گولیاں نہ چلتی ہوں یا شہر بمبار طیاروں کی بمباری سے

محفوظ ہوں تو سہاگنیں بیوہ نہیں ہوتیں۔ ان کی عزتیں محفوظ ہوتی ہیں اور بچوں کی ہنسی سے بھی زیادہ دلنواز کوئی نغمہ ہوسکتا ہے۔ یہ ہنسی جنگ سے اور قبضے سے محفوظ گھروں، باغوں اور بازاروں ہی میں گونجتی ہے۔

امن کا مفہوم بس وہی جانتے ہیں جو اس وقت کشت وخون کے ایک عظیم عذاب سے گزر رہے ہیں۔ اس بحران کو دور سے دیکھنے والے ہوں یا اس میں زندگی کا عذاب سہنے والے دونوں کا ہی یہ کہنا ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہورہا ہے کہ انسان بنیادی طور پر حیوانی جبلت رکھتا ہے۔ بظاہر یہ اتنی سادہ اور درست بات ہے کہ اسکی تردید کرنا آخری درجے کی کم فہمی محسوس ہوتی ہے لیکن اگر اس مسئلے پر گہرائی میں جاکر غور وخوض کیا جائے تب ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم معاملات کو بہت سادہ اور سطحی انداز میں دیکھنے کے عادی ہوچکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر حیوانی جبلت رکھتا اور اس کے اندر محض خون آشام درندے ہی غرار ہے ہوتے تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ دنیا جو ساری روایات کے اعتبار سے آدم وحوا اور سائنسی تحقیقات کی رو سے دس مردوں اور سات عورتوں کی اولاد سے آباد ہوتی۔ اسکی آبادی آج چھ ارب سے تجاوز نہ کرچکی ہوتی۔ انسان اگر اتنا ہی جارحیت پسند ہوتا جتنا وہ ہمیں فلوجہ۔ تورابورا، رام اللہ اور ماضی کے دوسرے جنگ زدہ شہروں اور بستیوں میں نظر آتا تھا اور دکھائی دیتا ہے۔ تو دنیا کی آبادی آج بمشکل چند لاکھ یا زیادہ سے زیادہ چند کروڑ پر مشتمل ہوتی۔ اس بارے میں ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ انسان تو بہت دور کی بات ہے وہ جانور جو ایک دوسرے کے ازلی دشمن سمجھے جاتے ہیں ان کو بھی اگر ساتھ ساتھ پرامن طور پر رہنے کی تربیت دی جائے تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہ سکتے ہیں۔ شاید یہ اسٹیفورڈ یونیورسٹی کی بات ہے جہاں بلی اور چوہے کو ایک ساتھ رہنے اور ایک پلیٹ سے کھانے کی تربیت دی گئی اور آخرکار یہ تجربہ کامیاب رہا۔ وہ بلی جو چوہے کو اپنا شکار بنانے میں لحظہ بھر کی دیر نہیں کرتی۔ آخرکار وہی بلی ایک چوہے کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانے کو معمولی بات سمجھنے لگی۔

ان دنوں جہاں دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں سے جنگ کی خبریں آرہی ہیں وہیں سری لنکا۔ سوڈان۔ ہندوستان۔ پاکستان اور دوسرے برسرپیکار علاقوں میں امن کا بھی چرچا ہے۔ یہ امن صرف جنگ زدہ علاقوں کی ہی نہیں ساری دنیا کے ضرورت ہے۔ ایک پرسکون اور پُرامن دنیا

سے بڑی راحت انسانوں کے لیے کچھ بھی نہیں ہوسکتی۔ بیسویں صدی میں تیسری دنیا کے ان تمام ملکوں میں بڑی بڑی مزاحمتوں نے جنم لیا جو اپنے ہی آمروں سے پہلی دنیا کے جبر و استبداد سے عاجز آ چکے تھے۔ ان میں برصغیر۔ روس۔ چین۔ افریقہ اور ایشیا ہیں۔ اور لاطینی امریکا کے متعدد ملک شامل ہیں۔ ان میں شروع سے آخر تک ایک کے سوا تمام مزاحمتی تحریکیں پُرتشدد اور مسلح جدوجہد پر مبنی تھیں۔ عدم تشدد پر مبنی صرف مہاتما گاندھی اور خان عبدالغفار خان کی تحریک تھی۔ ورنہ لینن یا نیلسن منڈیلا ہوں یا چند دنوں پہلے جان سے گزر جانے والے یاسر عرفات سب ہی نے مسلح مزاحمت کی۔ بیسویں صدی کے ان بڑے اور مقبول رہنماؤں میں سے صرف نیلسن منڈیلا تھے جو رفتہ رفتہ اس بات سے قائل ہوئے کہ تشدد مزید تشدد کو جنم دیتا ہے اور تشدد کا یہ دائرہ پہلے سے کچلے ہوئے پس ماندہ عوام کو غریب تر پسماندہ تر اور مجبور تر کرتا چلا جاتا ہے۔ اور آخر کار عدم تشدد کے ہتھیار سے انہوں نے جنوبی افریقہ کی بدترین نسل پرست اور ریاستی جبر کی انتہا کرنے والی حکومت کو گھٹنے ٹیکنے اور عوامی خواہشات کے سامنے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

یاسر عرفات نے ۱۹۷۴ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں جو تقریر کی تھی اس وقت وہ فلسطین کی مسلح مزاحمت کے رہنما تھے اپنی اس تاریخی تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ میرے ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے ہاتھ میں زیتون کی شاخ ہے۔ میں عالمی برادری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے بندوق رکھنے پر مجبور کر رہے ہیں اور میرے ہاتھ سے زیتون کی شاخ کو گرنے نہ دے۔ یاسر عرفات نے اپنی مسلح جدوجہد کی آنچ رفتہ رفتہ مدھم کی لیکن افسوس کہ امریکا اور دوسرے مغربی ممالک اور اسرائیل نے ان کی درخواست پر کان نہ دھرا۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ فلسطین کی تحریک آزادی کی باگ ڈور امن کی اور مذاکرات کی بات کرنے والے یاسر عرفات کے ہاتھ سے نکل کر ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو صرف اور صرف مسلح جدوجہد کی بات کرتے ہیں۔ جنہیں خودکش حملے کرتے ہوئے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ کسی فوجی ٹھکانے یا قافلے کو نشانہ بنا رہے ہیں یا نہتے شہریوں اور بچوں کو۔ اس پس منظر میں آج کی دنیا کو دیکھئے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ شاید نا اُمیدی ہمارا مقدر ہے۔ شاید انسان کے اندر صرف وحشی درندے غراتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کے لیے بے تاب ہے۔

اس کے باوجود فلسفیوں۔ نفسیات دانوں۔ دانشوروں اور سیاست دانوں کی ایک بڑی

تعداد ہے جو تاریخی شواہد، نفسیاتی تحقیق و تفتیش، سیاسی تحریکوں اور مسلح مزاحمتوں کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ بیشتر انسان اپنی اصل میں امن پسند ہیں۔ وہ جنگ سے گریز چاہتے ہیں اور ایک پرسکون اور پرامن دنیا میں خوش امیدی کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواہاں ہیں۔ علم البشریات کے حوالے سے اگر اس بات کا کھوج لگانے کی کوشش کی جائے کہ زیادہ اور کم متشدد سماج یا جنگ آمادہ اور امن پسند سماج کے درمیان کیا بنیادی فرق پایا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کی سماجی تربیت اور اس میں ان کے اندر یہ اصول راسخ کرنا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں اور عورتوں کا احترام کریں اور چھین جھپٹ کو اپنی زندگی کا رویہ بنانے سے گریز کریں۔ انسان میں امن پسندی کے رویوں کا سیاسی بنیادوں پر جائزہ لینے کے لیے اسپین کے مشہور شہر سیوائل میں جسے ہم اسپین کی اسلامی تاریخ میں اشبیلیہ کے نام سے جانتے ہیں، وہاں مختلف علوم کے ماہرین کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس کے اختتام پر ۱۶رمئی ۱۹۸۶ء کو ان دانشوروں اور علم البشریات کے ماہرین کی جانب سے یہ اعلان نامہ جاری کیا گیا کہ:

یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ ہم نے اپنے حیوانی اجداد سے جنگ کرنے کا رویہ ورثے میں پایا ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ جنگ یا کوئی دوسرا پُرتشدد رجحان ہماری انسانی فطرت میں جینیاتی طور پر داخل کیا گیا ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ انسانی ارتقا کے عمل میں رجحانات کی دیگر قسموں کے مقابلے میں جارحانہ رجحان کو زیادہ اختیار کیا گیا ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ انسان ایک 'پُر تشدد ذہن' کا مالک ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ جنگ کا باعث 'جبلت'، یا کوئی واحد تحریک ہے۔

اسٹین فورڈ کے نفسیاتی معالجین کی ہلاکت گریز خوش امیدی کی برابری کرتے ہوئے سیوائل کے ان ماہرین نے اعلان کیا:

ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حیاتیات انسانیت کو جنگ کے لیے مجبور نہیں کرتی اور یہ کہ انسانیت کو حیاتیاتی قنوطیت کی قید سے آزاد کرایا جاسکتا ہے اور امن کے بین الاقوامی سال اور آنے والے برسوں میں درکار قلبِ ماہیت کے اہداف کی ذمہ داری لینے کے لیے پُراعتمادی کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ باوجودیکہ یہ اہداف اداروں کے اور اجتماعی ہیں، ان کا انحصار انفرادی شراکت داروں کے شعور پر بھی ہے جن کے لیے قنوطیت اور خوش امیدی فیصلہ کن عامل ہیں۔ جس

طرح یہ کہا جاتا ہے کہ 'جنگیں لوگوں کے ذہنوں میں شروع ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح امن بھی ہمارے ذہنوں میں شروع ہوتا ہے۔ہم میں سے ہر شخص پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی'۔

آج کے عالمی حالات میں یہ باتیں بیشتر لوگوں کو دیوانے کا خواب محسوس ہوتی ہیں لیکن جب یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ جنگیں انسانوں کے ذہنوں میں شروع ہوتی ہیں تو پھر اس متبادل کو بھی آزمانا ضروری ہے کہ امن کا آغاز بھی انسانوں کے ذہنوں میں ہوتا ہے۔

آج کی لہولہان جنگ اور خانہ جنگی اور تشدد سے کراہتی ہوئی دنیا کے لوگوں کو اس طرف بھی راغب کرنے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۲۴ نومبر ۲۰۰۴ء

نجات دیدہ ودل کی گھڑی

وہ بیسویں صدی کا آغاز تھا جب بنگال کے قومی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب 'گیتا نجلی' میں اپنے غلام وطن کے لیے آزادی کی جنت میں بیدار ہونے کی خواہش کی تھی۔ اس جنت کا نقشہ انہوں نے ان الفاظ میں کھینچا تھا:

جہاں دل ودماغ میں کوئی خوف نہ ہو اور جہاں سر اٹھا کر چلنے کی آزادی ہو
جہاں علم آزاد ہو
جہاں گھروں کی تنگ دیواروں سے دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہ بانٹا گیا ہو
جہاں لفظ گہری سچائیوں کے آئینہ دار ہوں
جہاں بہترین جدوجہد میں مصروف ہاتھ تکمیل چاہتا ہو
جہاں تعقل کی شفاف ندی مردہ خیالوں کے ریگستانوں کی خشک ریت میں گم نہ ہوگئی ہو
جہاں ذہن ہر لحظہ کشادہ ہونے والے قول وفعل کی دنیا میں تمہاری راہنمائی کو پہنچتا ہو۔

انگریز کے نوآبادیاتی تسلط سے برصغیر کو نجات ملی تو ٹیگور برسوں پہلے رخصت ہو چکے تھے، ان کی نظر سے آزادی کا وہ رنگ نہیں گزرا جسے دیکھ کر فیض صاحب بے اختیار کہہ اٹھے تھے:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

اور یہ صرف برصغیر کی آزادی کا ہی معاملہ نہ تھا، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا میں نوآبادیاتی تسلط سے نجات کی جتنی بھی تحریکیں چلیں، ان کی کامیابی ان برِ اعظموں اور ملکوں کے عوام کے لیے کوئی مژدۂ نجات نہ لائی، لوگ غریب سے غریب تر ہوتے گئے، پہلے وہ سفید فام آقاؤں کے غلام

تھے تو اب اپنی ہی ہم قوم اشرافیہ کے جبر کی چکی میں پسنے لگے، حقوق انسانی اور شرف انسانی جس سے وہ محروم رکھے گئے تھے، اب محروم تر ہو گئے۔ یہی وہ صورتحال تھی جس نے ایشیا کے دانشوروں ادیبوں، قانون دانوں اور صحافیوں کو مضطرب کیا اور انہوں نے ایشیائی عوام کے انسانی حقوق کے لیے جدو جہد کا آغاز کیا۔ یہ جدو جہد آج بھی جاری ہے، بقول فیض صاحب:

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ایشیائی عوام کے شرف انسانی کی بازیافت کے لیے اب سے دس برس پہلے ایک تنظیم ایشیائی کمیشن برائے انسانی حقوق قائم ہوئی جس نے برسوں کی محنت اور ریاضت کے بعد ۱۹۹۸ء میں انسانی حقوق کا ایشیائی منشور جاری کیا۔ یہ منشور ۱۰ ردسمبر ۱۹۴۸ء کو جاری ہونے والے عالمی منشور برائے انسانی حقوق کی پچاسویں سالگرہ کے موقعہ پر جاری ہوا۔ ایشیائی منشور کو تحریر کرنے سے پہلے برسوں اس کے نفسِ مضمون پر بحث مباحثہ چلا تا کہ منشور میں ہر ایشیائی قوم، علاقے، مذہب اور فرقے کے لوگوں کی دانش و بنیش شامل ہو۔ اس بحث مباحثے میں انفرادی سطح پر دانشوروں، ادیبوں اور قانون دانوں کے علاوہ ۲۰۰ سے زیادہ ایشیائی غیر سرکاری تنظیموں نے حصہ لیا، انسانی حقوق کے اس ایشیائی منشور پر مزید بحث مباحثے کے لیے اسے ایشیا کے مختلف ملکوں کے اخباروں اور جرائد و رسائل میں شائع کیا گیا، تا کہ عوام بھی اس کی تدوین و تحریر میں حصہ لے سکیں۔

تین برس کی شب و روز محنت کے بعد ایشیائی عوام کے حقوق کا یہ منشور جاری ہوا اور اس کی روشنی میں آج بھی ایشین ہیومین رائٹس کمیٹی ان حقوق کے حصول کے لیے جدو جہد کر رہی ہے۔ اس ایشیائی منشور کی تدوین کرنے والوں کا کہنا تھا کہ ایشیائی قومیں ایک طویل عرصے تک، خصوصاً نو آبادیاتی عہد کے دوران، اپنے حقوق اور آزادیوں کی کثیر خلاف ورزیوں کی شکار رہی ہیں۔ آج بھی ہمارے عوام کے بڑے حصے کا استحصال اور ان پر جبر کا سلسلہ جاری ہے اور نفرت اور عدم برداشت کے نتیجے میں ہمارے متعدد سماج ٹکڑوں میں بٹ گئے ہیں۔ لوگوں میں یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ امن اور انسانی وقار صرف اسی وقت ممکن ہوگا جب تمام افراد اور گروہوں کے نا قابل تقسیم حقوق تسلیم کر لئے جائیں گے اور ان کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ ان کا عزم ہے کہ انسانی حقوق اور آزادیوں کے لیے جدو جہد کے ذریعے اپنے اور آنے والی نسلوں کے لئے امن اور انصاف کو

یقینی بنائیں۔ اس مقصد کی خاطر وہ اس منشور کی منظوری دیتے ہیں جس کے ذریعے ایشیائی عوام کی اس خواہش اور امنگ کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ امن اور وقار کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

شہری سماج میں جبر اور استعماریت کے سیاسی جبر کے خلاف مزاحمت میں، اور اس کے ساتھ ہی جمہوریت کے قیام یا اس کی بحالی کے لئے جدو جہد گہری تاریخی جڑیں رکھتی ہے۔ اس وقت ایشیا تیز رفتار تبدیلی کے دور سے گزر رہا ہے، جس کے اثرات سماجی ڈھانچوں، سیاسی اداروں اور معیشت پر پڑ رہے ہیں۔ ترقی اور ٹیکنالوجی کی جدید صورتوں، نیز ان تبدیلیوں کو بروئے کار لانے والے سیاسی اداروں اور معاشی تنظیموں سے روایتی اقدار کو خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ خصوصاً معیشتوں کی منڈی کاری اور عالمگیریت، نجی اور سرکاری، ریاستی اور بین الاقوامی برادری کے درمیان توازن تبدیل کر رہی ہیں، اور غریبوں اور محروموں کے حالات کو مزید ابتر کر رہی ہیں۔ ٹیکنالوجی کے اثرات، منڈی کو مادی مفادات کے حوالے سے تشکیل دینے اور کمیونٹی کی تباہی کے نتیجے میں، یہ تبدیلیاں زندگی کے بیشتر قابل قدر پہلوؤں کے لئے خطرہ بن گئی ہیں۔ اپنی زندگیوں اور ماحول پر لوگوں کا اختیار کم ہوتا جارہا ہے، اور کچھ کمیونیٹز کو اپنے قدیم گھروں اور زمینوں سے بے دخلی کے خلاف بھی کوئی تحفظ حاصل نہیں رہا۔ مزدوروں کا بے تحاشہ استحصال جاری ہے، ان کی تنخواہیں عموماً اتنی قلیل ہیں، جس سے زندگی کی بقا بھی ممکن نہیں ہے اور حفاظتی معیار اتنا پست ہے کہ مزدوروں کی زندگیاں ہر لحمہ خطرے کی زد پر رہتی ہیں۔ انتہائی بنیادی مزدور حقوق اور قوانین کا نفاذ بھی کم کم کیا جاتا ہے۔

ایشیائی ترقی کا عمل تضادات سے بھرا ہوا ہے۔ عوام کا ایک طبقہ امیر ہوا ہے تو بہت نچلی سطح کی غربت بھی موجود ہے۔ ہمارے عوام کی ایک وسیع تعداد کی صحت، خوراک اور تعلیم کی سطحیں ہولناک ہیں اور انسانی زندگی کے وقار کی نفی کرتی ہیں۔ دریں اثناء قیمتی وسائل آلات جنگ پر ضائع کئے جارہے ہیں، مجموعی طور پر ایشیا اسلحے کی خریداری میں سب سے آگے ہے۔ ہماری حکومتوں کا دعویٰ ہے کہ ترقی کی جس راہ کا انتخاب کیا ہے اس سے پیداوار اور عوام کے فلاح و بہبود میں اضافہ ہوگا لیکن ہمارے قدرتی وسائل انتہائی غیر ذمہ دارانہ طور پر ختم کئے جارہے ہیں۔ مفلس اور محروم لوگوں کی دیکھ بھال کرنے کے مقابلے میں گالف کے میدانوں کی تعمیر زیادہ اہمیت اختیار کرگئی ہے۔

حالیہ عشروں میں ایشیائی عوام شدید قوم پرستی، کج رو نظریات، نسلی تفریق، اور تمام مذاہب کی بنیاد پرستی سے پیدا ہونے والے تنازعے اور تشدد کی متعدد شکلوں سے تکلیف جھیل چکے ہیں۔ عوام کی

ایک کثیر تعداد کو ذاتی، ملکیتی یا کمیونٹی سلامتی میسر نہیں ہے۔ کثیر تعداد میں برادریوں اور گروہوں کو بے گھر کیا جارہا ہے اور ترک وطن پر مجبور کیے جانے والوں کی تعداد روز افزوں ہے۔

حکومتوں نے لامحدود اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لئے ہیں۔ انہوں نے عوام کو ان کے حقوق اور آزادیوں سے محروم کرنے کے لیے قوانین نافذ کئے ہیں اور قومی وسائل کی لوٹ مار میں غیر ملکی فرموں اور گروپوں سے گٹھ جوڑ کرلیا ہے۔ بدعنوانی اور اقربا پروری بے لگام ہو چکی ہے اور سرکاری یا نجی طور پر اختیار رکھنے والوں کا کوئی احتساب نہیں ہوتا۔ بہت سی ریاستوں میں مطلق العنانیت نے قومی نظریے کی شکل اختیار کرلی ہے اور ان کے شہریوں کو حقوق اور آزادیوں سے محروم کردیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کہا یہ جاتا ہے کہ یہ بیرونی تصورات قابل مزاحمت ہیں اور ایشیا کی مذہبی اور ثقافتی روایات میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس کے بجائے 'ایشیائی اقدار' کے جعلی نظریوں کی تلقین کی جاتی ہے جو حکمرانوں کی مطلق العنانیت پر پردہ ڈالنے کی بھونڈی کوشش ہے۔ بہت سے ایشیائی ممالک میں انسانی حقوق سے حکومتی بے توجہی یا ان کی خلاف ورزی کے مقابل وہاں کے عوام کے درمیان حقوق اور آزادیوں کی اہمیت کا شعور بڑھ رہا ہے۔ انہیں اپنی مفلسی اور سیاسی ناطاقتی اور اپنے حقوق اور آزادیوں سے محروم کئے جانے کے درمیان تعلق کا ادراک ہے۔ وہ اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ معاشی نظاموں کو انسانی حقوق اور آزادیوں کے ایک فریم ورک کے اندر رہ کر کام کرنا چاہیے تاکہ معاشی عدل، سیاسی شراکت، احتساب، اور سماجی امن کو یقینی بنایا جاسکے۔

اس منشور میں حقِ زندگی، حقِ امن، حقِ جمہوریت، ثقافتی شناخت اور ضمیر کی آزادی، ترقی اور سماجی انصاف، عورتوں، بچوں، مزدوروں، طلبا، قیدیوں اور سیاسی نظر بندوں کے حقوق کی بات کی گئی ہے۔ پاکستان جہاں آج بھی لوگ ان حقوق سے محروم ہیں، وہاں دسمبر کے مہینے میں انسانی حقوق کے عالمی منشور کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کے ایشیائی منشور کے بارے میں بھی بات کرنے اور حکومت پاکستان پر دباؤ بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ منشور ہمارے مخصوص حالات سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، اس کے حصول کی جدوجہد ہمارے لوگوں کے شرف انسانی کی بحالی میں زیادہ موثر ثابت ہوسکتی ہے اور نجات دیدہ و دل کی گھڑی جلد قریب آسکتی ہے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۲۲ دسمبر ۲۰۰۴ء

عراق: حیرتوں کی سرزمین

عراق ایک ایسی سرزمین ہے جو آج سے نہیں ہزاروں برس سے دنیا کو حیران کرتی چلی آئی ہے۔ قدیم مصری تہذیب کی ہم پلہ اس تہذیب کے آثار سمیریوں (قدیم عراقیوں) کی ذہانتوں کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ دنیا کا وہ عظیم سیلاب جس نے اس پورے خطے کو تباہ و برباد کردیا تھا، اسی سرزمین پر آیا تھا۔ یہ اس سیلاب کا قصہ ہے جسے سمیری کتبوں اور گل گامش کی طویل رزمیہ نظم میں اُتنانشتم Utnahshtm اور بائبل اور قرآن میں طوفان نوح کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ آویزاں باغات جو دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہیں، یہیں لگائے گئے۔ ان باغات کو سیراب کرنے کے لیے بلندی پر پانی پہنچانے کا کمال پہلی مرتبہ یہیں دکھایا گیا۔ سمیری امراء کی حویلیاں اور دیوتاؤں کے مندر سات منزلہ ہوتے تھے۔ فن تعمیر میں قدیم عراقیوں کی مہارت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر منزل تیس سے چالیس فٹ کی بلندی رکھتی تھی۔ منارہ بابل جو اس وقت دنیا کی بلندترین عمارت تھی، یہیں تعمیر ہوا۔ رسم الخط کی ایجاد میں وہ قدیم مصریوں کے ہم پلہ تھے اور دنیا میں پہلی مرتبہ باضابطہ قوانین بھی یہیں مرتب ہوئے جو آج بھی حمورابی کے قوانین کے نام سے مشہور ہیں۔ دنیا کا پہلا باضابطہ کتب خانہ جو آشور بنی پال سے منسوب ہے یہیں قائم ہوا، اس کے علاوہ بھی یہاں متعدد کتب خانے تھے، کھدائی کے دوران جن میں سے ایک سے تیس ہزار تحریری تختیاں برآمد ہوئی ہیں۔

ایک ایسا سماج جس نے آج سے ہزاروں برس پہلے اپنی الواح گلی اہتمام اور احترام سے سنبھال کر رکھی ہیں اسے چار ہزار برس بعد اکیسویں صدی کی سب سے بڑی طاقت نے اپنی جبروت کا نشانہ بنایا۔ اس کی قدیم ترین تہذیب کے آثار اس کے آباد شہر اور اس کے ہنستے بولتے

کھاتے کھیلتے شہری خاک میں ملا دیے گئے۔ اوراب وہاں جمہوریت 'نافذ' کرنے کے لیے امریکی نگرانی میں انتخابات کرائے جارہے ہیں۔

جمہوریت کا بیج توجہ اور محبت سے کسی زمین میں بویا جاتا ہے اور خون پسینے سے سینچا جاتا ہے۔ جمہوریت مارشل لاء آرڈیننس نہیں جسے بندوق کے زور پر نافذ کیا جائے۔ ہم نے خود بھی بندوق کی نال پر نافذ ہونے والی جمہوریتوں کا ذائقہ چکھا ہے، اسی لیے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی جمہوریتوں کا انجام بھی کیا ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عراقیوں نے کبھی انتخابات نہیں دیکھے یا کسی پولنگ اسٹیشن کے سامنے قطار نہیں لگائی۔ ۵۰ء کی دہائی میں شاہ فیصل کے اور نوری السعید کے قتل اوران کی لاشوں کو گلیوں میں گھسیٹنے کے بعد عراق کے تقریباً ہر آمر نے اپنی حکومت کو جائز قرار دینے کے لیے 'انتخابات، کرائے۔ صدام حسین بھی ایسے ریفرنڈم کراتے رہے ہیں جن میں انہیں ۹۹ راعشاریہ ۹ فی صد ووٹ ڈالے گئے ہیں۔ لیکن عراقی بھی جانتے ہیں اور دنیا بھی اس حقیقت سے واقف رہی ہے کہ صدام حسین، حسنی مبارک، جنرل ایوب، ضیاالحق اور پرویز مشرف کو ملنے والے ووٹوں کی حقیقت کیا ہے۔

عراق میں جو انتخابات ہوئے انہیں روکنے یا انہیں ناکام بنانے کے لیے امریکا کے خلاف مزاحمت کرنے والے گروپوں نے صرف مخالفانہ بیانات ہی نہیں دیے۔ انتخابات کے اعلان کے ساتھ ہی مزاحمتی گروپوں نے اُمیدواروں کو قتل کرنے یا ان پر قاتلانہ حملوں کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ انہوں نے بار باراس بات کی دھمکی بھی دی تھی کہ پولنگ اسٹیشنوں پر خودکش حملے کیے جائیں گے اور جن لوگوں نے ان انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی ہمت کی انہیں بھی قتل کردیا جائے گا۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا، وہ سچ کر دکھایا۔ انتخابات کے دن یوں تو ہر شہر میں بھی کوئی نہ کوئی پُرتشدد واقعہ ہوا لیکن مزاحمت کرنے والوں کا اصل نشانہ شہر بغداد تھا جہاں دن بھر میں یکے بعد دیگر ۹ خودکش حملے ہوئے جن میں ۲۷ رافراد ہلاک ہوئے۔ امریکی سرپرستی میں کام کرنے والی عراقی حکومت نے انتہائی سخت گیری سے امن وامان قائم رکھنے کی کوشش کی اور مزاحمت کرنے والوں کے ٹھکانوں پر پیشگی حملے بھی کیے اس کے باوجود وہ پرتشدد کارروائیوں پر قابو نہیں پاسکی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک کروڑ تیس لاکھ رجسٹرڈ ووٹروں میں سے نصف افراد رائے دہی کا اپنا حق ضرور استعمال کریں گے لیکن جیسا کہ میں نے ابتداء میں لکھا تھا کہ عراق حیرتوں کی سرزمین ہے۔ اس بار

بھی عراقیوں نے دنیا کو اور خود اپنی حکومت کو حیران کر دیا۔ غیر ملکی خبر رساں ایجنسیوں کے ہزاروں نمائندے دنیا بھر سے عراق پہنچے ہوئے تھے اور ان کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ پولنگ اسٹیشنوں پر ووٹ ڈالنے والوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں۔ ان میں سے بیشتر انتخابات پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور بہت سے مزاحمت کاروں کی دھمکیوں کے پیش نظر اپنے چہرے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ بعد میں کسی قسم کی انتقامی کارروائی کا نشانہ بننے سے محفوظ رہ سکیں عراقی حکومت نے ابتدائی طور پر یہ خبر دی کہ ووٹ ڈالنے کا تناسب ۷۲ فیصد رہا ہے لیکن بعد میں اس دعوے کی تردید کی گئی اور حکومت نے کہا کہ لگ بھگ ۶۰ فیصد ووٹروں نے ملک بھر میں ووٹ ڈالا ہے۔

عمومی طور سے اس بات کی توقع کی جا رہی تھی کہ امریکی قبضے کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کی سنی جائے گی اور ووٹ ڈالنے کا تناسب بہت کم ہوگا لیکن عوام کی معقول تعداد نے انتخابات میں حصہ لے کر دنیا کو حیران کر دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے شفاف ہونے کے بارے میں کوئی حتمی اور یقینی بات نہیں کہی جا سکتی کیونکہ ان کی نگرانی کے لیے بین الاقوامی نگراں کمیٹی کے افراد نے عراق جانے سے انکار کر دیا تھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ انہیں اغوا کر لیا جائے گا۔ بین الاقوامی نگرانی نہ ہونے کے باوجود یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ عراقیوں نے توقع سے کہیں بڑی تعداد میں انتخابات میں حصہ لیا۔ اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا تھا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں رہنے والے عراقی بھی ووٹ ڈالنے کا حق استعمال کر سکیں چنانچہ ایران، آسٹریلیا، انگلستان، امریکا، اردن اور دوسرے ملکوں میں نوجوان اور بوڑھے عراقی مردوں اور عورتوں نے لمبی لمبی قطاریں لگائیں اور ووٹ ڈالے۔ ان میں سے بہت سے وہ تھے جو صدام حسین کی حکومت کے چنگل سے نکل کر بھاگے تھے اور جنہوں نے ایک بڑی مدت جلاوطنی میں گزاری ہے۔ ان کی خوشی کا عالم دیدنی تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عراق میں شیعہ اکثریت میں ہے لیکن ایک طویل عرصے سے ملک پر سنیوں کی حکومت قائم رہی ہے، بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ صدام حسین کے رشتہ داروں یا دوستوں کی حکومت رہی ہے۔ اس بات کی بناء پر شیعہ اکثریت شدید ناراض رہی ہے۔ حالیہ انتخابات میں ووٹروں کی کثیر تعداد شیعوں اور کردوں پر مشتمل تھی اور وہ کھلم کھلا اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور یہ بھی کہتے ہوئے سنے گئے کہ اب انہیں بھی حکومت کا حق ملے گا۔ عراقی سنی اس

صورت حال سے بہت متفکر تھے اور ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جمعہ کے روز خطبے میں بغداد کے سب سے بڑے سنی عالم نے مزاحمت کرنے والوں کی دھمکیوں اور سنی علما کی اپیلوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے نمازیوں سے کہا کہ وہ ان انتخابات میں ضرور حصہ لیں تا کہ ان کے نمائندے بھی اسمبلی میں پہنچ سکیں۔

سچ تو یہ ہے کہ دنیا والوں کی اکثریت عراق کی پیچیدہ سیاسی اور نسلی یا مذہبی صورت حال سے واقف نہیں۔ میں جب IKV کی Peace & conflict Resolution کانفرنس میں شرکت کے لیے دی ہیگ میں تھی تو عراق سے آنے والے کرد مردوں اور عورتوں کی باتیں سن کر حیران رہ گئی تھی۔ ایک طرف پاکستان، ہندوستان، بوسنیا، آئرلینڈ اور دوسرے ملکوں سے آنے والوں مندوبین تھے جو عراق پر امریکی حملے اور غاصبانہ قبضے کی شدید مخالفت کر رہے تھے، دوسرے طرف کُردوں کے نمائندے تھے جو امریکی قبضے کو اپنی نجات قرار دے رہے تھے اور اپنی خوشی کا کھلم کھلا اظہار کر رہے تھے۔ ان کرد خواتین سے جب میں نے بحث کی تو انہوں نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کرا دیا تھا کہ جو کچھ ہم پر گزری ہے، وہ آپ پر گزرتی تو ہم آپ سے پوچھتے۔ صدام حکومت نے کُردوں کے ساتھ جس نوعیت کے مظالم کیے، ان پر جس قدر بھیانک کیمیاوی ہتھیار استعمال کیے ان سے میں بہ خوبی واقف ہوں، اس لیے کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل سے وابستگی اور Index on Censorship کے مسلسل مطالعے کی بناء پر مجھے ان کے ساتھ دلی ہمدردی رہی ہے۔ تاہم کسی غیر ملکی طاقت کا آپ کے ملک پر مجھے قبضہ ایک الگ معاملہ ہے۔ میں نے کرد مندوبین کو یاد دلایا تھا کہ صدام حسین نے جو کیمیاوی ہتھیار آپ لوگوں پر استعمال کیے وہ امریکا کے دیے ہوئے تھے، اور اسے معلوم تھا کہ ان کا نشانہ آپ کی قوم بن رہی ہے لیکن اُس نے عراقی حکومت کو روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میری اس بات پر اُن خواتین نے مجھے گھور کر دیکھا تھا اور یہ کہا تھا کہ صدام حکومت سے نجات کے لیے ہم شیطان کا بھی خیر مقدم کر سکتے ہیں۔ میرے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

عراقی انتخابات کی کُردوں اور شیعوں کی خوشی کی تفصیل پڑھ کر میری نگاہوں میں اُن کُرد خواتین اور مردوں کے چہرے گھوم گئے ہیں۔ عراقی واقعی حیران کر دیتے ہیں۔ اگر حیران نہ کرتے تو کربلا اور نجف کے پولنگ اسٹیشن ویران رہتے اور فلوجہ، جہاں امریکی فوجوں کے خلاف سب

سے شاندار مزاحمت ہوئی اور جہاں کے بارے میں لوگوں کو یقین تھا کہ ووٹ ڈالنے کوئی نہیں نکلے گا وہاں بھی لوگ گھروں سے نکلے اور انہوں نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔

عراقی تجربے سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ عوام جمہوریت چاہتے ہیں۔ ان کی شاندار مزاحمت کے نتیجے میں امریکا وہاں انتخابات کرانے اور جمہوری عمل شروع کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ عراقی عوام نے غیر ملکی قبضہ ختم کرانے کے لیے مزاحمت کے جو مختلف حیران کن راستے اختیار کئے ہیں وہ جلد نتیجہ خیز ثابت ہوں گے۔

عراق دنیا کے لیے ہمیشہ سے حیرتوں کی سرزمین رہا ہے اور عراقی اس سے کہیں زیادہ حیران کر دیتے ہیں۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۲ فروری ۲۰۰۵ء

غلطی کا کفارہ

آج کی ڈاک میں مجھے ہوائی یونیورسٹی سے پروفیسر گلین ڈی پیج کا خط موصول ہوا ہے۔ ۱۹ر جنوری کے اس خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

'With Profound Respect for your historic contribution to a nonkilling world'.

اس محبت اور مبالغہ آمیز خط کے ساتھ ہی ان کی بیگم گلینڈا پیج نے میری تصویریں بھیجی ہیں جو انہوں نے کراچی یونیورسٹی کے انٹرنیشنل ریلیشنز کے شعبے میں پیج صاحب کے ساتھ اتاری تھیں۔ چند ہفتوں پہلے پیج صاحب اپنی کتاب Nonkilling Global Political Science کے اردو ترجمے کی تقریب رونمائی کے لیے بہ طور خاص کراچی آئے تھے۔ مجھ سے ان کا غائبانہ تعارف ہو چکا تھا، اس دن روبرو ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ ۷۶ برس کی عمر میں بھی وہ اپنے مقصد کو آگے بڑھانے اور دنیا میں عدم تشدد کو پھیلانے کے لیے کس قدر پُر جوش اور سرگرم ہیں۔ وہ یونیورسٹی آف ہوائی میں پروفیسر ایمریٹس ہیں اور سینٹر فار گلوبل نان وائلنس کے بانی صدر ہیں۔ ہونولولو میں رہتے ہیں اور عدم تشدد پھیلانے کی خاطر دنیا بھر کا سفر کرتے رہتے ہیں۔

ایک ایسے زمانے میں جب دنیا تشدد کی ایک طاقتور اور مہیب لہر کی زد میں ہے 'ہلاکت گریز عالمی علم سیاسیات' کو بڑھاوا دینے کی بات اپنی جگہ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ پروفیسر پیج کی یہ تازہ ترین کتاب انگریزی میں لکھی گئی اور اس وقت دنیا کی متعدد زبانوں میں شائع ہو چکی ہے جن میں عربی، چینی، فرانسیسی، گجراتی، ہندی، جاپانی، کورین، ملیالم، فلپینو، روسی، سنسکرت، سنہالی، ہسپانوی، تامل اور تھائی شامل ہیں۔

پروفیسر سکندر مہدی جو کراچی یونیورسٹی میں انٹرنیشنل ریلیشنز کے چیئرمین رہے ہیں اور ان دنوں رجسٹرار کے عہدے پر فائز ہیں، ان کی ملاقات ایک بین الاقوامی سیمینار میں پروفیسر پیج سے ہوئی۔ انہوں نے پیج صاحب کو مشورہ دیا کہ اس اہم کتاب کا ترجمہ اردو میں بھی ہونا چاہیئے۔ یوں یہ کتاب اردو میں شائع ہوئی اور پیج صاحب اس کی تقریب رونمائی کے لیے کراچی آئے۔

پروفیسر پیج سے تفصیلی ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس کتاب کے ترجمے پر مبارکباد دی اور عدم تشدد کے فلسفے پر تادیر بولتے رہے۔ انہوں نے مرحوم خان عبدالغفار خان کا بار بار ذکر کیا جنہیں ہمارے یہاں عموماً باچا خان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ عدم تشدد کا پرچار مہاتما گاندھی کے لیے آسان تھا کیونکہ وہ جس خطے میں اہنسا کی بات کر رہے تھے، وہاں ڈھائی ہزار برس پہلے بدھ مت اور جین مت کا بول بالا تھا اور آج بھی کروڑوں لوگ ان دونوں مذاہب کی عدم تشدد پر مبنی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس خان عبدالغفار خان نے اس علاقے میں عدم تشدد کی بات کی جہاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں پر بچہ اپنی مٹھی میں کارتوس لے کر پیدا ہوتا ہے ان کا کہنا تھا کہ باچا خان نے صرف بات ہی نہیں کی اپنا ایک بڑا حلقہ اثر پیدا کیا جو آج بھی موجود ہے اور ان کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے۔

پروفیسر پیج کی زندگی بھی عجیب نشیب و فراز سے گزری ہے۔ وہ اب سے ۷۶ برس پہلے امریکا میں پیدا ہوئے ۱۹ ربرس کے ہوئے تو فوج میں بھرتی ہو گئے اور کیپٹن کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء کے درمیان انہوں نے کوریا کی جنگ میں حصہ لیا۔ فوج سے نکلے تو بین الاقوامی سیاسیات کی تعلم حاصل کرنے میں جُت گئے اور ۱۹۵۹ء میں پی ایچ ڈی کر کے دم لیا۔ تعلیم اور تحقیق کے دوران رفتہ رفتہ پروفیسر پیج کی قلب ماہیت ہوتی گئی۔ وہ شخص جس نے کوریا کی جنگ میں حصہ لیا تھا، آخر کار عدم تشدد کا ایک ایسا پرچار کرنے والا بن گیا جسے علم سیاسیات کی بین الاقوامی برادری آج تسلیم کرتی ہے اور اس کی باتوں کو حوالے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

پروفیسر پیج کی اس عظیم تبدیلی میں سب سے بڑا ہاتھ اس بات کا ہے کہ جنوبی کوریا میں فوجی حکومت جس قدر ظالمانہ انداز میں اپنے لوگوں پر حکمرانی کر رہی تھی، اس کی مخالفت کرنے کے بجائے امریکی حکومت اس فوجی حکومت کی سرپرستی کر رہی تھی۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ جنوبی کوریا کے مقبول سیاسی رہنما کم دائی جنگ اور عدم تشدد پر یقین رکھنے والے شاعر کم چی ہا کو کسی وقت

بھی پھانسی ہو سکتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ امریکا ان غیر انسانی اقدامات اور عوام کے انسانی حقوق غصب کیے جانے کے معاملے کو سنجیدگی سے لے گا اور جنوبی کوریا کی راہ میں مزاحم ہوگا۔ اس بارے میں جب انہیں اپنی حکومت سے مایوسی ہوئی تو انہوں نے اس بارے میں غور وفکر شروع کیا۔ امریکا میں اٹھتے بیٹھتے جمہوریت اور انسانی حقوق کی بات کی جاتی تھی۔ وہاں لوگ آزاد تھے اور ان کے خیالات کی بناء پر انہیں سزائے موت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا، تو پھر امریکا ان اصولوں کو دوسرے ملکوں میں کیوں نظر انداز کرتا تھا؟ ایسی حکومتوں کی سرپرستی کیوں کرتا تھا جہاں فوجی آمر حکمران تھے اور اپنے لوگوں پر بدترین تشدد روا رکھتے تھے؟ ایسا کیوں تھا کہ بے گناہ اور بے قصور لوگ جنگوں اور خانہ جنگیوں میں مارے جا رہے تھے۔ اور ان جنگوں اور خانہ جنگیوں میں امریکا منفی کردار ادا کر رہا تھا؟ ان ملکوں کے جابر حکمرانوں کو امداد اور اسلحہ فراہم کر رہا تھا؟

بہت سے 'کیوں' تھے اور جب پروفیسر پیج نے ان کی گہرائی پر غور کیا تو سب سے پہلے انہیں کوریا کی جنگ میں اپنی شرکت پر ندامت ہوئی پھر انہوں نے یہ طے کیا کہ اپنی اس فاش غلطی کا کفارہ وہ اس طرح ادا کر سکتے ہیں کہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کے بارے میں کوشش کریں جہاں انسان، انسان کو قتل نہ کرتا ہو، جہاں طاقتور ملک کمزور ملکوں پر غاصبانہ قبضے اور ان کے وسائل پر قبضے کے لیے حملے نہ کرتے ہوں اور جہاں اس قوم کو 'عظیم' نہ مانا جائے جس کے اسلحہ خانے مہلک ترین ہتھیاروں سے اٹے پڑے ہوں۔

تشدد سے عدم تشدد کی طرف سفر بہت مشکل اور صبر آزما تھا۔ انہوں نے عدم تشدد کے فلسفے پر کتابیں پڑھیں، جین مت اور بدھ مت کا مطالعہ کیا۔ اس حوالے سے ٹالسٹائی بہ طور خاص ان کے زیر مطالعہ رہا۔ انہوں نے مہاتما گاندھی اور مارٹن لوتھر کنگ کے نظریات سے آگہی حاصل کی۔ پھر وہ سفر پہ نکلے اور ہندوستان، جنوبی امریکا اور روس گئے۔

جرمنی میں جس بھیانک پیمانے پر فاشزم کا فروغ ہوا تھا اس کے بعد وہاں عدم تشدد کے اصولوں پر بننے والی گرین پارٹی کی بانی صدر پیٹرا کے کیلی سے ملاقات کے بغیر وہ اپنے مطالعاتی دورے کو مکمل نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اسی لیے پیج نے کیلی سے تفصیلی ملاقاتیں کیں اور بحث مباحثوں میں حصہ لیا۔ ۱۹۸۱ء میں انہوں نے Islam and Nonviolence کے موضوع پر جزائر بالی میں یونیورسٹی آف ٹوکیو کے تعاون سے ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کرایا اور اسی نوعیت کی دوسری

سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ سائنسی خطوط پر ایسے شواہد اکٹھا کریں جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ انسان پیدائشی قاتل نہیں ہے۔

لگ بھگ پچاس برس کی تحقیقی کاوشوں، عدم تشدد پر یقین رکھنے والوں سے ملاقاتوں اور بحث مباحثوں کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ نہ صرف ایک ہلاکت گریز سماج ممکن ہے بلکہ انہوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کے نتیجے میں جب یہ کتاب لکھی تو اس میں یہ بھی ثابت کیا کہ انسانوں کی اکثریت نے کبھی کسی دوسرے انسان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا کی نصف آبادی خواتین پر مشتمل ہے اور ان میں سے ننانوے اعشاریہ نو فی صد قاتل نہیں ہوتیں۔ اس طرح مردوں کی اکثریت بھی کبھی قتل نہیں کرتی۔ انہوں نے کوریا کی جنگ کے ذاتی تجربے اور اس کے علاوہ دوسرے اعلیٰ فوجی افسروں اور سپاہیوں کی یادداشتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فوجیوں میں سے بھی بہت کم ایسے ہوتے ہیں جنہوں نے دوبدو مقابلے میں اپنے دشمن کی جان لی ہو۔

اپنی اس کتاب میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ 'اگر بنی نوع انسان فطری طور پر قاتل ہوتے، اگر صرف نصف انسانیت ناگزیر طور پر قاتلانہ رجحان کی حامل ہوتی، تو اپنی مختلف شکلوں میں خاندان کا وجود باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ باپ، ماؤں کو قتل کر ڈالتے، مائیں، باپوں کو، والدین بچوں کو اور بچے والدین کو۔ ایسے واقعات ہوتے تو ہیں لیکن ان واقعات کی بناء پر ہلاکت آفرینی کا ایک ایسا فطری قانون قائم نہیں ہوتا جو نوع انسانی کی تقدیر کے فیصلے کر سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت عرصہ پہلے دنیا کی آبادی عدم آباد کا رخ کر چکی ہوتی۔'

ایک ایسے زمانے میں جب مشرق، مغرب ہر طرف سے خون میں بھیگی ہوئی خبریں آتی ہیں، جب ہم ملک کے اندر اور باہر خودکش حملہ آوروں کو ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، جب ہمارے ٹیلی وژن اسکرین رسے بسے شہروں کو سوکھے ہوئے جنگل کی طرح جلتے ہوئے دکھاتے ہیں اور جب بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، کسی کو بمباری اور خون ریزی سے پناہ نہیں ملتی ایسے زمانے میں گلین ڈی پیج ایسے خواب دیکھنے اور خواب دکھانے والے قابل قدر ہیں۔

وہ اپنی ذات کے حوالے سے نہیں سوچتے، معمولی لباس اور گھسے ہوئے جوتوں میں وہ شہر شہر اور ملک ملک جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ دوستو زندگی بہت خوبصورت اور امکانات کا ایک خزانہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ حالات سے گھبرا کر خودکشی کر لینا یا حسد، ہوس اور انتقام کی آگ میں جل کر

کسی دوسرے شخص کی جان لے لینا، کسی ملک کے وسائل کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے اس پر چڑھ دوڑ نا غیرانسانی کام ہیں۔ ہمیں قتل کرنے کے لیے، ہمیں خوں ریزی اور ہلاکت خیزی کے لیے نہیں بنایا گیا۔ ہمارے ہاتھ، ہمارے ذہن، ہماری آنکھیں سب ہی اس لیے ہیں کہ ہم اس دنیا کو اپنی آئندہ نسلوں کے لیے جنت بنا جائیں۔ ہم اپنے پیچھے تلواریں لہراتے ہوئے اور بمبار طیاروں سے ہلاکت برساتے ہوئے لوگوں کی کہانیاں کیوں چھوڑ جائیں؟ ہمارے بچے جھولتے ہوئے جنگلوں، بہتے ہوئے شفاف دریاؤں اور سفید برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی کہانیاں کیوں نہ سنیں اور کیوں نہ کہیں۔

پروفیسر تیج اپنی تحریر سے اپنی گفتگو سے متاثر کرتے ہیں۔ وہ خواب دیکھنے والوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دنیا کو ہمیشہ خواب دیکھنے والوں ہی نے نئے خطوط پر تعمیر اور تبدیل کیا ہے۔ سری لنکا میں عدم تشدد کی توانا تحریک سرودیا شرمادھنا موومنٹ کے رہنما اے ٹی آریا رتنے کا تیج صاحب کے فلسفے کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ ان کے خیالات پولیٹکل سائنس کے عالموں اور مفکروں کو اس بات پر اُکساتے ہیں کہ وہ آگے بڑھ کر ایک ایسے سماج کی تعمیر میں شریک ہوں جہاں کبھی کوئی قتل نہ ہو اور نہ کسی کو قتل ہونے کا خطرہ درپیش ہو۔

ہم جس متشدد سماج میں زندہ ہیں اور ہر لمحے اپنی اور اپنے پیاروں کی جان کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں، اس سماج میں کیا اس سے زیادہ خوبصورت خواب دیکھا جاسکتا ہے؟

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۹ فروری ۲۰۰۵ء

مطلق العنان روشن خیال صدر عسکرا کایو

یہ ٦٠ء کی دہائی کے ابتدائی برس تھے جب میں نے کرغیزستان کو چنگیز آئتما توف کی کہانیوں اور ناولوں میں دریافت کیا۔ شاہ بلوط کے پیڑوں سے ڈھکے ہوئے اس کے بلند و بالا پہاڑ جن کی برفیلی چوٹیاں بادلوں کے نقاب میں اپنا چہرہ چھپاتی ہیں۔ ان پہاڑوں کے دامن میں سانس لینے والی دنیا کی عمیق ترین جھیل السیک ۔کول جس سے کرغیز شاعروں اور ادیبوں نے شاعری اور داستانیں کشید کیں۔ سوسوا سو برس پہلے گزرنے والا کرغیزستان کا قومی گیت نگار توکتوگُل (میں نے اسے ہمیشہ تختہ گُل کے نام سے پکارا) جس کے گیتوں میں کرغیزستان کے لوگوں کی آرزوئیں اور ان کے خواب سانس لیتے ہیں۔ اس کے مغرور جوان، اس کی طناز حسینائیں جن کی زندگی مشقت کرتے گزری لیکن جنہوں نے کسی مطلق العنان حکمران کے سامنے سرنہیں جھکایا، جن کی آزادمزاجی اور آزادہ روی کبھی انہیں کسی کا غلام نہیں بنا سکی۔ کرغیزستان کے یہ تمام روپ میں نے چنگیز کے ناولوں اور کہانیوں میں دیکھے اور انہیں کبھی فراموش نہ کرسکی۔

اب جبکہ کرغزستان اس وقت دنیا کی توجہ کا مرکز ہے اور وہاں ایک ناقابل یقین واقعہ رونما ہوا ہے تو مجھے چنگیز آئتما توف کے سارے ناول اور اس کے بہت سے کردار یاد آئے۔ میں نے ان کرداروں کو کبھی بشکک کی سڑکوں پر جمہوریت اور پارلیمنٹ کی بالادستی کے لیے نعرے لگاتے دیکھا اور کبھی وہ مجھے حزب اختلاف کے رہنماؤں کی صورت میں نظر آئے۔ واقعی بڑے لکھنے والے ایسے ہی زندہ کردار تخلیق کرتے ہیں جو ان کے سماج میں کہیں بھی، کبھی بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں اور ہمیں ان ادیبوں کی خلاقی کا قائل کردیتے ہیں۔ کرغیزستان میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، اسے اسی طرح ہونا چاہیئے تھا۔ افسوس اگر ہے تو اس بات کا کہ سابق اور مفرور صدر عسکرا کایو نے وہ سب

کچھ کیوں کیا جس کے بعد انہیں اپنے اہل خانہ کے ساتھ جان بچانے کے لیے پڑوسی ریاست قازقستان میں پناہ لینی پڑی۔؟

عسکرا کایو نے طبعیات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی لیکن شوق انہیں مصوری کا تھا، موسیقی سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ غم دنیا سے فرصت ملتی تو وہ کینوس پر رنگ بکھیرتے تھے، توکتوگل اور دوسرے کرغیز گیت نگاروں کے نغموں کو موسیقی کا آہنگ دیتے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ اپنے لوگوں کے طیش اور غضب کے رنگ اپنے ذہن کے کینوس پر نہ اتار سکے؟ اور اپنی حکومت کے خلاف لگائے جانے والے نعروں کی گونج کو اس وقت نہ سن سکے جب کرغزستان میں پیدا ہونے والے اس سیاسی بحران سے نمٹا جاسکتا تھا؟

کیسی عجیب بات ہے کہ چھتر ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا کرغیزستان جہاں تین ہزار سے زیادہ جھیلیں سانس لیتی ہیں، ان سب کا پانی بھی کرغیز عوام کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ناکافی رہا۔ وسطی ایشیا کا یہ ملک کرغیزستان، سوویت یونین کی تحلیل کے بعد اگست ۱۹۹۱ء میں آزاد ہوا۔ چین، قازقستان، تاجکستان، اور ازبکستان کی سرحدیں کرغزستان سے ملتی ہیں اور یہ معدنی دولت اور وسائل سے چھلکتا ہوا ایک حسین ملک ہے۔ یہاں کے لوگوں کو توقع اس بات کی تھی کہ آزادی کے بعد وہ سچی آزادی کا ذائقہ چکھ سکیں گے لیکن وہاں کے مطلق العنان حکمران صدر عسکرا کایو جو بہت روشن خیال اور معتدل مزاج سمجھے جاتے تھے، انہوں نے صرف زبانی جمع خرچ سے کام لیا۔ مسٹر اکایو سوویت یونین کی تحلیل سے قبل اس ریاست میں برسر اقتدار تھے اور گزشتہ ۱۴ برسوں میں ان کی گرفت اقتدار پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ وسطی ایشیا کی نو آزاد مملکتوں میں جو لوگ برسر اقتدار ہیں، ان میں مسٹر اکایو سب سے 'نرم مزاج' سمجھے جاتے تھے لیکن آزادی کے بعد وہ اپنے لوگوں کو محض وعدوں کے تحفوں سے بہلاتے رہے نسلی بنیادوں پر کرغیزستان میں کشیدگی بڑھتی گئی اور ملک میں موجود ازبک اقلیت سے کرغیز اکثریت کے تعلقات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ آزادی کے لگ بھگ ڈیڑھ برس بعد کرغیزستان میں بین الاقوامی سطح کی حقوق انسانی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا سبب یہ تھا کہ حکمران یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ان کا ملک حقیقی معنوں میں 'آزاد' ہوگیا ہے لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔ اس وقت کے کرغیز وزیر داخلہ کے حکم پر ازبکستان سے خفیہ طور پر آئے ہوئے حقوق انسانی کے تین سرگرم کارکنوں کو

گرفتار کرلیا گیا۔ از بکستان کی حکومت کو اپنے ان تین شہریوں کی تلاش تھی، چنانچہ کرغیز حکومت نے انہیں گرفتار کر کے از بکستان کی حکومت کے حوالے کر دیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے دنیا بھر سے آئے ہوئے حقوق انسانی کے رضا کاروں کو ششدر کر دیا اور کرغیز حکومت کی 'آزادی' اور 'غیر جانبداری' کے دعوے کو شدید نقصان پہنچا۔

آزادی کے فوراً بعد کچھ لوگ عسکرا کایو کو 'جمہوریت کا تابندہ ستارہ' کہتے تھے لیکن ملک میں جس بڑے پیمانے پر رشوت ستانی، بدعنوانی اور لاقانونیت پھیلی اس نے لوگوں کو دہشت زدہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی لوگ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ روسی اثر ورسوخ بڑھتا جا رہا ہے۔ روسی کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا گیا اور کرغیزستان وسط ایشیا کی وہ واحد ریاست بن گیا جہاں روسی فوجی اڈہ قائم ہوگیا۔ روسی اثر ورسوخ کا یہ عالم تھا کہ متعدد سابق کمیونسٹ افسران، اکایو حکومت میں اہم عہدوں پر فائز رہے اور جابرانہ انداز میں امورِ مملکت چلاتے رہے۔ یہ تمام باتیں عوام کو بر افروختہ کرتی رہیں لیکن ملک میں 'جمہوریت' کے نام پر جمہوری اصولوں کا قتل عام لوگوں کے لیے ایک عذاب بن گیا۔ ان کا خیال تھا کہ کمیونسٹ نظام کے خاتمے اور مارکیٹ اکانوی کے آغاز کے بعد ان کی زندگی میں بہتر تبدیلی آئے گی لیکن حقیقت یہ تھی کہ عوام کی غربت میں تیزی سے اضافہ ہوا، ان کا معیار زندگی گر گیا اور وہ ان سہولتوں سے بھی محروم ہوگئے جو انہیں سوویت یونین کے دور حکومت میں حاصل تھیں۔

سابق صدر اکایو آزادی کے پہلے دن سے صدارت کے عہدے پر فائز تھے، اس کے بعد وہ اپنے آپ کو صدر منتخب کرواتے رہے۔ ۲۰۰۰ء میں وہ جب صدر منتخب ہوئے تو لوگوں کو اندازہ ہوا کہ وہ اس عہدے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔ یہ خبریں بھی ملک میں گشت کرنے لگیں کہ وہ اپنے کسی قریبی رشتہ دار یا بااعتماد شخص کو صدر منتخب کروا کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی کہا جانے لگا کہ وہ ملکی آئین میں ترمیم کر کے صدر کی مدت لامحدود کرنے والے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیجیے کہ لوگوں کو اس بات کا یقین آ گیا کہ وہ تاحیات صدر رہنے کے خواہش مند ہیں۔ صدر اکایو نے ان افواہوں کی شدت سے تردید کی لیکن اسی شدت سے لوگوں کو ان پر یقین آتا گیا۔

انہیں جب دوبارہ صدر منتخب کیا گیا تھا، اسی وقت سے ان پر انتخابات میں دھاندلی کے

الزامات لگائے جانے لگے تھے اور پھر ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ ان الزامات کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ حزب اختلاف مضبوط ہوتی گئی، احتجاج کی آواز بلند تر ہوتی گئی اور اسی شدت سے اُسے دبایا جانے لگا۔ مارچ ۲۰۰۲ء سے احتجاجی مظاہروں کا آغاز ہوا۔ ایک ایسے ہی مظاہرے کے دوران پولیس نے فائرنگ کی چھ آدمی ہلاک ہوئے اور ۶۱ زخمی، ان میں سے ۴۷ پولیس والے تھے اور ۱۴ شہری۔ ۲۰۰۲ء کے مئی اور نومبر میں بھی صدر اکایو کی مخالفت میں پرتشدد مظاہرے ہوئے۔ ان مظاہروں کا سلسلہ اگلے دو برسوں میں جاری رہا۔ ۲۰۰۵ء کی ابتدا میں قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کا اعلان ہوا اور جب ان کے نتائج آئے تو لوگوں نے ان نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اوش اور جلال آباد میں ہونے والے مظاہروں میں دس افراد ہلاک ہوئے اور اس کے ساتھ ہی احتجاج کی آگ تیزی کے ساتھ پھیلتی چلی گئی۔ حکومت نے معاملے کو گفت و شنید کے ذریعے طے کرنے کا اعلان کیا لیکن حزب اختلاف کے رہنماؤں نے کہا کہ یہ مذاکرات اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں جب خود صدر عسکر اکایو اس میں موجود ہوں۔

صدر سے استعفیٰ کا مطالبہ بھی کیا گیا جسے انہوں نے مسترد کر دیا، احتجاج کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ مظاہرین صدارتی محل کے احاطے میں داخل ہو گئے اور اس پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے شہروں میں بھی مظاہرین نے سرکاری عمارتوں پر قبضہ کر کے اکایو سرکار سے آزادی کا اعلان کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۲۳ مارچ کو جب اسلام آباد میں جنرل پرویز مشرف یوم پاکستان کی پریڈ کی سلامی لے رہے تھے، اسی روز کرغیزستان کے مرد آہن، صدر عسکر اکایو اپنے اہل خانہ کے ساتھ ملک سے فرار ہو رہے تھے، یوں ان کی 'روشن خیال اور متعدل مزاج' حکومت اپنے انجام کو پہنچی۔ کرغیز حزب اختلاف کے سامنے ملک کو حقیقی جمہوریت سے ہمکنار کرنے کے لیے کڑی آزمائش کا سامنا ہے۔ وہ کس حد تک اس امتحان میں پورا اترتے ہیں، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن کرغیزستان میں جو کچھ ہوا وہ وسط ایشیا کی غیر جمہوری ریاستوں اور دوسرے متعدد ملکوں کے ان حکمرانوں کے لیے ایک سبق کی حیثیت رکھتا ہے جو روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے نام پر آئین کو پامال کرتے ہیں پارلیمنٹ کو یرغمال بناتے ہیں اور منتخب صدر کے لبادے میں مطلق العنان حکمران کے طور پر حکومت کرتے ہیں۔

یہ آخری سطریں لکھتے ہوئے مجھے ایک بار پھر چنگیز آئتماتوف کی یاد آئی۔ آزادی کے بعد وہ

کرغیز پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا، پھر یہ خبر آئی کہ وہ صدر عسکر اکائیو کے مقابلے میں صدارتی انتخاب لڑنا چاہتا ہے، اس کے بعد کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی اس خواہش کا کیا انجام ہوا۔ ہاں یہ ضرور معلوم ہے کہ اس کے بعد وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں اور یورپی یونین، ناٹو، یونیسکو، نیدرلینڈ اور لکسمبرگ میں کرغیزستان کے سفیر کے طور پر فرائض انجام دیتا رہا۔ ان دنوں وہ شاید لکسمبرگ میں رہتا ہے۔ عسکر اکائیو کا انجام دیکھنے کے بعد شاید اس نے سجدہ شکر ادا کیا ہو کہ وہ اس عہدے پر فائز نہیں ہوا۔

ایک مصور اور موسیقار نے صدارتی عہدے پر متمکن ہو کر جو کچھ کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کا ادیب اگر صدر ہوتا تو جانے وہ کیا کرتا۔ شاید اسی لیے بزرگوں نے اقتدار سے دامن بچانے کے لیے کہا ہے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۳۰ مارچ ۲۰۰۵ء

امن اور عورت

ایک کرم فرما ہیں جنہیں ریٹائر ہوئے عرصہ ہو چکا۔ بہت دنوں تک دونوں بہوؤں میں جھگڑے کراتے رہے، جب ان دونوں کو اندازہ ہوا کہ ان کے خسر لارڈ ماؤنٹ بٹین اور ریڈکلف سے کم نہیں تو انہوں نے آپس میں صلح کر لی اور انہیں ایک بہت عمدہ ریڈیو تحفے میں دے دیا۔ اب وہ اپنا بیشتر وقت ریڈیو ایران، آل انڈیا ریڈیو، بی بی سی، ڈوئچے وَلے اور وائس آف امریکا کی اردو سروس سننے میں گزارتے ہیں۔ اس کے بعد ان پروگراموں کی روشنی میں کچھ دوستوں کو خط لکھتے ہیں اور کچھ کو فون کر کے غیر فرمائشی پروگرام سناتے ہیں۔ میرا نام بھی ان کی ٹیلی فون ڈائری میں درج ہے۔ چنانچہ ۱۳ رمئی کی رات گیارہ بجے وائس آف امریکا اردو سروس کا پروگرام 'آپ کی محفل' ختم ہوا، اور ان کا فون آیا۔ میری آواز سنتے ہی انہوں نے نارض لہجے میں کہا ماشاللہ اب آپ عورتوں کو بھی یہ دعویٰ ہو گیا کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان امن کی کوششوں میں آپ لوگوں کا کوئی حصہ ہے۔

میں نے جان کی امان چاہتے ہوئے ان سے عرض کیا کہ حضور غلطی وائس آف امریکا کی اردو سروس نے کی ہے کہ اس موضوع پر ہندوستان اور پاکستان کی چند خواتین سے بات چیت براہ راست نشر کی، یہ سن کر وہ مزید ناراض ہوئے اور انہوں نے دھڑ سے فون بند کر دیا۔

بات اتنی سی تھی کہ مئی کے پہلے ہفتے میں واشنگٹن سے صفیہ کاظم کا فون آیا۔ وہ عرصہ دراز سے وائس آف امریکا کی اردو سروس سے وابستہ ہیں، میری ان کی ملاقاتیں ۶۸، ۶۹ میں وائس آف امریکا کے کراچی آفس میں ہوئی تھیں، ان سے تعلق خاطر کا رشتہ رہا، یہی وجہ ہے کہ وہ کراچی آئیں یا میں واشنگٹن جاؤں تو ان سے ملاقات رہتی ہے۔ لیکن یہ ان کا پہلا فون تھا جو امریکی دارلحکومت

سے آیا اس لیے مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ اردو سروس ایک گھنٹے کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس براہ راست نشر کرے گی اور مجھے بھی اس گفتگو میں حصہ لینا ہے۔ ۱۳ رمئی کی رات وائس آف امریکا اردو سروس کی صفیہ کاظم اور ہندی سروس کی رشمی شکلا ہم سے پوچھ رہی تھیں کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان امن قائم کرنے کی کوششوں میں دونوں ملکوں کی عورتوں کا کیا کردار رہا ہے؟

گفتگو نرملا دیش پانڈے نے شروع کی۔ وہ ایک بزرگ سیاسی رہنما ہیں، انہوں نے گاندھی جی، باچا خان اور اچاریہ ونا بھاوے کے ساتھ امن جلوسوں میں اور برٹش حکومت کے خلاف احتجاجی جلسوں میں حصہ لیا ہے جیل گئی ہیں۔ ہزاروں میل پیدل چلی ہیں۔ دونوں ملکوں میں وہ 'دیدی' کہی جاتی ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں امن کے لیے کام کرنے والوں کو 'گولی نہیں بولی' کا نعرہ ان ہی نے دیا ہے۔ دیدی نے بہ طور خاص ۲۰۰۴ء کا ذکر کیا جب وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بہائی، جینی اور بدھسٹ عورتوں کا امن کارواں لے کر قصور میں پنجابی کے مشہور صوفی شاعر بلھے شاہ کے عرس میں شریک ہونے کے لیے گئی تھیں اور ان سب کا بے مثال استقبال ہوا تھا۔

اسی طرح WIPSA کی Founder Member ڈاکٹر موہنی گری کی باتیں ہم نے سنیں۔ کارگل کے فوراً بعد انتہائی تناؤ کے دنوں میں انہوں نے ۴۱ عورتوں کے ساتھ بس میں لاہور اور اسلام آباد کا دورہ کرنے کی ہمت کی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کا سواگت ڈنڈوں اور پتھروں سے ہوگا لیکن اُن کا سواگت پھولوں اور محبتوں سے کیا گیا تھا۔ شوانی بھاردواج، پیم راجپوت اور نادرہ راج ببر نے بھی دونوں ملکوں کے درمیان امن قائم کرنے کی کوششوں کے بارے میں بتایا۔

پاکستان سے فہمیدہ ریاض نے امن کے حوالے سے ایک نظم سنائی۔ انیس ہارون، اجوکا تھیٹر کی مدیحہ گوہر، شوکت فرخ اور میں نے اس بات چیت میں لیا۔ مدیحہ گوہر نے اپنے مشہور اسٹیج ڈرامے 'ایک تھی نانی' کے بارے میں بتایا جس میں ۹۳ برس کی زہرا سہگل اور ۸۸ برس کی عذرا بٹ نے اداکاری کی تھی، یہ ہندوستان اور پاکستان میں بٹی ہوئی دو بہنوں کا قصہ ہے جسے دونوں ملکوں میں بہت پسند کیا گیا۔ مدیحہ کہنے لگیں کہ دونوں ملکوں کے لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لیے ہم ۱۶ برس سے کام کر رہے ہیں لیکن شروع میں ہمیں پاکستان میں بُرا بھلا کہا جاتا تھا۔ میرا

کہنا تھا کہ اب تو دونوں طرف کی سرکار دوستی کی بات کرتی ہے ورنہ ۲۶ برس پہلے ۱۹۷۹ء میں جب ہم بارہ پندرہ لوگوں نے 'پاک ہند پریم سبھا' بنائی، امن کی اور دوستی کی بات کرنے کے لیے جلسہ کیا، اور اس میں اس وقت کے انڈین کونسل جنرل مانی شنکر آئر (جوان دنوں پٹرولیم کے وزیر ہیں) کو چیف گیسٹ بنایا تو ہم غدار اور RAW کے ایجنٹ کہے گئے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ کارگل ایڈونچر کے فوراً بعد مئی ۲۰۰۰ء میں جب حنا جیلانی، عاصمہ جہانگیر اور میں ۶۰ عورتوں اور لڑکیوں کو لے کر دوستی بس کے ذریعے لاہور سے واہگہ کے راستے دلّی کے لیے روانہ ہوئے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا کہ ہندوستان جانے کے لیے اتنی بہت سی عورتیں ہمارے ساتھ ہیں۔ اس لیے کہ جب ہم نے ۱۹۷۹ء میں پاک ہند پریم سبھا بنائی تو بہت مشکل سے دس بارہ لوگ، اُس میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ ہر شخص ڈرتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ہندوستان سے امن کی بات نہیں کر رہے، پاکستان سے غداری کر رہے ہیں۔ اور اب پلوں کے نیچے سے پانی تو کیا، بڑے بڑے دریا بہہ گئے ہیں۔ پاکستان، ہندوستان کے درمیان امن کی بات کرنا ان دنوں فیشن ہے۔ اب جب میں سال میں تین مرتبہ عورتوں کی بلائی ہوئی امن کانفرنسوں میں جاتی ہوں، وہاں بہترین ادیب خواتین اور امن کے لیے سرگرم کارکن عورتوں کی باتیں سنتی ہوں تو جی خوش ہوتا ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ بات واقعی آگے بڑھی ہے۔

جنگ۔ عورتوں، مردوں، بچوں، بوڑھوں، شہروں، دیہاتوں سب ہی کو اپنا نوالہ بناتی ہے لیکن عورت پر دُہرا عذاب آتا ہے۔ جنگ کی صورت میں اس کا سب کچھ داؤ پر لگ جاتا ہے۔ اس کا گھر، اسکے بچے، خاندان، گھر کے مرد لڑنے جائیں، مارے جائیں، جنگی قیدی بنیں یالا پتہ ہو جائیں، جسمانی یا ذہنی طور پر معذور ہو کر گھر لوٹیں تو ان کے ہر وضع کے تشدد کو ان کے گھر کی عورت سہتی ہے۔ در بہ در ہونے کی صورت میں سر چھپانے کے لیے ٹھکانہ ڈھونڈنا، دو وقت کی روٹی، ایندھن، پانی اور دوا کا انتظام کرنا اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہوتا ہے کہ وہ فاتح فوجیوں کے ہاتھوں بے حرمت ہو کر بدترین جسمانی اور ذہنی اذیت کا شکار ہوتی ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں فاتح افواج نے مفتوح قوموں کی عورتوں کے ساتھ جو کچھ کیا، گزشتہ چند دہائیوں میں جاپانی، ویتنامی، بنگلہ دیشی، کشمیری، کرد اور افغان عورتوں پر جو گزری۔ بوسنیائی اور

فلسطینی اور دوسری متعدد قومیت کی عورتوں نے جو کچھ جھیلا، وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امن دنیا بھر کی عورتوں کا سب سے بڑا مسئلہ اور ضرورت ہے۔ سری لنکا، نیپال، شمالی آئرلینڈ، عراق جہاں بھی مسلح گروہ ایک دوسرے سے سر بہ گریباں ہیں وہاں کی عورتیں ان تنازعات اور مسلح تصادم کے خاتمے کے لیے کوشاں ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان امن قائم کرنے کے لیے خواتین کی کوششوں کو ہمیں دو حصوں میں بانٹ کر دیکھنا چاہئے۔ کچھ وہ ہیں جو امن کے لیے مہم چلاتی ہیں اور رضا کارانہ طور پر امن دوست سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہیں۔ دوسری وہ خواتین ہیں جنہوں نے اپنی تحریروں سے دونوں ملکوں کے درمیان بچھی ہوئی نفرت کی بارودی سُرنگوں کو ناکارہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ برصغیر کی ادیب خواتین یہ کام آج سے نہیں ۱۹۴۷ء سے کر رہی ہیں، ان میں عصمت چغتائی، امرتا پریتم، قرۃالعین حیدر، خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ، جمیلہ ہاشمی، مہاشویتا دیوی، جیلانی بانو، کرشنا سوبتی، اجیت کور، بپسی سدھوا بالکل سامنے کے نام ہیں۔ ہم جب دونوں ملکوں کے درمیان امن کی اور اس میں خواتین کے کردار کی بات کرتے ہیں تو ہم ارون دھتی رائے کو کیسے بھلا سکتے ہیں جنہوں نے The End of Imagination لکھ کر ہندستان اور پاکستان کے لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور انہیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان ایٹمی دشمنی کے نتیجے میں دونوں طرف کے کروڑوں لوگ اذیت ناک موت سے دوچار ہو جائیں گے اور ہمارا شاندار علمی، ادبی اور ثقافتی ورثہ نیست و نابود ہو جائے گا۔ اس حوالے سے میں نے بھی اپنی کہانیوں، اپنے کالموں اور اپنی کتاب 'ضمیر کی آواز' میں چھپنے والے مضامین کے ذریعے کوشش کی کہ امن کے لیے کی جانے والی کوششوں میں اپنا حصہ ڈال سکوں۔

اسی طرح فرقہ واریت اور جنگی جنون کے علاوہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان امن قائم کرنے کی کوششوں کے حوالے سے ہم ٹیسٹا اسٹلواڈ کی حصہ داری کو بھی نہیں بھول سکتے۔ وہ بال ٹھاکرے کے ممبئی میں رہتی ہیں ۱۹۹۳ء سے Combat Communalism نکال رہی ہیں اور اس کے علاوہ بھی انہوں نے ان موضوعات پر متعدد کتابیں مرتب اور شائع کی ہیں۔ ٹیسٹا نے امن کے حوالے سے اپنے رسالے کے کئی خصوصی نمبر شائع کیے اور بہ طور خاص گجرات فسادات اور بیکری کیس میں ان کے رسالے نے سچ کی وکالت مدلل اور پُر زور انداز میں کی ہے۔ اسی طرح

ریتومینن، اروشی بُٹالیا، کملابھسین اور دوسری متعدد خواتین ہیں جن کے قلم نے جنگی جنون، فرقہ واریت اور انسان دشمنوں کے خلاف بند باندھے ہیں۔ یہ کوششیں دونوں طرف ہوئی ہیں، ان کوششوں کو ہم جس قدر سراہیں وہ کم ہے۔ ان خواتین نے برصغیر کی عورت کا سر بلند کیا ہے۔

روز نامہ 'جنگ'، کراچی

۱۸رمئی ۲۰۰۵ء

ضمیر کی عدالت کا فیصلہ

مارچ ۲۰۰۳ء میں جب ٹونی بلیئر کی حکومت نے عراق میں برطانوی فوجوں کو بھیجنے کا فیصلہ کیا تو سیاستدانوں، دانشوروں، ادیبوں اور حقوق انسانی کے سرگرم کارکنوں کا ایک بڑا حلقہ بلیئر کی عراق پالیسی کی شدت سے مخالفت کررہا تھا۔ ان تمام لوگوں اور برطانوی عوام کی ایک بڑی تعداد کا کہنا تھا کہ ہمیں امریکی مفادات کی خاطر اس پرائی لڑائی میں حصہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ غیر انسانی اقدام ہے اور آگے چل کر ہمیں اس کی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی۔ ان ہی دنوں بلیئر کابینہ کی ایک وزیر کلارے شارٹ Clare Short نے اس اقدام پر احتجاج کرتے ہوئے وزارت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ میں اپنے ہاتھوں پر بے گناہوں کا خون نہیں دیکھ سکتی۔

۷/۷ کے بم دھماکوں پر بیشتر برطانوی سیاستدانوں نے بہت محتاط ردّعمل کا اظہار کیا ہے اور مارچ ۲۰۰۳ء میں ٹونی بلیئر کے فیصلے کو سات جولائی کے بم دھماکوں سے جوڑنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ تاہم کالارے شارٹ نے اس موقعہ پر کسی قسم کی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا اور جی ایم ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ کہا کہ مجھے اس بات میں ہرگز شبہہ نہیں کہ لندن میں ہونے والے بم دھماکوں کا تعلق عراق میں برطانیہ کی فوجی مداخلت سے ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ حکومتی حلقوں سے بعض ایسی آوازیں اٹھ رہی ہیں جو اس معاملے کو 'بدی' قرار دے رہی ہیں، یہ آوازیں ہمارے ہر اقدام کو درست کہہ رہی ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم عراق میں ہونے والی بے اندازہ ہلاکتوں میں ملوث ہیں اور ہم شرق اوسط کے بارے میں ایک ایسی پالیسی کی حمایت کررہے ہیں جو فلسطینیوں کو ہمارے دُہرے معیار کے بارے میں آگاہ کرتی ہے اور ان کے اندر طیش کو جنم دیتی ہے۔

کلارے شارٹ کی مخالفت صرف حکمران جماعت نے ہی نہیں کی ہے، ان کی مخالفت میں ن ایسے ممبر پارلیمنٹ بھی پیش پیش ہیں جو مسلمان ہیں، پاکستانی ہیں اور جن کا کہنا ہے کہ ان بم ماکوں کو عراق کی جنگ سے جوڑنا بہت خطرناک ہوسکتا ہے۔ وہ اسے عمل کا ردِعمل قرار دینے سے ریز کی پالیسی اختیار کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔

یہ موقف صرف ایک سابق برطانوی وزیر کا ہی نہیں، دوسرے بہت سے برطانوی، امریکی .ور مغربی دانشوروں کا بھی ہے۔ ان تمام لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ہم دنیا کو ایک محفوظ جگہ بنانا چاہتے ہیں تو امریکا، برطانیہ اور دوسرے مغربی ملکوں کو عراق سے اپنی فوجیں فوراً نکال لینی چاہئیں۔

عراقی عوام گزشتہ دو برس سے شدید مصائب کا شکار ہیں نہتے شہریوں پر ہونے والی بے محابا بمباری، ان کے شہروں کی تباہی، ان کے ثقافتی ورثے کی بربادی، ان کے تیل کے کنوؤں پر غاصبانہ قبضہ اور اس سے پہلے سالہا سال تک ان پر عائد کی جانے والی پابندیاں جس نے لاکھوں بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور ایک خوددار قوم کو بھک منگوں کی صف میں بٹھا دیا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو قوموں کے اندر بارود بچھا دیتی ہیں۔ لندن بم دھماکوں کی جتنی مذمت کی جائے وہ کم ہے کیونکہ اس میں بھی بے گناہ جانیں ضائع ہوئیں لیکن اس کے ساتھ ہی عراق اور افغانستان اور جنوبی وزیرستان، فلسطین یا دوسرے علاقوں میں ہونے والی قطعاً بے گناہ لوگوں کی ہلاکتوں کا بھی ماتم ہونا چاہیے۔

ویتنام کو جب امریکا نے اپنا وار تھیٹر بنایا تو عالمی ضمیر بہت دیر سے بیدار ہوا تھا اور اس بیداری میں بھی سب سے بڑا ہاتھ اس برطانوی بوڑھے برٹرینڈ رسل کا تھا جسے پولیس سڑکوں پر گھسیٹتی تھی اور ویتنام جنگ کے خلاف جس کے تنہا مظاہرے برطانوی عوام کو اس قدر مشتعل کرتے تھے کہ وہ اس کی تواضع سڑے ہوئے ٹماٹروں سے کرتے تھے۔

گزشتہ چالیس برسوں میں دنیا بہت بدل گئی ہے، آج دنیا میں کروڑوں کا ایک حلقہ موجود ہے جس کے لیے امن اس کے ضمیر کا مسئلہ ہے۔ عراق کے حوالے سے امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف ۲۳ سے ۲۷ جون تک استنبول میں ورلڈ ٹریبونل برائے عراق کا تکمیلی اجلاس ہوا جس میں عراق کی جنگ اور اس کے قانونی پہلو، اس جنگ کے حوالے سے اقوام متحدہ کا کردار، عراق میں جن جنگی جرائم کا ارتکاب کیا گیا، عراق کے اس ثقافتی ورثے کی تباہی جو دراصل تمام دنیا کا ثقافتی

ورثہ تھا، جنگ کے نتیجے میں ماحولیات کی تباہی اور میڈیا نے اس جنگ کے حقائق جس طور پیش کیے، یہ تمام معاملات اس ٹریبونل کے اختتامی اجلاس میں زیر بحث آئے۔

یہ ٹریبونل اب سے دو برس پہلے قائم ہوا تھا اور اس کے مختلف اجلاس اس دوران بارسلونا، ممبئی، لندن، کوپن ہیگن، برسلز، نیویارک، ہیروشیما، لزبن، جنوبی کوریا، روم اور جنیوا میں ہوتے رہے۔ ٹریبونل نے حملے اور قبضے کے شواہد اور جو تاریخی دستاویزات اکٹھا کی تھیں وہ سب کی سب اختتامی اجلاس میں پیش کی گئیں۔ اس مقدمے میں جیوری کے ممبران ترکی، ہندوستان، ملیشیا، امریکا، بلجیم، برازیل، جنوبی کوریا، اسرائیل، عراق، ارجنٹائن اور جنوبی افریقہ کے دانشوروں، ادیبوں، وکلا اور صحافیوں پر مشتمل تھے۔ افسوس کہ اس ٹریبونل میں کوئی پاکستانی موجود نہیں تھا جبکہ رسل کے قائم کردہ وار ٹریبونل میں مرحوم محمود علی قصوری نے پاکستانی دانشوروں اور صاحب ضمیر افراد کی نمائندگی کی تھی۔ ہم نے گزشتہ چالیس برسوں میں جتنی 'ترقی' کی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مرحوم قصوری صاحب کے صاحبزادے اب ایک فوجی حکومت کے وزیر خارجہ ہیں اور 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' میں امریکا کے حمایتی۔ اس ٹریبونل میں ہمارے یہاں سے اگر کوئی منتخب نہیں ہوا تو اس میں خطا کسی اور کی نہیں ہماری ہے۔ ویسے یہ بات بھی کچھ کم دلچسپ نہیں کہ اس ٹریبونل کا صرف آخری اجلاس ایک مسلمان ملک ترکی کے شہر استنبول میں ہوا، ورنہ تمام اجلاس اغیار، کفار اور مشرکین کے شہروں میں ہوئے۔

ہندوستان کی ارون دھتی رائے جنہوں نے عراق پر امریکا کے حملے اور قبضے کے خلاف آدھ درجن سے زیادہ مضمون لکھے، جنہیں ۱۹۹۷ء میں ادب کو بوکر انعام مل چکا ہے۔ ۲۰۰۴ء میں سڈنی امن انعام دیا گیا اور ۲۰۰۲ء میں لانان کلچرل فریڈم انعام دیا گیا، انہوں نے ۲۳ جون کو اس اختتامی اجلاس کی اختتامی تقریر کی۔ وہ اپنی بے باکی اور لگی لپٹی رکھے بغیر سخت سے سخت بات کہہ دینے کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہو چکی ہیں۔ یہ شہرت انہوں نے گزشتہ چھ برسوں میں حاصل کی ہے، اس شہرت کا آغاز ان کے مضمون 'تخیل کی لذت' سے ہوا جس میں انہوں نے ہندوستان کے ایٹمی دھماکوں کی پُر زور مخالفت اور مذمت کی تھی اور یہ کہا تھا کہ اگر یہ بات غداری ہے تو ہاں۔ میں غدار ہوں۔

ان ہی ارون دھتی رائے نے ورلڈ ٹریبونل برائے عراق میں اختتامی اجلاس کا آغاز کرتے

ہوئے کہا کہ:

یہ اجلاس ترکی میں منعقد ہورہا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی اپنی اہمیت ہے۔ امریکا نے مارچ ۲۰۰۳ء میں، عراق پر فوجی قبضے سے پہلے عراقی دفاع کو تباہ کرنے کے لیے، ترکی کے فضائی اڈوں کا بھرپور استعمال کیا۔ ترکی آج بھی امریکا کا ایک اہم سیاسی اتحادی ہے حالانکہ اس ملک کی رائے عامہ اپنی حکومت کی اس پالیسی کی شدید مخالف ہے۔ ضمیر کی جیوری کی ترجمان کی حیثیت سے یہ امر میرے لیے تکلیف کا باعث ہوگا اگر میں ہندوستان کی حکومت کا ذکر نہ کروں جو ترکی کی حکومت کی طرح معاشی پالیسیوں اور دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں امریکا کی اتحادی ہے۔

یہ ٹریبونل بجائے خود مزاحمت کی ایک علامت ہے۔ تاریخ کی ان بدترین بزدلانہ جنگوں کے خلاف، اس جنگ کے خلاف جس میں پہلے بین الاقوامی اداروں کو ایک ملک کو غیر مسلح کرنے کے لیے استعمال کیا گیا اس کے بعد اس ملک کے خلاف ہتھیاروں کا ایسا بے دریغ استعمال ہوا جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی اور یہ بین الاقوامی ادارے اس حملے میں جارح کے ساتھ تھے۔

دوسری بات واضح ہونی چاہیے کہ اس ٹریبونل کا مقصد صدام حسین کا دفاع کرنا ہرگز نہیں ہے۔ صدام حسین نے عراقیوں، کردوں، ایرانیوں، کویتیوں اور دیگر لوگوں پر جو مظالم کئے ہیں، انہیں موجودہ المیے کے دور میں بھی معاف اور فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تاہم، اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جب صدام حسین انسانوں پر بدترین مظالم کررہے تھے تو اس وقت انہیں امریکی حکومت کی مکمل سیاسی اور مادی حمایت حاصل تھی۔ جب وہ گیس کے ذریعے کردعوام کو ہلاک کررہے تھے تو امریکی حکومت انہیں مالی امداد اور اسلحہ فراہم کیا کرتی تھی۔

ورلڈ ٹریبونل برائے عراق میں ایسے ممتاز افراد شامل ہیں جو ظالمانہ جارحیت اور بدترین پروپیگنڈے کے دور میں بڑی ہمت اور ولولے سے ایسی شہادتیں اور حقائق مرتب کررہے ہیں جو ان لوگوں کے لیے ایک موثر ہتھیار کا کام دیں گے جو عراق پر قبضے کے خلاف مزاحمت کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ ان امریکی، برطانوی، اطالوی اور آسٹریلوی سپاہیوں کے لیے ہتھیار ثابت ہوں گے جو کسی کی جان نہیں لینا چاہتے اور اس جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہتے جس کی بنیاد جھوٹ پر رکھی گئی ہے۔ اس ٹریبونل نے جو حقائق اور معلومات مرتب کیے ہیں وہ صحافیوں،

ادیبوں، شاعروں، گلوکاروں، مصوروں، وکیلوں، پلمبروں، ٹیکسی ڈرائیوروں، کاریں ٹھیک کرنے والوں اور ان تمام باضمیر لوگوں کے لیے ہتھیار کا کام دیں گے جو اس قبضے کی مزاحمت کرنا چاہتے ہیں۔

انٹرنیشنل کرمنل کورٹ کو چاہیے کہ وہ اس ٹریبونل کی شہادتوں کو بش، بلیئر، جان ہورڈ، سلویو بریسونی سمیت ان تمام سرکاری افسروں، فوجی جرنلوں، کارپوریٹ کے سربراہوں کے خلاف جنگی مجرم کے طور پر مقدمہ چلانے میں استعمال کرے۔ عراق پر حملہ، ہم سب کی عزت نفس، ذہانتوں اور مستقبل پر حملہ ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ بین الاقوامی قانون، ورلڈ ٹریبونل برائے عراق کے فیصلے پر عمل کا پابند نہیں ہے۔ یہ ٹریبونل، دنیا کے ان کروڑوں انسانوں کے ضمیر کی آواز ہے جو عراقی عوام کے قتل، محکومیت اور تذلیل پر خاموش تماشائی بنے نہیں رہنا چاہتے۔

یہ فیصلہ عراق کے مظلوم عوام کے حق میں ہے۔ طیش میں بھرے ہوئے مسلمان نوجوان کیا اس فیصلے سے اتفاق نہیں رکھتے؟ اور اگر رکھتے ہیں تو انہیں انتہا پسندانہ کارروائیوں کی بجائے اُن لوگوں سے جڑنے کی ضرورت ہے جو ان کے ہم خیال اور ہم آواز ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ جڑ کر وہ دنیا کے مظلوموں کے لیے زیادہ بڑا کام کر سکتے ہیں، امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف زیادہ بڑی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۲۰ جولائی ۲۰۰۵ء

۶۰ برس میں امریکا نے کیا سیکھا؟

وہ ۱۹۹۸ء کے موسم خزاں کی ایک اداس سہ پہر تھی جب میں ویتنام ویٹرنز میموریل کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ شیشے کی طرح چمکتے ہوئے سیاہ گرینائٹ کی دو اونچی اور طویل دیواریں جن پر لگ بھگ ۵۸ ہزار اُن امریکی سپاہیوں کے نام کندہ ہیں جو ویتنام کی جنگ میں کام آئے یا جن کی پھر کوئی خبر نہ ملی۔ پیتل کے اونچے اونچے رحل نما اسٹینڈ جن پر جنگ میں کام آنے والوں کے ناموں کی حروف تہجی کے اعتبار سے فہرستیں۔ بوڑھی عورتیں اور مرد ان فہرستوں میں اپنے پیاروں کے نام ڈھونڈتے ہوئے۔ اور پھر دیوار پر ان کے نام پڑھتے ہوئے۔ آنکھ سے گرتے ہوئے آنسو بوڑھے ہاتھوں میں کانپتا ہوا پھولوں کا گلدستہ۔ ان لوگوں کا غم حق بجانب لیکن ان لاکھوں ویتنامیوں کا حساب کہاں تھا جو اپنے شہروں دیہاتوں اور جنگلوں میں حملہ آور امریکیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

اس روز میری آنکھوں کے سامنے ہیروشیما اور ناگاساکی میں امریکا کے ایٹمی حملوں سے مارے جانے والے بے گناہ شہریوں کی لاشوں کے ڈھیر اور زخمی ہونے والوں کے عذاب گھوم گئے تھے۔ ہیروشیما میں چند منٹ کے اندر ایک لاکھ چالیس ہزار شہری ختم ہوئے، ناگاساکی میں مارے جانے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے کم تھی۔ یہ دو ہدف جنہیں امریکی حکومت بار بار 'فوجی ہدف' قرار دیتی رہی وہاں ہلاک ہونے والوں کی ۹۵ فی صد تعداد عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھی۔

ہیروشیما کے امن پارک میں ان ایک لاکھ چالیس ہزار شہریوں کے لیے ہر سال اگر بتیاں اور شمعیں جلائی جاتی ہیں، نوجوان، بچے اور بوڑھے ان کی یاد میں رنگین قندیلیں روشن کر کے دریاؤں میں بہاتے ہیں اور ہر مرتبہ اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ وہ غلطی جو امریکیوں نے کی، وہ

ہم کبھی نہیں کریں گے۔ لیکن افسوس کہ امریکا نے ۶۰ برس پہلے جو غلطی کی تھی اس سے آج تک کچھ نہیں سیکھا۔ ۱۹۴۵ء میں اپنی بے پناہ فوجی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے بعد اس کے حکمرانوں نے کبھی بھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ غلطی پر ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد یہ تو درست ہے کہ امریکا نے ایٹمی ہتھیار استعمال نہیں کیے لیکن اس کے بعد اس نے اپنی قاہرانہ قوت کے اظہار کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں کیوبا مزائل کرائسس کے موقعہ پر انسانی تاریخ کا شاید سب سے بڑا نیوکلائی بحران پیدا ہوا جسے اس وقت کے سوویت یونین کے رہنماؤں کے تحمل نے ٹال دیا۔ سابق امریکی وزیر دفاع رابرٹ میکنامارا نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ویتنام جنگ کے دوران بھی کئی مرتبہ، جنگ جیتنے کے لیے، ویت نامیوں پر نیوکلیائی بم مارنے کے بارے میں غور کیا گیا تھا۔ اس وقت بھی امریکی حکومت نیوکلیائی ہتھیاروں کے بارے میں جو پالیسی رکھتی ہے اسے مسترد کرتے ہوئے رابرٹ میکنامارا نے 'فارن پالیسی' کے مئی جون ۲۰۰۵ء کے شمارے میں لکھا ہے کہ ان نیوکلیائی ہتھیاروں کے استعمال کے بارے میں امریکی نقطۂ نظر 'غیر اخلاقی، غیر قانونی، فوجی نقطۂ نظر سے غیر ضروری اور انتہائی حد تک خطرناک ہے۔'

ادھر سابق امریکی اٹارنی جنرل رامزے کلارک کے اس بیان کو سامنے رکھیے کہ 'شروع سے آج تک ہمارا بنیادی مقصد یہ رہا ہے کہ ہم دنیا پر اپنی مکمل بالادستی قائم کرسکیں۔ ہم کرۂ ارض پر موجود ہر ملک و قوم کو اپنے زیر نگیں لانا چاہتے ہیں۔ ایسا عدم تشدد سے ممکن ہو سکے تو اچھا ہے، وگرنہ ہم بھیانک تشدد استعمال کرنے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔'

سابق اعلیٰ امریکی اہل کاروں کے یہ بیانات اس بات کا واضح اشارہ ہیں کہ امریکی حکمرانوں کی سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے دنیا کے کسی بھی ملک سے کہیں زیادہ ملکوں اور ریاستوں پر حملہ کیا ہے اور انہیں تہس نہس کیا ہے۔ آج جبکہ دنیا بھر میں ایٹمی حملوں کی ۶۰ ویں سالگرہ منائی جارہی ہے اور ساری دنیا کے باضمیر انسان ایٹمی ہتھیاروں اور طاقت کے ذریعے کمزور ملکوں پر غاصبانہ حملے کے خلاف مظاہرے کررہے ہیں، حد تو یہ ہے کہ واشنگٹن اور نیویارک کے علاوہ دوسرے امریکی شہروں میں بھی جنگ مخالف مظاہرے ہورہے ہیں اس وقت بھی امریکی حکمرانوں کو اپنی فاش غلطیاں نظر نہیں آتیں۔

اس وقت یہ حقیقت دنیا میں سب پر آشکار ہو چکی ہے کہ پانچ ہزار برس کی انسانی تاریخ میں اب تک امریکی جنگی طاقت سے بڑی قوت قاہرہ نہیں ابھری ہے۔ اگلے برس امریکا کا فوجی بجٹ ۳۹۶ بلین ڈالر ہوگا۔ یہ گزشتہ امریکی فوجی بجٹ سے لگ بھگ ۵۰/ارب ڈالرز زیادہ ہے۔ یہ روس کے فوجی بجٹ سے چھ گنا زیادہ ہے۔ یورپی یونین کے تمام ملک اسلحہ پر جتنی رقم خرچ کرتے ہیں امریکا اس سے چار گنا زیادہ رقم صرف کرتا ہے۔ اور ہاں امریکا اس وقت جن ملکوں پر حملہ آور ہے، قبضہ کر چکا ہے یا انہیں شدید دباؤ میں رکھے ہوئے ہے، میری مراد عراق، ایران، لیبیا، شمالی کوریا، سوڈان، شام اور کیوبا سے ہے، ان سات ملکوں کے مشترک فوجی اخراجات سے اس کا فوجی خرچ ۲۶ گنا زیادہ ہے۔ عراق جس پر بھاری پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے ہتھیاروں کے رکھنے کا الزام لگا کر امریکا نے حملہ کیا تھا اس کے فوجی اخراجات سے ۲۹۳ گنا زیادہ امریکا کے فوجی اخراجات ہیں۔ صدر امریکا کے کہنے کے مطابق ۲۰۰۷ء میں وہ ان اخراجات میں مزید اضافہ کریں گے اور ۴۵۱ بلین ڈالر اس مد میں خرچ کریں گے۔

بیسویں صدی سے آج تک اگر امریکی استبداد کا اور قوت قاہرہ کے ذریعے بلواسطہ یا بلاواسطہ طور پر قوموں کو کچلنے کی امریکی پالیسیوں کا جائزہ لیا جائے تو فلپائن، کوریا، کمبوڈیا، ویتنام، ہیٹی، کیوبا، عراق، افغانستان، نکاراگوا اور لاطینی امریکا کے مختلف ملک امریکی جبروت کا شکار نظر آتے ہیں اور یہ مصرعہ بے اختیار لبوں پر آجاتا ہے کہ:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

یہ درست ہے کہ جاپان پر ایٹمی حملے کے بعد اور بہ طور خاص ویتنام جنگ کے آخری دنوں میں امریکی شہریوں میں اپنی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف جذبات ابھرے اور وہ لاکھوں کی تعداد میں جلوس نکال کر اور کھلے بندوں اپنے حکمرانوں سے اختلاف کر کے اس کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں لیکن سب سے الم ناک یہ حقیقت ہے کہ امریکی حکمرانوں کو اپنی بھیانک غلطیوں کا نہ احساس ہے اور نہ ادراک۔

ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے والے میجر کلاڈ ایتھرلے نے جاپانی عوام کے نام ایک کھلے خط میں لکھا تھا کہ میں وہ فوجی ہوں جس نے ہیروشیما کو نیست و نابود کیا۔ میرا ضمیر اس جرم پر عذاب میں مبتلا ہے۔ میں معافی کا طلب گار ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے خلاف کیوں صف آرا ہوں؟

جنگ ایک وحشیانہ اور غیر انسانی فعل ہے۔ ہم اشرف المخلوقات ہو کر خود ہی ایک دوسرے کو کیسے تباہ کر سکتے ہیں؟ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے ہیروشیما کی راکھ میں سونے والے'امن، کے لیے فریاد کرتے ہیں۔

۶۰ برس ایک طویل مدت ہے جس میں کوئی ملک اپنی غلطیوں سے کنارہ کر سکتا ہے، اپنی خطاؤں پر معذرت کر سکتا ہے لیکن وہ طاقت جو امریکی حکومت نے ایٹم بم کی صورت حاصل کی اور اُسے جاپان کے بے گناہ شہریوں پر آزما کر یہ جانا کہ جیتے جاگتے شہر آدھے منٹ میں یوں مسل کر پھینکے جا سکتے ہیں جیسے وہ کوئی پتنگا، یا مچھر ہوں۔ اس احساس نے انہیں فرعونِ بے سامان بنا دیا۔ سوویت یونین کی تحلیل کے بعد اب وہ دنیا کی واحد طاقت ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس طاقت کے بل پر وہ ساری دنیا کے ملکوں کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

امریکا نے جاپان پر اس وقت ایٹمی حملہ کیا جب وہ ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار تھا اور عالمی جنگ کا ختم ہو جانا محض چند دنوں کی بات تھی۔ اس کے باوجود امریکی صدر نے ان دو شہروں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ دنیا کو یہ بتا دیا جائے کہ امریکا کس قوت قاہرہ کا مالک ہے۔ یہ سبق سوویت یونین کے لیے بھی تھا جو امریکا کے برابر آنے کی کوشش میں جُٹا ہوا تھا۔

ہیروشیما کی ایٹمی تباہی کے حوالے سے چند دنوں پہلے لاس اینجلس ٹائمز میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہم امریکی جنہیں اس وقت اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتے ہیں، وہی ہم پر اس ہتھیار سے حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جو ہم نے جاپانیوں کے خلاف استعمال کیا تھا اور جس کے بعد وہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔

لاس اینجلس ٹائمز کا کہنا ہے کہ اُسامہ بن لادن کے بیانات میں بار بار ہیروشیما کا حوالہ آتا ہے، یہ کہا جاتا ہے کہ ہم ان گنت امریکیوں کو ہلاک کر دیں گے، ہم وہ کریں گے کہ لوگ ۹/۱۱ کو بھول جائیں گے۔ یہ باتیں، یہ بیانات اس بات کا اشارہ ہیں کہ بہت سے لوگ ہمارے بارے میں اسی طرح سوچ رہے ہیں، جس طرح ہم نے ۱۹۴۵ء میں جاپانیوں کے بارے میں سوچا تھا۔ وہ سوچ رہے ہیں کہ جس طرح امریکا نے ان شیطانی ہتھیاروں کو استعمال کر کے جاپانی شہنشاہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا، اسی طرح ہم امریکا کو بھی مشرق وسطیٰ سے نکل جانے پر مجبور کر سکتے

ہیں۔

امریکیوں نے کبھی اس بات کا شاید تصور بھی نہ کیا ہو کہ جس عفریت کو انہوں نے پیدا کیا اور پھر اسے نہتے شہریوں پر استعمال کیا، جس کی طاقت سے وہ دنیا کے کمزور ملکوں کو دہلاتے رہے، وہی عفریت کبھی ان کے خلاف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یا اگر استعمال نہ کیا جائے تو کم سے کم کچھ لوگ اس حوالے سے سوچ سکتے ہیں، اپنی خواہش کا اظہار کر سکتے ہیں۔

وہ لوگ جنہوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے ہلاک شدگان، زخمیوں اور متاثرین کا حال پڑھا ہے، ان کی تصویریں اور ان پر بننے والی فلمیں دیکھی ہیں، ان دیکھنے والوں کے اندر ایٹمی ہتھیاروں سے نفرت پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا امریکی صدور اور ان کے اعلیٰ عہدیداروں نے ان تصویروں اور فلموں کو صرف چنگیز اور ہلاکو کی نظروں سے ہی دیکھا؟ کیا ان کے اندر کے انسان کی آنکھیں کبھی ان الم ناک مناظر کو نہ دیکھ سکیں اور انسانی اذیتوں کی اس دلدل میں دھنسے ہوئے بے گناہ انسانوں کا درد ان کے اندر کبھی نہیں جاگ سکا جو انہیں اپنی اس بھیانک غلطی پر کف افسوس ملنے اور دنیا میں انسانوں کی طرح سوچنے سمجھنے اور رہنے کا سلیقہ عطا کرے۔

وہ جنہوں نے ۶۰ برس میں اپنی غلطی سے کچھ نہیں سیکھا، ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ اگلے چھ مہینوں میں اپنے غلط فیصلوں پر خط تنسیخ پھیر سکیں گے، خوش فہمی کی انتہا ہوگی۔ تاریخ میں کی جانے والی غلطیوں کا حساب وقت برابر کرتا ہے۔ اب باضمیر امریکیوں کو وقت کے سامنے ہی اپنا معذرت نامہ پیش کرنا چاہیے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۸/اگست ۲۰۰۵ء

چہروں پر اُمید کی روشنی

نیویارک کے سب سے امیر علاقے مین ہیٹن کے مشرقی حصے میں ۱۸؍ایکڑ زمین ایسی ہے جو ریاستہائے متحدہ امریکا کی نہیں۔ اس زمین پر ایک اونچی عمارت سر اٹھائے کھڑی ہے جسے ہم سب یو این ہیڈ کوارٹرز کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ زمین بین الاقوامی خطہ کہلاتی ہے اور ان تمام ملکوں کی ملکیت ہے جو اس تنظیم کے رکن ہیں۔ نیویارک اور امریکا کے دوسرے بڑے شہروں کے حساب سے دیکھیے تو یہ کچھ زیادہ بلند عمارت نہیں لیکن اس کی بالا قامتی کا سبب یہ ہے کہ اب بھی تیسری دنیا کے بہت سے نادار اور ناانصافی کا شکار ملک اس کے روبرو اپنا مقدمہ لے کر جاتے ہیں۔

اس کے پیش دالان میں قدم رکھیے تو وہ پستول آپ کے قدم تھام لیتی ہے جس کی نال میں گرہ لگی ہوئی ہے۔ جنگ سے نفرت کا اس سے خوبصورت اظہار بھلا اور کیا ہوسکتا ہے۔ عوامی راہداری کی مشرقی سمت میں Stained Glass کا وہ یادگاری دریچہ آپ کو آگے نہیں بڑھنے دیتا جو یو این او کے ایک نہایت دیانتدار دانشور اور مدبر ڈاگ ہیمر شولڈ اور ان کے ساتھیوں کے نام معنون کیا گیا ہے۔ ہیمر شولڈ اور ان کے ساتھی ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ گہرے اور ہلکے نیلگوں رنگوں اور آبی لہریوں سے شیشے پر فرانسیسی تخلیق کار مارک شاغل نے وہ کام کیا ہے جو محبت اور امن کی مختلف علامتوں کو ابھارتا ہے۔ بچہ، پھول، مامتا، جدوجہد کرتے ہوئے لوگ۔ ایک خوبصورت شاہکار جسے دیکھ کر دل موم ہو جاتا ہے۔

سرخ مخمل کا پس منظر اور پیش منظر میں چینی فنکاروں کی دیدہ ریزی کا بے مثال شاہکار، ہاتھی دانت کے آٹھ ٹکڑوں سے تراشا جانے والا ریل گاڑی کا ایک نمونہ جس میں ان لوگوں کے چہرے بھی نظر آتے ہیں جو ڈبوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ۹۸ چینی کاریگروں

نے دو سال کی شب و روز محنت سے تراشا تھا۔ انسانی ہنر کاری اور چین کی ہزاروں برس تہذیب کے تسلسل کا ایک شاہ کار۔ جاپان کی طرف سے عطیہ کی جانے والی ایک امن گھنٹی ہے جو ۶۰ ملکوں کے سکّوں کو ڈھال کر بنائی گئی، ان سکّوں کو جمع کرنے میں جاپانی بچوں نے بھی ہاتھ بٹایا تھا۔ یہ گھنٹی صنوبر کے پیڑوں کی لکڑی سے بنائے جانے والے شنٹو معبد کے نمونے کے اندر نصب کی گئی ہے۔ امریکا کے ہاتھوں ایٹمی تباہی کا زخم کھانے والے جاپان نے یہ امن گھنٹی ۱۹۵۴ء میں اقوام متحدہ کو نذر کی تھی۔ اس گھنٹی کو سال میں دو مرتبہ بجایا جاتا ہے۔ موسم بہار کے پہلے دن اور ۲۱ ستمبر کو جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا آغاز ہوا تھا۔ اب ۲۱ ستمبر کا دن امن کے عالمی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں جب اس امن گھنٹی کی تنصیب کو ۴۰ برس مکمل ہوئے تو اس وقت کے جنرل سکریٹری بطرس غالی نے کہا تھا 'یہ جاپانی گھنٹی جب بھی بجائی گئی ہے اس نے دنیا بھر کے انسانوں کو یہی پیغام دیا ہے کہ امن انمول ہے۔ امن کی صرف خواہش کرنا ہی کافی نہیں۔ امن کے لیے ان تھک اور مشکل جدوجہد کی ضرورت ہے'

یواین او کی عمارت کے پیش دالان میں رکھی ہوئی وہ پستول جس کی نال میں گرہ لگی ہوئی ہے اسی کی طرح وہ شاندار مجسمہ بھی دل کو چھو لیتا ہے جو سابق سوویت یونین کے ایک مجسمہ ساز نے بنایا تھا۔ کانسی کا یہ مجسمہ ایک ایسے شخص کا ہے جو اپنے ہتھوڑے کی چوٹ سے ایک تلوار کو توڑ کر اس سے ہل بنا رہا ہے۔ جنگ سے امن کی طرف مراجعت کی خواہش۔ تلوار سے سروں کی فصل کاٹنے کی بجائے، ہل سے زمین کا سینہ چیرنے اور فصلیں اگانے کی خواہش۔

ایسی ہزارہا خواہشیں ان سینوں میں پلتی ہیں جو بنیادی انسانی ضرورتوں اور حقوق سے محروم ہیں اور جن کے ملک اس عالمی تنظیم کے رکن ہیں۔ ان میں سے بیشتر ملک ایسے ہیں جن کے سربراہ انسانی حقوق کے عالمی منشور اور دوسری بیشمار دستاویزات پر دستخط کر چکے جن میں انسانوں کے لیے مساوات، آزادی اور روزگار کے وعدے ہیں، جن میں بھوک سے نجات پانے والے معدوں اور تعلیم کی روشنی سے منور ہونے والے ذہنوں کی بات کی گئی ہے۔ لیکن ان فرامین اور میثاق پر دستخط کرنے والے حکمران اپنے اپنے ملکوں کے لوگوں کو ان تمام نعمتوں سے محروم رکھتے ہیں۔

دنیا بھر سے ہر سال درجنوں ملکوں کے رہنما نیویارک آتے ہیں اور اس کے پوڈیم پر بین الاقوامی تعلقات عامہ کا ایک ایسا ناٹک دکھایا جاتا ہے جس میں وعدوں کے سرسبز باغ ہوتے ہیں

اور دعووں کے دریا بہائے جاتے ہیں۔ اس مرتبہ اقوام متحدہ کو قائم ہوئے ساٹھ برس ہو گئے چنانچہ اس سال یہ تقریب کچھ زیادہ دھوم دھام سے منائی گئی اور ہر ملک کے سربراہ نے اپنے آپ کو اس برات کا دولہا جانا۔ یا کم سے کم اپنے اپنے ملکوں کے سرکاری ٹیلی وژن سے اپنے عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ دراصل اس محفل کی ساری رونق بس اسی کے دم سے تھی۔

اس وقت دنیا کی اکثریت کا مسئلہ غربت اور امن ہے۔ وہ ملک جنہیں ابھی صدر امریکا نے فتح کرنے کا ارادہ نہیں کیا ہے، غربت انہیں فتح کر چکی ہے۔ ان غریب ترین اور کم غریب ملکوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ۲۰۰۵ء میں ان کا ہر بچہ خواندہ ہو چکا ہوگا لیکن وہاں ناخواندگی کی دلدل بچوں کو اسی طرح نگل رہی ہے۔ وہ اسی طرح جبری مشقت بھوک اور بیماری کا شکار ہیں جس طرح پہلے تھے۔ امریکا جس نے قطرینا میں فطرت کی غضب ناکی کا شکار ہونے والے اپنے ہی شہریوں کے عذابوں کی طرف متوجہ ہونے کی کوئی خاص کوشش نہ کی، وہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے غریبوں کا درد کیسے محسوس کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی اصرار پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے امیر ملک اپنے ۳۵ برس پرانے وعدے سے پھر گئے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دنیا کے غریب ملکوں کو ترقیاتی کاموں کے لیے اپنی مجموعی قومی آمدنی کا ایک فی صد سالانہ دیا کریں گے۔ اب ۳۵ برس بعد یہ طے پایا ہے کہ امیر ملک اپنی مجموعی قومی آمدنی کا صرف اعشاریہ سات فیصد غریب ملکوں کے ترقیاتی منصوبوں کے دیں گے۔

دنیا کے غریب ملکوں کی نمائندگی کرنے والے کئی اداروں کا کہنا ہے کہ امریکا نے اور دنیا کے دوسرے امیر ملکوں نے انہیں شدید مایوس کیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر یہ عالمی ادارہ دنیا کے غریبوں کی بھوک، ناداری، بیروزگاری اور بیماری کے ساتھ ساتھ جنگ کے خاتمے اور ماحولیات جیسے معاملات سے نمٹ نہیں سکتا تو پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا کے بیشتر ملک اس لیے اس تباہ حالی کو پہنچے ہیں کہ طاقتور ملکوں نے ماضی میں انہیں اپنی نوآبادی رکھ کر ان کے وسائل کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا۔

Global Call to Action against Poverty اور اسی نوعیت کی دوسری تنظیموں کا کہنا ہے کہ امریکا نے عراق کا ۳۰ بلین ڈالر کا قرض تو معاف نہیں کیا لیکن اس ملک پر حملے اور ناجائز قبضے کی مد میں کئی سو ارب ڈالر خرچ کر دیے۔ ہزار ہا انسانی جانوں کا زیاں اور تاریخی

شہروں کی تباہی و بربادی اس کے سوا ہے۔

۲۰۰۰ء میں اقوام متحدہ کے رکن ملکوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ ۲۰۱۵ء تک بھیانک غربت، بھوک، شیر خوار بچوں اور ماؤں کی شرح اموات میں کمی اور ناخواندگی کے خاتمے کو حتمی بنائیں گے۔ اس بہت مشکل کام کو کرنے میں اب صرف دس برس باقی ہیں اور اس کے آثار نظر نہیں آتے کہ ایسا ممکن ہو سکے گا۔ یہ اربوں انسانوں کے ساتھ ان کے حکمرانوں اور دنیا کے امیر اور طاقت ور ملکوں کا جھوٹ اور دھوکہ ہے۔ اس نوعیت کی دھوکہ دہی کے بعد امریکا یا دوسرے امیر ملکوں کو دہشت گردی کے خاتمے کی بات اس لیے نہیں کرنی چاہیے کہ ناانصافی، غربت، بیروزگاری اور بھوک کی دلدل میں ہی دہشت گردی کی فصل اُگتی ہے۔ جمہوریت اور انصاف سے لوگوں کو محروم رکھ کر یہ کیسے فرض کیا جا سکتا ہے کہ ان کے اندر طیش کے آتش فشاں نہیں پھٹیں گے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اگر ایرانی صدر نے شاہنامہ فردوسی کا یہ مصرعہ دہرایا کہ یہ محفل 'نشستند و گفتند و برخاستند' کی تصویر ہے تو کیا غلط کہا۔ اقوام متحدہ ایسے ادارے سے غریب، جنگ زدہ، جمہوریت سے محروم اور امن کو ترسے ہوئے لوگ اگر اُمیدیں وابستہ نہ کریں تو آخر اور کیا کریں۔

یو این او کی عمارت میں ایک امریکی آرٹسٹ نارمن راک ویل کی بنائی ہوئی پینٹنگ کا ایک موزیک آویزاں ہے۔ اس کا نام 'سنہرے اصول' ہے اور اس میں دنیا کے تمام مذاہب علاقوں اور نسلوں کا ایک گروہ دکھائی دیتا ہے۔ امن اور انصاف کے طالب ان عورتوں، مردوں، بوڑھوں، بچوں، گوروں، کالوں کے چہروں پر اُمید کی ایک روشنی ہے، ان کی آنکھوں میں انتظار کی کیفیت ہے۔ وہ وعدوں کے پورا ہونے کا انتظار ہیں اور مجھ ایسے ہزار ہا لوگ مایوس نہیں ہونا چاہتے لیکن اُمید پرستوں کے پاس بھی اُمیدوں کا ختم نہ ہونے والا سرمایہ تو نہیں۔ اس سے پہلے کہ سب نااُمید ہو جائیں اور انصاف کے حصول کے لیے قتل و غارت پر تُل جائیں، کہیں سے تو اُمید کا مژدہ آئے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی
۲۱ ستمبر ۲۰۰۵ء

عراق: ایک بھیانک دلدل

نائین الیون کا واقعہ محض ایک بہانہ تھا جس نے افغانستان اور عراق کی قسمت پر مُہر لگادی۔ ۱۹؍مارچ ۲۰۰۳ء کی شب امریکی بمبار طیارے تمام بین الاقوامی قوانین کی دھجیاں اڑاتے ہوئے عراق کی سرحدوں میں گھسے اور کیا بغداد کیا بصرہ، عراق کی متعدد بستیاں امریکی نخوت ورعونت کا نشانہ بنیں۔ شہر اور شہر والے سوکھی لکڑیوں کی طرح جل اٹھے اور امریکا کی زمینی فوج فتح کے شادیانے بجاتی ہوئی عراق کی سرزمین پر داخل ہوئی۔ وہ ملک جو ابتدا میں امریکی حکمرانوں اور ان کے اتحادیوں کو ترنوالہ محسوس ہوا تھا، وہ گزشتہ تین برس سے ایک ایسی دلدل ثابت ہوا ہے جس سے نکلنا ان کے لیے عذاب ہو چکا ہے۔ ۱۹؍مارچ ۲۰۰۶ء کو اس حملے کے تین برس مکمل ہو گئے، ان برسوں کے دوران ساری دنیا میں اس ناجائز اور سفاکانہ حملے کے خلاف سینکڑوں مظاہرے ہوئے اور ان میں شریک ہونے والوں کی تعداد بعض حالات میں نصف کروڑ تک پہنچی۔ یہ درست ہے کہ چند دنوں پہلے جو مظاہرے ہوئے ان میں شرکاء کی تعداد پہلے کی نسبت کم تھی اس کے باوجود یہ بات اہم ہے کہ مذہب، نسل، رنگ اور علاقے کی تخصیص کو خاطر میں لائے بغیر لندن سے روم اور استنبول سے ویانا اور کراچی اور لاہور تک لوگ عراق پر حملوں کے خلاف یک زبان تھے۔ یہ مظاہرے آسٹریلیا، جاپان، ترکی، اسپین، ڈنمارک، سوئیڈن اور آسٹریا میں ہوئے۔ ان مظاہروں کے دوران امریکی صدر کو دہشت گرد نمبر ایک قرار دیا گیا اور امریکا کو ایران پر حملے سے باز رہنے کے لیے کہا گیا۔

اس جنگ کے خلاف امریکا میں ہونے والے مظاہرے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ امریکی شہریوں کی جانب سے صدر بش کی پالیسیوں کی مخالفت کا واضح اور کھلا ثبوت ہیں۔

نیویارک، واشنگٹن، سان فرانسسکو اور لاس اینجلس جیسے بڑے شہروں میں ہونے والے مظاہروں کے علاوہ امریکا کے درجنوں چھوٹے شہروں میں بھی جنگ مخالف مظاہرے ہوئے۔ ان مظاہروں کا اہتمام کرنے والی یوں تو بہت سی تنظیمیں تھیں لیکن ان میں پیش پیش ANSWER تھی جس کا مکمل نام (Act Now to Stop War & End Racism) ہے۔ نیویارک میں ٹائمز اسکوائر میں جمع ہونے والے مظاہرین سے متعدد لوگوں نے خطاب کیا اس دوران ہر شخص نے امریکی صدر کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ لوگ عراق سے امریکی فوجوں کے فوری انخلا کے حق میں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکا کو کسی انتظار یا شرط کے بغیر مکمل طور سے اپنی فوجیں عراق کی سرزمین سے واپس بلا لینی چاہئیں۔ تقریر کرنے والوں کا کہنا تھا کہ عراق میں تشدد کا اصل سبب امریکی فوجوں کی موجودگی ہے۔ اور چونکہ امریکی سیاستدان اس بارے میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کو تیار نہیں اس لیے ہم شہری سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ ان لوگوں کا ارادہ ٹائمز اسکوائر میں فوجی بھرتی کے ایک مرکز پر مظاہرے کا تھا لیکن نیویارک پولیس نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی، اسی لیے مظاہرین اس مرکز سے قدرے فاصلے پر جمع ہوئے۔ وہ لوگ امریکی پولیس کی اس پابندی سے جھنجھلائے ہوئے تھے چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اقوام متحدہ کے صدر دفتر تک مارچ کریں گے۔ ANSWER نے اس بات کا اعلان بھی کیا کہ وہ اتوار اور پیر کے روز امریکا بھر میں ۳۰۰ مظاہرے کریں گے۔ اسی دوران ایک دوسرے جنگ مخالف گروپ United for Peace & Justice کی طرف سے ۵۰ امریکی ریاستوں میں ۵۰۰ جنگ مخالف مظاہروں کا اعلان کیا گیا۔

ان مظاہروں میں شریک افراد جہاں 'عراق سے نکل جاؤ'، 'عراق چھوڑ دو' اور 'جنگ فوراً بند کرو' جیسے پلے کارڈ اور بینر لیے ہوئے تھے وہیں کچھ بینر 'ہمارے سپاہیوں کو واپس لاؤ' کے علاوہ ایک بینر پر یہ بھی تحریر تھا کہ 'بش مرض کی علامت ہے، سرمایہ داری بیماری ہے اور انقلاب علاج ہے۔'

عراق پر حملے سے پہلے اور اس کے فوراً بعد مغربی سیاستدانوں، دانشوروں اور صحافیوں کی ایک بڑی تعداد تھی جس نے اس حملے کی مخالفت کی اور اس بارے میں اپنے خیالات کے برملا اظہار سے ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ برطانیہ اور امریکا کے چند اہم اور موقر اخبارات میں جو کچھ

لکھا گیا، ان میں سے چند اقتباسات یہاں تاریخ دار پیش کیے جا رہے ہیں۔

یکم اگست ۲۰۰۴ء کو معروف اور مقبول برطانوی صحافی رابرٹ فسک نے اپنے وزیر اعظم کے اس دعوے کی نفی کی کہ 'عراق میں سب کچھ ٹھیک ہے'۔ فسک نے لکھا کہ 'عراق کی کٹھ پتلی حکومت جو امریکا کے زیرِ اثر ہے، اس کے ہاتھ سے عراق کا بڑا حصہ نکل چکا ہے۔ ہر ماہ فوج پر سینکڑوں حملے ہو رہے ہیں۔ جولائی ۲۰۰۴ء تک ان حملوں میں ۷۰۰ سے زائد جانیں گئی ہیں، مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ صدر بش اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں'۔

۳۱ اگست ۲۰۰۴ء کے 'فنانشل ٹائمز' میں چھپا کہ 'عراق میں تیل کی پائپ لائن پر حملے کی وجہ سے تیل کی برآمدات نچلی سطح پر پہنچ چکی ہیں۔ عراق جنگ کی آگ میں جل رہا ہے۔ بش اور بلیئر حکومتیں سرمایہ دار دنیا میں سب سے زیادہ جھوٹے اور فریب دہی پر آمادہ گردانی جاتی ہیں۔ اسپین اور ہنڈراس کی فوجوں کے عراق سے چلے جانے کے بعد امریکا اور برطانیہ اکیلے ہو گئے ہیں۔ صدر بش دنیا کو یہ باور کرانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں، جیسا کہ انہوں نے بلغاریہ کے صدر سے کہا، کہ عراق میں آئین منظور ہونے کے بعد الیکشن ہونگے اور پھر عراقی فوج کو تیار کیا جائے گا کہ وہ بعد میں یہ لڑائی لڑیں۔ بہر حال کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی ہے کہ اتحادی فوجیں عراق سے کب تک جائیں گی'۔

برطانوی اخبار 'گارجیئن' نے ۱۶ ستمبر ۲۰۰۴ء کو لکھا کہ 'اینگلو امریکی افواج کے سینئر فوجی افسر عراق کی جنگ کا موازنہ اسٹالن گراڈ میں دوسری عالمی جنگ کے دوران نازیوں کی شکست سے کرتے ہیں۔ صدر بش عراق میں حالات کی کوئی بھی بہتر تصویر پیش کریں، حقیقت یہ ہے کہ عراق کی جنگ میں امریکا کے لیے صرف تباہی ہے۔ عراق پر حملہ کرنے سے پہلے اینگلو امریکی اتحاد نے عراق کو دنیا کے لیے خطرہ قرار دیا تھا مگر حملہ کے بعد عراق، ان طاقتوں کے لیے خطرہ بن گیا ہے، وہ اُن کے لیے ایسی تباہی کا باعث ہوگا جو بہت عرصے تک اُن پر اثر انداز ہوتی رہے گی۔ امریکا کے سابق وزیر خارجہ کولن پاؤل نے جنگ شروع ہونے سے پہلے سلامتی کونسل کے سامنے عراق میں مہلک ہتھیاروں کی موجودگی پر اصرار کیا تھا اور ان ہتھیاروں کو دنیا کے لیے تباہ کن قرار دیا تھا، وہ بعد میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ یہ مہلک ہتھیار عراق میں کہیں نہیں پائے گئے'۔

۱۱ جنوری ۲۰۰۵ء کو 'فنانشل ٹائمز' نے ایک بار پھر لکھا کہ 'دفاعی ماہرین کے تجزیے کے

مطابق اتحادی فوج کی عراق کے مختلف علاقوں میں طویل تعیناتی نے فوج کو تھکا کر پست کر دیا ہے جس کے اثرات دکھائی دینے لگے ہیں۔ اس تھکن اور ٹوٹ پھوٹ کا زیادہ شکار فوجی نیشنل گارڈ، ریزرو فوجی اور جز وقتی فوجی ہیں جن پر مشتمل امریکی فوج کا ۴۰ فیصد حصہ عراق میں موجود ہے۔ جنوری ۲۰۰۵ء میں امریکی ریزرو فوج کے ایک اعلیٰ افسر نے اپنے سربراہ سے یہ شکایت کی کہ اس کے فوجی دستوں کی عراق میں تعیناتی اور صف آرائی نے انہیں ایک پست ہمت اور شکستہ فوج میں تبدیل کر دیا ہے۔'

یکم فروری ۲۰۰۵ء کو 'فنانشل ٹائمز' نے لکھا کہ 'امریکی اور اتحادی فوجوں کی عراق میں موجودگی کسی بھی طور سے مسئلے کا حل نہیں ہے، بلکہ ان کی موجودگی عراق کے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ اس لیے ان افواج کو عراق سے جلد از جلد واپس بلانے کا فیصلہ ہونا چاہیے۔'

۱۴ رفروری ۲۰۰۵ء کے اخبار 'ڈیلی میل' میں اینڈریو گلین نے لکھا کہ 'عراقی انتخابات کتنے بھی اہم تصور کئے جائیں، کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کے نتیجے میں ایک موثر حکومت کا آغاز ہو سکے گا۔ ممکن ہے کہ اس حکومت کا خاتمہ اسمبلی بلڈنگ کے اندر ہی ہو جائے کیونکہ ملک کے بیشتر حصوں میں نئے وزراء اپنی جان کو خطرہ محسوس کرتے ہوئے کسی کو اپنی شکل نہیں دکھا سکیں گے۔ عراق پر قبائلی لیڈروں اور باغیوں کا موثر قبضہ ہے۔ ملکی معیشت تباہ حال ہے اور کوئی بنیادی سہولت عوام کو میسر نہیں ہے۔ ایسے میں کوئی منتخب حکومت چاہے وہ کتنی ہی مستعد اور تجربہ کار کیوں نہ ہو، اس صورتِ حال کو جلد تبدیل نہیں کر سکتی۔'

امریکی ہفت روزہ 'فارورڈ' میں یروشلم یونیورسٹی کے پروفیسر مارچ وان گری والڈ نے لکھا کہ: 'صدر بش کے خلاف الزام عائد کر کے مقدمہ چلایا جائے کہ انہوں نے امریکی عوام کو دھوکہ دے کر امریکا کو ایک ایسی جنگ میں جھونک دیا ہے جو کہ شہنشاہ آگسٹس کی ۹ سال قبلِ مسیح میں جرمنی پر چڑھائی اور ہاری ہوئی جنگ سے بھی زیادہ احمقانہ ہے اور یہ کہ عراق پر امریکا کا حملہ گزشتہ دو ہزار برس کے عرصے میں سب سے احمقانہ اقدام ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جنگ جو مارچ ۲۰۰۳ء کو بش نے عراق پر حملے سے شروع کی تھی اور جس کے ۶ ہفتے بعد یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ مشن مکمل ہو گیا ہے، یہ جنگ ابھی دس سال یا اُس سے بھی زیادہ لمبے عرصے تک جاری رہے گی اور امریکا کے لیے اس سے نکلنا مشکل ہے۔ عراق میں حکومت کی تبدیلی کی خواہش کا اعلان

کر کے امریکا ایک جال میں پھنسنے کی غلطی کر چکا ہے اوراس کے پاس جلد نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔امریکا کو وہاں رکنے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے اور چھوڑنے کی صورت میں بھی اس کے لیے ملامت ہی ملامت ہے۔'

یہ برس دو برس پرانی تحریریں ہیں لیکن اس بارے میں تازہ ترین اداریہ امریکا کے معتبر اخبار لاس اینجلس ٹائمز کی ۱۹ر مارچ ۲۰۰۶ء اشاعت میں شائع ہوا۔ یہ وہ دن تھا جب امریکا کے مختلف شہروں اور خود لاس اینجلس میں جنگ مخالف مظاہرہ ہو رہا تھا۔ لاس اینجلس ٹائمز نے لکھا' آج سے تین برس پہلے عراقی امریکا کی فوجی طاقت سے 'دہشت زدہ اور ششدر' رہ گئے تھے۔ آج امریکی اس جنگ کی انتہاؤں سے 'دہشت زدہ اور ششدر' ہیں۔ ویتنام میں بدترین شکست نے امریکا کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا، پھر ۸۰ر اور ۹۰ کی دہائی میں گریناڈا، خلیج کی اور کوسوو کی جنگ امریکیوں کے لیے ایک ایسا 'حلوہ' ثابت ہوئی جس کے بعد امریکیوں کا اپنی عظیم ترین حیثیت پر اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ لیکن عراق پر قبضے کے دوران یہ اعتماد ایک بار پھر خاک میں مل گیا ہے۔'

عراق جنگ کے حوالے سے اس وقت زمینی حقیقت یہ ہے کہ ایک اخباری جائزے کے مطابق ۶۵ فیصد امریکی اس جنگ کے شدید مخالف ہیں اور وہ اپنی افواج کی فوری واپسی چاہتے ہیں۔ جنگ مخالف گروپوں کا کہنا ہے کہ ان تین برسوں کے دوران ہمارے ۲۳۰۰ نوجوان مارے جا چکے ہیں۔ ایک بڑی تعداد معذور ہو چکی ہے۔ اس جنگ میں ۱۵۰ر ارب ڈالر جھونکنے کے بعد خزانہ خالی ہو چکا ہے جس کے اثرات امریکی عوام کی زندگیوں پر مرتب ہوئے ہیں۔ شہری آزادیوں کا سلب ہونا اس کے سوا ہے۔

دنیا کے عوام کی اکثریت کے ساتھ ساتھ خود امریکی عوام نے عراق پر امریکی حملے اور قبضے کو مسترد کر دیا ہے۔ کیا امریکی صدر اس روز کا انتظار کر رہے ہیں جب ان کے مواخذے کی بات جو فی الحال ایک بہت مختصر حلقے میں کی جا رہی ہے، ایک حقیقت بن جائے؟

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۲۲ مارچ ۲۰۰۶ء

۲۳ منٹ ۴۰ سیکنڈ کے اندر

ہم دنیا کو قبلِ مسیح اور بعدِ مسیح کے زمانے میں تقسیم کرتے ہیں، اسی طرح کی ایک تقسیم بیسویں صدی میں بھی ہوئی، یہ ۱۶/ جولائی ۱۹۴۵ء کا دن تھا جب دنیا جوہری جن کی پیدائش سے پہلے اور اس جن کی پیدائش کے بعد کے زمانے میں تقسیم ہوگئی۔ یہ وہ دن تھا جب امریکا نے نیومیکسیکو میں پہلا ایٹمی تجربہ کیا اور دنیا ایک ایسے دور میں داخل ہوگئی جب انسان نے کائنات میں اپنے گھر، اس کرۂ ارض جیسے خوبصورت ترین سیارے کو اپنے ہاتھوں سے نیست و نابود کردینے کی بنیاد رکھی۔ کیسی المناک بات ہے کہ انسانی ہلاکت خیزی کے اس مہیب دور میں قدم رکھنے کو امریکیوں نے 'ٹرینٹی' یعنی 'تثلیث' کا نام دیا۔ عیسائیت کی اس مذہبی اصطلاح کی اس سے بڑی بے حرمتی نہیں ہوسکتی تھی۔ امریکا کا پہلا ایٹمی دھماکہ، کہانی کا وہ جن تھا جو بوتل سے باہر لایا گیا اور اب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے بوتل میں واپس کیسے بند کیا جائے۔ مشکل یہ ہے کہ ایٹمی ہلاکت خیزی کہانیوں کا جن نہیں کہ جسے بہلا پھُسلا کر واپس بوتل میں بند کردیا جائے۔ ایٹمی تخفیف اسلحہ کے لیے کیے جانے والے اقدامات، ایٹمی ٹیکنالوجی کو پھیلنے سے روکنے کی کوششیں آج تک ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ امریکا اس جن کو بوتل سے باہر لایا اور پھر اس کی تباہ کاریوں کی ہولناکی اور اپنی بے اندازہ فوجی قہرناکی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایسا بیقرار ہوا کہ اپنا پہلا ایٹمی تجربہ کرنے کے صرف ۲۱ دن بعد ہیروشیما اور ۲۴ ویں دن ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر دو زندہ شہروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس وقت سے آج تک ان دو شہروں کے قتل پر بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں اور لاکھوں صفحے سیاہ کیے گئے ہیں۔ ایٹمی جنگ یا کسی ایٹمی سانحے کے نتیجے میں یہ دنیا کس طرح فنا ہوجائے گی، انسان اپنی تمام ذہانتوں اور اپنے تخلیقی خزانوں کے ساتھ کس طرح کائنات سے معدوم ہوجائے

گا، ان موضوعات پر نہایت خوبصورت اور پُر اثر فلمیں بنی ہیں لیکن طاقت کا نشہ اور دنیا پر حکومت کرنے کی خواہش دنیا کے متعدد ملکوں کو ایٹمی تجربات کرنے اور ایٹمی اسلحہ تیار کرنے سے باز نہیں رکھ سکی ہے۔

ایٹمی تجربات اور ایٹمی اسلحے کے انبار سے اس کرۂ ارض کو اور انسانیت کو جو خطرات ہیں، ان سے ہم سب آگاہ ہیں لیکن ایٹمی عہد میں قدم رکھنے کا ایک بھیانک پہلو اور بھی ہے، جس کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ یہ ایٹمی حادثوں اور سانحوں کا معاملہ ہے۔ ۲۶ /اپریل ۲۰۰۶ء کو چرنوبل کے ایٹمی سانحے کی ۲۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔ یہ دنیا میں اب تک کا سب سے بڑا ایٹمی حادثہ ہے۔ اس کی شہرت اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ حادثہ اس وقت کے سوویت یونین میں ہوا تھا اور مغربی حکومتوں اور میڈیا نے اس حادثے کی پل پل کی خبر دنیا تک پہنچائی تھی۔

وہ ہفتہ ۲۶ /اپریل ۱۹۸۶ء کی رات تھی۔ ایک عام سی رات جب اس وقت کے سوویت یونین اور آج کے بیلا روس کے چھوٹے سے شہر چرنوبل میں لوگ اپنے اپنے گھروں میں آرام کی نیند سو رہے تھے۔ وہاں بنے ہوئے ایٹمی بجلی گھر میں موجود انجینئر اور ٹیکنیکل اسٹاف اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا اور اپنے اپنے کام کر رہا تھا۔ اس رات بھی مسئلہ یہی تھا کہ بجلی کی پیداوار کم تھی اور طلب زیادہ۔ ایٹمی بجلی گھر کی نگرانی کرنے والے انجینئر، افسر شاہی کو بار بار یہ بات یاد دلا رہے تھے کہ چاروں ٹربائین اپنی صلاحیت سے زیادہ کام کر رہے ہیں، ان پر مزید دباؤ نہ ڈالا جائے لیکن افسر شاہی کا حکم تھا کہ بجلی کی پیداوار زیادہ ہونی چاہیے تا کہ دور دراز کے جن علاقوں کو بجلی کی اشد ضرورت ہے، اسے پورا کیا جا سکے۔ یہ ایک ایسا حکم تھا جس سے سرتابی نہیں کی جا سکتی تھی چنانچہ چرنوبل کا ایٹمی بجلی گھر ضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے زیادہ بجلی پیدا کرتا رہا اور دور دراز کے علاقے روشنی سے جگمگاتے رہے۔

اس کے بعد کے معاملات نہایت ٹیکنیکل ہیں اور انسان سے سرزد ہونے والی نا قابل معافی غلطیوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس رات ایک ٹیکنیشین سے غلطی ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۶ /اپریل کی رات، ایک بجے سے ایک بج کر تیئس منٹ چالیس سیکنڈ کی درمیانی مدت میں ایٹمی ری ایکٹر کے اندر پیدا ہونے والی توانائی اپنی مقررہ حد سے ایک سو بیس گنا زیادہ بڑھ گئی۔

اس بھیانک توانائی نے چشم زدن میں تمام پریشر ٹیوبوں کے چیتھڑے اڑا دیے اور پھر چند

سیکنڈ کے اندر ایٹمی ری ایکٹر کی نہایت دبیز کنکریٹ کی چھت اور حفاظتی حصار ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ اڑ گیا۔

یہ چرنوبل ایٹمی ری ایکٹر کا وہ حادثہ تھا جس کی اطلاع دنیا کو سوئیڈن سے ملی جہاں کی فضاؤں میں تابکاری اچانک بڑھ گئی تھی۔ بیلا روس جہاں یہ حادثہ ہوا، وہ اس وقت سوویت یونین میں شامل تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سوویت یونین میں خبروں کی اشاعت پر جس نوعیت کی پابندیاں تھیں اس کے سبب اس مہلک حادثے کی اطلاع سوویت باشندوں اور باقی دنیا کو بہت دیر سے ملی۔ تاہم اس وقت کے سوویت رہنما اور پارٹی کے جنرل سکریٹری صدر میخائیل گوربا چوف کا موقف کچھ اور ہے۔ چرنوبل کے سانحے کی بیسویں سالگرہ کے موقعہ پر انہوں نے ایک مضمون میں اس سانحے کی تفصیلات لکھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

آج سے ۲۰ سال قبل چرنوبل میں ایک ایسا ایٹمی حادثہ رونما ہوا جو پانچ سال بعد روس کو توڑنے میں پریسٹرائیکا سے بھی بڑی اور اہم وجہ بن گیا۔ بلاشبہ چرنوبل کی تباہی ایک تاریخی موڑ ثابت ہوئی۔ ایک دور اس تباہی سے پہلے تھا اور دوسرا دور اس سے قطعی مختلف جو اس تباہی کے بعد شروع ہوا۔ ۲۶/اپریل ۱۹۸۶ء کو جس رات چرنوبل کے ایٹمی ری ایکٹر میں دھماکہ ہوا۔ اگلی صبح صورتحال پر بحث کے لیے پولٹ بیورو کا اجلاس ہوا اور پھر اس کے نتائج اور اثرات سے نمٹنے کے لیے ایک سرکاری کمیشن تشکیل دیا گیا، جس کی ذمہ داری صورتحال کو سنبھالنا تھا، تاکہ سنجیدہ معاملات خصوصاً متاثرہ علاقے میں لوگوں کی صحت کے معاملے کو دیکھا جاسکے۔ اس کے علاوہ اکیڈمی آف سائنس نے معروف سائنسدانوں پر مشتمل ایک گروپ قائم کیا اور انہیں ہنگامی بنیادوں پر چرنوبل کے علاقے میں بھیج دیا گیا۔ پولٹ بیورو کو فوری طور پر ایسی مکمل معلومات دستیاب بھی نہیں تھیں جن سے دھماکے کے بعد کی صورتحال کی صحیح عکاسی ہوسکتی۔ اس کے باوجود پولٹ بیورو میں اس بات پر مکمل اتفاق رائے موجود تھا کہ ہمیں جو بھی معلومات موصول ہوں انہیں اسی طرح آگے عوام تک پہنچایا جائے۔

'۳۶ گھنٹے تک ہمارے پاس سرے سے کوئی معلومات ہی نہیں تھیں۔ کچھ دن بعد ہمیں پتہ چلا کہ جو کچھ ہوا ہے، وہ محض حادثہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقی ایٹمی تباہی ہے۔ چرنوبل میں ہمارا چوتھا ایٹمی ری ایکٹر دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ اگرچہ چرنوبل کے بارے میں پہلی رپورٹ ۲۸/اپریل کو

پراودا میں چھپ گئی تھی مگر ابھی تک کچھ بھی واضح نہیں تھا مثلاً جب ری ایکٹر پھٹا تو آگ کو فوری طور پر پانی سے بجھا دیا گیا، جس سے صورتحال بدتر ہو گئی کیونکہ جوہری ذرات نے فضا میں پھیلنا شروع کر دیا۔ دو سو سے زائد میڈیکل ٹیمیں لوگوں پر ہونے والے زہریلے اثرات کے ٹیسٹ کرنے میں مصروف تھیں۔ سب سے سنگین خطرہ یہ تھا کہ جوہری مواد زیر زمین رسنا شروع ہو جائے گا اور پھر وہ دریائے ڈین میں شامل ہو جائے گا۔ اس طرح دریا کے کنارے پر واقع کیو (خیوا) اور دیگر شہروں میں بسنے والے عوام کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ لہٰذا ہماری پہلی ترجیح دریا کے کناروں کا تحفظ تھا جس کے لیے ہم نے سب سے پہلے چرنوبل پلانٹ کو بند کر دیا اور ملک کے تمام وسائل اس تباہی پر قابو پانے میں لگا دیے گئے جن میں کنکریٹ کے ایک ایسے خول کی تیاری بھی شامل تھی جو چوتھے ری ایکٹر کے لیے حفاظتی حصار کا کام دے سکے۔'

چرنوبل بیلا روس اور یوکرائن کی سرحد پر واقع ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے آس پاس کے علاقے، یوکرائن اور بیلا روس کی ریاستوں کی ایک بڑی آبادی اس ایٹمی سانحے کا شکار ہوئی۔ ان لوگوں پر کسی دشمن ملک نے نیوکلیائی حملہ نہیں کیا تھا، وہ تو اپنے ہی اس ایٹمی بجلی گھر کی تباہی کا شکار ہو گئے جو ان کے گھروں کو روشن رکھتا تھا۔

چند دنوں پہلے اس بارے میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے ایک رپورٹ جاری کی ہے جس میں متاثرہ عوام اور طبی ماہرین کو تابکاری کے مضر اثرات کے بارے میں صحیح اور بروقت معلومات کی فراہمی کے لیے کوششوں کو جاری رکھنے جیسی سفارشات کی گئی ہیں۔ عالمی ادارہ صحت کے ڈائریکٹر جنرل لی جونگ ووک نے کہا ہے کہ چرنوبل میں تعمیر نو کے وقت ہمیں متاثرہ افراد کے ہلاک ہو جانے والے عزیز و اقارب کو نہیں بھولنا چاہیے اور نہ ان کو جو زندہ تو بچ گئے لیکن تابکاری سے متاثر ہوئے۔ واضح رہے کہ ۲۶؍اپریل ۱۹۸۶ء کو چرنوبل ایٹمی بجلی گھر سے حادثاتی طور پر تابکاری کے اخراج کا علم ہونے کے بعد علاقے بھر سے ایک لاکھ ۳۵ ہزار افراد کو محفوظ مقامات پر منتقل کر دیا گیا تھا جبکہ بعد ازاں متاثرہ علاقوں سے مزید دو لاکھ ۳۰ ہزار افراد کو محفوظ مقامات پہنچایا گیا۔ ماحولیات کے لیے کام کرنے والی بین الاقوامی تنظیم 'گرین پیس' نے کہا ہے کہ ۲۰ سال قبل چرنوبل ایٹمی پلانٹ سے خارج ہونے والی تابکاری سے متاثر ہونے والوں کی اصل تعداد ایک لاکھ سے بھی زائد ہو سکتی ہے۔ 'گرین پیس' کا کہنا ہے کہ چرنوبل ایٹمی پلانٹ سے ۲۰ سال قبل حادثاتی طور پر

بڑے پیمانے پر خارج ہونے والی تابکاری کے اثرات ابھی تک جاری ہیں اور اس وقت کی نوجوان نسل کی صحت پر مضر اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یوکرائن، بیلا روس اور روس میں تابکاری سے متاثرہ نوجوانوں کی قوت مدافعت ختم ہورہی ہے اور وہ مختلف امراض کا شکار ہورہے ہیں۔

اس سانحے نے سوویت یونین کی تحلیل میں کتنا کردار ادا کیا، اس بارے میں مسٹر گورباچوف کی بات میں وزن ہے لیکن اس سے قطع نظر اس سانحے نے سارے یورپ اور تمام دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔فوری طور پر ۳۱/افراد ہلاک ہوئے لیکن بعد میں صرف صفائی کا کام کرنے والوں میں سے لگ بھگ آٹھ ہزار افراد تابکاری کے سبب ہلاک ہوئے۔سانحے کے بعد چند دنوں تک حکام کو اس بات کا اندازہ نہیں ہوا کہ یہ کتنا خوفناک سانحہ ہے، چنانچہ چرنوبل اور اس سے متصل علاقوں میں زندگی معمول کے مطابق جاری رہی۔ بچے سبزہ زاروں میں کھیلتے رہے، شادیاں ہوتی رہیں اور لوگ چرنوبل ایٹمی ری ایکٹر کو ٹھنڈا کرنے والے پانی کے تالاب میں بنسیاں ڈالے بیٹھے مچھلی کا شکار کرتے رہے اور اذیت ناک موت دبے قدموں ان کی طرف بڑھتی رہی۔

۲ مئی ۱۹۸۶ء کو یعنی حادثے کے چھٹے دن بعض ذمہ دار اہل کار چرنوبل پہنچے اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ری ایکٹر سے ۳۰ کلومیٹر کے دائرے میں آنے والی آبادی کا انخلا ہونا چاہیے۔آہستہ آہستہ حکام کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوا اور ۲ مئی سے ۳۱ مئی کے دوران ایک لاکھ ۳۵ ہزار افراد کا انخلا عمل میں آیا۔اس کے بعد سویڈن سے ملنے والی اطلاعات نے پورے یورپ کو ہراساں کر دیا اور تابکاری کے اثرات معلوم کرنے اور اس حوالے سے لوگوں کو طبی امداد فراہم کرنے اور متاثرہ علاقوں سے نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس سانحے کی بیسویں سالگرہ کے موقعہ پر 'گرین پیس' نے جو اندازے لگائے ہیں اس کے مطابق ۱۹۸۶ء سے ۲۰۵۶ یعنی ستر برس کے اندر یوکرائن، بیلا روس اور روس کے اندر تابکاری کا شکار ہونے والے ۹۳ ہزار افراد ہلاک ہوجائیں گے۔اس کے علاوہ بیلا رس میں خون کے کینسر سے لگ بھگ تین ہزار اور تھائرائیڈ گلینڈ کینسر سے ۱۴ ہزار افراد مزید ہلاک ہوں گے۔ایٹمی ری ایکٹر سے خارج ہونے والی تابکاری متاثرین پر جس تباہ کن حد تک اثر انداز ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی جسمانی اور ذہنی طور پر معذور بچے پیدا ہورہے ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ اثرات ابھی کئی دہائیوں تک جائیں گے اور اس سانحے سے متاثر ہونے والوں کے بچے کسی نہ کسی بیماری کا شکار رہیں گے۔

چرنوبل کی بیسویں سالگرہ کے موقعہ پر بیلارس کے ایک صحافی ویسلی سیماشکو Vasily Semashko نے چرنوبل کا رخ کیا اور ان لوگوں سے ملاقاتیں کیں جو آج بھی متاثرہ اور تابکاری سے آلودہ علاقے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس نے وہاں بہت کچھ دیکھا، بہت سے لوگوں سے ملا اور ان سے باتیں کیں۔ اس روداد کو اس نے 'چرنوبل سفر' کے نام سے لکھا......

☆ ۹/اپریل ۲۰۰۶ء کو میں اور میرا ساتھی ڈان چرنوبل کے علاقے میں داخل ہوئے۔ ڈان ایک امریکی فوٹوگرافر ہے اور اس کے ساتھ سفر کرنا میرے لیے کچھ آسان نہیں تھا اس لیے کہ بیلاروس اور واشنگٹن کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ اس سفر کے دوران ہمیں اندازہ ہوا کہ متاثرہ علاقے میں سفر کرنے کے دوران گھریلو طور پر کشید کی جانے والی ووڈکا کے دو گھونٹ ایک نعمت ہیں۔ ووڈکا ایک خود فراموشی سی طاری کر دیتی ہے اور تابکاری سے متاثرہ علاقے میں پھرنے کا خوف ذہن کے کسی دور افتادہ گوشے میں جا سوتا ہے۔

☆ ۱۱/اپریل کو ہم نے براجن کا رخ کیا، یہ وہ چھوٹا سا شہر ہے جو ممنوعہ علاقے سے متصل ہے۔ ممنوعہ علاقے سے لوگوں کو بہ جبر منتقل کیا گیا تھا اور آج بھی وہاں جانے کے لیے خصوصی اجازت نامہ ضروری ہے۔

☆ ۱۳/اپریل ۲۰۰۶ء کو ہم پولیسکی تک پہنچے۔ اسے ۱۹۸۸ء میں بنایا گیا تھا۔ یہ ایک طرح کا پارک ہے جس میں مختلف جانوروں کے جوڑے چھوڑے گئے اور خاص طور سے بڑے پیمانے پر پیڑ پودے لگائے گئے تاکہ جانوروں پر تابکاری کے اثرات کا جائزہ لیا جاسکے اور جنگل، متاثرہ علاقے میں تابکاری کے ذرات کو کم کرنے میں مدد دے سکے۔

☆ ۱۵/اپریل کو ہم نے چرنوبل زون کا دورہ کیا۔ اس علاقے میں پیڑ پودے جھاڑیاں بہ کثرت اُگ آئے ہیں۔ یوں کہہ لیجیے کہ ویران سڑک کے دونوں طرف گھنے جنگل ہیں اور بارشوں نے خالی جگہ کو دلدلی علاقے میں بدل دیا ہے۔

☆ ۱۷/اپریل کو ہم چرنوبل کے سانحے سے متاثرہ ان دیہاتوں میں پہنچے جہاں تابکاری کے اثرات ختم ہو چکے ہیں اور پھر ہم نے اس ممنوعہ علاقے میں قدم رکھا جو چرنوبل کے گرد تیس

کلومیٹر کا دائرہ رکھتا ہے۔

☆ ۱۷ اپریل کی رات ہم نے ممنوعہ علاقے کے اس دیہات میں گزاری جس میں اب بھی چند گھرانے آباد ہیں۔ اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے کموفلاج سوٹ پہنے، اپنی بائی سائیکلیں اپنی گاڑی کی ڈکی میں رکھیں، اپنے سلیپنگ بیگ، کھانے پینے کا سامان، پانی کے کین اور ایک تھرماس میں گرما گرم کافی رکھی اور روانہ ہوگئے۔ اندھیرے میں بیس کلومیٹر کا سفر کرتے ہوئے ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں اسفالٹ کی سڑک ختم ہوگئی تھی۔ اس سے آگے کا راستہ ایسا نہ تھا جس پر ہم اپنی گاڑی چلا سکتے۔ ہم نے اپنی بائیسائیکلیں اور دوسرا سامان نکالا اور روانہ ہوگئے۔ ہمارے پیر کیچڑ میں دھنس رہے تھے، ہوا جھاڑیوں اور پیڑوں میں سرسرا رہی تھی، ہمارے ایک طرف وہ علاقہ تھا جسے ماحولیاتی ریزرو کا نام دیا گیا ہے اور تین طرف ان دیہاتوں کے چند گھروں کی روشنیاں تھیں جن میں لوگ آباد ہیں۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور اس کی روشنی میں سارا علاقہ ایک عجب وحشت ناک منظر پیش کر رہا تھا۔ ہم آگے بڑھتے رہے لیکن اب ہم تھک چکے تھے۔ ہمارے اطراف وہ گھر تھے جن میں کوئی نہیں رہتا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہاں بھوتوں کا بسیرا ہے۔ میں تابکاری جانچنے والا آلہ Dosi Meter نکالتا ہوں اور ان خالی گھروں میں اسے چلا کر دیکھتا ہوں۔ آخر کار ایک ویران گھر میں سب سے کم تابکاری کا علم ہوتا ہے۔ ہم اپنی بائیسائیکلیں رکھ کر اس گھر میں بچھے ہوئے بستر پر اپنے سلپنگ بیگ میں سو جاتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے اور ہمیں اٹھنے میں الکساہٹ ہوتی ہے لیکن آخر کار ہم دونوں اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور تھرماس میں بچی ہوئی گرم کافی پی کر اپنے سفر پر ایک بار پھر روانہ ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اپنا سامان وہیں چھوڑ دیا ہے لیکن Dosi Meter، کیمرہ اور چھوٹا ٹیپ ریکارڈر ہمارے ساتھ ہے۔

ویسلی سیماشکو اور اس کا ساتھی ڈان متاثرہ علاقے میں دور دور تک گھومے۔ گھر، کلب، دکانیں سب پر آسیب کا سایہ تھا۔ صرف آٹھ گھر آباد تھے اور ڈوزی میٹر بتا رہا تھا کہ اس جگہ پر رہنا خطرناک ہے۔ ایک جگہ انہوں نے گائیوں کو چرتے دیکھا۔ اس جگہ تباہ کاری خطرے سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کا دودھ اور گوشت کون استعمال کرتا ہوگا۔ انہیں خیال آیا۔ ویسلی سیماشکو کے لیے یہ اداس کر دینے والا سفر تھا۔ چرنوبل میں ہونے والے حادثے سے اس سارے علاقے کی زندگی

بدل کر رکھ دی تھی۔ وہاں کے اصلی باشندے دور دراز کے علاقوں میں رہنے پر مجبور تھے۔ چند گھرانے ایسے تھے جو سب کچھ جاننے کے باوجود واپس آ گئے تھے اور تابکاری سے آلودہ فضا میں سانس لے رہے تھے، آلودہ پانی پی رہے تھے۔ ان کا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا سب ہی تابکار ذرات سے آلودہ تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ گھونٹ گھونٹ موت پی رہے تھے اور ایسے نوالے کھا رہے تھے جو انہیں موت کی طرف لے جا رہے تھے۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ کہیں اور رہ نہیں سکتے تھے۔ وہ جس جگہ پیدا ہوئے تھے، وہیں مرنا چاہتے تھے خواہ وہ کتنی ہی اذیت ناک موت کیوں نہ ہو۔ چرنوبل میں ہونے والے اس ایٹمی حادثے نے لاکھوں لوگوں کی زندگیاں بدل کر رکھ دیں اور ان کی آئندہ نسلیں بھی اس حادثے کے سبب ایک اذیت ناک اور غیر فطری زندگی گزارنے پر مجبور ہوئیں۔

یہ محض ایک ایٹمی حادثے کا قصہ ہے جو دنیا تک تمام تفصیل کے ساتھ پہنچا۔ لیکن ۱۶ر جولائی ۱۹۴۵ر کو جب امریکا نے نیو میکسیکو میں جوہری بم کا پہلا دھماکہ کیا تھا، اس وقت سے ۲۱ مارچ ۲۰۰۶ء تک دنیا میں ۲۹۹ سے زیادہ ایسے ایٹمی حادثات ہو چکے ہیں جنہوں نے دنیا کے ماحول کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا، جن سے نکلنے والی تابکاری کے اثرات دور دور تک پہنچے اور جو کروڑوں انسانوں کی صحت پر براہ راست اثر انداز ہوئے۔

ان حادثات کا سب سے الم ناک پہلو یہ ہے کہ اس نوعیت کے حادثات کی خبر اگر لوگوں کو ہو جائے تو انہیں نہایت پُر زور اور پُر اثر انداز میں تسلی اور دلاسہ دیا جاتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ۱۶ر جولائی ۱۹۴۵ء سے ۲۱ مارچ ۲۰۰۶ء تک دنیا بھر میں سینکڑوں ایٹمی حادثات رونما ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چرنوبل کو چھوڑ کر تقریباً تمام حادثات متعلقہ حکومتوں نے 'قومی راز' کے تہہ خانوں میں دفن کر دیے۔ جہاں یہ حادثات ہوئے تھے وہاں کے گرد و نواح میں رہنے والے عام شہری معمول کی زندگی گزارتے رہے، بیشتر حادثات کو چھپانے کے لیے شہری آبادی کا نہ انخلا ہوا اور نہ انہیں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایات دی گئیں۔ مگر اس نوعیت کے تمام 'قومی راز' اس ملک کے لوگوں کی صحت، ان کی زندگی اور ان کے ماحول کی بربادی کا سبب بنے۔ گزشتہ ۶۰ برس کے دوران ہونے والے ۲۹۹ میں سے چند واقعات اور حادثات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

☆ ۱۹۶۴ء میں ایک امریکی بی۔۵۲ بمبار جو ایٹم بموں کی کھیپ لے کر جا رہا تھا میری لینڈ میں

گر کر تباہ ہو جاتا ہے۔

☆ ۱۹۶۵ء میں ایک امریکی ری پروسسنگ پلانٹ میں حادثہ ہوتا ہے جو بھاری مقدار میں پلوٹونیم کے اخراج کا سبب بنتا ہے۔

☆ ۱۹۷۵ء میں جاپان کے می ہاما نیوکلیر پاور پلانٹ سے تابکاری کا اخراج ہوتا ہے۔

☆ ۱۹۸۷ء میں انگلستان میں سڑک پر ایک حادثہ ہوتا ہے۔ یہ ایٹمی اسلحہ لے جانے والے ٹرک کا حادثہ ہے۔

☆ ۱۹۸۵ء میں جرمنی کے شہر ہیل برون میں ایٹمی مزائل میں آگ لگ جاتی ہے۔

☆ ۱۹۸۳ء میں نیوکلیائی توانائی سے چلنے والا ایک امریکی سیٹلائٹ بحر ہند میں گر کر تباہ ہو جاتا ہے۔

☆ ۱۹۶۹ء میں امریکی طیارہ بردار جہاز جس پر ایٹمی اسلحہ لدا ہوا تھا، اس میں آگ لگ جاتی ہے اور دھماکے ہوتے ہیں۔

☆ ۱۹۶۸ء میں ایک بی۔۵۲ بمبار طیارہ جو ایٹم بموں کو لے کر جا رہا تھا، کینیڈا کے شہر ٹورنٹو کے قریب گر کر تباہ ہو جاتا ہے۔

☆ ۱۹۶۶ء میں ایٹمی اسلحہ لے جانے والا ایک بی باون بمبار اسپین کے نامعلوم مقام پر گر کر تباہ ہو جاتا ہے جس سے بھاری مقدار میں پلوٹونیم کا اخراج ہوتا ہے۔

☆ ۱۹۶۱ء میں ایک امریکی بی باون بمبار جو ایٹم بموں کی کھیپ لے کر جا رہا تھا، گر کر تباہ ہو جاتا ہے اور عملے کے تمام افراد ہلاک ہو جاتے ہیں۔

ان تمام حادثوں کی تفصیلات پڑھیے تو 'قومی راز' کے دبیز پردے سے صرف یہ بات چھن کر آتی ہے کہ کہیں دو آدمی ہلاک ہوئے اور کہیں آٹھ آدمی۔ یہ نہیں بتایا جاتا کہ وہاں رہنے والوں پر کیا گزری؟ تابکاری کے اخراج نے ان کا کیا حشر کیا؟ بحر ہند کی مچھلیوں پر کیا بیتی؟ آلودہ سمندری لہریں کن کن آباد ساحلوں سے ٹکرائیں؟ اس بارے میں دنیا کے ہر ملک کی حکومتوں کے لب سلے ہوئے ہیں۔

امریکا، روس، برطانیہ، فرانس، چین، جاپان، ارجنٹائن، جرمنی، ہندوستان، سوئٹزر لینڈ، لیتھونیا، پاکستان ملکوں کی ایک طویل فہرست ہے جہاں اس نوعیت کے ایٹمی حادثات ہوئے اور

جن سے بڑے پیمانے پر تابکاری کا اور بھاری پانی اخراج ہوا۔ ان معاملات میں سے بیشتر کی اطلاع ان ملکوں کے عوام کو نہیں ہوئی۔ وہ اپنے ہلاکت خیز ماحول سے بے خبر اپنی زندگی گزارتے رہے اور الم ناک موت سے قریب تر ہوتے رہے۔

روزمرہ زندگی میں ہمیں لوگ اکثر یہ سوال کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ آخر دنیا بھر میں اتنی نئی اور خوفناک بیماریاں کیسے پیدا ہو رہی ہیں، کینسر کا اتنے بڑے پیمانے پر پھیلاؤ کیوں ہو رہا ہے۔ یہ سوال کرنے والوں کی خدمت میں مودبانہ عرض ہے کہ ان معاملات کی تفصیل میں جائیے جن پر 'قومی راز' کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے، اس پردے کے پیچھے جھانکیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی حکومتیں اپنے عوام کی زندگیوں سے کس طور کھیل رہی ہیں۔

چرنوبل دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گیا اس لیے دنیا بھر نے ۲۶/اپریل کو اس سانحے کی ۲۰ ویں سالگرہ منائی لیکن یقین کیجئے کہ وہ سانحے جو عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے انکی فہرست بہت طویل ہے۔ چرنوبل کی تباہی میں ۲۳ منٹ ۴۰ سیکنڈ لگے تھے، بیشتر حادثے تو صرف چند منٹ میں ہوئے اور نہ جانے کتنے ہنستے کھیلتے خاندانوں کی زندگیاں بدل گئے۔

'اردو نیوز'، جدہ

۲۷/اپریل ۲۰۰۶ء

منہ چھپاتے پھرتے ہیں

دنیا کے عوام کی اکثریت امریکی حکومت کے غاصبانہ اور استعماری کردار کے خلاف ہے۔ اس مخالفت میں امریکی بھی کچھ پیچھے نہیں۔ اپریل کے آخری ہفتے میں نیویارک کی سڑکوں پر امریکیوں نے ایک بڑا احتجاجی جلوس نکالا۔ اس کی رہنمائی آسکر ایوارڈ پانے والی اداکارہ سوزان سارنڈن، صدر امریکا کے خلاف تن تنہا جنگ مخالف مہم چلانے والی سنڈی شیہان جس کا بیٹا بغداد کی جنگ میں مارا گیا اور ڈیموکریٹک پارٹی کے سابق صدارتی امیدوار جیسی جیکسن کر رہے تھے۔ جیسی جیکسن کا اور جلوس کے دوسرے رہنماؤں کا کہنا تھا کہ اس جنگ کو ہر قیمت پر بند ہو جانا چاہیے جو انسانیت کے لیے ایک ناسور ثابت ہو رہی ہے۔ اپریل کا مہینہ امریکی سپاہیوں کے لیے نہایت خونیں ثابت ہوا ہے اور اس ایک مہینے کے دوران ۶۹ امریکی سپاہی مارے گئے ہیں۔ جیسی جیکسن نے امریکی قوم سے کہا کہ وہ ہر شہر میں بڑے بڑے احتجاجی مظاہرے کریں تاکہ بش انتظامیہ پر دباؤ بنایا جاسکے۔ انہوں نے کہا کہ عراق میں WDM کے بارے میں جاسوسوں کی جھوٹی رپورٹوں کی بنا پر شروع ہونے والی اس جنگ کو فوری طور پر بند ہو جانا چاہیے کیونکہ اس جنگ میں ہم نے دولت، قیمتی جانیں اور عزت سب ہی کچھ گنوا دیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ویتنام، کوریا، نکاراگوا، پناما کے معاملات اب بھولی بسری کہانیاں ہو چکے ہیں۔ آج لوگوں کے اعصاب پر افغانستان اور عراق کسی کابوس کی طرح سوار ہیں۔ عراق ایک ایسا مقتل ہے جہاں سے روزانہ درجنوں ہلاکتوں کی خبریں آتی ہیں۔ امریکی دانشور، صحافی، تجزیہ نگار، ادیب سب ہی ایک اضطراب میں مبتلا ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ امریکی قوم پر تیزی سے زوال آیا ہے، دنیا میں اس کا اثر و رسوخ کم ہوا ہے اور اخلاقی بنیادوں پر وہ پسپا ہو چکی ہے، یہ ایسے معاملات

ہیں جو انہیں موجودہ امریکی صدر کی مخالفت پر مجبور کرتے ہیں۔ ابھی افغانستان اور عراق کا باب بند بھی نہیں ہوا ہے کہ صدر بش ایران کا محاذ کھولنے کے لیے بے تاب و بے قرار ہیں۔ دوسری طرف وہ جنوبی امریکا کے ایک چھوٹے سے ملک وینیز ویلا پر پابندیاں عائد کر رہے ہیں۔ دونوں ملکوں کے تعلقات آخری حد تک خراب ہو چکے ہیں۔ وینیز ویلا کی جانب سے اس خدشہ کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ امریکا اس پر بھی لشکر کشی کی تیاری کر رہا ہے۔ وینیز ویلا کی خطا صرف اتنی سی ہے کہ اس کے ایران اور کیوبا سے بہت اچھے تعلقات ہیں جبکہ صدر امریکا ان دونوں ملکوں کو دشمن نمبر ایک قرار دیتے ہیں۔

صدر بش کے اقدامات نے امریکا کے اندر ڈیموکریٹ پارٹی کے اہم لوگوں کو ان کی مخالفت پر بہت پہلے مجبور کر دیا تھا۔ سابق صدارتی امیدوار ال گور کھل کر انہیں اپنی تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں لیکن اس سے کہیں اہم یہ بات ہے کہ ری پبلکن پارٹی یعنی ان کی اپنی جماعت کے سنجیدہ اور بردبار افراد ان پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ چند دنوں پہلے ری پبلکن پارٹی کے کانگریس رکن، ہاؤس انٹرنیشنل ریلیشنز کمیٹی کے چیئر مین لیزی ہائیڈ نے کہا ہے کہ ان خطرات کی طرف سے کان بند کرنا یا لوگوں کی باتوں کو سنی ان سنی کرنا ہمارے مستقبل کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے رکن کا کہنا ہے کہ امریکا کو دنیا کے مختلف ملکوں میں جمہوریت درآمد کرنے سے باز رہنا چاہیے۔ یہ ان ملکوں کا اندرونی معاملہ ہے، وہاں کے عوام ان مسائل سے اپنے طور پر نمٹ سکتے ہیں۔ اگر ہم نے ان پر اپنی طرز کی جمہوریت تھوپنی چاہی تو وہاں کسی نوعیت کی بہتری کی بجائے انتشار، خونیں تصادم اور غیر مستحکم صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ اس بارے میں ایشیا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مارٹن جیکوئس کا کہنا ہے کہ بش حکومت نے ہر محاذ پر جس ناعاقبت اندیشی کا مظاہرہ کیا ہے اس نے ایک عالمی طاقت کے طور پر امریکی زوال کی شروعات کر دی ہے۔ اپنے اپنے طور پر یہی بات دوسرے متعدد ایشیائی، یورپی اور امریکی دانشور بھی کہہ رہے ہیں۔

امریکی زوال کی بات ہوتی ہے اور صدر بش کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو بے ساختہ وہ زمانہ یاد آتا ہے جب امریکا کو سیاست میں اخلاقی برتری اس لیے حاصل تھی کہ اس کے ۱۶ ویں صدر نے اپنے ہی ہم قوموں سے لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس امریکی صدر کا نام ابراہم لنکن تھا اور وہ جنوب کی ان امریکی ریاستوں کے خلاف تھا جو امریکا میں غلامی کو ایک ادارے کے طور پر قائم رکھنا

چاہتی تھیں۔اسی مخالفت کی بنا پر اس نے اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف ایک طویل اور خوفناک جنگ لڑنے سے گریز نہیں کیا تھا۔ دوسری مرتبہ صدر منتخب ہونے کے بعد اس نے کہا تھا 'میری خواہش ہے کہ میں انتظام مملکت اس طرح چلاؤں کہ بظاہر جب میرا کوئی دوست بھی نہ رہے تو ایک دوست میرے اندر موجود ہو۔ میں ضروری نہیں کہ جیت جاؤں۔ بلکہ میں تو سچائی پر قائم رہنا چاہتا ہوں۔ میری کامیابی لازم نہیں۔ لیکن میں اس روشنی کی رہنمائی میں چلوں گا۔ جو میرے اندر موجود ہے۔'

اس زمانے کے امریکا، امریکی سیاست اور غلاموں کی آزادی کے بارے میں ایک امریکی ادیب کی تحریر ہمیں بتاتی ہے کہ جب لنکن صدر منتخب ہوا، اس سے تیس برس پہلے سے جنوبی لوگوں کا ایک گروہ غلامی کے خلاف جوش وخروش سے سرگرم عمل تھا۔ اور یہ ملک کو جنگ کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اس عرصے میں بے انتہا جذباتی لٹریچر شائع ہوا۔ لیکچرار معاوضہ لے کر شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کا دورہ کرتے رہے، اور شمالی علاقوں میں غلاموں کے لباس کے غلیظ چیتھڑے، ان کی بیڑیاں اور زنجیریں۔ خون آلود کوڑے۔ نوکدار کالر اور دیگر اذیت پہنچانے والے آلات لوگوں کو دکھاتے اور ان پر کئے جانے والے ظلم وستم کی داستان، درد انگیز انداز میں سناتے۔ ۱۸۳۹ء میں امریکا میں غلامی مخالف سوسائٹی نے ایک کتاب 'امریکی غلامی' کے نام سے شائع کی، جس میں ایک ہزار شاہدین کے بیانات درج تھے۔ جن میں بتایا گیا تھا کہ غلاموں پر کس قدر بہیمانہ مظالم روا رکھے جاتے رہیں۔ گرم لوہے کے ساتھ جو آگ کے انگارے کی طرح سرخ ہوتا انہیں داغ دیا جاتا۔ ان کے دانت اکھاڑ دیئے جاتے۔ انہیں چاقوؤں سے زخمی کیا جاتا اور انہیں خونی کتوں سے نچوایا جاتا تھا۔ بچوں کو ماؤں سے جدا کر دیا جاتا۔ اور انہیں منڈی میں بیچ دیا جاتا جو عورتیں زیادہ بچے پیدا نہیں کرتی تھیں انہیں کوڑوں کی سزا دی جاتی۔ طاقت ور سفید فام مردوں کو ان کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ نکھرے ہوئے رنگ کے بچوں کے دام منڈی میں زیادہ مل سکتے تھے۔ غلامی کے خلاف سب سے زیادہ جذبہ پیدا کرنے والی چیز مخلوط نسل پیدا کرنے کا طریق کار تھا۔ کیونکہ اس سے بد اخلاقی اور بے حیائی کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ ونڈل فلپس نے اعلان کیا کہ جنوبی علاقے میں نصف لاکھ عورتوں کو مجبوراً بدکار بننا پڑا ہے۔ اس سلسلے میں ایسی نفرت انگیز کہانیاں شائع ہوئیں جنہیں دوبارہ شائع کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ غلاموں کے مالکوں پر یہ بھی الزام تھا

کہ وہ مخلوط النسل لڑکیوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ اور پھر انہیں دوسرے لوگوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں۔ سٹیفن۔ ایس۔ فاسٹر نے انکشاف کیا کہ جنوب میں پچاس ہزار عورتیں جو میتھوڈسٹ چرچ سے وابستہ ہیں انہیں بداخلاقی کی زندگی گزارنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ اور میتھوڈسٹ مبلغین غلامی کی اس لیے حمایت کر رہے ہیں کہ وہ خود ان عورتوں کو تصرف میں لانا چاہتے ہیں۔

اس وقت کا امریکی آئین غلاموں کے آقاؤں کے طرف داری کرتا تھا۔ اس لیے غلامی کے حامی، غلامی ختم کرنے والے ترمیم شدہ آئین کو موت کا پروانہ اور دوزخ کا عہد نامہ قرار دیتے تھے۔ غلامی کے خاتمے سے متعلق جو لٹریچر موجود ہے، اس میں سب سے زیادہ موثر وہ کتاب ہے۔ جو دینیات کی ایک پروفیسر نے تصنیف کی۔ اس کا نام 'چچا ٹام کا کیبن' ہے۔ اس کتاب نے غلاموں کی زندگی کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی، اور لاکھوں قارئین کے جذبات کو سچ کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ لنکن نے ستمبر ۱۸۶۲ء میں اپنی کابینہ میں غلاموں کی آزادی کے اعلان کا مسودہ پیش کیا لیکن جنوری ۱۸۶۳ء سے پہلے یہ نافذ نہ ہو سکا۔ ۱۸۶۳ء کے نوروز پر لنکن نے آزادی کے پروانے پر دستخط کرتے ہوئے کہا کہ اگر غلامی ظلم نہیں ہے۔ تو دنیا میں کوئی فعل بھی ظلم نہیں ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی اس سے زیادہ درست کام نہیں کیا، جو ابھی کرنے والا ہوں۔ امریکا کے سیاہ فام غلاموں کو یہ آزادی ایک طویل اور خونیں خانہ جنگی کے بعد ملی۔ ابراہم لنکن اور اس کے بعض ساتھیوں کی استقامت اور انسانیت پر مکمل ایمان کے بغیر یہ آزادی اتنی آسان نہ تھی۔ اس خانہ جنگی میں کام آنے والے تمام افراد امریکی تھے۔ ان میں وہ نوجوان بھی تھے جن کی عمریں اٹھارہ برس سے کم تھیں۔ ۲۱ نومبر ۱۸۶۴ء کو اس نے اپنی زندگی کا مشہور ترین خط لکھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی ایک دیوار پر اس خط کی نقل آویزاں ہے۔ یہ خط بوسٹن کی مسز لیڈیا بکسبائی کے نام لکھا گیا ہے۔ لنکن نے لکھا 'میری عزیزہ! مجھے محکمہ جنگ کی فائلوں اور میساچوسیٹس کے ایڈ جوٹنٹ جنرل کے بیان سے معلوم ہوا ہے کہ تم پانچ بچوں کی ماں ہو اور یہ بچے میدان جنگ میں شاندار کارنامے سر انجام دیتے ہوئے کام آئے ہیں۔ میرے پاس وہ لفظ نہیں جن سے تمہارے بچوں کا پُرسہ کر سکوں۔ اتنے عظیم نقصان پر کوئی بھی تسلی کارگر نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ تمہارے بیٹوں نے ری پبلک کی خاطر جان قربان کر کے قوم کو ممنون احسان کر دیا ہے۔ میں دعا

کرتا ہوں کہ خدا تمہاری تکلیفوں اور دکھوں کو کم کرے اور تمہارے ذہن میں صرف اپنے جگر گوشوں کی یاد رہ جائے جو تمہارے لیے خوشی کا موجب ہو اور تمہارا سر فخر سے بلند رہے کہ تم نے آزادی کی قربان گاہ پر ایک عظیم قربانی پیش کی ہے۔'

ہم یہ توقع کیوں رکھیں کہ صدر بش عراقی نوجوانوں کی ہلاکت پر افسردہ ہوں گے لیکن وہ اس ناجائز ظالمانہ جنگ میں اپنے جن نوجوانوں کو قتل کروا رہے ہیں کیا انہیں کبھی ان کی یاد بھی نہیں آتی؟ صبح سویرے جب ان کی آنکھ اپنے نرم و گداز بستر میں کھلتی ہے تو کیا کبھی اپنے ہاتھوں پر ان امریکی نوجوانوں کے خون کی سرخی انہیں لمحے بھر کے لیے اپنی جھلک نہیں دکھاتی جو بے گناہ عراقیوں کو ہلاک کرتے ہوئے خود بھی مارے گئے؟ عراق میں مارے جانے والے فوجی نوجوانوں کی مائیں ان کے خلاف مظاہرے کر رہی ہیں، ایسے موقعوں پر کیا کبھی اپنے ہی ایک سابق صدر ابراہم لنکن کا یہ خط انہیں کبھی یاد آیا جواب سے ۱۴۲ ربرس پہلے لکھا گیا تھا۔ اس خط کے لکھنے والے کے قلم میں جو طاقت اور اخلاقی قوت ہے کیا وہ ان کے اندر بھی موجود ہے؟ یقیناً نہیں، تب ہی وہ سینڈی شیہان سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں، تب ہی وہ احتجاجی مظاہروں میں اپنے بیٹوں کے خون رائیگاں کا حساب مانگنے والی ماؤں کا سامنا نہیں کرتے۔

روزنامہ 'جنگ'، کراچی

۱۴ رجون ۲۰۰۶ء

'پاگلوں، خبطیوں اور غداروں' کی ضرورت ہے

اگست کے مہینے میں ساری دنیا ہیروشیما اور ناگاساکی، کے مقتولین کی یاد مناتی ہے۔ ان دو شہروں میں کبوتر اڑائے جاتے ہیں، گزشتگاں کی یاد میں منٹ، دو منٹ کی خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ شام ڈھلتی ہے تو ہزاروں اپنے ہاتھوں میں جلتی ہوئی شمعیں لے کر نکلتے ہیں۔ دریاؤں میں روشن قندیلیں بہائی جاتی ہیں۔ امن کے گیت گائے جاتے ہیں۔

ان لوگوں کو 'احمق' اور 'جذباتی' کہنے والے، ان پر طنزیہ انداز میں مسکرانے والے نامی گرامی سائنس دان، سیاست دان اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ ابتدائی ایٹم بموں سے ہزار گنا زیادہ خوفناک اور مہلک بم بنائے جاتے ہیں۔ اس سانحے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایٹمی ہتھیار تیار ہی نہیں کیے جاتے لیکن اس کی بجائے زیادہ 'بہتر' اور زیادہ 'موثر' ایٹم بم بنائے جانے لگے۔ تمام بڑی طاقتوں کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کی دوڑ شروع ہوگئی اور اس کے حق میں دلیل یہ دی گئی کہ 'عالمی امن' برقرار رکھنے کے لیے ایٹمی ہتھیار نہایت ضروری ہیں اور یہ بھی کہ زیادہ سے زیادہ ایٹمی ہتھیار، امن عالم کی ضمانت اور علامت ہیں۔

آج دنیا کے بہت سے ملک ایسے ہیں جن میں جنگی جنون کو اور ایٹمی قوت بننے کی خواہش کو ہوا دی جاتی ہے۔ ان ملکوں کے ننگے اور بھوکے عوام کو 'عظیم طاقت' بننے کے سنہری خواب دکھائے جاتے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کے لیے اپنی مٹھی کے چاولوں اور اپنے ہاتھ کی روٹی سے بھی دستبردار ہو جائیں کیونکہ وہ اپنے دشمن سے اسی وقت محفوظ رہ سکتے ہیں جبکہ وہ ایٹمی طاقت ہوں۔

ایک ایسے مہیب دور میں زندہ رہتے ہوئے مجھے تین افراد بہت شدت سے یاد آتے ہیں۔

'پاگلوں، خبطیوں اور غداروں' کی ضرورت ہے

اگست کے مہینے میں ساری دنیا ہیروشیما اور ناگاساکی، کے مقتولین کی یاد مناتی ہے۔ ان دو شہروں میں کبوتر اڑائے جاتے ہیں، گزشتگاں کی یاد میں منٹ، دو منٹ کی خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ شام ڈھلتی ہے تو ہزاروں اپنے ہاتھوں میں جلتی ہوئی شمعیں لے کر نکلتے ہیں۔ دریاؤں میں روشن قندیلیں بہائی جاتی ہیں۔ امن کے گیت گائے جاتے ہیں۔

ان لوگوں کو 'احمق' اور 'جذباتی' کہنے والے، ان پر طنزیہ انداز میں مسکرانے والے نامی گرامی سائنس دان، سیاست دان اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ ابتدائی ایٹم بموں سے ہزار گنا زیادہ خوفناک اور مہلک بم بنائے جاتے ہیں۔ اس سانحے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایٹمی ہتھیار تیار ہی نہیں کیے جاتے لیکن اس کی بجائے زیادہ 'بہتر' اور زیادہ 'موثر' ایٹم بم بنائے جانے لگے۔ تمام بڑی طاقتوں کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کی دوڑ شروع ہوگئی اور اس کے حق میں دلیل یہ دی گئی کہ 'عالمی امن' برقرار رکھنے کے لیے ایٹمی ہتھیار نہایت ضروری ہیں اور یہ بھی کہ زیادہ سے زیادہ ایٹمی ہتھیار، امن عالم کی ضمانت اور علامت ہیں۔

آج دنیا کے بہت سے ملک ایسے ہیں جن میں جنگی جنون کو اور ایٹمی قوت بننے کی خواہش کو ہوا دی جاتی ہے۔ ان ملکوں کے ننگے اور بھوکے عوام کو 'عظیم طاقت' بننے کے سنہری خواب دکھائے جاتے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کے لیے اپنی مٹھی کے چاولوں اور اپنے ہاتھ کی روٹی سے بھی دستبردار ہو جائیں کیونکہ وہ اپنے دشمن سے اسی وقت محفوظ رہ سکتے ہیں جبکہ وہ ایٹمی طاقت ہوں۔

ایک ایسے مہیب دور میں زندہ رہتے ہوئے مجھے تین افراد بہت شدت سے یاد آتے ہیں۔

یہ تینوں اس زمانے میں زندہ تھے جب یہ ایٹمی عفریت پیدا ہوا بلکہ ان میں سے ایک تو اس کی پیدائش کا سبب بنا میری مراد آئن اسٹائن سے ہے۔ بیسویں صدی کا وہ عظیم سائنس دان اور دانشور جس نے آخری سانس تک خود کو معاف نہیں کیا اور اپنی عمر کے باقی ماندہ سال ان ہتھیاروں کی مخالفت میں بسر کیے۔ اس نے اپنے گرد دنیا کے ان باضمیر انسانوں کو جمع کیا جنہیں جنگ سے نفرت تھی اور جو ایٹمی ہتھیاروں کو تلف کرنے کی بات کرتے تھے۔ اس نے ایک خط میں لکھا 'ہمارے سامنے دو راستے ہیں، یا تو ہم جوہری اسلحے سے نجات حاصل کر لیں یا نسل انسانی کی مکمل تباہی اور اس کے نیست و نابود ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔ قومی تفاخر ایک بچکانہ بیماری ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت چھوت کی بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ہماری نصابی کتابیں جنگ کی تعریف و توصیف سے بھری ہوئی ہیں اور اس کے لائے ہوئے عذابوں اور تباہ کاریوں کو چھپاتی ہیں۔ یہ کتابیں ہمارے بچوں کی رگوں میں نفرتوں کا زہر انڈیلتی ہیں۔ میں جنگ کی بجائے امن کی تبلیغ کروں گا۔ میں نفرت کی بجائے محبت کو پھیلاؤں گا۔'

مجھے امریکی فوجی میجر کلاڈ ایتھرلے یاد آتا ہے جو ہیروشیما پر بم گرانے والوں میں سے ایک تھا، جس نے اپنی آنکھوں سے لاکھوں کے شہر کو دو منٹ کے اندر راکھ اور دھواں بن کر اڑتے دیکھا۔ میجر ایتھرلے اس خوفناک منظر کو اپنے ذہن سے کبھی نہ کھرچ سکا۔ وہ بیسویں صدی کی امریکی تاریخ کا باضمیر انسان ہے جس نے ۶/اگست ۱۹۴۵ء کو ایٹم بم گرانے کے چند لمحوں بعد ہی یہ جان لیا تھا کہ سیاستدان اور جرنیل 'فرض شناسی' اور 'وطن سے وفاداری' کے نام پر اس سے ایک ایسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کے کرنے کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ جاگتا رہتا تو اس کی آنکھوں میں ایک شہر کے صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کا منظر کھنچا رہتا اور سوتا تو اذیت کے جہنم میں جھلتے ہوئے ہزاروں چہرے اسے اپنی طرف تکتے نظر آتے، ان کی کرب ناک چیخیں اس تک پہنچتیں اور وہ دیوانوں کی طرح سوتے سے اٹھ بیٹھتا۔ انسانیت کا مجرم ہونے کا یہ احساس اسے دیمک کی طرح کھانے لگا۔ تنگ آ کر اس نے امریکی فضائیہ کی شاندار ملازمت ترک کر دی اور پیٹ پالنے کے لیے معمولی نوکریاں کرنے لگا۔ ذہنی حالت بگڑی تو نفسیاتی معالجوں کے پاس گیا۔ ان ہی دنوں ۱۹۵۰ء میں امریکی صدر ٹرومین نے ایٹم بم سے کہیں زیادہ مہلک ہتھیار 'ہائیڈروجن بم' بنانے کا اعلان کیا تو ایتھرلے پر ڈپریشن کا اتنا

شدید دورہ پڑا کہ اس نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی، دوسری مرتبہ اس نے اپنی کلائی کی رگیں کاٹ لیں لیکن بچالیا گیا۔ اسی دوران وہ ہیروشیما کے ان ہسپتالوں کو وقتاً فوقتاً رقم بھیجتا رہا جہاں ایٹمی حملے کے متاثرین کا علاج ہوتا تھا۔ اس نے جاپانی ڈاکٹروں، صحافیوں اور دانشوروں کو خط لکھے اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہیروشیما پر گرائے جانے والے بم کی ہولناکی اور تباہ کاری کی شدت سے وہ واقف نہ تھا۔ نادانستہ میں اس سے جس جرم کا ارتکاب ہوا اس کی اذیت نہ اسے دن کو چین لینے دیتی ہے اور نہ رات کو آرام کرنے دیتی ہے۔

ان ہی دنوں امریکیوں نے صدارتی انتخاب میں دوسری جنگ عظیم کے ایک جرنیل جنرل آئزن ہاور کو اپنا صدر منتخب کرلیا۔ ایتھرلے کو یقین ہوگیا کہ جنگی جنون کو ہوا دینے والے عناصر امریکی سماج میں روز بہ روز طاقتور ہوتے جارہے ہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی امریکی عوام کو اس سچ سے آگاہ کرنے کے لیے وقف کردے گا کہ ان کے جرنیلوں اور سیاستدانوں نے ملک اور قوم کے نام پر انسانیت کے خلاف کن جرائم کا ارتکاب کیا ہے اور ان کا جنگی جنون آئندہ بھی امریکا کی رسوائی اور بدنامی کا سبب بن سکتا ہے۔ ایتھرلے کا یہ عزم امریکی محکمہ دفاع کے لیے ناقابلِ برداشت تھا چنانچہ وہ گرفتار کرلیا گیا اور محض سرکاری ماہرینِ نفسیات کی گواہی پر اسے تیسرے درجے کا پاگل قرار دے کر ٹیکساس کے فوجی ہسپتال میں قید کردیا گیا۔ یہ برٹرینڈ رسل اور آسٹریا کے دانشور گنٹر اینڈرز کی ذات تھی جنہوں نے میجر ایتھرلے کا مقدمہ لڑا۔ یہ گنٹر تھا جس نے اپنی اور 'پاگل' ایتھرلے کی خط و کتابت شائع کرائی اور دنیا پر یہ ثابت کیا کہ فوجی ڈاکٹر جنہیں 'دیوانہ' قرار دیں وہ کیسے 'فرزانے' ہوتے ہیں۔

خطوں کے اس مجموعے سے میں میجر ایتھرلے کا ایک خط پڑھتی ہوں جس میں اس نے لکھا تھا: 'میں سمجھتا ہوں وہ وقت آ پہنچا ہے جب بہ طور فرد ہم اس بات کا ازسرِنو جائزہ لیں کہ سماجی اداروں یعنی سیاسی جماعت، ٹریڈ یونین، مذہب اور مملکت کے سامنے کیا ہمیں سپر ڈال دینی چاہیے؟ اور کیا اپنے خیالات اور اپنے افعال ہمیں ان کے احکامات کے تابع کردینے چاہئیں؟'

جاپانی عوام کے نام اس نے ایک خط میں تحریر کیا: 'میں وہ فوجی ہوں جس نے ہیروشیما کو نیست و نابود کیا۔ میرا ضمیر اس جرم پر عذاب میں مبتلا ہے۔ میں معافی کا طلب گار ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے خلاف کیوں صف آرا ہوں؟ جنگ ایک وحشیانہ اور غیر انسانی فعل ہے۔ ہم اشرف

المخلوقات ہو کر خود ہی ایک دوسرے کو کیسے تباہ کر سکتے ہیں؟ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے ہیروشیما کی راکھ میں سونے والے 'امن' کے لیے فریاد کرتے ہیں۔'

یہ گنٹر کی ذات تھی جس نے میجر ایتھرلے کو اس کے باضمیر ہونے پر مسلسل داد دی۔ اس کے حوصلے پست نہیں ہونے دیے اور عالمی ضمیر کو بیدار کر کے امریکی وزارت دفاع کو مجبور کیا کہ ان کی جنگجویانہ پالیسیوں پر اعتراض کرنے والے اور امریکی رائے عامہ کو ان پالیسیوں کے خلاف ہموار کرنے والے اس صحیح الدماغ اور باضمیر شخص کو رہا کریں جسے انہوں نے پاگل قرار دے کر قید کر رکھا ہے۔ یہ اسی کے خطوط اور تحریریں تھیں جنہوں نے امریکا اور یورپ میں 'حب وطن' اور 'فرض کی ادائیگی' ایسے محترم جذبوں کو اپنے جنگی جنون کی تسکین کے لیے استعمال کرنے والے جرنیلوں اور سیاستدانوں کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کیا۔ آج کی جنگ زدہ اور تصادم آمادہ دنیا میں ایسے ہی فلسفیوں اور دانشوروں کی ضرورت ہے۔

میجر ایتھرلے اور گنٹر کی خط و کتابت ایک غیر معروف اشاعتی ادارے سے شائع ہوئی اور اس کا پیش لفظ رسل نے لکھا۔ برٹرینڈ رسل زندگی میں ہمیشہ ایک امن پسند کے طور پر پہچانا گیا۔ اسے اپنے ملک میں خواص اور عوام دونوں کی دشنام طرازیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے ایٹمی ہتھیاروں اور برطانیہ کے ایٹمی تجربوں کے خلاف برطانوی وزیراعظم کی قیام گاہ کے سامنے مظاہرہ کیا تو وہ اس کا واحد شریک تھا۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو اس پر سڑے ہوئے ٹماٹر اور گندے انڈے پھینک رہے تھے۔ اسے 'خبطی' اور 'غدار' کہہ رہے تھے۔ پولیس اسے وہاں سے گھسیٹ کر لے گئی لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا اور آخر تک جنگ پسندوں سے صلح کے لیے تیار نہیں ہوا۔

۶ راگست کی تاریخ تین دن پہلے گزری ہے اور آج ۹ راگست ہے۔ ناگاساکی، کو ۶۱ برس پہلے آج ہی کے دن قتل کیا گیا تھا۔ اگست کی یہ تاریخیں مجھے بہت مضطرب رکھتی ہیں۔ ان دنوں مجھے آئن اسٹائن، میجر کلاڈ ایتھرلے اور برٹرینڈ رسل یاد آتے رہتے ہیں۔ مجھے خیال آتا ہے کہ آج جب دنیا تہذیبوں کے تصادم اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر ایک سنگین اور مہیب بحران کا شکار ہے، آج جب ۶۱ برس پہلے کے ایٹم بموں سے کہیں زیادہ مہلک ہتھیار ہمارے درمیان اژدھوں کی طرح پھنکار رہے ہیں تو اس جنون سے لڑنے والے کیوں پیدا نہیں ہو رہے۔؟

مانا کہ یورپ میں عوام کی ایک بڑی تعداد، کچھ ادیب، کچھ دانشور سڑکوں پر نکلتے ہیں، اس کے باوجود میرا یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ یورپ اور امریکا اتنے بانجھ کیوں ہو گئے کہ میجر کلاڈ ایتھرلے، اور آئن اسٹائن جیسے باضمیر پیدا نہیں کرتے جو اپنے جرائم کا اعتراف کر سکیں۔ ان جنگی جنونیوں سے اپنی قوت کے ساتھ لڑ سکیں جنہوں نے اس کرۂ ارض کو بارود کا ڈھیر بنا دیا ہے۔ وہ لوگ کہاں ہیں جو یہ کہہ سکیں کہ ہم غلط تھے، ہم اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں جنہیں اس کرۂ ارض سے، اپنے گزرے ہوئے کل، آج اور آئندہ سے محبت ہے۔

دنیا کو مسٹر ٹونی بلیئر اور مسٹر جارج ڈبلیو بش کی نہیں، آئن اسٹائن، رسل اور میجر کلاڈ ایتھرلے جیسے 'پاگلوں، خبطیوں اور غداروں' کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی
۹/اگست ۲۰۰۶ء

'نئی دنیا'

ایک زمانہ تھا جب دنیا میں انقلاب امریکا اور انقلاب فرانس کی دھوم تھی۔

انقلاب فرانس نے دنیا میں آزادی، مساوات اور اخوت کی ایک نئی طرح ڈالی، اس انقلاب کے زمانے میں لگنے والے نعرے آج بھی دنیا کے نوجوانوں کو محبوب ہیں لیکن پھر آہستہ آہستہ اس انقلاب کا رنگ پھیکا پڑا اور بیسویں صدی میں اسی انقلابی فرانس نے الجزائر میں کون سے ستم نہیں توڑے۔ اسے اپنی نو آبادی بنائے رکھنے اور اس کے وسائل پر قبضہ رکھنے کے لیے وہاں کی مزاحمتی تحریک کو کس طرح نہیں کچلا گیا۔ وہی فرانسیسی جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران اپنے ملک پر نازی قبضے کے خلاف شاندار مزاحمت کی تھی اور جن کی زیر زمین تحریک نے مزاحمت کی ایک نئی تاریخ لکھی تھی، وہ صرف چند برس بعد سب کچھ بھول کر الجزائری تحریک آزادی کو کچلنا اپنا فرض منصبی سمجھنے لگے۔ اسی زمانے میں فرانز فینن نے ایک کتاب The Wretched of the Earth لکھی جس کا اردو ترجمہ 'افتادگانِ خاک' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب کو تیسری دنیا کا عوامی منشور کہا جاتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آنے والی اس کتاب نے فرانس کے بہت سے لوگوں کا ضمیر جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا دیباچہ ژاں پال سارتر نے تحریر کیا۔ اس طویل دیباچے میں اس نے فرانسیسیوں اور یورپی ممالک کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

> 'آپ کہیں گے ہم تو ولایت میں رہتے ہیں اور نو آبادیات میں جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان میں ہماری مرضی شامل نہیں ہے۔ ٹھیک ہے آپ نو آبادیات میں نہیں گئے لیکن محض اس وجہ سے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں

دیا جاسکتا۔ تاجروں اور فوجیوں کے وہ ہراول دستے جنہوں نے اپنی چالاکیوں، عیاریوں اور فوجی کارروائیوں سے ممالکِ غیر کو اپنی نوآبادیاں بنالیا، آپ ہی میں سے تو تھے۔ آپ نے ہی انہیں وہاں بھیجا تھا اور انہوں نے نوآبادیات کا استحصال کر کے آپ کو مالا مال کیا۔ آپ نے انہیں یہ تنبیہ ضرور کی تھی کہ اگر انہوں نے بہت زیادہ خون بہایا تو آپ ان پر سے ہاتھ اٹھالیں گے اور کبھی کبھی ایسا ہوا بھی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی حکومت غیر ممالک میں اپنے جاسوسوں اور شورش برپا کرنے والوں کی پشت پناہی کرتی ہے لیکن جب وہ پکڑے جاتے ہیں تو لاتعلقی کا اظہار کرتی ہے اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتی ہے۔ آپ جو بڑے اعتدال پسند اور انسانیت نواز ہیں، جو تہذیب وتمدن کے اس حد تک دلدادہ ہیں کہ یہ دلدادگی تصنع لگنے لگتی ہے، کس تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ یہ بھول جاتے ہیں کہ آپ نوآبادیات کے مالک ہیں اور ان نوآبادیات میں آپ کے نام پر لوگوں کا قتل عام کیا جاتا ہے۔ فینن اپنے رفیقوں کو، خاص طور پر ان کو جو مغربیت کے رنگ میں خاصے رنگے ہوئے ہیں، یہ بتاتا ہے کہ ولایت کے لوگوں اور نوآبادیات میں ان کے نمائندوں کے درمیان مفادات کا کیسا زبردست اشتراک ہے جس نے ان کے اتحاد کو مستحکم کر دیا ہے۔

ہمت کر کے اس کتاب کو پڑھ ہی ڈالیے کیونکہ یہ آپ کو شرم دلائے گی۔'

سارتر میں انقلاب فرانس کی روح زندہ تھی اسی لیے وہ فرانسیسیوں کو آئینہ دکھا سکا، ان سے 'غدار' اور 'وطن فروش' جیسے القابات سن کر بھی سر اٹھا کر چلتا رہا۔ اور آج بھی وہ دنیا میں ایک بلند تر مقام رکھتا ہے لیکن انقلاب امریکا کو بیسویں اور پھر اکیسویں صدی میں جس قدر شدید زک پہنچی ہے، اس کا اندازہ ابھی شاید ممکن نہ ہو اور اس کا ازالہ شاید کبھی نہ ہو سکے۔ آیئے! کچھ دیر کو ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جارج واشنگٹن، تھامس جیفرسن اور ابراہم لنکن زندہ ہو گئے ہیں اور ان کے سامنے گزشتہ ساٹھ ستر برس کے امریکی حکمرانوں کی کارگزاری رکھ دی گئی ہے۔ انہیں جاپان پر ایٹمی حملے، کوریا، کمبوڈیا، ویتنام، نکاراگوا، چلی، ال سلواڈور، پناما اور عراق میں امریکی مداخلت اور

خوں ریزی کی کہانیاں سنادی گئی ہیں، انہیں ۷/ اکتوبر ۲۰۰۱ء سے آج کے لمحے تک افغانستان پر امریکی بمباری کی فلمیں دکھا دی گئی ہیں۔ ان لوگوں نے افغانستان پر حملے کے بارے میں صدر امریکا سے لے کر وزارت دفاع اور وزارت خارجہ کے اہم ذمہ دار سرکاری اہل کاروں کے بیانات پڑھ لیے ہیں۔ انہوں نے عراق پر امریکی حملے، غاصبانہ قبضے اور پھر وہاں ہونے والی لوٹ مار، خونریزی اور سفاکی کے تمام شواہد اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں۔

آیئے! ہم سوچتے ہیں کہ اس 'امریکی کارگزاری' سے آگاہ ہونے کے بعد ان امریکی مدبروں اور رہنماؤں کا کیا حال ہو سکتا ہے؟

میرے خیال میں اگر یہ سب کچھ ممکن ہو تو یہ لوگ حیرت اور صدمے سے شاید جاں بر نہ ہو سکیں اور دوبارہ ان کی روحیں عالم بالا کو پرواز کر جائیں، ورنہ ان کے ہوش و حواس کھو دینے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔ اس کا بھی مجھے یقین ہے کہ اگر دوبارہ سے اپنے حواسوں میں آ جائیں تو یہ تینوں اعلان کر دیں گے کہ کسی دوسرے ملک کا نام امریکا رکھ دیا گیا ہے کیونکہ ہم نے جس امریکا کی بنیاد رکھی تھی، انصاف، آزادی، مساوات اور جمہوریت اس کے بنیادی ستون تھے، ہم نے کسی غاصب اور استحصالی ملک کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اور جب انہیں یقین دلایا جائے گا کہ یہ ان ہی کا امریکا ہے تو وہ شاید اپنے امریکی ہونے سے انکار کر دیں یا شاید بیسویں صدی کے بیشتر امریکی سیاستدانوں اور مدبروں کو عاق کرنے کا اعلان کر دیں اور اپنا گریباں چاک کر کے جنگل و صحرا کا رُخ کریں۔

۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو امریکی سیاستدانوں اور جرنیلوں نے ایک خوں ریز عوامی جدوجہد کے بعد جب برطانیہ کے نوآبادیاتی چنگل سے نجات حاصل کی تھی تو امریکی خواص اور عوام دونوں نے اس کی بھاری قیمت ادا کی تھی۔ اسی زمانے میں 'نئی دنیا' کی اصطلاح رائج ہوئی تھی۔ امریکیوں کا کہنا تھا کہ انقلاب امریکا سے پہلے جو دنیا تھی وہ 'پرانی دنیا' تھی اور اب ہم ایک 'نئی دنیا' کی تشکیل کر رہے ہیں۔

انقلاب برپا کرنے والے ان امریکی رہنماؤں نے 'اعلان آزادی' کے ابتدائی حصے میں لکھا تھا:

'ہم ان حقائق کو حتمی سمجھتے ہیں کہ تمام انسان یکساں حیثیت کے ساتھ پیدا

ہوئے اور خالق نے انہیں بعض ایسے حقوق دیے جو قطعاً چھینے نہیں جاسکتے۔ان حقوق میں زندگی، آزادی اور سعی راحت شامل ہیں۔ان ہی حقوق کے حصول کے لیے انسانوں کے درمیان حکومتیں بنتی ہیں۔وہ اپنے تمام جائز اختیارات شہریوں کی رضامندی سے حاصل کرتی ہیں۔چنانچہ جب حکومت کی کوئی شکل ان مقاصد کے لیے تباہی کا باعث بن جاتی ہے تو لوگوں کا حق ہے کہ اسے بدل دیں یا ختم کردیں اور اس کی جگہ نئی حکومت قائم کرلیں۔'

امریکی اعلان آزادی ایک شاندار دستاویز ہے لیکن افسوس کہ اس کی روح کئی دہائیوں پہلے پرواز کر چکی ہے اور آج امریکا ایک ایسی استبدادی اور استعماری قوت ہے جو دنیا کی کمزور ترین قوم کو بھی پوری قوت سے کچلنے کو بہادری اور ایک کارنامہ خیال کرتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ انقلاب امریکا آج ناکام ہو چکا ہے۔یہ انقلاب اس لیے رونما ہوا تھا کہ اس زمانے کے امریکیوں نے آزادی، مساوات اور عالمی برادری کا ایک خواب دیکھا تھا لیکن اب وہ خواب ان لوگوں کے قبضے میں ہے جو صرف اپنے مفادات کی عینک سے ساری دنیا کو دیکھتے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ دنیا کے دیگر تمام ملک اور تمام قومیں اس لیے ہیں کہ وہ امریکا کی چاکری کریں اور اس کے ہر فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کردیں اور ان ملکوں کے وسائل پر امریکا کا قبضہ ہو۔

ایک امریکا پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد کا امریکا تھا۔اس امریکا کو پہلی جنگ عظیم کے نقصانات نہ ہونے کے برابر ہوئے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ پہلی جنگ عظیم اس کے لیے خوش حالی کا پیغام لائی۔اس سے بھی اہم بات یہ ہوئی کہ امریکیوں میں جنگ سے نفرت کا ایک ایسا جذبہ ابھرا جس کی بناء پر وہ بین الاقوامی سیاست سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دینے لگے۔اس کے باوجود پہلی جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد امریکا میں جس قدر تیز رفتار صنعتی ترقی ہوئی اس نے جہاں امریکیوں کو ایک دولت مند قوم بنادیا، وہیں اسلحہ سازی کی صنعت نے بڑے پیمانے پر وسعت حاصل کی اور اس اسلحے کی کھپت امریکی صنعت کاروں کے لیے ایک مسئلہ بن گئی۔یہ خوش حالی، اطمینان اور اپنی قوت پر یقین تھا جس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکا کو علیحدگی کی پالیسی ترک کرنے پر آمادہ کیا۔اس آمادگی پر اکسانے میں ایک بڑا حصہ اسلحہ سازی کی صنعت

سے تعلق رکھنے والوں کا تھا۔ اور پھر اس جنگ میں امریکی عمل دخل اس حد تک بڑھا کہ اس نے جاپان پر ایٹمی حملوں سے بھی گریز نہیں کیا اور یہیں سے مغربی اقوام کی قیادت براہ راست امریکا کے ہاتھ میں آ گئی۔

طاقت و اقتدار انسانوں کو خراب کرتا ہے اور مطلق طاقت و اقتدار انسانوں اور قوموں کو ایسے تکبر اور نخوت میں مبتلا کرتا ہے جس کے بعد وہ خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھنے لگتے ہیں۔ جاپان کو ایٹمی حملوں کا نشانہ بنانے کے بعد سے آج تک امریکی حکمرانوں کا ذہن دنیا پر بلاشرکت غیرے حکومت کے خواب دیکھتا ہے، اسی خواب کی تکمیل کے لیے پچاس برس تک انہوں نے دنیا کو سرد جنگ میں مبتلا رکھا۔ ویتنام سے افغانستان اور عراق تک طاقت کا وحشیانہ استعمال اس خواب کی تکمیل کا ایک حصہ ہے۔

امریکی انقلاب کو برپا کرنے والے آج اگر زندہ ہو جائیں تو یہی سوچیں گے کہ کیا اسی لیے ہم نے برطانوی استعمار سے جنگ لڑی تھی؟ ابراہم لنکن کی سمجھ میں یہ کیسے آئے گا کہ وہ اپنے ملک کے غلاموں کی آزادی کے لیے سالہا سال لڑا تھا، اس کے سگڑ پوتوں کو کیا ہوا کہ وہ کروڑوں کی آبادی رکھنے والے ملکوں کو غلام بنانے کے درپے ہو گئے۔ جارج واشنگٹن کی عقل حیران رہے گی کہ مفروضوں کی بنیاد پر ملکوں پر حملہ کرنا، انہیں ملبے کا ڈھیر بنا دینا کس طور انصاف پر مبنی ہے۔

انقلاب امریکا کی بنیاد رکھنے والوں نے ایک 'نئی دنیا' آج سے سوا دو سو برس پہلے تخلیق کی تھی، جس نے اپنے وقت کی سب سے بڑی نوآبادیاتی قوت سے لڑائی لڑ کر آزادی حاصل کی تھی، جس کا ایمان تھا کہ اس کی آزادی کے ساتھ ہی 'پرانی دنیا' مر چکی ہے اور اب وہ 'نئی دنیا' پیدا ہوئی ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے خوبصورت خواب دیکھے گی اور ایک برطانوی، فرانسیسی یا امریکی سماج کی بجائے ایک انسانی سماج وجود میں آئے گا۔

وہ ویتنامی بچہ جس کا گھر نپام بم کا شکار ہوا، وہ افغانی بچہ جس کا گھر امریکی بمباری کی زد میں ہے، وہ عراقی بچی جو اپنے گھر والوں سے محروم ہو چکی ہے اور جسے ایک وقت کی روٹی کے لیے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے، ان سب کے لیے اس 'نئی دنیا' کا وجود کہیں نہیں ہے۔ وہ ایک ظالم اور غاصب دنیا کو جانتے ہیں جس نے ان کے سارے خواب اپنی فوجی قوت سے روند ڈالے۔

آج امریکی حکمران ایک ایسی 'نئی دنیا' کی تشکیل چاہتے ہیں جس پر وہ بلاشرکت غیرے حکومت کریں، یہ ایک ایسی خواہش ہے جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند!

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی
۶ ستمبر ۲۰۰۶ء

گیارہ کروڑ بے گناہوں کا قتل

نائین الیون کی پانچویں سالگرہ سے چند دن پہلے نیویارک کے میئر نے اس سانحے کو اکیسویں صدی کا سب سے بڑا سانحہ اور دہشت گردی کا واقعہ ٹھہرایا۔ انہوں نے کہا کہ اس خوفناک دہشت گردی کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

ان کا یہ جملہ اکیسویں صدی کا شاید سب سے بڑا لطیفہ ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے امریکی تاریخ نہیں پڑھی اور جنہیں امریکی ریاست کی ستم کاریوں کا علم نہیں، ہوسکتا ہے وہ اس جملے پر آمنا و صدقنا کہیں لیکن جو لوگ کتابیں پڑھتے ہیں، حقائق جاننے کے لیے جستجو کرتے ہیں، وہ موصوف کے اس جملے پر قہقہہ لگانے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں میں بے شمار امریکی بھی شامل ہیں جو امریکی، فلسفی، ماہر لسانیات اور دانشور نوم چومسکی کے اس جملے سے اتفاق کرتے ہیں کہ 'زیادہ طاقت ور ریاستیں، دنیا کی بدترین دہشت گرد ریاستیں ہیں اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کا تو کسی سے مقابلہ ہی نہیں ہے۔'

ہم پانچ برس سے نائین الیون کے سانحے کے بہانے دنیا کی کمزور اور غریب قوموں پر ہونے والے ستم دیکھ رہے ہیں۔ افغانستان اور عراق پر امریکی حملہ، ان ملکوں کی تاراجی اور ان پر امریکا کا غاصبانہ قبضہ دیکھ رہے ہیں۔ اور امریکی مدبرین سے یہ بھی سن رہے ہیں کہ دہشت گردوں کو دنیا کے لیے درسِ عبرت بنا دیا جائے گا۔

ان دنوں نائین الیون کے سانحے کے بارے میں بہت سی کتابیں اور فلمیں سامنے آچکی ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ ان میں سے کچھ امریکی حکومت کے موقف کو اجاگر کرتی ہیں اور کچھ ایک مہیب سازش کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو موجودہ امریکی حکومت کے بعض کار

پردازوں کی تیار کی ہوئی تھی۔اس بارے میں پھر کبھی سہی،اس وقت مجھے نیویارک کے میئر کی بات کے حوالے سے تاریخ کے وہ سچ یاد آرہے ہیں جو کتابوں میں موجود ہیں لیکن امریکی حکومتیں جن پر مختلف خوش نما پردے ڈالتی رہتی ہیں۔

اس وقت مجھے ریڈ انڈین قبائل کی وہ 'نسلی صفائی'، یاد آرہی ہے جو امریکا کی سرزمین پر قدم رکھنے والوں نے فوراً ہی شروع کر دی تھی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ریڈ انڈین نسل معدوم ہونے کے خطرات سے دوچار ہے اور سفید فام امریکی، شمالی امریکا کے بلاشرکت غیرے مالک ہیں۔

یوں تو امریکی ریاست نے غیر ممالک کی سرزمین پر غیر اعلانیہ حملے، قبضے اور اور لوٹ مار کا سلسلہ اٹھارویں صدی سے شروع کر دیا تھا لیکن ہم اپنی بات انیسویں صدی سے آغاز کرتے ہیں جو امریکی ریاستی دہشت گردی کے عروج کا آغاز ہے۔

ہم یہ دیکھتے ہیں ۱۸۰۱ء میں امریکی میرین سپاہی سلطنت عثمانیہ کے زیراثر ریاستوں مراکش، الجزائر، تیونس اور طرابلس کی سرزمین پر اترتے ہیں اور اس بربری جنگ کا آغاز ہوتا ہے جو ۱۸۰۵ء تک جاری رہی۔اس جنگ کے دوران امریکی بحریہ نے ان ملکوں کی مختلف بندرگاہوں پر حملے کیے اور قتل و غارت گری کا ایک ایسا بازار گرم کیا جس نے اس وقت کی عالمی طاقت برطانیہ اور فرانس کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ شاید ان کی عالمی بالادستی کے دن گنے جا چکے ہیں۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ۱۸۰۶ء کے بعد کئی دہائیوں تک امریکی فوجیں فرانس، اسپین اور بلیجیئم کی نوآبادیوں پر حملے کرتی ہیں، بستیوں کو تباہ کرتی ہیں اور نہتے شہریوں کا قتل عام کرتی ہیں۔ اس تمام جدال و قتال کا مقصد صرف اور صرف زمین اور وسائل پر قبضہ اور کمزور قوموں اور علاقوں پر امریکی دہشت کا بٹھانا تھا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انیسویں صدی کے دوران 'امریکی مفادات کے تحفظ کی خاطر' امریکی بحری جہازوں کے ذریعے افریقہ، کیوبا، یونان، سماٹرا، چین، ارجنٹائن، جزائر فجی، پیراگوئے، میکسیکو، کوریا، جزائر ہوائی، مصر، ترکی، پناما، برازیل، اسپین اور ہیٹی میں امریکی فوجیں اتاری جاتی ہیں، کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ 'ہم اپنی طاقت کا مظاہرہ اس لیے کر رہے ہیں کہ ہمیں کمزور نہ سمجھا جائے' اور کبھی یہ فوج کشی 'امریکی شہریوں اور امریکی قونصل خانے کی جان و مال کی حفاظت' کے نام پر کی جاتی ہے۔

۱۹۰۰ء سے امریکی ریاستی دہشت گردی کھل کر سامنے آتی ہے اور جزائر فلپائن پر اس وقت دھاوا بولا جاتا ہے جب فلپینی اسپین سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ اور اسی برس چین کے دارالحکومت پیکنگ (بیجنگ) میں امریکی سپاہی دندناتے پھرتے ہیں۔ بہانہ یہ بنایا جاتا ہے کہ چین کے اندرونی خلفشار کے دوران کہیں کسی 'غیر ملکی' کی جان کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ ان امریکی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ۱۹۳۴ء تک چینی سرزمین پر موجود رہتے ہیں۔

۱۹۰۰ء سے دنیا کے متعدد آزاد اور خود مختار ملکوں کے خلاف چھوٹے یا بڑے پیمانے پر لشکر کشی امریکیوں کا وتیرہ بن جاتی ہے۔ یہاں ان ملکوں کے ناموں کی فہرست دی جائے تو وہ کئی سطروں میں آئے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ امریکا کے ان اقدامات کو ریاستی دہشت گردی کے سوا اور کس نام سے پکارا جائے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ نیویارک کے میئر اور اان جیسے خیالات رکھنے والے امریکی حکام کو یہ تمام واقعات اسکول میں پڑھائے گئے ہیں یا نہیں۔ یا پھر نائین الیون کو دہشت گردی کا خوفناک ترین واقعہ قرار دینے والے 'یادفراموشی'، کے مرض میں گرفتار ہیں؟

کیا انہیں یاد نہیں کہ ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۲ء کے دوران امریکا کی بری اور بحری فوجوں اور میرین کے دستوں نے فلپائین میں دو لاکھ نہتے شہری، مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا تھا؟ مشہور امریکی ادیب مارک ٹوائن اور بعض دوسرے ادیبوں اور دانشوروں نے اس خونریزی پر شدید احتجاج کیا لیکن اس وقت کے امریکی صدر ولیم میک کنلے نے اسے 'خدا کی رضا' کے نام سے یاد کیا تھا۔

۶ / اور ۹ / اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کے دو شہروں کو جس طرح ایٹم بموں کے ذریعے چشم زدن میں ملیامیٹ کر دیا گیا، اس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ دو لاکھ سے زیادہ شہری آن کی آن میں خاکستر ہو گئے، لاکھوں کو ہفتوں کی شدید اذیت کے بعد موت آئی اور لاکھوں آج بھی ہیروشیما اور ناگاساکی کے مضافات میں بنی ہوئی ایٹمی جھونپڑ پٹیوں میں رہتے ہیں اور ان کی گزر بسر بھی کی اور فلاحی تنظیموں کی امداد پر ہے۔ امریکی تاریخ کی یہ وہ دو شرمناک تاریخیں ہیں جن کے بعد امریکیوں کو UGLY AMERICAN (بدصورت امریکی) کہا جانے لگا۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء اور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۴ء کے دوران امریکا نے کوریا، لاؤس، ویتنام اور کمپوچیا کے خلاف جس نوعیت کی ریاستی دہشت گردی کی اس میں لگ بھگ پون کروڑ بے گناہ

شہری مارے گئے، بستیوں کی بستیاں جلا کر راکھ کر دی گئیں اور لاکھوں معذور ہوئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ۱۶/ مارچ ۱۹۶۸ء کو 'مائی لائی' کا الم ناک سانحہ ہوا۔ اس سانحے پر ایک کتاب ONE MORNING IN THE WAR میں تلخیص و ترجمہ کر چکی ہوں، اس لیے آج بھی مائی لائی کا نام لکھتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس روز امریکی سور ماؤں نے جن کی سربراہی لیفٹیننٹ ولیم کیلی کر رہا تھا صبح سویرے مائی لائی کا محاصرہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں ویت کانگ گوریلوں کو پناہ دی گئی ہے، ان گوریلوں کی تلاش میں جب اسے ناکامی ہوئی تو اپنی ناکامی کا انتقام اس نے نہتے کسانوں، بوڑھی عورتوں، شیر خوار بچوں سے لیا، سینکڑوں اپنے گھروں اور کھیتوں میں مار دیے گئے اور درجنوں کو گڑھوں میں دھکیل کر انہیں خودکار ہتھیاروں سے ہلاک کیا گیا۔ شہری آبادی کے اس قتل عام کی خبر کو پہلے دبا دیا گیا لیکن پھر بعض ذرائع سے یہ خبر نکلی اور ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اس خوں چکاں واقعے نے دنیا میں اور خود امریکا میں آگ لگا دی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ مائی لائی کا خونیں واقعہ جنگ ویتنام کے خلاف امریکا میں ہونے والے مظاہروں کا ایک بڑا سبب بنا لیکن مجھے یقین ہے کہ نیویارک کے میئر اور امریکی صدر اور نائب صدر کو یہ واقعہ یاد نہ ہوگا، وہ اسے ریاستی دہشت گردی کی بجائے 'امریکی مفادات کے تحفظ' کا نام دیتے ہوں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دل میں وہ لیفٹیننٹ ولیم کیلی کو امریکی سورما سمجھتے ہوں۔

اسی طرح ۱۹۹۱ء سے آج تک امریکی ریاستی دہشت گردی سے عراقیوں کو پناہ نہیں مل سکی ہے۔ امریکی بری، بحری اور فضائی فوجوں نے دو لاکھ سے زیادہ بے گناہ عراقی بچوں، عورتوں اور مردوں کا بہیمانہ قتل عام کیا ہے۔ خلیج کی جنگ کے دوران ہتھیار ڈالنے والے عراقی سپاہیوں کو بھی چُن چُن کر نشانہ بنایا گیا اور جنیوا کنونشن کے ہر قاعدے، ضابطے اور اصول کی خلاف ورزی کی گئی۔ اور اس وقت بھی عراق پر امریکا کا ناجائز قبضہ ہے اور نہتے شہریوں کی ہلاکتوں کا سلسلہ جاری ہے۔

نائین الیون کا بہانہ بنا کر امریکا جس طرح افغانستان پر چڑھ دوڑا اور اسے 'دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ' قرار دیا ایک لاکھ سے زیادہ بے گناہ افغان مرد، عورتیں اور بچے مارے گئے، لاکھوں بے گھر ہوئے، پورے ملک کو تہس نہس کر دیا گیا اور آج بھی امریکی افواج افغان سرزمین پر قابض ہیں۔

امریکا نے دنیا کے بدنام ترین ڈکٹیروں کی حمایت کی، انہیں دولت اور ہتھیار دیے کہ وہ

منتخب جمہوری حکومتوں کا تختہ الٹ کر تیسری دنیا کے ان ملکوں پر قابض ہو جائیں اور امریکا کی طفیلی ریاست کا کردار ادا کریں۔ یہ کام ڈومینکن ری پبلک، چلی، یونان اور لاؤٹیا کے علاوہ دوسرے متعدد ملکوں میں کیا گیا۔ لاؤٹیا میں پانچ لاکھ شہری مارے گئے۔ امریکی سرپرستی میں انڈونیشیا کے مردآہن نے دس لاکھ شہریوں کو موت کے گھاٹ اتارا، کمبوڈیا میں بیس لاکھ شہری قتل ہوئے جبکہ ویت نام جنگ میں مارے جانے والوں کی تعداد پینتیس لاکھ تک پہنچتی ہے۔

امریکی جمہوریت کے دامن پر یہی وہ بدنما داغ ہیں جس نے بہت سے باضمیر امریکیوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ امریکی جھنڈے میں باون ریاستوں کے ستارے ہٹا کر وہاں نازی سواستکا بنادیں اور یہ بانگ دہل یہ اعلان کریں کہ جدید دنیا میں امریکی حکومت سے بڑی دہشت گرد تنظیم پائی نہیں جاتی۔

میں اس بحث میں نہیں پڑتی کہ نائین الیون کا سانحہ کس فرد، گروہ یا حکومت کا کرایا ہوا تھا۔ اس میں مارے جانے والے بے گناہوں سے اور ان کے پس ماندگان سے مجھے دلی ہمدردی ہے، اس سانحے میں میرے کئی قریبی جاننے والے ہلاک ہوئے، انکا مجھے غم ہے لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ میں ۱۶/مارچ ۱۹۶۸ء کے مارے جانے والے بے گناہوں کی یاد بھی مناؤں۔ ۶/اگست اور ۹/اگست کو ہلاک ہونے والے جاپانی شہریوں کا سوگ میں ہر سال مناتی ہوں اور ہاں میں ان ریڈ انڈین باشندوں اور افریقی غلاموں پر ہونے والے تشدد اور ان کے بہیمانہ قتل کی یاد بھی مناؤں جو شمالی، جنوبی اور وسطی امریکا میں ۱۶۰۷ء سے شروع ہوا اور ۱۸۹۰ء تک جاری رہا۔

اس قتل عام میں جو سفید فام امریکیوں اور امریکی ریاست کی سرپرستی میں جاری رہا اس میں نو کروڑ، جی ہاں نو کروڑ ریڈ انڈین مرد، عورتیں اور بچے مارے گئے۔

ان تمام تاریخی حقائق سے آگاہ ہو کر میں نیویارک کے میئر کے اس بیان پر کیوں یقین کروں کہ نائین الیون تاریخ میں دہشت گردی کا سب سے بڑا واقعہ تھا۔

تاریخ میں امریکا کے نام سینکڑوں نائین الیون لکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہ نائین الیون ہیں جن میں گیارہ کروڑ کے لگ بھگ انسان ہلاک کیے گئے۔

ہے کوئی جو ان کا ماتم کرے اور ان کی یاد منائے؟

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی
۱۲/ستمبر ۲۰۰۶ء

ایٹمی ہتھیاروں میں پناہ

کچھ دنوں پہلے ایک جنگ مخالف مظاہرے کی تصویر چھپی۔ایک خاتون کے ہاتھ میں جو پلے کارڈ تھا اس پر لکھا تھا 'خدا جنگ کے ذریعے امریکیوں کو جغرافیے کی تعلیم دیتا ہے۔' چند دوستوں کی سمجھ میں یہ جملہ نہ آیا حالانکہ بات سادہ سی ہے۔امریکیوں کی اکثریت اپنے حال میں مست رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہزارہا امریکی فوجیوں کی میتیں تابوت میں بند ہو کر وطن نہیں پہنچیں اس وقت تک ایک عام امریکی ویتنام کے بارے میں شاید کچھ بھی نہیں جانتا تھا، اسی طرح افغانستان اور عراق کا محلِ وقوع بھی امریکیوں کے علم میں اُسی وقت آیا جب امریکی سپاہیوں کے قومی پرچم میں لپٹے ہوئے تابوت سی۔۱۳۰ ر کے کارگو ہولڈ سے نکال کر فوجی اعزاز کے ساتھ امریکا کے مختلف قبرستانوں میں دفن کیے جانے لگے۔

اس تناظر میں دیکھیے تو یہ جملہ فوراً سمجھ میں آجاتا ہے کہ امریکیوں کی جغرافیہ فہمی کا جنگ سے کیا تعلق ہے اور خدا نے انہیں یہ مشکل علم سمجھانے کا کیسا آسان طریقہ ایجاد کیا ہے۔لیکن ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ امریکی جنگ کے بغیر شمالی کوریا کے جغرافیے سے آگاہ ہو چکے ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ شمالی کوریا میں ابھی تک امریکی چھاتہ بردار نہیں اتارے گئے، میرین دستہ بھی وہاں نہیں پہنچا، یہ بھی درست ہے کہ وہاں کے شہریوں پر شدید اقتصادی پابندیاں اپنے خوفناک اثرات مرتب کر رہی ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ صدر بش نے اسے 'بدی کا محور' قرار دینے کے باوجود اس پر نہ کلسٹر بم برسائے، نہ اس کی شہری آبادی پر لیزر گائیڈڈ مزائل مارے گئے۔امریکی حکومت کا خیال تھا کہ شمالی کوریا والے 'رحم دلی' کے اس مظاہرے پر امریکی طاقت اور جبروت کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے لیکن سجدہ ریز ہونا تو دور کی بات ہے انہوں نے شہنشاہ فلک پناہ بش بہادر کی حکم

عدولی کرتے ہوئے ایٹمی دھماکہ کر دکھایا۔ اس نافرمانی پر شاہ جم جاہ کو جتنا طیش آئے وہ کم ہے لیکن یہ ان کی کرم گستری ہے کہ انہوں نے ابھی تک شمالی کوریا پر مسٹر آرمیٹج کی نگرانی میں اپنے بمبار طیارے بھیج کر اس کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجائی ہے، اور وہ ابھی تک اسے بالکل اسی طرح محض آنکھیں دکھا رہے ہیں جس طرح سخت گیر باپ اپنے ناہنجار بیٹے کی حکم عدولی پر دانت پیستے اور گھورتے رہتے ہیں۔ اسے بش بہادر کی 'شفقت پدری' سے تعبیر کرنا چاہیے۔

شمالی کوریا کی اس ایٹمی نافرمانی کے بارے میں ہمیں سب سے زیادہ اعتبار اور انحصار گھر کی گواہی پر کرنا چاہیے۔ گھر کی یہ گواہی دھماکا ہونے کے فوراً بعد سابق امریکی صدر جمی کارٹر نے دی۔ کارٹر صاحب کا شمار ان امریکیوں میں ہوتا ہے جو بش انتظامیہ کی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے ہیں اور بش انتظامیہ جہاں آگ لگاتی ہے وہ اسے مکالمے اور میل ملاقات کے ذریعے بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بل کلنٹن کے زمانۂ صدارت میں سفارت کاری کے ذریعے انہوں نے شمالی کوریا کو اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ وہ اپنا جوہری پروگرام بند کر دے گا اور اس سلسلے میں معائینے کے لیے ایٹمی توانائی کے عالمی ادارے کو جانچ پڑتال کی سہولتیں بھی فراہم کرے گا۔ شمالی کوریا کے جنوبی کوریا سے جو تنازعات چل رہے ہیں انہیں بھی پُر امن طور پر نمٹانے کے لیے دونوں ملک براہ راست مذاکرات کریں گے اور خطے میں کسی قسم کی جنگ جوئی کو فروغ نہیں دیں گے۔

جمی کارٹر موجودہ امریکی صدر کی اس پالیسی پر تاسف کا اظہار کرتے ہیں جس کے تحت انہوں نے مصالحت کاروں کے تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اور شمالی کوریا میں اپنی فوجیں اتارنے کی دھمکی دینے کے ساتھ ہی اسے 'برائی کا محور' قرار دیا۔ شمالی کوریا والے اس نامناسب اور غیر متوقع امریکی رویے سے نہ صرف یہ کہ مایوس ہوئے بلکہ اسے انہوں نے اپنی خود مختاری پر حملہ تصور کیا اور دوبارہ سے ایٹمی پروگرام شروع کرنے کا اشارہ کر دیا۔

جمی کارٹر، کوفی عنان اور دوسرے مصالحت کاروں نے ایک بار پھر اس گمبھیر مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی، ستمبر ۲۰۰۵ء میں ایک معاہدہ ہوا جس سے اس بات کا امکان ہوا کہ شمالی اور جنوبی کوریا کے درمیان تعلقات بہتر ہوں گے اور شمالی کوریا اپنے ایٹمی پروگرام سے دستبردار ہو جائے گا۔ لیکن ہمارے صدر امریکا کی عمر اور عرصۂ حکومت دونوں اسی طرح 'دراز' ہوں جس طرح وقت ظالم کے

لیے رسی دراز کرتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف جنوبی کوریا کی پیٹھ تھپکی دوسری طرف کچھ نا قابلِ اشاعت جملے شمالی کوریا کے حکمرانوں کی شان میں ادا کیے۔ نتیجہ وہی نکلا جس کے وہ خواہشمند تھے۔ شمالی کوریا ہتھے سے اکھڑ گیا اور اس نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنے جوہری پروگرام کو ایک بار پھر سے جاری کر رہا ہے۔ یہ سنتے ہی بش بہادر نے بلا شرکت غیرے دنیا پر اپنی حکمرانی ثابت کرنے کے لیے شمالی کوریا کی گوشمالی کا فیصلہ کیا اور اس پر شدید نوعیت کی اقتصادی اور مالی پابندیاں عائد کر دیں۔ ان پابندیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج شمالی کوریا دنیا کے آٹھواں ملک ہے جو ایٹمی دھما کا کر چکا ہے اور اس کے نتیجے میں امریکیوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ دنیا کے نقشے پر شمالی کوریا کہاں پایا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی جان گئے ہیں کہ اس کا رقبہ امریکی ریاست پنسلوانیا سے کچھ کم ہے اور وہ ۶۰۰ میل لمبا ایک جزیرہ نما ہے۔ آبادی دو کروڑ بتیس لاکھ ہے اور شرح خواندگی ۹۹ فی صد ہے۔

امریکی عوام اور بش صاحب دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ جب وہ پاکستان جیسی ایٹمی طاقت کو ایک فون کر کے اس کے حکمرانوں سے ہر بات منوا سکتے ہیں تو شمالی کوریا جو اقتصادی پابندیوں سے نڈھال ہے، جس کا رقبہ ان کی ایک ریاست سے بھی کم ہے اور جس کی آبادی پاکستان سے سات آٹھ گنا کم ہے، وہ ان کی حکم عدولی کیسے کر سکتا ہے اور اس نے ان کے ایک فون پر اپنے ایٹمی پروگرام سے دستبرداری اور یوٹرن لینے کا اعلان کیوں نہیں کیا۔ ہمیشہ کی طرح بش صاحب کو پہلا خیال تو یہی آیا کہ کیوں نہ اس مچھر جتنے ملک کو مسل کر رکھ دیا جائے لیکن جمی کارٹر ایسے 'بزدلوں' نے سمجھایا کہ حضور اس طرح آپ ایک نیا محاذ کھول کر ملک کے لیے کچھ بھلا نہیں کریں گے، اگر لاکھوں کوریائی مارے گئے تو آپ کو بھی ہزاروں تابوتوں کا نیا آرڈر دینا پڑے گا۔ اسی دوران شمالی کوریا نے اعلان کیا کہ وہ ایٹمی تجربات کے حوالے سے نئی بنیادوں پر مذاکرات کے لیے تیار ہے۔

جمی کارٹر نے اس بات کو حوصلہ افزا قرار دیا کہ شمالی کوریا ابھی تک ستمبر ۲۰۰۵ء کے سمجھوتے کو قابلِ عمل خیال کرتا ہے۔ انہوں نے 'نیویارک، ٹائمز' میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 'اگر شمالی کوریا اپنے جوہری ہتھیاروں کی تیاری کا پروگرام آگے نہ بڑھانے اور اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ پر امن رہنے پر آمادہ ہو جائے تو امریکا کو چاہیے کہ وہ شمالی کوریا کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہ کرے اور اس کے ساتھ تعلقات بحال کرنے پر مبنی ایک براہ راست اور دوٹوک بیان

جاری کردے۔'ان کا کہنا تھا کہ ایک مشتعل جوہری ملک کو اس نوعیت کا تاثر نہ دیا جائے کہ اسے مستقل طور پر بین الاقوامی برادری سے نکال دیا گیا ہے۔اسے اس خوف میں بھی مبتلا نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی بقا کو خطرہ لاحق ہے،اس طرح اس کے عوام کو خوفناک محرومیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔'

ذاتی طور پر میں ایٹمی تجربات اور ہتھیاروں کی مخالف ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ امریکا اور ایٹمی کلب کے دوسرے رکن ممالک شمالی کوریا کی مذمت کن بنیادوں پر کررہے ہیں؟اس سے بڑی منافقت ممکن نہیں ہے۔امریکا دنیا کا پہلا ملک ہے جس نے نہ صرف پہلا ایٹمی تجربہ کیا بلکہ اس کے چند ہی دنوں بعد جاپان کے دو شہروں کو اس نئے ہتھیار سے ملیا میٹ بھی کردیا۔اس کے بعد سے آج تک امریکا نے سینکڑوں نہیں ہزاروں ایٹمی تجربے کیے ہیں۔

بش حکومت نے اس بارے میں جو رویہ شمالی کوریا کے ساتھ اختیار کیا اس کے نتائج سامنے ہیں۔طیش دلانے والی یہی حکمت عملی وہ ایران کے ساتھ اختیار کیے ہوئے ہے۔اس سارے پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عالمی سطح پر ایٹمی ہتھیاروں کی اس بڑے پیمانے پر تیاری اور اس کے پھیلاؤ کی حقیقی ذمہ داری امریکا پر عائد ہوتی ہے۔اس نے اکیسویں صدی میں آزاد ملکوں پر طاقت و جبروت کے ذریعے ناجائز قبضے کی جس روایت کا آغاز کیا ہے اس نے شمالی کوریا،ایران اور دوسرے متعدد ملکوں کو اس خوف میں مبتلا کردیا ہے کہ وہ ان کے علاقے اور وسائل پر قبضے کے لیے کسی بھی وقت چڑھ دوڑے گا۔

دنیا آج ایک ایسی غیر محفوظ جگہ ہو چکی ہے جس کے خیال سے ہی کپکپی چڑھتی ہے۔اسے پھر سے تمام انسانوں کے لیے محفوظ و مامون بنانے کی خاطر امریکا کو ایک مہذب ملک کا طرز حیات اختیار کرنا ہوگا۔ورنہ ایک دوسرے کے مخالف درجنوں ملک اپنی پناہ ایٹمی ہتھیاروں میں ڈھونڈیں گے اور شدید خوف کی یہ فضا دنیا کو بارود کا ایک ایسا ڈھیر بنادے گی جو کسی معمولی سی بات پر بھک سے اڑ جائے گا اور دنیا کے مختلف مذاہب اور قدیم کتابوں میں قیامت کی جس انداز میں پیش گوئی کی گئی ہے وہ درست ثابت ہوگی۔

روزنامہ'ایکسپریس'،کراچی
۱۵/اکتوبر ۲۰۰۶ء

پیارے امریکا.....

آیئے! کچھ دیر کو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جارج واشنگٹن، تھامس جیفرسن اور ابراہم لنکن زندہ ہو گئے ہیں اور ان کے سامنے گزشتہ ساٹھ ستر برس کے امریکی حکمرانوں کی کارگزاری رکھ دی گئی ہے۔ انہیں جاپان پر ایٹمی حملے، کوریا، کمبوڈیا، ویتنام، نکاراگوا، چلی، ال سلواڈور اور پناما میں امریکی مداخلت اور خوں ریزی کی کہانیاں سنا دی گئی ہیں، انہیں ۷/اکتوبر ۲۰۰۱ء سے آج کے لمحے تک افغانستان اور عراق پر ظالمانہ حملے اور ناجائز قبضے کی تمام فلمیں دکھا دی گئی ہیں۔ ان لوگوں نے ان حملوں کے بارے میں صدر امریکا سے لے کر وزارت دفاع اور وزارت خارجہ کے اہم ذمہ دار سرکاری اہل کاروں کے بیانات پڑھ لیے ہیں۔ انہوں نے باجوڑ اور اس سے پہلے کی بمباریوں میں ہلاک ہونے والے بے گناہوں کی چارپائیوں پر رضائیاں اوڑھ کر لیٹی ہوئی لاشیں اور پارہ پارہ بدن دیکھ لیے ہیں۔ انہوں نے امریکا کے 'دستِ حق پرست' پر بیعت کرنے والے سب سے بڑے اتحادی کی شان میں امریکی صدر کی داد و تحسین سن لی ہے اور قصیدے پڑھ لیے ہیں۔ اور ہاں انہوں نے ابوغریب اور گوانتانا موبے میں امریکی فوجیوں کی 'بے مثال کارگزاریوں' کی ویڈیو کلپس دیکھ لی ہیں۔

آیئے! ہم سوچتے ہیں کہ اس 'امریکی کارگزاری' سے آگاہ ہونے کے بعد ان قائدین امریکا کا کیا حال ہو سکتا ہے؟

میرے خیال میں اگر یہ سب کچھ ممکن ہو تو یہ لوگ حیرت اور صدمے سے شاید جاں بر نہ ہو سکیں اور دوبارہ ان کی روحیں عالم بالا کو پرواز کر جائیں۔ اس کا بھی مجھے یقین ہے کہ اگر یہ پھر سے زندہ کیے جائیں تو یہ تینوں اعلان کر دیں گے کہ کسی دوسرے ملک کا نام 'امریکا' رکھ دیا گیا ہے

کیونکہ ہم نے جس امریکا کی بنیاد رکھی تھی، انصاف، آزادی، مساوات اور جمہوریت اس کے بنیادی ستون تھے، ہم نے کسی غاصب اور استحصالی ملک کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اور جب انہیں یقین دلایا جائے گا کہ یہ ان ہی کا امریکا ہے تو وہ شاید اپنے امریکی ہونے سے انکار کر دیں یا شاید بیسویں صدی کے بیشتر امریکی سیاستدانوں اور مدبروں کو عاق کرنے کا اعلان کر دیں اور اپنا گریباں چاک کر کے جنگل وصحرا کا رخ کریں۔

۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو امریکی سیاستدانوں اور جرنیلوں نے ایک خوں ریز عوامی جدوجہد کے بعد جب برطانیہ کے نوآبادیاتی چنگل سے نجات حاصل کی تھی تو امریکی خواص اور عوام دونوں نے اس کی بھاری قیمت ادا کی تھی۔ اسی زمانے میں 'نئی دنیا' کی اصطلاح رائج ہوئی تھی۔ امریکیوں کا کہنا تھا کہ انقلاب امریکا سے پہلے جو دنیا تھی وہ 'پرانی دنیا' تھی اور اب ہم ایک 'نئی دنیا' کی تشکیل کر رہے ہیں۔ انقلاب برپا کرنے والے ان امریکی رہنماؤں نے 'اعلان آزادی' کے ابتدائی حصے میں لکھا تھا:

> 'ہم ان حقائق کو حتمی سمجھتے ہیں کہ تمام انسان یکساں حیثیت کے ساتھ پیدا ہوئے اور خالق نے انہیں بعض ایسے حقوق دیے جو قطعاً چھینے نہیں جاسکتے۔ ان حقوق میں زندگی، آزادی اور سعی راحت شامل ہیں۔ ان ہی حقوق کے حصول کے لیے انسانوں کے درمیان حکومتیں بنتی ہیں۔ وہ اپنے تمام جائز اختیارات شہریوں کی رضامندی سے حاصل کرتی ہیں۔ چنانچہ جب حکومت کی کوئی شکل ان مقاصد کے لیے تباہی کا باعث بن جاتی ہے تو لوگوں کا حق ہے کہ اسے بدل دیں یا ختم کر دیں اور اس کی جگہ نئی حکومت قائم کرلیں۔'

امریکی اعلان آزادی ایک شاندار دستاویز ہے لیکن افسوس کہ اس کی روح کئی دہائیوں پہلے پرواز کر چکی اور آج امریکا ایک ایسی استبدادی اور استعماری قوت ہے جو دنیا کی کمزور ترین قوم کو بھی پوری قوت سے کچلنے کو بہادری اور ایک کارنامہ خیال کرتا ہے۔

دیکھا جائے تو انقلاب امریکا ناکام ہو چکا ہے۔ یہ انقلاب اس لیے رونما ہوا تھا کہ اس زمانے کے امریکیوں نے آزادی، مساوات اور عالمی برادری کا ایک خواب دیکھا تھا لیکن اب وہ

خواب ان لوگوں کے قبضے میں ہے جو ساری دنیا کو اپنے مفادات کی عینک سے دیکھتے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ دنیا کے دیگر تمام ملک اور تمام قومیں اس لیے ہیں کہ وہ امریکا کی چاکری کریں اور اس کے ہر فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور ان ملکوں کے وسائل پر امریکا کا قبضہ ہو۔

انقلابِ امریکا کی اس ناکامی نے صرف تیسری دنیا ہی نہیں، پہلی دنیا کے بھی بہت سے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو ششدر کر دیا ہے۔ یہ لوگ امریکی اعلانِ آزادی کو یاد کرتے ہیں اور اپنے سر پر خاک ڈالتے ہیں۔ امریکی حکمرانوں اور فوجیوں سے یہ ان کا سادہ سوال ہے کہ اپنے وجود میں چھپے ہوئے وحشی درندے پر وہ آخر کب قابو پائیں گے۔ امریکا سے، دنیا بھر کے ادیبوں اور دانشوروں کے یہ سوالات بہت پرانے ہیں۔

تحریروں، تقریروں، مذمتی بیانات کے اس ہجوم میں مجھے کینیڈا کی مشہور ادیب مارگریٹ ایٹ ووڈ کی یاد آتی ہے۔ اس نے 'امریکا کے نام ایک خط' لکھا۔ اس خط نے کینیڈا، امریکا اور برطانیہ میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ لوگ جو مارگریٹ ایٹ ووڈ کی تحریروں کے دلدادہ ہیں، انہوں نے مارگریٹ کی اس تحریر کی بھی بے حد داد دی لیکن ناقدینِ کرام نے سر پکڑ لیا۔ وہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اسے چند برسوں کے اندر ادب کا نوبل انعام مل جائے گا لیکن نوبل انعام لینے کے لیے کبھی کبھی زبان پر تالے ڈالنے پڑتے ہیں اور قلم کو لگام دینی ہوتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مارگریٹ ایٹ ووڈ نے اپنے ان ناقدوں کو کیا جواب دیا، لیکن اس کی بعض تحریروں سے یہی اندازہ ہوا کہ اسے اپنے قلم کی حرمت، نوبل ادبی انعام سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ امریکا کے نام مارگریٹ نے یہ خط دو یا شاید تین برس پہلے لکھا تھا، اس خط کا آغاز کچھ یوں ہوا ہے:

'پیارے امریکا: تمہیں یہ خط لکھنا مشکل ہو رہا ہے اس لیے کہ اب مجھے یقین نہیں رہا ہے کہ تم کون ہو۔

ہم میں سے بعض دوسرے لوگوں کو بھی اسی مشکل کا سامنا ہوگا۔ میں سمجھتی تھی کہ میں تمہیں جانتی ہوں: ہم پچھلے ۵۵ برس میں ایک دوسرے سے مانوس ہو چکے تھے۔ تم مکی ماؤس اور ڈونلڈ ڈک کی وہ کامک بکس تھے جو میں نے ۱۹۴۰ء کی دہائی کے اواخر میں پڑھیں۔ تم میرے پسندیدہ ریڈیو پروگرام تھے۔ تم وہ موسیقی تھے جس کے ساتھ میں گاتی اور رقص کرتی تھی۔ تم میرے لیے بے پناہ خوشی اور لطف کا سبب تھے۔

تم نے میری چند پسندیدہ کتابیں لکھیں۔ تم نے ہکل بری فن اور ہاک آئی، اور 'لٹل وومن' کی بیتھ اور جو کو تخلیق کیا۔ اس کے بعد تم میرے چہیتے تھورو تھے، بابائے ماحولیات، انفرادی ضمیر کا گواہ؛ اور والٹ وہٹمن، عظیم جمہوریہ کا مغنی، اور ایملی ڈکنسن، تنہائی کی روح کی پاسبان۔ تم ہیمٹ اور شینڈلر تھے، اندھیری گلیوں سے گزرنے والے بہادر، اس کے علاوہ تم ہیمنگ وے، فٹز جیرلڈ اور فاکنر جیسے تین حیرت انگیز شاعر اور ادیب تھے جنہوں نے تمہارے دل کی پوشیدہ اور اندھیری بھول بھلیاں کے نقشے ابھار کر واضح کیے۔ تم سنکلیر لیوس اور آرتھر ملر تھے جو اپنے اپنے امریکی آدرش لے کر تمہارے اندر موجود تصنع اور ریاکاری کے پیچھے پڑے رہے، اس لیے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ تم اس سے بہتر ہو سکتے ہو۔

تم 'ان دی وار فرنٹ' کے مارلن برانڈو تھے، تم 'کی لارگو' کے ہمفرے بوگارٹ تھے، تم 'نائٹ آف دی ہنٹر' کی للین گش تھے۔ تم آزادی، ایمان داری اور انصاف کے مبلغ تھے۔ تم معصوموں کے محافظ تھے۔ میں ان سب باتوں پر یقین رکھتی تھی۔ میرے خیال میں تم بھی رکھتے تھے۔ اس وقت یہی سچ لگتا تھا۔

اس خط کے لکھنے میں شاید یہی میری مشکل رہی ہے: مجھے اب اس بات کا یقین نہیں ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ بہرحال، تمہارے پاس انتڑیاں الگ الگ کر کے دیکھنے والے (Entrail-Sifters) کی پوری تجربہ کار جماعت ہے جو اس کے علاوہ کچھ کام نہیں کرتی کہ ایک ایک رگ اور نس کا تجزیہ کیا جائے۔ میں تم کو تمہارے بارے میں ایسی کون سی بات بتا سکتی ہوں جو تم کو پہلے سے معلوم نہ ہو؟ آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ تم اپنے ساتھ کیا کر رہے ہو۔

تم امریکی آئین کی جڑ کاٹ رہے ہو۔ نئی آئینی ترمیم کے بعد اب یہ ممکن ہے کہ آپ کے گھر میں آپ کی مرضی یا اجازت کے بغیر داخل ہوا جا سکے، آپ کو کسی سبب کے بغیر پکڑا اور نظر بند کیا جا سکتا ہے، آپ کی ڈاک کھول کر پڑھی جا سکتی ہے، آپ کی نجی دستاویزات کی جانچ پڑتال ہو سکتی ہے۔ یہ وسیع پیمانے کی کاروباری چوری، سیاسی دھمکی اور جعل سازی کی ترکیب کے سوا اور کیا ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ تم کو بتایا گیا ہے کہ یہ تمہاری اپنی حفاظت کے لیے ہے مگر لمحے بھر کے لیے ذرا سوچو۔ تم اتنی آسانی سے تو ڈرنے والے نہیں تھے۔

تم پر قرض کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے جو ایک ریکارڈ ہے۔ تم اسی طرح خرچ کرتے رہے تو پھر

بہت جلد وہ وقت آ جائے گا جب تم اتنے بڑے فوجی ایڈونچر کا بوجھ برداشت نہیں کرسکو گے۔ تم اپنی معیشت میں آگ لگا رہے ہو۔ پھر کچھ ہی عرصے بعد تمہارے پاس اپنے مسائل کا ایک یہی حل ہوگا کہ خود کوئی چیز پیدا نہ کرو بلکہ دوسرے لوگوں کی صنعت وحرفت پر چھین جھپٹ کرو اور 'گن ڈپلومیسی' کی قیمت پر سب کچھ حاصل کرلو۔

اگر تم اس پھسلواں ڈھلان پر یوں ہی آگے بڑھتے رہے تو پھر ساری دنیا کے لوگ فیصلہ کرلیں گے کہ پہاڑ پر بسا ہوا تمہارا شہر ایک گندی بستی ہے اور تمہاری جمہوریت ایک دھوکا۔ وہ سمجھیں گے کہ تم نے قانون کا احترام چھوڑ دیا ہے۔ وہ سمجھیں گے کہ تم نے اپنا آشیانہ خود ہی برباد کرڈالا ہے۔'

مارگریٹ ایٹ ووڈ کا یہ خط اگر جارج واشنگٹن، تھامس جیفرسن اور ابراہم لنکن پڑھ لیں تو وہ شاید خودکشی کرنا چاہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ عالم بالا میں خودکشی نہیں کی جاسکتی!

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی

۵نومبر ۲۰۰۶ء

خودفریبیوں کے حصار میں

صدام حسین دنیا کے خوش نصیب ترین لوگوں میں سے ایک تھے۔ زندہ رہے تو لاکھوں انسانوں کی جان سے کھیلتے رہے۔ ان انسانوں میں ایرانی، عراقی، کویتی کی تخصیص نہ تھی۔ شیعہ، سنی، کرد سب ہی کو انہوں نے موت کا ذائقہ چکھنے پر مجبور کیا۔ کردوں کے لیے اذیت ناک موت مسٹرڈ گیس کے روپ میں آئی اور ایرانیوں کے لیے میدان جنگ میں بارودی سرنگوں اور اسکڈ مزائیلوں کی برسات کی صورت۔ قریب ترین جگری دوستوں کے بارے میں 'مخبرت' کے محکمے نے اگر کسی شک کا اظہار بھی کیا تو ان میں سے کوئی زہر، کوئی خنجر سے مارا گیا، کسی کے سینے میں تولہ بھر سیسہ اترا اور کسی کی لاش کے ٹکڑے اس کی بیوی کو تحفے میں بھیجے گئے، اپنی چہیتی بیٹیوں کے شوہروں سے بگڑے تو بیٹیاں بیوہ کردی گئیں۔ اپنے معتوبین کو برسرعام پھانسی دینا ان کا مشغلہ تھا۔ بغداد نے ایسی متعدد پھانسیاں دیکھی ہیں۔ امریکا ان کا یار غار تھا لیکن کویت پر صدام حسین کے حملے نے بنی ہوئی بات بگاڑ دی۔ کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ درپردہ امریکا نے ہی انہیں اس کی ترغیب دی تھی تاکہ بعد میں اس حملے کو عراق پر جھپٹنے کا بہانہ بنا سکے۔ خلیج کی جنگ میں صدام حسین کے تمام فوجی دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے، عراق کا فوجی طمطراق جس کا شہرہ تھا، وہ پانی کا بلبلہ ثابت ہوا۔ اور اس کے بعد صدام حسین پر امریکی شکنجہ تنگ ہونا شروع ہوا جس کی قیمت پانچ لاکھ عراقی بچوں نے دی، جس کا خمیازہ عراقیوں نے غربت اور کس مپرسی کی صورت میں بھگتا۔ صدام حسین اس کے بعد بھی خوش نصیب ہی رہے۔ امریکی حملے اور قبضے کے بعد گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، سزا سنائی گئی اور پھر وہ آخری مرتبہ اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ پیروں میں لرزش نہیں تھی، چہرے اور سیاہ سوٹ پر شکن نہ تھی، کلمہ پڑھتے ہوئے، عراق اور عرب دنیا کی عظمت کا مژدہ سناتے ہوئے تختۂ دار پر پہنچے

اور لمحے بھر میں وہ کھیل تمام ہوا جسے زندگی کہتے ہیں۔ میں انہیں خوش نصیب اس لیے سمجھتی ہوں کہ جب وہ زندہ تھے تو اپنی ہیبت و جبروت کے سبب لوگ ان سے لرزہ بہ اندام تھے۔ موت سے ہمکنار ہوئے تو اپنے تمام مظالم اور جرائم کے باوجود مسلم اُمہ کی اکثریت کے 'ہیرو' ٹھہرے۔ قاہرہ، بغداد، استنبول اور کولکتہ میں ان کے حق میں مظاہرے ہوئے۔ کولکتہ کی ایک ہندو لڑکی نے ان کی پھانسی دیکھی تو صدمے سے یوں نڈھال ہوئی کہ خود بھی گلے میں پھندا ڈال کر جھول گئی۔ وہ شخص جس کے انسانی جرائم سے دفتر کے دفتر بھرے ہوئے ہیں، ایک قابض فوج کے متنازع فیہ مقدمے کے نتیجے میں پھانسی گھاٹ پہنچا تو اس شخص کے آخری لمحات نے لوگوں کے دلوں کو موم کر دیا۔ کوئی اس کے ۲۳ سالہ دورِ حکومت کو 'شاندار ترین' قرار دے رہا ہے اور کسی کے خیال میں وہ اسلامی دنیا کا ایک فرزندِ سر بلند ہے جس نے امریکی طاغوت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

ہم جذباتی لوگ ہیں پل بھر میں ساری خطائیں معاف کر دیتے ہیں۔ ہمیں اس وقت یہ یاد نہیں رہا کہ عراق کے اسٹیج پر نمودار ہونے والے اس شخص کے دورِ حکومت کے بیشتر دنوں کا منظر نامہ امریکی دماغوں نے لکھا اور اس کی گرفتاری، مقدمے اور پھر زندگی کے آخری لمحوں کی کوریوگرافی بھی امریکیوں کا کمال تھی۔ وہ صدام حسین کی سائیکی سے بہ خوبی واقف تھے، انہیں معلوم تھا کہ زندگی کے وہ آخری لمحات جن کے بارے میں صدام حسین جانتے تھے کہ ان لمحوں سے مفر نہیں اور اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ وہ دنیا کے اربوں انسانوں کے سامنے نمودار ہونے والے ہیں، ان لمحات میں وہ اپنی اسی آن بان کا مظاہرہ کریں گے جس کے سحر میں وہ سولہ برس کی عمر سے گرفتار ہوئے اور پھر ہر آنے والا دن ان کے اس طلسم ذات میں اضافہ ہی کرتا رہا۔ وہ اپنے بارے میں عظمتیں فرض کرتے رہے اور آخری لمحے تک خود کو 'عظیم ترین' اور 'عربوں کا نجات دہندہ' تصور کرتے رہے۔ امریکی جانتے تھے کہ جس شخص کے عروج کو انہوں نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا، اب اس کا زوال بھی ان ہی کے کام آئے گا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد شرق اوسط اور ایشیا کے کئی مسلمان ملک جب تاجِ برطانیہ کے سائے سے نکل کر جمہوریہ امریکا کے سایہ عاطفت میں آئے تو ان ملکوں کے وسائل و ذرائع پر قابض رہنے کے لیے ضروری تھا کہ ان میں اٹھتی ہوئی انقلابی اور جمہوری لہروں کا راستہ روکا جائے۔ کہیں اس کام کے لیے شاہ ایران اور دوسرے شاہان اعلیٰ مرتبت کی سر پرستی کی گئی اور کہیں آمرانِ مطلق کو حلقہ بگوش کیا گیا۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے مراکشی ادیب عبداللطیف لعابی نے لکھا ہے کہ 'عرب دنیا حقیقت میں وسعتِ قلب، کشادہ ذہن اور تخلیقی وفور رکھتی ہے لیکن یہ شاندار لوگ ان آمرانِ مطلق یا شاہانِ اعلیٰ مرتبت کے ہاتھوں کچل دیے جاتے ہیں، جن کا واحد مسئلہ اپنے مفادات اور اپنے اقتدارِ مطلق کا تحفظ ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مغرب ان تمام المیوں کو دیکھتا ہے۔ ان سے صرف نظر کرتا ہے اور اس حکمران اشرافیہ کی پشت پناہی کرتا ہے جو اپنے لوگوں کی آزادی اور ان کے خوابوں کا گلا گھونٹتی رہتی ہے۔'

ایران، عراق جنگ کے ذریعے امریکا نے ایران اور عراق دونوں کو کمزور کیا، خلیج کی جنگ سے عرب دنیا تقسیم ہوئی، اقوام متحدہ کی پابندیوں نے عراق کو جو شرق اوسط کا سب سے مستحکم اور ترقی یافتہ ملک تھا گھٹنوں کے بل جھکا دیا اور پھر ۲۰۰۳ء آیا جب امریکا اپنے اتحادیوں کے ساتھ عراق کو فتح کرنے کے لیے چڑھ دوڑا۔ کہنے کو یہ چڑھائی WMD مہلک ترین ہتھیاروں کی تلاش میں کی گئی تھی لیکن کون نہیں جانتا کہ امریکا کی نظر عراقی تیل کے کنوؤں پر تھی۔ صدام حسین جنہیں آج عراقیوں کی ایک بڑی تعداد شہیدِ مظلوم کہہ رہی ہے اور جن کے لیے مسلم اُمہ سینہ کوبی کر رہی ہے، وہ عین ان دنوں میں امریکی حملے سے نمٹنے کی پیش بندی کی بجائے ناول لکھ رہے تھے۔ مجھے بغداد کے وہ دن یاد آتے ہیں جب ہلاکو خان کی فوجیں قلعے کی فصیلوں پر دستک دے رہی تھیں، اس وقت علمائے کرام شہر کو کافروں کی یلغار سے بچانے کے لیے مختلف آیات کے ورد کی تلقین کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ وظائف کفار کی افواج کو سوکھی ہوئی گھاس کی طرح اڑا دیں گے اور جلالی دعائیں انہیں خاکستر کر دیں گی۔ ہلاکو کی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں، خلیفۃ المسلمین کو ہاتھی سے کچلوایا گیا، اس کی بیگمات اور بیٹیاں ہلاکو اور اس کے ساتھیوں کے حصے میں آئیں، باندیاں لشکریوں میں تقسیم ہوئیں۔ شہریوں کے خون سے دجلہ سرخ ہوا، اس کے کتب خانے چھ مہینے تک جلتے رہے۔

بغداد آج کے ہلاکو کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس ہلاکو نے عراق کو جس طرح لوٹا، برباد کیا، تشدد اور جوابی تشدد کی دلدل میں اتارا، اسے دہرانے کی ضرورت نہیں لیکن یہ جاننا ہم پر لازم ہے کہ جب آج کے ہلاکو کی فوجیں بغداد کی طرف قدم بڑھا رہی تھیں تو امت مسلمہ کی اکثریت کا 'ہیرو'، کیا کر رہا تھا۔ یہ وہ دور ہے جب صدام خود کو عرب دنیا کا عظیم دانشور، فلسفی اور ادیب فرض

کر چکے تھے۔ انہوں نے ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۳ء تک کئی ناول تحریر کیے۔ وہ ارنسٹ ہیمنگوے کی تحریروں اور بہ طور خاص 'بوڑھا اور سمندر' کے عاشق تھے۔ انہوں نے جب ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو پہلے ناول 'زبیبہ اور بادشاہ' کی نوک پلک معروف عراقی ادیب مجیبہ العزیزی کے شوہر سامی نے سنواری اور جس روز اس ناول کی ڈھائی لاکھ کاپیاں چھپ کر نکلیں، اسی روز سامی پانی کا ایک گلاس پیتے ہوئے ہلاک ہوگیا۔ مجیبہ کا کہنا ہے کہ سامی کو صدام حسین کے حکم پر زہر دیا گیا تا کہ وہ لوگوں سے اس ناول کے بارے میں باتیں نہ کرے۔

آخری ناول اس روز مکمل ہوا جب امریکی طیارے بغداد پر بمباری شروع کرنے والے تھے۔ صدام نے اس ناول کی آخری سطریں لکھیں اور خود روپوش ہوگئے۔ انہیں اپنے لکھے ہوئے جملوں پر یقین تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اپنے آخری ناول 'اُخرج منہایا ملعون' کے شاندار، شجیع، عربی النسل ہیرو سلیم کی طرح وہ عراق کے شہروں اور بغداد کی سڑکوں پر نمودار ہوں گے اور 'حزقیل' اور اس کے حلیف رومن بادشاہ کو شکست فاش دیں گے۔ اس ناول میں 'حزقیل' سازشی یہودی ہے، رومن بادشاہ کی صورت میں امریکا کو پیش کیا گیا ہے۔ سلیم کے روپ میں صدام حسین ہیں، سلیم وہ عرب شہسوار جس کی فوجیں رومن فوجوں پر تیروں کی بوچھاڑ کرتی ہیں اور جب رومی فوجی زمین پر گر جاتے ہیں تو سلیم کے قبیلے کی عورتیں لاٹھیوں اور تلواروں سے حملہ آوروں کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ سلیم کی سیاہ زلفیں اس کے شانوں پر لہرا رہی ہیں۔ وہ تلوار سونت کر 'اللہ اکبر'، 'عراق زندہ باد'، 'اسلام پائندہ باد' کے نعرے لگاتا ہوا دشمنوں کی فوجوں پر ٹوٹ پڑتا ہے اور کشتوں کے پشتے لگاتا چلا جاتا ہے۔ آخر کار حزقیل اور رومی بادشاہ فرار ہو جاتے ہیں، اپنے علاقے میں پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ روم کے دو بلند منارے جل رہے ہیں، حزقیل یہ دیکھ کر اپنا چہرہ اور سینہ پیٹ لیتا ہے۔ پھر عربوں کو دادِ شجاعت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ایسا فدائی حملہ صرف عرب ہی کر سکتے تھے۔ ناول قرآن کی ان آیات پر ختم ہوتا ہے جن میں ابرہہ کے لشکر کا ذکر ہے جسے ابابیلوں نے کنکریاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ سلیم ان آیات کو بہ آواز بلند پڑھ رہا ہے اور فرطِ مسرت سے اشک بار ہے۔

صدام حسین خوش نصیب تھے کہ زندگی کے آخری لمحے تک وہ خود فریبیوں کے ہفت رنگ غبار کے حصار میں رہے۔ اپنے خیال میں وہ سر بلند تھے، سرفراز تھے، عراقیوں کے، عربوں کے اور ملت مسلمہ کے سردار تھے۔

امریکا ملت اسلامیہ کے لیے کئی بت تراش چکا ہے، ان بتوں پر ہمارے نوجوان پروانہ وار اپنی جانیں نثار کررہے ہیں۔ اب ایک نیا بُت صدام کی صورت تراشا گیا ہے۔ ہماری نوجوان نسل کچھ دنوں اس کی پوجا کرے گی۔ وہ ذہانتیں جو ایک زندہ اور دھڑکتی ہوئی قوم کو جنم دیتی ہیں، ایک جمہوری فضا کو پروان چڑھاتی ہیں وہ فرقہ واریت اور جذباتیت کی بھینٹ چڑھتی رہیں گی۔ اپنے آخری ناول میں صدام نے جس ملعون کو اپنی زمین سے نکل جانے کا حکم دیا تھا، وہ اسی سرزمین پر دندنا رہا ہے۔ راوی اس کے لیے چین لکھتا ہے اور عراقی قوم ہلاکت، تشدد اور انتقام کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔

صدام حسین خوش نصیب تھے کہ فتح کے خواب دیکھتے ہوئے دنیا سے چلے گئے لیکن بغداد آج کے ہلاکو کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی

۷ جنوری ۲۰۰۷ء

بغداد پر تیسرے ہلاکو کا حملہ

۱۷ر جنوری ۲۰۰۳ء کو تقریر کرتے ہوئے اس وقت کے عراقی مردِ آہن صدام حسین نے کہا تھا کہ بغداد زمین پر خدا کا نیزہ تھا اور عربوں کے کاسئہ سر دانش اور رفعت نشان عرب ورثے کا سرچشمہ رہے ہیں۔ ان کی تقریر کی یہ چند سطریں پڑھتے ہوئے میں تاریخ میں بغداد کا سراغ تلاش کرتی ہوں۔

۱۸۰۰ ر قبل مسیح حمورابی کی ایک قانونی دستاویز میں ایک شہر 'بگدادو' کا نام آیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس شہر میں 'بغ' نام کا ایک بت تھا اور اسی لیے یہ شہر 'بغ داد' کہلایا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ بادشاہ شیرواں کا وہ باغ تھا جہاں وہ لوگوں کے ساتھ انصاف کرتا تھا اور اسی لیے یہ جگہ 'باغِ داد' کہی گئی یعنی وہ باغ جہاں انصاف ملتا ہو۔ کچھ اس کا رشتہ آرامی زبان سے جوڑتے ہیں جس سے مطلب 'بھیڑوں کا باڑہ' نکلتا ہے۔

یہ بستی جو 'بگدادو'، 'باغِ داد' اور پھر 'بغداد'، کہلائی، واقعی 'بھیڑوں کا باڑہ' ہے جس پر ہر زمانے میں بھیڑیے ٹوٹتے رہے یہ ۹ ویں صدی قبل مسیح میں لوٹا گیا اور سینکڑوں برس تک ایک گم نام سی بستی رہا۔ اس کی قسمت اس وقت جاگی جب عباسی خلیفہ منصور نے اسے اپنے دارالخلافہ کے طور پر منتخب کیا، اس کی تعمیر کا کام اگست ۷۶۲ء سے شروع ہوا جس میں ایک لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا۔ اور پھر بغداد دنیائے اسلام کا وہ شہر بن گیا جو سلطنتوں کی تقدیر کے فیصلے کرتا تھا اور جہاں کی دولت و حشمت کے قصے فرنگیوں کو اپنی طرف کھینچ لاتے تھے۔

اور پھر بغداد کے عروج کے دامن سے زوال کی گرد بھی لپٹی۔ اس زوال کا آغاز فرقہ وارانہ اور نسلی فسادات سے ہوا۔ وہ خلیفہ جو دور دراز کے ملکوں میں صاحبِ اقتدار بن بیٹھنے والے طالع

آزماؤں کواپنے دربار سے سندِ حکمرانی عطا کرتا تھا، وہ اپنے دارالخلافہ میں اپنا حکم منوانے سے قاصر ہوتا چلا گیا۔ بغداد کبھی شیعہ سنی فساد کا نشانہ بنا، کبھی حنبلی اور شافعی دست وگریباں ہوئے۔ یہ ایسے بھیانک فسادات تھے جن میں ہر مرتبہ دونوں طرف کے ہزار ہا افراد مارے گئے، گھر اور محل لوٹے گئے، ایک فرقے کی عورتیں دوسرے فرقے کے لیے مالِ غنیمت بنیں۔ یہودی جو چالیس ہزار کی تعداد میں بغداد کے شہری تھے، ان پر حملہ ہوا، ان کی جان، مال اور آبرو کچھ بھی محفوظ نہیں رہی۔ دو سے تین سو برس کے اس انتشار اور افتراق نے خلافت عباسیہ کو کھوکھلا کر دیا اور جب ہلاکو خان غول بیابانی کی طرح بغداد پر نازل ہوا تو چند دنوں کی مزاحمت کے بعد تاتاریوں کا ٹڈی دل سلطنت عباسیہ کی عظمت وشوکت کو یوں چاٹ گیا جیسے وہ کبھی موجود ہی نہیں تھی۔ ہلاکو نے لاکھوں کا سر اڑایا، کروڑوں کی دولت اپنے چھکڑوں پر بار کی، ہزار ہا عورتوں کو باندی بنایا اور ہزاروں مرد غلام ہوئے۔ ہر شاندار عمارت، ہر مقدس مقبرہ مسمار کیا گیا اور دجلہ کی لہریں لاکھوں کتابوں کی راکھ کو مہینوں بہا کر لے جاتی رہیں، اس راکھ میں ان شہریوں کا خون بھی شامل تھا جو زندہ تھے تو مسلمان، عیسائی، یہودی، سنّی، شیعہ، حنبلی اور شافعی تھے، تاتاری تلواروں سے قتل ہوئے تو ان کا سرخ لہو یک جان ہو کر دجلہ کی لہروں کو اپنے رنگ میں رنگتا رہا۔ تاریخ اسلام کا یہ وہ سانحۂ عظیم ہے جس نے مسلمانوں کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔

ہلاکو ستارہ پرست تھا جبکہ تیمور لنگ کو مسلمان مورخین 'الامیر الکبیر' اور 'صاحبِ قران' لکھتے رہے، وہ حیات تھا تو اسے 'سلطان' لکھا گیا، موت کا نوالہ بنا تو 'جنت مکان' کے لقب سے یاد کیا گیا۔ یہ وہ سلطان تیمور ہے جس کے بارے میں مسلمان مورخین یہ کہتے ہیں کہ 'حامیٔ اسلام ہونے کی حیثیت سے تیمور علما اور نوظہور سلسلۂ نقشبندیہ کی بڑی پاسداری کیا کرتا تھا اور جب کبھی وہ جنگ کے لیے نکلتا تو صلحاء، علماء، ادیبوں اور فن کاروں کا ایک جم غفیر اس کے ہم رکاب ہوتا تھا۔'

ہمارے اس اسلامی ہیرو کے 'حامیٔ اسلام' ہونے کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ کبھی وہ ماوَرالنہر پر عمر شیخ کے خلاف لشکر کشی کرتا ہے، کبھی سلطان احمد جلائر کو شکست دیتا ہے۔ اہل اصفہان بغاوت کرتے ہیں تو وہاں کے ستر ہزار باشندے تہ تیغ کیے جاتے ہیں۔ غیاث الدین 'روزنامۂ غزوات ہندوستان' میں لکھتا ہے کہ 'کشتگان کی کھوپڑیوں سے جو مینار بنائے گئے وہ بلند عمارتوں سے بھی اونچے ہوگئے۔' یہ 'حامیٔ اسلام' ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ دلّی فتح کی، ۸۰ ہزار

لوگوں کا قتل عام کیا، کروڑوں کا مال و متاع اور عورتیں ساتھ لے گیا۔ اس کے ہاتھوں سلطان بایزید کا جو انجام ہوا، اس سے تاریخ کا ہر طالب علم آگاہ ہے۔ ابھی بغداد کے سقوط کو بہ مشکل ڈیڑھ صدی گزری تھی کہ تیمور لنگ اپنی شہنشاہیت کا اعلان کرتا ہوا بغداد پر نازل ہو گیا۔ چالیس ہزار شہری تہ تیغ ہوئے جو کچھ ایک سو چالیس برس کے اندر تعمیر ہوا تھا وہ اس 'حامیٔ اسلام' کے ہاتھوں چالیس دنوں میں برباد ہوا۔

بغداد اس کے بعد بھی کبھی چین سے نہیں رہا، چھوٹے بڑے حملے اور تاخت و تاراج اس شہر کا مقدر رہی۔ یہاں کبھی اُموی خاندان کے شہزادوں کے تڑپتے ہوئے لاشوں پر دستر خوان چنے گئے اور کبھی ہلاکو اور تیمور لنگ کے ہاتھوں اس کے شہریوں کی کھوپڑیاں مٹی اور گارے کے میناروں میں چنی گئیں۔ بیسویں صدی میں بھی یہ شہر کئی مرتبہ دریائے خوں میں نہایا۔ اور یہ کوئی پرانا قصہ تو نہیں جب بعث پارٹی نے بغاوت کی، شاہ فیصل دوم اور نوری السعید کو صرف قتل ہی نہیں کیا گیا، ان کی لاشیں برسرِ عام پہلے الٹی لٹکائی گئیں اور پھر لوگ انہیں سڑکوں پر گھسیٹتے پھرے یہاں تک کہ وہ ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ بعد میں صدام حسین کے ہاتھوں عراقیوں پر جو ستم ہوئے، ان کا بھی یہ عالم ہے کہ 'ہمیں یاد ہے سب ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'

صدام نے ۱۷ر جنوری ۲۰۰۳ء کی تقریر میں کہا تھا کہ تاریخ دائروں میں سفر کرتی ہے لیکن ہر زمانے کے حوالے سے اس دہرائے جانے کے عمل میں نام، کردار اور مقامات بدل جاتے ہیں۔

آج بغداد پر تیسرے ہلاکو کا حملہ بھی تاریخ کے دہرائے جانے کے عمل کا ایک عکس ہے۔ نام اور کردار بدل گئے ہیں لیکن بغداد کی غارت گری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ یہ بھی تاریخ کا ایک الم ناک مذاق ہے کہ جس طرح ہلاکو کی فوجوں کو اپنے چڑھا کر لائے تھے، اسی طرح اس بار بھی صدام حسین خود ہی تیسرے ہلاکو کی فوجوں کو بغداد کی فصیلوں کے اندر لانے کا سبب بنے۔ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو نے شہر تاراج کیا تھا، شہری تہ تیغ ہوئے تھے اور علم و حکمت کے موتی آگ کے سپرد ہوئے تھے۔ ۱۴۰۱ء میں یہی سب کچھ تیمور لنگ نے کیا اور ۲۰۰۳ء میں بھی تاریخ دہرائی گئی۔

آج کا بغداد جہاں پانچ ہزار برس کی عظیم الشان تاریخ کے آثار قومی عجائب گھر میں محفوظ تھے۔ اشوریوں، سمیریوں، کلدانیوں، میدیوں اور اس کے بعد کی اقوام کے وہ نوادرات جو زمین کی گہرائیوں سے نکالے گئے، انہیں حملہ آور فوجیوں نے نہیں، 'نامعلوم' شہریوں نے یوں خاک میں ملایا

کہ اب ان کے ٹکڑے بھی نہیں جوڑے جا سکتے، ہر الماری کے شیشے توڑ دیے گئے اور اس میں محفوظ آثار قدیمہ کو نابود کر دیا گیا، پھر باری قومی لائبریری کی آئی اور نادر ترین مخطوطے، عہد قدیم کی نایاب کتابیں، وہ قرآنی نسخے جن کا کوئی عکس بھی موجود نہیں، مٹی کا تیل چھڑک کر نذر آتش کیے گئے۔ عراق کی تہذیب ثقافت اور تاریخ گھنٹوں میں نیست و نابود کر دی گئی۔ اس 'کام' سے پہلے امریکا کی عائید کردہ پابندیاں اور فوجی حملہ لاکھوں بچوں، بوڑھوں، عورتوں ور مردوں کو فاقوں، گولیوں اور کلسٹر بموں سے ختم کر چکا تھا۔ مقدس مقامات کی بے حرمتی ہو چکی تھی اور عورتیں روندی جا چکی تھیں۔

بغداد پر قبل مسیح سے ۱۲۵۸ء ۱۴۰۱/ اور پھر آج تک اپنے اپنے دور کے ہلاکو حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ تیسرا ہلاکو امریکا ہے جس نے اپنے تمام اخلاقی، سیاسی اور قانونی اصول روند کر رکھ دیے۔ ہلاکو یا تیمور لنگ نے انسانی حقوق کا عالمی منشور نہیں مرتب کیا تھا، ہیومن رائٹس کمیشن نہیں بنائے تھے، کسی جنیوا کنونشن پر دستخط نہیں کیے تھے۔ وہ کتابوں اور نادر مخطوطوں کی اپنے شہروں میں نمائش نہیں کرتے تھے، وہ میدانوں اور صحراؤں سے اٹھنے والے وحشی اور طاقت و جبروت کے ماننے والے تھے لیکن اکیسویں صدی کے ہلاکو کے بارے میں کیا کہا جائے کہ اسے انسان پرستی کے دعوے ہیں۔ اس کے لوگ چاند کو تسخیر کر چکے اور دور دراز کے سیاروں پر ان کے سیارچے اتر چکے۔

اس فرعونیت اور ہامانیت کا حساب کون لے گا؟

افغانی اور عراقی، ویتنامی اور جاپانی، کوریائی اور سلواڈوری اس سے انتقام نہیں لے سکتے لیکن وقت سے بڑا منتقم المزاج بھلا کون ہوسکتا ہے۔ صدام حسین نے ۱۷ر جنوری ۲۰۰۳ء کو کہا تھا کہ ہر وہ فرد جس کی روح اور بدن میں ہلاکو کا ارادہ اور عمل پل رہا ہے وہ بغداد کی فصیلوں کے سائے میں خودکشی کرے گا۔ ان کا یہ دعویٰ تو پورا نہ ہوسکا لیکن یہ بات اب نوشتۂ دیوار ہو چکی کہ اکیسویں صدی کا ہلاکو اپنے کبر و نخوت کے خنجر سے خودکشی کرے گا۔ ناانصافیوں اور بے رحمیوں کے تیر پلٹ کر آتے ہیں اور ظالم و بے رحم کے بدن میں پیوست ہو جاتے ہیں۔

کچھ ظالم اور بے رحم اپنے ہی تیروں کا شکار ہو چکے، کچھ کی گھات میں وقت بیٹھا ہے اور وقت سے بڑا شکاری کائنات میں موجود نہیں۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی
۱۰ر جنوری ۲۰۰۷ء

بزرگوں کے گناہوں سے نئی نسل کی لاتعلقی

لندن کا پارلیمنٹ اسکوائر وہ جگہ ہے جہاں روزانہ حکومت مخالف مظاہرے ہوتے ہیں۔ امن کی بات کرنے والے اور جوہری ہتھیاروں کے مخالف یہاں دھرنا دیئے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں جمع ہونے والوں کو جب کسی سیاستدان پر بہت غصہ آتا ہے تو اسے گندے انڈے اور سڑے ہوئے ٹماٹر کھینچ کر مارتے ہیں۔ پولیس بھی موجود ہوتی ہے لیکن جب تک بات مار پیٹ تک نہ پہنچے وہ خاموش کھڑی تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ نہ کوئی گرفتار ہوتا ہے نہ کسی کے خلاف خفیہ تحقیقات ہوتی ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کا تعلق جنگ مخالف تنظیموں سے ہے۔ ان میں برائن ہا یہاں کی مشہور شخصیت ہیں۔ انہوں نے جون ۲۰۰۱ء میں عراق کی خلاف معاشی پابندیوں پر احتجاج کرتے ہوئے دھرنا دیا اور تمام وقت اور تمام موسموں میں وہیں بیٹھے رہے۔ ۲۳ مئی ۲۰۰۶ء کو پارلیمنٹ نے Serious Organised Crime & Police Act پاس کیا اور پارلیمنٹ اسکوائر کے ایک میل کے قطر میں مظاہروں پر پابندی عائد کردی اور برائن ہا کو زبردستی وہاں سے اٹھا دیا گیا۔ برائن ہا نے پارلیمنٹ اسکوائر میں جو 'امن کیمپ' لگایا تھا اس کا ایک بڑا حصہ مارک والنگر کی تصویروں، پوسٹروں، مجسموں اور امن جھنڈوں پر مشتمل تھا۔ اسکوائر کے سبزہ زار پر چھوٹی چھوٹی واٹر پروف اور ترپالوں سے بنی ہوئی چھولداریاں لگائی گئی تھیں۔ بارش ہوتی، برف پڑتی تو مظاہرین ان چھولداریوں میں چلے جاتے، اسٹوو پر چائے بنائی جاتی، گرم چائے ان سر پھروں کا لہو گرماتی اور بارش تھمتے ہی وہ باہر آجاتے۔ یہاں مظاہرے کے لیے پانچ سو، ہزار یا پانچ ہزار کی شرط نہیں۔ یوں تو یہ لوگ جب بڑے بڑے امن مظاہرے کرتے ہیں تو ان میں پانچ اور دس لاکھ افراد بھی شامل ہوتے ہیں لیکن اس نوعیت کے مظاہرے جو

مستقل بنیادوں پر ہو رہے ہوں ان کے لیے پانچ دس افراد بھی کافی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دنیا تیاگ کر بیٹھ جاتے ہیں اور بیٹھے رہتے ہیں۔

عراق میں ہونے والی جنگ اور اس میں برطانوی سپاہیوں کی شمولیت کے حوالے سے یہاں مارک والنگر کی جس نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا اس کا بہت شہرہ ہوا اور یہ نمائش برطانوی حکومت اور اس وقت کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر کے لیے بہت خفت کا سبب بنی۔ اس نمائش کو جب پارلیمنٹ اسکوائر سے ہٹایا گیا تو اس سے کچھ فاصلے پر ٹیٹ گیلری کے ایک بڑے ہال میں یہ منتقل کر دی گئی۔ میں نے اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو یہاں کے ایک معروف شاعر اور ادیب ابراہیم رضوی اور میری بھتیجی شامہ خیری نے اس 'نیک کام' میں میرا ہاتھ بٹایا اور وہاں ہم تینوں گئے۔ مارک والنگر کی یہ نمائش جسے ۲۰۰۷ء State Britain کا نام دیا گیا ہے۔ ٹیٹ گیلری کے سفید مرمر سے بنے ہوئے اس وسیع ایوان میں لگی ہوئی ہے جسے 'ڈووین گیلریز' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نمائش میں ۶۰۰ سے زائد مجسمے، تصویریں، جنگ مخالف جھنڈے، پوسٹر، مارے جانے والے بچوں کے کھلونے اور برائن ہا کو لکھے جانے والے وہ خط شامل ہیں جو ان کے حامیوں نے انہیں لکھے۔ ٹیٹ گیلری کا یہ حصہ اس نوعیت کی کئی عصری نمائشیں پیش کر چکا ہے جن میں مائیکل لینڈے، مونا حاتم اور آنیا گلا کیو کی نمائشیں بھی شامل ہیں۔ یہیں رچرڈ لانگ اور رچرڈ سیرا کی نہایت مشہور نمائشیں بھی ہو چکی ہیں۔

عراق پر امریکی حملے اور اس حملے میں امریکی سپاہیوں کے شانہ بشانہ برطانوی سپاہیوں کی موجودگی نے برطانیہ میں بہت سے لوگوں کو نہ صرف بلیئر حکومت سے ناراض کیا بلکہ اس خیال سے بھی دہشت زدہ کیا کہ ان کے بیٹے، بھائی اور شوہر ایک ایسے ملک کی تباہی اور تاراجی میں حصہ لے رہے ہیں جس نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ نہیں کیا تھا اور جس کی سرزمین پر برطانیہ کو فوجیں اتارنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ عراق پر جنگ سے پہلے عائد شدہ اقتصادی پابندیوں نے عراقی بچوں کو جس بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا وہ معاملہ بھی برطانوی عوام اور دانشوروں کے ضمیر کے لیے ایک بڑی خلش کا سبب بنا۔ رہی سہی کسر عراق کی نہتی اور بے گناہ شہری آبادی پر اندھا دھند بمباری نے پوری کر دی۔ ٹیٹ گیلری کے ڈووین گیلریز میں جہاں والنگر کی یہ نمائش ہو رہی ہے۔ وہ چالیس میٹر طویل ہے۔ یہ نمائش جب پارلیمنٹ اسکوائر میں ہو رہی تھی تو اس میں برطانوی عوام

کی طرف سے رکھے گئے پوسٹر، پینٹنگز اور بچوں کے کھلونے بھی شامل تھے لیکن انہیں پولیس نے ایک حالیہ ایکٹ کے تحت ضبط کرلیا۔ والنگر نے اس سرکاری غنڈہ گردی پر سخت بیانات دیئے او رپھراس نے پندرہ لوگ ملازم رکھے، ۹۰ ہزار پونڈ اپنی جیب سے خرچ کیے اور چھ مہینے لگا کر ۲۰۰۷ء Britain State کو ڈودین گیلریز میں نئے سرے سے مرتب کیا۔ مارک والنگر کو دو مرتبہ ٹرنر پرائز کے لیے نامزد کیا گیا ہے۔ یہ ایک بڑا اعزاز ہے جو کسی ہم عصر مجسمہ ساز کے حصے میں آیا ہے۔

ٹیٹ گیلری سے کہیں بڑھ کر دی نیشنل گیلری ہے جو ٹرافالگر اسکوائر میں ہے اور جہاں اگر نہ جایا جائے تو لندن کا سفر مکمل نہیں ہوتا۔ اس گیلری میں چند دنوں پہلے scratch the surface کے نام سے ایک نمائش شروع ہوئی ہے اور یہ بھی لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی ہے اس نمائش کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے برطانیہ کی نئی نسل نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ اپنے پرکھوں اور اپنے ہم عصر سیاستدانوں کے جرائم دنیا کے سامنے لاکر رہے گی۔ ڈودین گیلری میں ایک بڑی رنگین تصویر لوگوں کے قدم تھام لیتی ہے۔ اس تصویر میں ٹونی بلیئر اور ان کے دائیں بائیں ان کے وزراء خارجہ ہیں جن کے سامنے خون سے بھرے ہوئے پیالے رکھے ہیں۔ ہنستے ہوئے ان تین چہروں اور خون سے بھرے ہوئے پیالوں کے نیچے ایک جملہ لکھا ہے اور وہ کچھ یوں ہے 'ہم کھانے سے پہلے اپنے ہاتھ ضرور دھوتے ہیں' یہ ایک ایسی تصویر اور اس کے نیچے لکھا گیا کاری جملہ ہے جو بے اختیار آنکھوں کو نم کردیتا ہے۔

بالکل اسی طرح دی نیشنل گیلری میں ہونے والی نمائش 'اسکریچ دی سرفیس' افریقہ سے ہونے والی غلاموں کی تجارت کے بارے میں ہے۔ برطانیہ نے جس طرح ملکہ الزبتھ اول کے زمانے میں ہندوستان کا رخ کیا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھے تھے۔ اسی طرح برطانوی مہم جو جون ہاکنز نے ملکہ الزبتھ اول کی اجازت سے سیرالیون کے ساحل پر اپنے جہاز لنگر انداز کیے۔ یہ ۱۵۶۲ء کا زمانہ تھا۔ وہ تین جہازوں اور سو افراد کے عملے کے ساتھ وہاں پہنچا تھا۔ وہاں سے اس نے ۳۰۰ صحت مند اور توانا افریقی نوجوان اغوا کیے، اپنے جہازوں میں بھرے اور کیریبین جا پہنچا جہاں اس نے ان آزاد افریقیوں کو غلام کے طور پر ہسپانوی آبادکاروں کے ہاتھوں فروخت کیا اور ان کے عوض اشرفیوں کے تھیلیاں لے کر پلٹا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے افریقہ میں رہنے والے سیاہ فاموں کی زندگی صدیوں کے لیے تاریک کردی۔

اس مہم جوئی نے ہاکنز اور دوسرے برطانوی مہم جو افراد کو یہ بتایا کہ یہ سیاہ فام چہرے ان کے لیے سنہری اشرفیاں ہیں اور پھر افریقہ کی طرف جہازوں کے جہاز جانے لگے اور یہ غلاموں کی تجارت سب سے منافع بخش کاروبار بن گئی۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری، رنگ آئے چوکھا کے مصداق انگریز جہازراں مختلف افریقی ساحلی شہروں کا رخ کرتے اور وہاں سے آزاد شہریوں کو غلام بنا کر لاتے اور انہیں فروخت کر دیتے۔ وہ لوگ جو یہ تجارت کر رہے تھے انہوں نے اس سے حاصل ہونے والی دولت سے فیکٹریاں لگائیں، بینک قائم کیے اور جہاز بنانے والے کارخانے بنائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے برطانیہ میں ایک ایسے دولت مند طبقے نے عروج حاصل کیا جس کے ہاتھ غلاموں کی ذلت آمیز زندگی کی کالک سے سیاہ ہو چکے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں ان 'نئے امراء' نے اپنی دولت کے مظاہرے کے لیے بہت سی پینٹنگز بنوائیں اور آرٹ کے سرپرست بن بیٹھے۔ ۱۸۰۷ء میں جب برطانیہ کے کچھ باضمیر سیاستدانوں اور دانشوروں نے پارلیمنٹ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ غلاموں کی تجارت کو غیر قانونی قرار دے تو لیورپول کے ممبر پارلیمنٹ نے اس قرارداد کی شدید مخالفت کی تھی۔ اسی طرح مسز آسوالڈ اور ان کے شوہر تھے جو اس تجارت سے امیر الامراء بن بیٹھے تھے۔ وہ بھی پارلیمنٹ سے پاس ہونے والے اس قانون کے سخت مخالفوں میں تھے۔

حال ہی میں دی نیشنل گیلری نے ان دونوں انسان دشمن افراد کی پورٹریٹ کی نمائش کی تو ۲۰۰۴ء کے ٹرنر پرائز کے لیے نامزد ہونے والے آرٹسٹ ینکا شونیبار نے اس حوالے سے اپنا 'جواب' پیش کیا۔ جواب نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔ ۲۰۰۷ء کے سال میں برطانیہ غلامی کے خاتمے کے لیے منظور ہونے والے ایکٹ کے دو سو سال مکمل ہونے کا جشن منا رہا ہے۔ غلاموں کی تجارت پر نئی نئی کتابیں سامنے آ رہی ہیں۔ تصویری نمائشیں ہو رہی ہیں۔ یوں برطانیہ کی نئی نسل اپنے بزرگوں کے گناہوں سے لاتعلقی کا اظہار کر رہی ہے اور خاص طور پر عراق سے جنگ کے بارے میں اپنی حکومت کے مؤقف پر برہم نظر آتی ہے۔ ایک زندہ اور متحرک سماج کی یہ بڑی نشانیاں ہیں۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی
۳۰ جولائی ۲۰۰۷ء

مردہ خانے کی سیڑھیوں پر

عراق سے دم بہ دم شہروں کی تباہی اور شہریوں کی بربادی کی تصویریں چلی آتی ہیں۔ ایک تصویر آج کے تمام اخباروں میں چھپی ہے، یہ باقوبہ سے آئی ہے، ایک نوجوان عراقی ماں اپنے بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے اور اس کے سر کو، اس کے رخسار کو تھپک رہی ہے بچے کا ننھا سا ہاتھ ماں کے شانے پر ہے۔ میں پہلی نظر میں یہ سمجھی کہ شاید وہ اپنے بیمار بچے کو دلاسہ دے رہی ہے۔ لیکن جب اس کے نیچے لکھی ہوئی عبارت پڑھی تو لفظ اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتے جو مجھ پر طاری ہوئی۔ وہ نوجوان ماں اپنے چھ سالہ بچے کی لاش گود میں لیے مردہ خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ بچہ اپنی ماں کے ساتھ بس میں سفر کر رہا تھا جسے کسی نامعلوم بندوقچی نے نشانہ بنایا۔ بچہ اسی لمحے ختم ہو گیا، ماں رہ گئی جو اپنی آغوش میں اس کا ننھا سا بدن سمیٹے، اسے کیسی والہانہ محبت سے یوں دیکھ رہی ہے، اسے یوں تھپک رہی ہے جیسے وہ ابھی گہری نیند سے چونک کر آنکھیں کھول دے گا۔ مسکرا کر ماں کو دیکھے گا اور کسی چیز کی فرمائش کرے گا۔

اس جنگ زدہ ملک نے، اس کے شہروں نے، اس کے شہریوں نے کیسے ستم نہیں سہے۔ امریکیوں کے ہاتھوں اور ان اپنوں کے ہاتھوں جو امریکیوں کے غاصبانہ قبضے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ بچہ کسی امریکی گولی کا شکار نہیں ہوا۔ ہم جب اپنے مخالفوں سے آزادی کے لیے لڑتے ہیں اور اپنے طیش کے اظہار کے لیے خودکش حملے کرتے ہیں تو مارے جانے والے عموماً وہ ہوتے ہیں جو غاصبوں کے خلاف ہیں اور اپنے ملک سے غیر ملکی فوجوں کی واپسی اور امن کی بحالی چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نامعلوم بندوقچی نے اپنے 'شکار' کی تصویر دیکھی ہوگی یا نہیں اور اگر دیکھی ہو تو شاید ماں اور بچے کی یہ تصویر اس کے سینے میں برچھی بن کر اتری ہو۔ یا شاید

اس نے امریکی قبضے کے خلاف احتجاج کے اس انداز کو درست سمجھا ہو۔ میں کچھ نہیں جانتی۔

ایک معاصر انگریزی اخبار۔نے اس تصویر کے نیچے اس مظاہرے کی خبریں شائع کی ہیں جو ۱۵ر ستمبر ۲۰۰۷ء کو امریکی دارالحکومت واشنگٹن میں وہائٹ ہاؤس کے سامنے شروع ہوا اور مظاہرین وہاں دھرنا دینے کے بعد جلوس کی شکل میں کیپٹل ہل تک گئے۔ اس مظاہرے میں منتظمین کے مطابق لگ بھگ ایک لاکھ افراد شریک تھے۔ اسے دیکھنے والے پاکستانی صحافیوں کا کہنا ہے کہ مظاہرین بہت زیادہ مشتعل تھے۔ 'عراق پر فوج کشی بند کی جائے'، 'امریکی فوجوں کو واپس بلایا جائے' کے مطالبے کے ساتھ ہی وہ صدر امریکا کے مواخذے کا مطالبہ بھی کر رہے تھے۔

اس مظاہرے کا اہتمام Act Now To Stop The War And End Racism Coalation نے کیا تھا۔ اس تنظیم کا مختصر نام ANSWER ہے۔ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان پر امریکی حملے کے امکانات پیدا ہوئے تو ہنگامی بنیادوں پر صرف تین دن بعد ۱۴ر ستمبر کو امریکا کے سابق اٹارنی جنرل ریمزے کلارک اور دوسرے جنگ مخالف دانشوروں اور امریکی شہریوں نے مل کر یہ تنظیم قائم کی جس نے افغانستان پر امریکی حملے سے پہلے ۲۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کو واشنگٹن میں ایک عظیم الشان امن مظاہرہ کیا۔ اس میں امریکی حکومت سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی جنگ مخالف اور نسل مخالف پالیسیوں پر عمل پیرا نہ ہو۔ یہ تنظیم بنیادی طور پر 'استعمار مخالف' ہے اور اس کی اسٹیرنگ کمیٹی میں سوشلسٹ، مارکسسٹ، شہری حقوق کے لیے آواز بلند کرنے والے وکیل، بائیں بازو کی ترقی پسند تنظیمیں شامل ہیں۔ ان لوگوں میں مسلمان، عرب نژاد، فلسطینی، فلپینو اور لاطینی امریکا سے تعلق رکھنے والے گروہوں کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے۔ ۲۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد سے اب تک امریکا میں اس اتحاد کے تحت بڑے بڑے جنگ مخالف مظاہرے ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض مظاہروں میں لاکھوں افراد نے شرکت کی اور ان امریکی عوام کی رائے بدلنے میں بنیادی کردار ادا کیا جو یہ سمجھتے تھے کہ افغانستان اور عراق پر حملے کا حکم امریکی صدر کا 'دانشمندانہ' فیصلہ ہے۔ ان جنگ مخالف مظاہروں کے ردعمل میں کچھ امریکیوں نے جنگ کی حمایت میں مظاہرے شروع کیے لیکن عراق سے آنے والی ہولناک خبروں، تصویروں، ابوغریب جیل میں امریکی فوجیوں کا قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کی تفصیلات اور جنگ مخالف مظاہروں نے امریکی رائے عامہ کو بدلنا شروع کیا۔ یہ درست ہے کہ امریکی صدر ابھی تک مسند نشین ہیں لیکن یہ بھی ایک سامنے کی حقیقت ہے کہ ان کی

مقبولیت کا گراف خطرناک حد تک گر چکا ہے۔ اس وقت ٦٦ فیصد امریکی عراق میں امریکی فوجوں کی موجودگی کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صدر بش نے امریکا کو ایک ایسی جنگ میں دھکیل دیا ہے جو قطعاً غیر ضروری تھی۔ دو دن پہلے ہونے والے مظاہرے میں شریک ہونے والے ایک شخص کے یہ جملے ٹیلی ویژن چینلوں کے ذریعے کروڑوں امریکیوں تک پہنچے کہ 'اس جنگ کی وجہ سے ہمارے ملک میں جمہوریت ہم سے چھینی جارہی ہے اور حکمرانوں کے کارپوریٹ مفادات کی وجہ سے ہم اپنے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کیے جارہے ہیں۔'

جنگ مخالف جذبات رکھنے والے امریکیوں کا کہنا ہے کہ بش انتظامیہ اور بطور خاص نائب صدر ڈک چینی اور ان کے دوستوں کے کاروباری مفادات کو اس جنگ سے بے پناہ فائدہ ہوا ہے۔ عالمی مارکیٹ میں تیل کی ناقابل یقین حد تک بڑھ جانے والی قیمتوں اور اسلحہ تیار کرنے والی فیکٹریوں کے ٢٤ گھنٹے چلتے رہنے کے سبب ان شعبوں سے وابستہ بااثر افراد نے اربوں کھربوں ڈالر کمائے ہیں۔ یہ ڈالر عراقیوں کی تباہی و بربادی اور امریکی فوجیوں کے خون کی قیمت ہیں۔ صدر بش کے ٢٢ ہزار امریکی فوجیوں کی وطن واپسی کے اعلان سے بھی یہ مظاہرین مطمئن نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم اس جنگ کا فوری خاتمہ چاہتے ہیں اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ہر امریکی فوجی ہنگامی بنیادوں پر عراق سے واپس بلایا جائے۔ یہ عراقیوں کا ناقابل تنسیخ حق ہے کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں۔

وائٹ ہاؤس کے سامنے جمع ہونے والے مظاہرین نے جب پولیس کی لگائی ہوئی حفاظتی باڑ پھلانگی تو دو سو سے زائد افراد گرفتار کیے گئے اور مظاہرین پر پسی ہوئی کالی مرچ کا چھڑکاؤ کیا گیا لیکن مظاہرین نے ہمت نہیں ہاری اور وہ 'ہمارے روپے جنگ اور غاصبانہ قبضے پر نہیں تعلیم اور بیروزگاری ختم کرنے پر خرچ کرو' جیسے بینر اٹھائے چلتے رہے۔ یہ لوگ شانے سے شانہ ملائے ہوئے اور نعرے لگاتے ہوئے وہائٹ ہاؤس سے کیپٹل ہل تک گئے۔ جسے گھیرے میں لے کر پانچ ہزار مظاہرین نے سڑک پر لیٹ کر 'مردہ' ہونے کا مظاہرہ کیا۔ کیپٹل ہل پر بھی آہنی حفاظتی حصار قائم کیا گیا تھا۔ جس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مظاہرین اس جنگلے کو پھلانگ کر پار کرتے رہے اور گرفتار ہوتے رہے۔ مظاہرین سے سابق امریکی اٹارنی جنرل ریمزے کلارک، دو مرتبہ صدارتی انتخابات میں حصہ لینے والے رالف نیدر، ایٹا تھامس اور صدر بش کو ہر مرحلے پر تنقید

کا نشانہ بنانے اور ان کے خلاف تنہا مظاہرہ کرنے والی سینڈی شیہان نے تقریر کی۔ اگلے ہفتے سول نافرمانی شروع کرنے کا بھی اعلان کیا گیا۔

جنوری ۲۰۰۷ء کے بعد ہونے والا یہ سب سے بڑا جنگ مخالف مظاہرہ تھا۔ جس میں ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ امریکیوں نے شرکت کی۔ مظاہرین اور ان کے رہنما ڈیموکریٹس پر بھی جارحانہ انداز میں تنقید کرتے رہے۔ ان کا مؤقف تھا کہ امریکی حزب اختلاف ملکی مفادات کی حفاظت نہ کرسکی اور ڈیموکریٹک پارٹی جمہوریت پسندی اور حقوق انسانی کے لیے مؤثر آواز بلند کرنے میں ناکام رہی۔ اس مظاہرے میں ایک ایسا نوجوان شریک تھا جسے جولائی ۲۰۰۶ء میں عراق بھیجا گیا تھا۔ وہ ابھی حال ہی میں عراق سے واپس آیا ہے۔ اکیس سالہ نوجوان فل ایلف کا کہنا تھا کہ 'میں وہاں لگ بھگ ایک سال رہا۔ میری تعیناتی ابوغریب اور فلوجہ کے مضافات میں رہی۔ ہم جب وہاں پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ ہم عراق میں استحکام قائم کرنے کے لیے آئے ہیں۔ لیکن وہاں رہتے ہوئے ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم کسی بھی چیز کی تعمیر تو نہیں کر رہے تھے۔ عراقیوں کو ۲۴ گھنٹوں میں صرف دو گھنٹے بجلی مل رہی تھی۔ وہاں میں نے یہ بھی دیکھا کہ امریکی فوجی کس طرح لوگوں پر ظلم وستم کرتے ہیں۔ اس بارے میں جنرل پٹاریوس کی رپورٹ کا حقیقت سے دور دور کا واسطہ نہیں'۔

ان مظاہرین میں ڈیانے بھی موجود تھی، اس کا ۲۵ برس کا بیٹا اگست ۲۰۰۴ء میں عراق میں مارا گیا۔ اس نے کہا کہ میں کانگریس سے مطالبہ کرتی ہوں کہ وہ جنگ کے لیے جاری ہونے والے تمام فنڈ بند کردے۔ ان مظاہرین کا کہنا تھا کہ جب عراقیوں کو ہماری فوج کی ضرورت نہیں اور وہ انہیں غاصب تصور کرتے ہیں تو ہماری حکومت کے پاس وہاں اپنے فوجیوں کو رکھنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔

میں جانتی ہوں کہ امریکا میں ہونے والے جنگ مخالف مظاہرے ان عراقیوں کی جانیں واپس نہیں لا سکتے جو اس ناجائز امریکی جنگ کا نوالہ بنے۔ وہ اس ماں کے آنسو بھی خشک نہیں کرسکتے جو مردہ خانہ کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی چھ سالہ بیٹے کے بال سنوار رہی تھی رخسار سہلا رہی تھی لیکن یہ ضرور جانتی ہوں کہ یہ مظاہرے امریکی صدر کو آخرکار پسپائی کے لیے مجبور کردیں گے اور کچھ عراقیوں کی جانیں بچ جائیں گی اور کچھ عراقی مائیں اپنے پھول جیسے بچے اپنی آغوش میں سمیٹ کر کسی مردہ خانے کی سیڑھیوں پر نہیں بیٹھیں گی۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی

۱۷ ستمبر ۲۰۰۷ء

فلسطینیوں کا قتل عام۔ ہم سب منافق ہیں

۲۷ دسمبر ۲۰۰۸ء کی صبح جب اسرائیل کے لوگوں کی آنکھ کھلی تو انتہا پسند یہودی سیاستدان اور فوجی جرنیل، جنگ کے بھوکے بھیڑیے کو فلسطینیوں پر آزاد چھوڑ چکے تھے۔ وہ اسرائیلی جنہوں نے اپنے پڑوسی فلسطینیوں کی زندگیاں دیوانگی پر اترے ہوئے اپنے سیاستدانوں کے ہاتھوں پہلے بھی برباد ہوتے دیکھی تھیں انہوں نے فوری طور پر اس بہیمانہ حملے کے خلاف ایک دوسرے سے رابطے شروع کیے، ان میں کولیشن آف ویمن فار پیس سب سے آگے تھی۔ اس نے حداش، گش شولوم، برابوت 'یک آواز تحریک' اور دوسری امن تنظیموں سے فون اور انٹرنیٹ پر رابطے شروع کیے اور اسی شام چھ بجے جنگ مخالف مظاہرے کا اعلان کر دیا گیا۔ شام چھ بجے سے پہلے اسرائیلی پولیس، رائٹ پولیس، گھڑ سوار پولیس، پیٹرول کار گاڑیوں نے تل ابیب کے اس پُر رونق چوک کو گھیرے میں لے لیا جہاں یہ امن مظاہرہ ہونا تھا۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے بہت سے بینر تیار کیے تھے جن میں سب سے نمایاں یہ نعرہ تھا کہ 'یہ میری جنگ نہیں ہے' عبرانی، عربی اور انگریزی میں لکھے ہوئے اس بڑے بینر کی تصویریں ہمارے یہاں بھی بعض انگریزی اخبارات میں شائع ہوئیں۔ امن کے لیے آواز بلند کرنے والے ان نہتے مظاہرین کا 'دماغ درست کرنے کے لیے' جو پولیس فورس بھیجی گئی اس کے پاس دور مار رائفلیں تھیں۔ چھ بجے تک ہزاروں مظاہرین جمع ہو چکے تھے، اسرائیلی الیکٹرانک میڈیا، پریس اور حکومت جس پیمانے پر جنگی جنون بھڑکاتی ہے اسے نظر میں رکھا جائے تو نہتے فلسطینیوں پر ہونے والے حملے کے صرف ۱۲/ گھنٹے بعد یہ ایک بڑا جنگ مخالف مظاہرہ تھا جس میں شریک لوگوں کی پولیس سے جھڑپیں ہوئیں، بہت سے نوجوان گرفتار ہوئے لیکن مظاہرین دوسرے دن بھی آئے اور تیسرے دن بھی۔

یہاں یہ عرض کرتی چلوں کہ 'یک آواز تحریک' میں ۳،۳۱،۷۸۱ر اسرائیلی، ۲،۹۵،۷۷۷ فلسطینی اور دنیا بھر سے ۲۱،۱۵۴ر افراد شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آزاد فلسطین کی اور اسرائیلی قبضے اور تشدد کے خاتمے کی بات کرتے ہیں۔ ان دنوں گش شولوم کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اسرائیلی دارالحکومت کی سڑکوں پر مظاہرے کر رہے ہیں ان کے ہاتھوں میں پوسٹر ہیں جن پر لکھا ہے Stop the Mad War یش گلوول میں شامل لوگ وہ ہیں جنہوں نے مقبوضہ علاقوں میں فوجی خدمات دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ایسوسی ایشن فار سول رائٹس ہے، بیت شولوم ہے جو امن پسند عورتوں کی ایک تنظیم ہے۔ فلسطینی گھروں کو مسمار کرنے کے جرم اور فلسطینی علاقوں پر قبضے کے خلاف آواز بلند کرنے والی تنظیمیں ہیں۔ انتہا پسند یہودی، عسکریت پسند اسرائیلی حکمران اور فوجی جرنیل ان تمام تنظیموں اور ان میں شامل افراد کو 'غدار' قرار دیتے ہیں اور ان سے انتقام لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ فلسطینیوں کے لیے امن اور انصاف کے طلب گار اسرائیلیوں پر سڑکوں اور گھروں پر حملے کیے جاتے ہیں اور ان حملوں کا سب سے زیادہ شکار اسرائیلی عورتیں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسرائیل کی باضمیر عورتیں تھیں جنہوں نے فلسطینیوں کے حق میں امن تحریک چلانے کا آغاز کیا تھا۔ یہ جنوری ۱۹۸۸ء کا قصہ ہے۔ جب 'سیاہ پوش عورتیں' نامی تحریک فلسطین میں انتفاضہ کے ایک ماہ بعد شروع ہوئی۔ یہ اسرائیل کی مٹھی بھر عورتیں تھیں جو سیاہ لباس میں خاموشی سے تل ابیب کی کسی مصروف شاہراہ کے چوراہے پر کھڑی ہو جاتیں۔ ہاتھوں میں گتے کا ایک سیاہ پنجہ ہوتا جس پر عبرانی میں سفید سے 'قبضہ ختم کرو' لکھا ہوتا۔ اس خاموش مظاہرے کی اطلاع اسرائیل کے تمام شہروں میں پھیلتی گئی اور اسرائیل کے مختلف شہروں کی عورتوں نے ہر جمعہ کو یہ مظاہرہ شروع کر دیا۔ دسمبر ۲۰۰۱ء میں ۵ براعظموں کے ۱۵۰ر شہروں میں مختلف قومیتوں، نسلوں اور عقیدوں کی سیاہ پوش عورتوں نے بھرپور مظاہرے کیے۔ ان میں سب سے بڑا مظاہرہ یروشلم میں ہوا جہاں ۵ ہزار سے زیادہ اسرائیلی اور فلسطینی عورتوں نے اس مظاہرے میں حصہ لیا۔ ان میں دو بینروں کی عبارت لوگوں کی توجہ کا مرکز رہی۔ 'قبضہ ہم سب کو ہلاک کر رہا ہے' اور 'ہم ایک دوسرے کے دشمن ہونے سے انکار کرتے ہیں۔' ان عورتوں نے اسرائیلی پولیس اور سیاستدانوں کے خلاف احتجاجی مظاہرے جاری رکھے تو وہ 'غدار' اور 'وطن فروش' کہی گئیں ان پر پتھر پھینکے گئے، جوتے برسائے گئے، قاتلانہ حملے کیے گئے لیکن اسرائیل بھر میں ہزاروں عورتیں

ہر جمعہ کی دوپہر اپنے گھروں سے نکلتی ہیں، فلسطینیوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتی ہیں اور اپنے سیاستدانوں اور فوجیوں سے 'امن' کی طلب گار ہوتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تشدد ہمارے لوگ کریں یا دنیا کی کسی بھی قومیت نسل اور مذہب سے تعلق رکھنے والے، یہ ہمارے لیے ناقابل قبول ہے۔ ہم ہر نوعیت کے تشدد کو رد کرتے ہیں۔ صدیوں سے عورتوں کی بے حرمتی کو دوسری قوم کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، ہم اس ظالمانہ فعل کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہیں۔

'ففتھ مدر' نامی تنظیم کی بنیاد مارچ ۲۰۰۲ء میں رکھی گئی۔ اس میں بیشتر عورتیں وہ تھیں جنہوں نے Four Mother Movement چلائی تھی اور جنہوں نے لبنان پر اسرائیلی قبضے کے خاتمے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ ماؤں اور عورتوں کی حیثیت سے ہم اسے لازم سمجھتے ہیں کہ اپنی آواز بلند کریں اور اپنے عسکریت پسندوں، سیاستدانوں، فوجیوں اور قانون نافذ کرنے کے نام پر لاقانونیت پھیلانے والوں کو بتا دیں کہ اس تنازعے کو گولیوں سے نہیں صرف گفتگو سے حل کیا جا سکتا ہے۔ مئی ۲۰۰۶ء میں حماس نے انتخابات جیتے تو اسرائیلی شہریت رکھنے والی تانیا رائن ہارٹ نے لکھا کہ حماس کی حکومت کو تسلیم کیا جانا چاہیے کیونکہ یہ انصاف اور بین الاقوامی قوانین کا تقاضہ ہے۔ تانیا نے اپنے اس مضمون میں اسرائیلی حکومت کو یہ بھی یاد دلایا کہ حماس نے جنوری ۲۰۰۵ء میں اعلان کیا تھا کہ وہ مسلح جدوجہد سے کنارہ کر کے سیاسی جدوجہد کو اختیار کرے گی اور اس کے بعد گزشتہ ۱۷ مہینوں میں اس نے اپنے اس عہد کی پاسداری کی اور اس کی طرف سے دہشت گردی کا کوئی بھی واقعہ نہیں ہوا۔ تانیا نے اپنے اسی مضمون میں اپنی حکومت کو یہ بھی یاد دلایا تھا کہ اس نے ۱۹۹۳ء میں ہونے والے اوسلو معاہدے کی کسی بھی شق کی پاسداری نہیں کی اور فلسطینیوں سے ان کی سرزمین کو چھیننے کا سلسلہ جاری رکھا۔

میں اسرائیل کی شہری گیلا سورسکی کا مضمون پڑھتی ہوں جس نے لکھا کہ جب دہشت گرد سیاستدان بن جائیں تو وہی ہوتا ہے جو اسرائیل میں ہو رہا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ مناہم بیگن ایک دہشت گرد یہودی تنظیم کا سربراہ تھا اور اس کے ہاتھوں پر ۱۹۴۶ء میں کنگ ڈیوڈ ہوٹل میں ایک دہشت گرد حملے میں مارے جانے والے ۹۱ شہریوں کا خون تھا لیکن وہ ہمارا وزیر اعظم ہوا، اسی طرح وہ ایریل شیرون پر شدید تنقید کرتی ہے جو بیروت، غزہ، صابرہ، شتیلہ کیمپوں میں ہونے والی

ہولناک خون ریزی کا ذمہ دار تھا اور اسرائیلیوں نے اسے اپنا وزیر اعظم منتخب کیا۔

مسلم اُمہ اسرائیلی افواج کے ہاتھوں فلسطینی بچوں، عورتوں، بوڑھوں، نہتے شہریوں کا قتل عام دیکھ چکی، ہمارے عرب اور غیر عرب مسلمان حکمرانوں نے ان مظالم کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا، وہ بھی ہم سب کے سامنے ہے، ہم امریکا کے غلام اور منافق ہیں۔ ہیوگو شاویز کی فلسطین دوستی اور اسرائیلی جارحیت کے خلاف سخت ردعمل بھی ہم نے دیکھا ہے۔ شاید وقت آ گیا ہے کہ مسلم اُمہ اپنے حکمرانوں کی طرف دیکھنے کی بجائے ان غیر مسلم عناصر کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرے، جو فلسطین پر اسرائیل کے ناجائز قبضے اور اس کی نازل کی ہوئی ابتلا کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور نسل پرست یہودیوں کے پہلو میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صیہونیت کے بارے میں حقائق کو آشکار کرتے ہیں۔، لکھتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، جلسے کرتے ہیں، پولیس کا تشدد برداشت کرتے ہیں اور سینکڑوں ایسے یہودی بھی ہیں جو فلسطینیوں پر گولی چلانے سے انکار کی پاداش میں آج بھی جیل میں ہیں۔ ان میں مرد ہیں، عورتیں ہیں اور لارا میلو جیسی نوجوان لڑکیاں بھی ہیں۔ ہم ان لوگوں سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ آج نہیں تو کل اسرائیل اور فلسطین تنازعے میں کوئی مثبت کردار ادا کر سکیں گے۔ تل ابیب میں ہر جمعہ کو کسی بارونق چوک پر نکلنے والی سیہ پوش یہودی عورتیں، ان کا ساتھ دینے والے مرد، جو عدم تشدد کی اور ہلاکت گریزی کی بات کرتے ہیں، آج نہیں تو کل اسرائیل کے اجتماعی ضمیر کو جھنجھوڑنے میں کامیاب ہوں گے۔ خوں ریزی اور ہر قیمت پر غلبہ حاصل کرنا بہت سے انسانوں کی سرشت ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہنے والوں کی اکثریت کو امن اچھا لگتا ہے۔ امن ان کی آنے والی نسلوں کی زندگیوں اور خوشیوں کی ضمانت ہے۔ اگر جنگ دنیا کے ہر تنازعے کا حل ہوتی تو آج کرۂ ارض پر انسان معدوم ہو چکا ہوتا اور اس دنیا میں صرف چرند اور پرند نظر آتے۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی

۱۴ر جنوری ۲۰۰۹ء

جاپانی دوستوں سے گزارش

جاپان جسے اُبھرتے ہوئے سورج کی سرزمین کہا جاتا ہے جہاں ہندوستان سے نکالے جانے والے بدھ مت کو پناہ ملی تھی۔ اب صدیوں سے وہاں بدھ اور شنٹو مت کے ماننے والے رہتے ہیں۔ ان کی اور ہماری دوستی پرانی ہے۔ ہم اپنی شاہ خرچیوں سے خود کو کنگال کر چکے ہیں اور یہ دوستی کا ثمر ہے کہ انہوں نے ہمیں بھاری رقم امداد میں دینے کا اعلان کیا ہے۔ بودھ بھکشوؤں کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ جنگل جنگل پھرتے، خانقاہوں میں مذہب اور ادب کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے شام پڑے کسی کسان کی جھونپڑی کے سامنے پل بھر کو ٹھہرتے تھے اور اپنا کشکول اس کی دہلیز پر رکھ دیتے تھے۔ وہاں سے مٹھی بھر چاول اس میں ڈال دیا جاتا تھا۔ وہ خاموشی سے کشکول اٹھاتے اور واپس جا کر اپنے استاد کے قدموں میں رکھ دیتے۔

ہم جاپانیوں کے استاد تو نہیں لیکن انہوں نے دنیا کے ۱۰ رخوشحال ملکوں اور ۴ بین الاقوامی مالیاتی تنظیموں کی میزبانی کا اعلان کرتے ہوئے پاکستان کے لیے ایک کشکول رکھ دیا ہے کہ آیئے اور حسب استطاعت اس میں وہ رقم ڈالتے جایئے جو ایک بار پھر اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوگی۔

جاپانی دنیا کی بے مثال قوموں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے ہماری شاعری میں 'ہائیکو' کی صنف کا اضافہ کیا ہے۔ ہر سال ان کا کلچرل سینٹر پابندی سے ہائیکو مشاعرے کراتا ہے اور ہمارے شاعر جوق در جوق جاتے ہیں۔ ابھی چند دنوں پہلے انہوں نے جاپانی کیلنڈروں کی ایک نمائش کی جس میں سبزہ زار، دھان کے کھیت، بانس کے پیڑ، آتش فشاں پہاڑ، اڑتی ہوئی مرغابیاں، تیرتے ہوئے راج ہنس، اڑتے ہوئے بادل، پھولوں سے لدے ہوئے شاہ دانے کے پیڑ، حسین ترین

مناظرِ فطرت کی قاشیں تھیں جو دیواروں پر آ ویزاں کردی گئی تھیں۔ یہ حسن اور یہ دل فریبی دیکھ کر آ نکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ لیکن جی چاہتا ہے کہ ہمارے جاپانی دوست ہماری مالی دست گیری اور ہماری جمالیاتی حس کی تسکین کے ساتھ ہی ہمیں وہ المناک حقائق بھی بتائیں جن سے وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران دوچار ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں ایٹمی ہتھیاروں کے عشق میں مبتلا سیاستدانوں، دانشوروں اور سائنسدانوں کی کوئی کمی نہیں۔ جاپانیوں سے زیادہ کون سی قوم ہمیں بتاسکتی ہے کہ جب ان کے صرف دوشہروں پر امریکیوں نے ایٹم بم گرائے تو لوگوں پر کیا گزری اور آج بھی ان کے ہزاروں لوگ کن عذابوں سے دوچار ہیں۔ جاپانی دانشور، ادیب اور مصور ہمیں بتاسکتے ہیں کہ جو ایٹم بم ان پر گرائے گئے تھے ہم ان سے ہزار گنا زیادہ بھیانک تباہی پھیلانے والے بموں سے کھیل رہے ہیں اور ہر موقع پر اسے دے مارنے کا 'مژدہ' سناتے رہتے ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ ہمارے جاپانی دوست ہمارے دانشوروں اور سیاستدانوں کے لیے ایری ماروکی اور توشی ماروکی کے ان فن پاروں کی نمائش کا اہتمام کریں جو دنیا میں 'دی ہیروشیما میورلز' کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ وہ آرٹسٹ جوڑا تھا جو ۱۹۴۵ء میں ٹوکیو میں رہتا تھا۔ ہیروشیما کی تباہی کی خبر آئی تو ایری نے پہلی ٹرین پکڑ کر وہاں کا رخ کیا کیونکہ وہاں ایری کے والدین اور رشتے دار رہتے تھے۔ چند دنوں بعد توشی بھی اس سے آ ملی۔ وہاں انہوں نے جو کچھ دیکھا۔ اس کے بعد ان کی زندگی کا مقصد لوگوں کے عذابوں کو لکیروں اور رنگوں سے کینوس پر اتارنا ہوگیا۔ دونوں کی صحت تابکاری کے اثرات سے خراب ہوچکی تھی لیکن انہوں نے طے کیا کہ وہ اپنے لوگوں کے ان عذابوں کو باہر کی دنیا تک ضرور پہنچائیں گے۔ یہ وہ دن تھے جب ان دو بدبخت شہروں کے بارے میں خبروں اور تصویروں کی اشاعت پر قابض امریکی حکام کی طرف سے پابندی تھی۔ یہ ایک ایسا کام تھا جسے کرتے ہوئے وہ نہ جانے کتنی مرتبہ روئے اور نہ جانے کتنی جذباتی اذیتوں سے گزرے۔ سنسر شپ کی پابندی کے سبب انہوں نے اپنی بنائی ہوئی تصویروں کا عنوان 'روحیں' رکھا۔ ۱۹۵۰ء میں ان پینٹنگز کی نمائش کے بعد انہوں نے 'جہنم' اور 'پانی' کے عنوان سے پینٹنگز کی ایک سیریز بنائی۔

جی چاہتا ہے کہ جاپانی ہماری مالی امداد کے ساتھ ہی ہماری اخلاقی دست گیری بھی کریں۔ جس کی ہمیں شاید امداد سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ میں نے جاپان کے اس انسانی المیے پر ایک

افسانہ 'تنہائی کے مکان میں' لکھا تھا لیکن یہاں اردو کی مایہ ناز ادیب قرۃ العین حیدر کے رپورتاژ 'ستمبر کا چاند' سے چند سطریں آپ کی خدمت میں پیش کروں گی، جو ۱۹۵۷ء میں لکھا گیا تھا۔ اس زمانے میں جاپانیوں نے ادیبوں کی ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ جس میں ۲۸ ملکوں سے لگ بھگ ۲۰۰/ادیب شریک ہوئے تھے اور قرۃ العین حیدر نے اس میں پاکستان کی نمائندگی کی تھی۔

اسی کانفرنس میں شریک ہونے والے بلغاریہ کے ادیب بورسیڈ یلچیف نے کہا تھا 'پچھلے بارہ سال سے ہیروشیما محض ایک شہر کا نام نہیں رہا بلکہ انسانی ضمیر کا سمبل بن چکا ہے یہ ہمارے عہد کی ایک ایسی روحانی حد فاصل ہے جو تخریب کو تعمیر سے، کلچر کو غیر کلچر سے، انسانیت کو درندگی سے جدا کرتی ہے۔ ساتھ ہی اس نے اچھے ادیبوں کو برے ادیبوں سے علیحدہ کر کے دکھا دیا ہے۔ ہمارے عہد کا اچھا ادیب وہ ہے جو اس بھیانک خطرے کی طرف سے بے نیاز نہیں ہے جو ہزاروں انسانوں کے سروں پر ایٹمی طاقت کی وجہ سے منڈلا رہا ہے۔ یہ ادیب اپنے قلم کے ذریعے انسانیت کو ہیروشیما سے بچانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ خواہ ان کے سیاسی اور مذہبی نظریات کچھ بھی ہوں۔ یہ ہر انسان، ہر فنکار کا فرض ہے۔ ہمارے عہد کے ادیب کا کام محض جذبات اور واقعات کی داستان گوئی ہی نہیں۔ وہ اپنے لوگوں کی مصیبتوں سے بے نیاز زندگی کا غیر جانبدار تماشائی نہیں رہ سکتا' قرۃ العین حیدر نے جاپانیوں پر امریکی استبداد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا 'بے شمار لاشیں اب بھی پانی میں تیر رہی تھیں۔ گیند کی طرح پھولی ہوئی اور سفید۔ بڑی عجیب بات تھی کہ مردوں کی لاشیں منہ کے بل تیر رہی تھیں اور عورتوں کے چہرے اوپر تھے۔

'پویلین میں گٹار زور شور سے بجنا شروع ہو گیا۔ جس وقت بجلی کا کوندا لپکا، دفعتاً گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا۔ میرے چہرے کی کھال جدا ہونے لگی اور دھجیاں بن کر چہرے سے لٹک گئی۔ سامنے اسپتال تھا۔ یکلخت اس کی ہر کھڑکی سے سفید دھواں باہر نکلنا شروع ہوا۔ اور دوسری اور تیسری منزلوں سے مریض اور سفید پوش نرسیں کود کود کر دھوئیں میں گرنے لگیں۔ وہ سب نیچے سیمنٹ کی سڑک پر گرتے ہی ختم ہو گئے ہوں گے۔ ہم سب نے بے تحاشا دوڑنا شروع کیا اور دریا تک پہنچے۔ وہاں سینکڑوں آدمی زخمی اور جلے ہوئے پانی میں اپنے چیتھڑے بھگونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک آدمی پانی پانی چلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ جل کر سیاہ کوئلہ ہو چکا تھا۔ صرف دانتوں کی سفیدی نظر

آ رہی تھی...... جھیل کے کنارے ایک برطانوی ادیب گلاس اٹھا کر امریکن ادیب کے گلاس سے ٹکرا رہا تھا۔ باغ کا منظر کسی تصویر کی مانند مکمل تھا۔ جس وقت بجلی کا سا کوندا لپکا میں باورچی خانے میں کھڑی برتن دھو رہی تھی میری بہن کالج گئی ہوئی تھی۔ جب دوسرے لمحے مکان کے پرخچے اڑے، آگ لگ گئی یہ سب ایسا معلوم ہوا جیسے کسی خاموش فلم میں ہو رہا ہے۔ میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آئی۔ میں سماعت سے مکمل طور پر محروم ہو چکی تھی۔ جب ہم نے کالج کے کھنڈر میں میموریل سروس منعقد کی تو ہمیں ملبے سے صرف چاکلیٹ کا ڈبہ ملا جس پر میری بہن کا نام لکھا ہوا تھا جس میں وہ لنچ لے جایا کرتی تھی۔ اس کالج میں تین سو لڑکیاں تھیں۔ سب کی سب اسی لمحے ختم ہو گئیں...... واقعے کے دوسرے روز ہمارے اسپتال کے آنگن میں اندھا گھوڑا بھٹکتا ہوا آ نکلا۔ اس کا چہرہ جل چکا تھا اور آنکھیں پگھل گئی تھیں۔ وہ آنگن میں چکر کاٹتا رہتا اور ہمیشہ سامنے کی دیوار سے جا ٹکراتا۔ دریچوں میں سے ہم اسے دیکھ کر اپنی تکالیف بھول کر بہت دکھی ہوئیں۔ گویا وہ گھوڑا اور ہم ایک دوسرے کے غمگسار تھے۔'

قرۃ العین حیدر حال اور ماضی کو ایک دوسرے میں مدغم کر دینے میں مہارت رکھتی تھیں۔ ان کے اس رپورتاژ میں ہیروشیما کے بارے میں ان کا یہ ہنر عروج پر نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، اختر جمال اور جانے کس کس نے اس موضوع پر لکھا ہے۔ ضمیر نیازی مرحوم جاتے جاتے ہمیں 'زمین کا نوحہ' دے گئے۔ لیکن یہ باتیں شاید ہم پر بے اثر ہیں۔ جاپانی دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ ہمارے لیے دنیا کے سامنے کشکول پھیلاتے ہوئے ہمیں ایری اور توشی کے بنائے ہوئے 'جہنم' کو بھی دکھائیں، ہماری نئی نسل کو کچھ تو معلوم ہو کہ جس ہتھیار کو ہمارے یہاں برتری اور بالادستی کے سنہرے ہالے میں دکھایا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی
۴ فروری ۲۰۰۹ء

ظلم: ایک بیماری

ظلم ایک ایسی بیماری ہے جو انسان کو قدیم زمانوں سے لاحق ہے، اس بیماری میں مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے لوگ بلا استثناء مبتلا ہیں۔ ہمارے یہاں آج سے نہیں گزشتہ ۶۰ برس سے ظلم کا بازار گرم ہے۔ یہ ملک جن وعدوں کی بنیاد پر بنایا گیا تھا، وہ آخر کار سبز باغ ثابت ہوئے اور یہ پہلا ظلم تھا جو عوام کے ساتھ کیا گیا۔ اس کے بعد سے آج تک یہاں صرف ظلم ہوا ہے اور جب بھی کسی نے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کی ہے، اسے سرچشمۂ اقتدار پر قابض مہربانوں نے پوری قوت سے کچل دیا ہے۔ ہماری تاریخ میں مارچ کا مہینہ جہاں خوف کے بھنور لے کر آیا، وہیں اس بھنور میں بے خوفی سے کشتی ڈال دینے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ ظلم کے خلاف اگر عوام کا سیلاب امنڈ آئے تو بھنور اس سیلاب میں بتاشوں کی طرح گھل جاتے ہیں۔ ۱۶/مارچ عوام کی فتح کا دن ہے، یہ وکیلوں کے بے مثال عزم کی کامیابی کا اور ظلم کی پسپائی کا دن ہے۔

آزاد عدلیہ کی وہ لڑائی جو دو برس تک لڑی گئی، وہ اس حد تک ضرور کامیاب ہوگئی ہے کہ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری اپنے منصب جلیلہ پر فائز ہوگئے ہیں لیکن ابھی تو بہت سے مرحلے باقی ہیں جس کے بعد ہی یہ کہا جاسکے گا کہ پاکستان میں آزاد عدلیہ قائم ہوگئی ہے۔ ایک آزاد عدلیہ ہی ظلم کے راستے میں دیوار بنتی ہے اور کمزوروں اور لاچاروں کو ظالموں کے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت دیتی ہے، جو ظالم اور مظلوم کے درمیان انصاف کرتی ہے۔ گزشتہ دو برسوں میں ایک آزاد عدلیہ کی راہ میں صرف کانٹے بوئے گئے۔ یہ کانٹے آمروں نے بوئے اور انہوں نے بھی جو جمہوریت کے دعویدار ہیں اور جن کی زباں اب یہ کہتے نہیں تھکتی کہ آزاد عدلیہ کی بحالی کے لیے ان سے زیادہ بے قرار بھلا اور کون ہوسکتا تھا۔

اس وقت عالم یہ ہے کہ کروڑوں لوگوں نے اپنی تمام توقعات بحال ہونے والے چیف جسٹس سے وابستہ کرلی ہیں۔ایسا کرتے ہوئے ہم ان کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لے رہے۔وہ یونانی دیو مالا کے ہرکولیس نہیں کہ انصاف کے دریا کا رخ موڑ کر اس ملک کے بالادست طبقات کے مظالم اور بدعنوانیوں کی غلاظت کو آن کی آن میں صاف کردیں۔انصاف کی طرف قدم بہ قدم بڑھنے کے لیے ہمیں بھی ان کی کوششوں میں اپنا حصہ ڈالنا ہوگا،سپریم کورٹ کو اپنے ہر مرض کی دوا سمجھنے کے بجائے ہمیں اسے ان اہم ترین مسائل سے نمٹنے دینا چاہیے جن پر اس ملک کی بقاءاور اس کے عوام کے سکھ چین کا انحصار ہے۔

ظلم کی بات کرتے ہوئے مجھے کرشن چندر کا ایک ناول 'الٹا درخت' یاد آیا۔کہنے کو یہ ناول انہوں نے بچوں کے لیے لکھا تھا لیکن ریوتی سرن شرما نے کیا خوب کہا ہے کہ کرشن کے بالغ سیاسی اور سماجی شعور کے لمس سے یہ سارا قصہ ایک طنزیہ تمثیل بن گیا ہے اور اس کا ہر واقعہ اپنے اندر ایک گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔بارہ برس کا یوسف یتیم ہوجاتا ہے تو ماں کہتی ہے کہ تم بادشاہ کی فوج میں ملازم ہوجاؤ۔بیٹا انکار کرتا ہے اور اس کا انکار بادشاہ کے کانوں تک پہنچ جاتا ہے۔'کیونکہ جو بادشاہ ظلم کرتا ہے اس نے ملک میں مخبروں کا جال بھی بچھا رکھا ہوتا ہے'۔کہانی کی ابتداء میں ہی یوسف اور بادشاہ کا مکالمہ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ یہ سادہ سی کہانی کیسے پر پرزے نکالنے والی ہے۔بادشاہ ہکلا ہے اور جب یوسف پوچھتا ہے کہ کیا سارے بادشاہ ہکلے ہوتے ہیں تو بادشاہ کو غصہ آجاتا ہے اور وہ یوسف کو ڈانٹ کر بتاتا ہے کہ اسے ہکلاہٹ کی نہیں،ظلم کرنے کی بیماری ہے۔وہ یوسف کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی فوج میں شامل ہوجائے لیکن یوسف کو جب معلوم ہوتا ہے کہ اسے تنخواہ نہیں ملے گی بلکہ دوسرے ملکوں پر حملہ کرکے لوٹ مار کرنی ہوگی اور یہی اس کی آمدنی کا ذریعہ ہوگا تو وہ دوسرے ملکوں پر حملہ کرنے،انسانوں کو قتل کرنے اور مال غنیمت سمیٹنے سے انکار کردیتا ہے۔وہ فاقہ کرنے کے لیے تیار ہے لیکن فوج میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ اس طرح اسے بھی ظلم کی بیماری ہوجائے گی۔بارہ برس کا یوسف ایک موچی کا بیٹا ہے لیکن اس کے انسانی شعور کی داد دیجئے جو ہمارے بڑے بڑے جرنیلوں میں نہیں پائی جاتی۔

یوسف کے بادشاہ کو ظلم کرنے کی بیماری ہے اسی لیے وہ اپنی رعایا کی ہر خوبصورت چیز پر قبضہ کرلیتا ہے،خواہ وہ کسی کا سرسبز باغ ہو،ہرا بھرا کھیت ہو یا ٹھنڈے پانی کا کنواں،ہر چیز فوجیوں کا

دستہ بھیج کر بہ حق سرکار ضبط کر لی جاتی ہے۔اس کہانی کا ہیرو بارہ برس کا یوسف ایک کنویں میں اترتا ہے تو اسے ایسی اونچی آوازیں سنائی دیتی ہیں جیسے ہزاروں، لاکھوں جلوس ایک ساتھ چل رہے ہوں، ایک آواز سرگوشی میں اسے بتاتی ہے کہ یہ تمام آوازیں ان آدمیوں، شاعروں، سیاست دانوں کی ہیں جن کو ہمارے بادشاہ نے یا تو قتل کرا دیا ہے یا جیل میں ڈال دیا ہے کیونکہ وہ اس کے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔لیکن قتل ہو جانے اور جیل میں ڈال دیے جانے کے بعد بھی ان شاعروں اور ادیبوں اور سیاست دانوں کی آواز نہیں رکی اور ملک میں گونجتی رہی۔اس لیے بادشاہ نے اب تمام آوازوں کو پکڑ لیا ہے۔اور اس گنبد میں بند کر دیا ہے۔اب اس کا خیال ہے کہ یہ آوازیں ہمیشہ کیلئے دبا دی گئی ہیں اور اس کو ان سے کوئی خطرہ نہیں۔

یہ ناول ایک آئینہ ہے جس میں ہمیں جادوگروں کا الیکشن نظر آتا ہے۔کوئی الہ دین کا چراغ لیے بیٹھا ہے۔کسی کے پاس سلیمانی ٹوپی ہے، جھوٹے وعدوں کا طومار ہے جو عوام کے سامنے اٹھایا جا رہا ہے۔ ہر صفحے پر ایسے کاری جملے ہیں کہ پڑھیے اور عش عش کیجئے کہ ان جملوں میں ہمارے اردگرد کی کیسی سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔

کہانی میں ایک مقام پر ایک کردار سوال کرتا ہے 'آخر اس شہر کی سرکار اندھیرے میں کیوں کام کرتی ہے؟'

'اس شہر میں ہی نہیں، بہت سی جگہوں کی سرکار اندھیرے میں کام کرتی ہے۔اور شہریوں کی آنکھوں سے اوجھل رہ کر بہت سی باتیں طے کر لیتی ہے۔'

ہم ناول کے اختتامی حصے تک پہنچتے ہیں تو ایک مینار نظر آتا ہے جس کا صدر دروازہ بند ہے اور یہ صرف ان لوگوں کے لیے کھلتا ہے جو یہ کہیں کہ 'ہم سرکار کے غلام ہیں' لیکن یوسف کے ساتھی تو سرکار کے غلام نہیں، تب انہیں بتایا جاتا ہے کہ جب تم اس دروازے کے پاس پہنچو تو خبردار اپنی پلکوں کو کسی حالت میں نہ جھپکانا۔بس چپ چاپ ٹکٹکی باندھے سوراخ کی طرف دیکھتے رہنا۔سرکار کے غلاموں کی نشانی یہ ہے کہ وہ کسی حالت میں پلکیں نہیں جھپکاتے چپ چاپ ہاتھ باندھے حکم کی تعمیل کے لیے کھڑے رہتے ہیں۔

وہ جب اس مرحلے سے بھی گزر آتے ہیں تو اس شہر کے بارے میں سوال کرتے ہیں جس میں سینکڑوں ایسے سانپ چھپے ہوئے تھے جن کے کاٹے کا منتر نہ تھا۔تب یوسف اور اس کے

ساتھیوں کی مدد کرنے والا سبز پوش بزرگ انہیں بتاتا ہے کہ وہ سانپ نہیں آدمی تھے اور آدمی کے بھیس میں لوگوں کے ساتھ رہتے تھے، ایسے آدمی سانپوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اور وقت اور موقع دیکھ کر لوگوں کو ڈستے ہیں۔ ان لوگوں کے دلوں میں زہر بھرا رہتا ہے اور ان کی آنکھوں میں پتلیوں کی بجائے چاندی کی ٹکیاں ہوتی ہیں۔ اگر تم ان آنکھوں میں غور سے دیکھو تو ان کو بخوبی پہچان سکو گے۔ یہی وہ ہیں جو انسانوں کو لوٹتے ہیں اور ان میں جنگیں کراتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں پتلیاں نہیں ہوتیں۔ چاندی کی گول گول ٹکیاں ہوتی ہیں۔

ان جملوں کو پڑھتے ہوئے نگاہوں کے سامنے اپنے کتنے معتبر چہرے آ جاتے ہیں جن کے دلوں میں زہر بھرا ہے اور جن کے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا ہے۔ ان کا ایک وار خالی جائے تو وہ دوسری طرف سے وار کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں دولت کی ہوس ہے، جنہیں ظلم کی بیماری ہے۔ کرشن چندر نے یہ ناول بچوں کے لیے لکھا تھا لیکن اس میں پاکستان کے بڑوں کے لیے کیسے سبق پنہاں ہیں۔

اور ہاں بارہ برس کے یتیم یوسف کو نہ بھولیے گا جو موچی کا بیٹا تھا، فاقوں سے دوچار تھا، لیکن اس بادشاہ کی فوج میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا جسے ظلم کی بیماری تھی اور جو ساتھ والے ملک پر حملہ کر کے وہاں لوٹ مار کرنا چاہتا تھا۔ یوسف بڑی کٹھنائیاں سہتا ہے لیکن ظلم کی بیماری میں مبتلا ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ ہم جو ہر وقت انصاف کی دہائی دیتے رہتے ہیں، ہم کبھی اپنے اندر وہ ہمت تو پیدا کریں کہ ظلم کی بیماری میں مبتلا لوگوں کے ساتھ نہ کھڑے ہوں، یہ متعدی بیماری ہے، ظالموں کے قبیلے کے ساتھ رہنے سہنے سے یہ ہمیں بھی لگ سکتی ہے۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی

۲۵ مارچ ۲۰۰۹ء

ایک راستے کی ۵۰ ویں سالگرہ

کل جب یہ خبر نظر سے گزری کہ ۱۹ رمئی ۲۰۰۹ء کو منگل کے دن ویتنام میں اس راستے کی پچاسویں سالگرہ کا جشن اپنے عروج کو پہنچے گا جو کبھی 'خونی راستہ' اور کبھی 'ہوچی منہ راستہ' کے نام سے یاد کیا گیا تو بہت سی باتیں یاد آئیں، وہ باتیں جو ہمارے ماضی کا اہم حصہ ہیں لیکن ہماری نئی نسل جن سے واقف نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری نسلیں خود اپنی تاریخ کی حقیقتوں سے آگاہ نہیں ایسے میں وہ بھلا ویتنام اور چین، جاپان کے معاملات سے کیا واقف ہوں گی۔

ویتنامیوں نے جنوری کی ابتدائی تاریخوں سے ہی اس راستے کی تعمیر کے آغاز کا جشن منانا شروع کر دیا تھا۔ جو ۱۹ رمئی کو اپنے عروج کو پہنچا کیونکہ یہی ملک کے بانی صدر اور رہنما ہوچی منہ کی پیدائش کی تاریخ بھی ہے۔ اس راستے کا دھوم دھام سے جشن منایا گیا، اور اس شخص کو دل و جان سے یاد کیا گیا جس کے حکم پر یہ راستہ بنایا گیا تھا اور جس کی بے مثال جدوجہد اور حکمت عملی نے ویتنام کو آزاد کرایا اور دنیا کی دو عظیم ترین طاقتوں میں سے ایک کو بدترین شکست سے دوچار کیا۔ یہ راستہ جو ۱۹۵۹ء میں تعمیر ہونا شروع ہوا تھا ہزاروں میل لمبا ہے۔ یہ جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں، ندیوں، بستیوں، لاؤس اور کمبوڈیا سے گزرتا ہے، اسی کے ذریعے امریکیوں سے لڑنے والے ویت کانگ کو نئے فوجی رضا کار، اسلحہ، گولہ بارود، خوراک اور ضرورت کا ہر سامان پہنچایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر یہ راستہ نہ ہوتا تو ویت نامی امریکیوں سے جنگ آزادی نہیں جیت سکتے تھے۔

اس جنگ کا مرکزی کردار ہوچی منہ تھے جو ایشیا میں 'چچا ہو' کے نام سے یاد کیے گئے۔ 'چچا' اپنا جیکٹ اور تھیلا نما پتلون کی بجائے اگر بنیان پہن لیتے اور تہمد باندھ لیتے تو یہی محسوس ہوتا کہ کوئی بنگالی یا بہاری مولوی صاحب ہیں جو ابھی ٹوپی پہن کر اذان دینے لگیں گے لیکن ان کا بنگال

یا بہار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ویتنامی تھے اور کیا شمال کیا جنوب ان کے سب ہی چاہنے والے انہیں 'چچا' کہتے تھے۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ 'چچا' اپنے ملک کے چہیتے صدر تھے اور انہوں نے دنیا کی عظیم طاقت امریکا کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ ٹائم میگزین کے مطابق 'چچا' نے قوم پرستی اور کمیونزم کا نکاح پڑھوایا اور دور حاضر میں گوریلا جنگ کو ایک بے مثال فن میں بدل دیا۔ ربر کی چپل اور بوسیدہ سی قمیص پہننے والے اس شخص کو دیکھ کر کون تصور کر سکتا تھا کہ یہ سادہ اور غیر اہم نظر آنے والا بوڑھا امریکا جیسی عظیم طاقت کو اس کی پہلی شکست سے دوچار کرے گا اور لاکھوں امریکیوں کے سوچنے کا زاویہ نظر بدل دے گا۔ ۶۰/اور ۷۰ء کی دہائی میں امریکی سرکار کو یاد نہیں رہا تھا کہ جب فرانسیسیوں اور ویتنام کے درمیان جنگ سر پر تلی ہوئی تھی تو ۱۹۴۶ء میں اس شخص نے فرانسیسیوں سے بہت متانت سے کہا تھا کہ 'تم اپنے ایک فرانسیسی کے بدلے میں اگر میرے دس ویتنامی مارو گے تب بھی آخر کار جیت میری ہوگی۔'

فرانسیسیوں نے اس غریب دیہاتی شخص کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا تھا لیکن آخر کار پسپائی انہی کی ہوئی تھی، اسی طرح بڑبولے امریکیوں کی سمجھ میں بھی یہ شخص نہیں آیا تھا لیکن جب ان کی سمجھ میں یہ شخص اور اس کی قوم آئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس شخص کی قوم نے اپنے تیس لاکھ لوگ قربان کر دیئے جبکہ ۵۸ ہزار امریکی فوجی اور افسر مارے گئے جن کی یادگار واشنگٹن کی وہ دیوار ہے جس کے لیے سبز پتھر ہندوستان سے آیا، جس پر ویتنام جنگ میں ہلاک اور لاپتہ ہو جانے والے تمام امریکیوں کے نام کندہ ہیں۔ ایک سہ پہر میں نے درجنوں بوڑھے ماں باپ کو، بیواؤں اور ان کے بچوں کو دیوار پر کھدے ہوئے اپنے اپنے پیاروں کے نام پر انگلی رکھ کر روتے دیکھا ہے۔ تب ہی اسے امریکیوں کی دیوار گریہ کہا جاتا ہے۔ افسوس کہ امریکی سبق بہت جلد بھول جاتے ہیں، نہ بھولتے تو عراق اور افغانستان میں ایک بار پھر وار تھیٹر سجا کر نہ بیٹھ جاتے۔

ٹائم میگزین کے سرورق پر تصویر کا شائع ہونا بڑی بات ہوتی ہے۔ ہو چی منہ کی تصویر ۵۴ء اور ۶۵/اور امریکی شکست کے بعد ۱۹۷۵ء میں سرورق کی زینت بنی۔ وہ شخص جو اپنے ملک کی آزادی کیلئے کبھی قلی، کبھی کیک بنانے والے نانبائی اور کبھی حجام کا بھیس بدلتا رہا۔ لندن، نیویارک، پیرس، رنگون، کلکتہ اور بنکاک کی گلیوں میں پھرتا رہا، اس کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا۔ وطن کی آزادی۔ اس نے اپنے وطن کو آزاد ہوتے ہوئے نہیں دیکھا اور امریکیوں کی مکمل شکست سے

چھ برس پہلے وہ اس دنیا سے گذر گیا۔

فتح کے دن سائیگاؤں میں داخل ہونے والے بہت سے ٹینک ایسے تھے جن پر یہ بینر لگے ہوئے تھے کہ 'چچا ہو تم ہمیشہ ہمارے ساتھ چلتے رہے ہو۔' ۳۰ مئی ۱۹۷۵ء کو جب شمالی ویتنام کی فوجیں سائیگاؤں میں داخل ہوئیں اور امریکی فوجیوں اور سی آئی اے کے اہلکاروں کا انخلاء شروع ہوا تو جو تصویر پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بنی وہ اس ہیلی کاپٹر کی تھی جو امریکی سفارتخانے کی چھت پر ہوا میں معلق تھا اور امریکی افسران اس سے لٹکتی ہوئی سیڑھی پر چڑھ رہے تھے۔ یہ تصویر ایک ڈچ فوٹو گرافر نے کسی قریبی عمارت سے اتاری تھی جس نے اسے ساری دنیا میں شہرت دلا دی تھی۔ اس ڈچ فوٹو گرافر کی موت ابھی چند دنوں پہلے ہوئی ہے۔

مئی کے مہینے کی جنگ ویتنام کی تاریخ میں بے حد اہمیت ہے۔ یہ مئی ۱۹۶۹ء تھا جب امریکی اخبار 'نیویارک ٹائمز' نے کمبوڈیا پر امریکا کی خفیہ بمباری کی خبر دنیا پر آشکار کی۔ اسی کے بعد امریکی صدر نکسن نے ایف بی آئی کو ۴ر امریکی صحافیوں اور ۱۳ر سرکاری عہدیداروں کے فون خفیہ طور پر ٹیپ کرنے کا حکم دیا۔ امریکی اخبارات اور صحافیوں نے اس نوعیت کے اقدامات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۷۱ء میں 'نیویارک ٹائمز' 'واشنگٹن پوسٹ' اور 'ٹائمز' نے جنگ ویتنام سے متعلق وزارت دفاع کے خفیہ کاغذات شائع کرنے شروع کیے، جس پر صدر نکسن اور ان اخبارات کے درمیان قانونی جنگ شروع ہوگئی۔ بات وہاں تک پہنچی کہ امریکی اخبارات کی سنسر شپ کے خلاف جنگ صدر نکسن کے زوال اور ذلت کا سبب بنی۔ امریکی اخبارات نے جنگ ویتنام کے بارے میں حقائق شائع کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس نے امریکی رائے عامہ کو اس حد تک متاثر کیا کہ واشنگٹن، نیویارک اور دوسرے شہروں میں شہریوں، طلبہ اور جنگ سے لوٹ کر آنے والے امریکی فوجیوں کے مظاہرے شروع ہو گئے جن میں پہلے ہزاروں اور بعد میں لاکھوں افراد شریک ہونے لگے۔ ۳ سے ۵ مئی ۱۹۷۱ء تک امریکی نوجوانوں نے اتنے بڑے مظاہرے کیے کہ صرف واشنگٹن میں ۱۲۰۰۰ر نوجوان گرفتار کیے گئے تھے۔

ویتنام کی جنگ نے تمام دنیا بہ طور خاص یورپ اور امریکا کے باضمیر دانشوروں، ادیبوں اور طلبہ کو بہت مضطرب کیا اور اس اضطراب کا سب سے اہم اظہار جنگی جرائم کی وہ فرد جرم تھی جو رسل اور سارتر نے امریکا پر عائد کی۔ یہ ٹربیونل جو رسل انٹرنیشنل وار کرائمز ٹربیونل اور رسل سارتر ٹربیونل

کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، اسے رسل نے قائم کیا تھا اور اس کی میزبانی مشہور فرانسیسی ادیب اور فلسفی ژاں پال سارتر نے کی تھی۔ یہ ٹریبونل نومبر ۱۹۶۶ء میں بنا جس میں دنیا بھر کے ۱۸ ملکوں کی نمائندگی ہوئی جن کے ۲۵ افراد نے اس کی کارروائیوں میں حصہ لیا۔ یہ اپنے اپنے ملکوں کے اہم دانشور، ادیب اور قانون دان تھے۔ یہ کارروائیاں اسٹاک ہالم اور کوپن ہیگن میں ہوئیں اور اس کے لیے مختلف افراد اور اداروں نے عطیات دیئے۔ مسلمان ملکوں سے ترکی کے قانون دان، رکن پارلیمنٹ اور ٹرکش ورکرز پارٹی کے محمد علی ایبار اور پاکستان کے محمود علی قصوری شامل تھے۔

ویتنام کے حوالے سے اتنی باتیں، اتنی یادیں ہیں کہ جن کا اس مختصر سی تحریر میں ذکر ممکن نہیں۔ مائی لائی کا قتل عام ہے، رسل اور سارتر کی شائع کردہ 'امریکی جنگی جرائم' کی رپورٹ ہے۔ امریکی فوجیوں اور جاسوسوں کی ہیلی کاپٹر میں فرار کی تصویریں ہیں اور ان تصویروں کی اشاعت کے ٹھیک ۲۰ برس بعد اس وقت کے وزیر دفاع رابرٹ میکنمارا کی وہ کتاب ہے جس میں میکنمارا نے اپنی اور اپنی حکومت کی غلطیوں کا اعتراف کیا تھا۔ کاش جارج ڈبلیو بش نے ۱۹۹۵ء میں چھپنے والی یہ کتاب پڑھی ہوتی تو وہ ان جرائم کا دوبارہ ارتکاب نہ کرتے جن کے سبب امریکا بدترین اخلاقی بحران کا شکار ہوا، معاشی بدحالی کی دلدل میں دھنسا اور ہم افغانستان، عراق اور اب پاکستان میں ان امریکی جرائم کی فصل انتہا پسندی، دہشت گردی اور اپنے نہتے اور بے گناہ عوام کی بربادی کی شکل میں کاٹ رہے ہیں۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی
۲۰ مئی ۲۰۰۹ء

خون کی پیاس

۲۰ راگست کولندن میں ایک ایسی نمائش کا آغاز ہوا جو ایک برس جاری رہے گی اور اسے ۱۹۳۹ء Outbreak کا نام دیا گیا ہے۔لندن کے امپیریل وار میوزیم میں شروع ہونے والی یہ نمائش دوسری جنگ عظیم کے آغاز کی ۷۰ ویں سالگرہ کے موقع پر شروع ہوئی ہے۔افسوس کہ اس نمائش کو ہمارے وہ جنگجو اور جنگ پسند نہیں دیکھ سکیں گے جو دنیا کے ہر مسئلے کا حل جنگ وجدال اور قتال میں ڈھونڈتے ہیں۔ ۱۹۷۹ء سے ہمارے خطے میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی جنہوں نے اپنے مخالفین سے نجات پانے کا واحد راستہ اس بات میں ڈھونڈا کہ مختلف زاویہ نظر رکھنے والے ہر شخص کا سرا تار لیا جائے۔آج اگر امریکی جوائنٹ چیفس آف اسٹاف ایڈمرل مائیک ملن اور سینیٹر مون میک کین، سی این این، این بی سی اور اے بی سی چینل پر یہ بیانات دے رہے ہیں کہ افغانستان میں صورتحال بد سے بدترین ہورہی ہے اور طالبان طاقت پکڑ رہے ہیں تو یہ دراصل امریکا کی طرف سے اعتراف شکست ہے۔زمینی حقائق یہی بتاتے ہیں کہ امریکا ایک پریشان کن صورتحال سے دوچار ہے۔کاش اس مرحلے پر امریکی حکمران ماضی کے ان دنوں کو یاد کریں جب وائٹ ہاؤس نے افغانستان میں روسی افواج کے داخلے کو بہانہ بنا کر دنیا بھر کے 'مجاہدین' کی پرورش کیلئے اپنے خزانوں اور اپنے اسلحہ خانوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ پاکستان میں ایک جرنیل کی غاصب حکومت کے سر پر دست شفقت رکھا تھا اور یوں افغانستان، پاکستان اور خطے میں ایک عفریت کی پرورش شروع کی تھی۔امریکی حکمرانوں نے اپنے خیال میں ویت نام کی شرمناک پسپائی کے انتقام کا حساب کمیونسٹ بلاک سے افغانستان کے طول وعرض میں چکانے کا اہتمام کیا تھا۔یہ درست کہ سوویت یونین تحلیل ہوا، یہ بھی درست کہ مشرقی یورپ میں

کمیونسٹ بلاک منہدم ہوا، یہ بھی درست کہ اس زمانے میں امریکی حکمران اپنی اس 'فتح' پر پھولے نہیں سماتے تھے اور یہ اعلان ہوا کہ دنیا 'یک قطبی' ہوگئی ہے۔ آج دنیا میں تیزی سے پھیلتی ہوئی انتہا پسندی اور دہشت گردی درحقیقت امریکی حکمرانوں کی اسی کوتاہ اندیشی اور کم فہمی کا نتیجہ ہے جس کی سزا مسلم دنیا بھگت رہی ہے اور جس کا خاص نشانہ عراق، افغانستان، پاکستان اور اب یمن اور سوڈان ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے ۷۰ برس کی یاد منانے کے لیے لندن میں جس نمائش کا اہتمام کیا گیا ہے وہ پُرامن حالات میں زندگی بسر کرنے والے انگریزوں کی نئی نسل کے لیے حیرت کا سبب بنے گی اور وہ پچھلی نسل جس نے اس جنگ کے عذاب بھگتے جس کے کانوں نے ہر رات نازی جرمنی کے بمبار طیاروں کی آمد کا اعلان کرنے والے سائرن سنے، زیر زمین پناہ گاہوں میں راتیں گزاریں اور بمباری سے تباہ ہونے والے لندن میں زندگی بسر کی اور پنے عزیز رشتوں کی لاشیں اٹھائیں، اس نسل کے لیے یہ نمائش المناک یادوں کے دریچے وا کرے گی۔

پہلی جنگ عظیم کی طرح دوسری جنگ عظیم نے بھی غیر منقسم ہندوستان کے سماج پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی، یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی عوام غیروں کی غلامی، بے روزگاری اور غربت کی چکی میں پس رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب برطانوی راج نے اپنی سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے اپنی سب سے بڑی نوآبادی میں فوجی بھرتی شروع کی تو ہندوستان کے ہزاروں گھرانوں نے روزی کی آس میں اپنے بیٹوں کو فوجی بھرتی کے دفتر کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا اور پھر جانے والوں کی تنخواہوں کے منی آرڈر کی راہ دیکھتے رہے۔ جنگ نے جب طول کھینچا تو بوڑھے باپ ان کے خطوں کا انتظار کرنے لگے اور اپنے اس فیصلے پر کفِ افسوس ملنے لگے کہ انہوں نے چند روپوں کے عوض اپنے گھرانے کی خوشیاں برطانوی راج کے وار آفس میں کیوں گروی رکھ دی تھیں۔

اس جنگ کی ہولناکی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں دنیا کی متعدد قوموں کے سپاہیوں نے حصہ لیا اور جنگ میں لڑنے والے فوجیوں کی تعداد ۱۰ کروڑ تھی۔ دنیا کے ۷ کروڑ سے زیادہ لوگ اس کا نوالہ بنے۔ جن میں ۵ کروڑ بچے، بوڑھے، عورتیں یعنی عام شہری تھے۔ جبکہ لگ بھگ ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ فوجی ہلاک ہوئے۔ ان میں وہ ۵ لاکھ فوجی بھی شامل ہیں جو مختلف

محاذوں پر پسپائی کے دوران جنگی قیدی بنے، کنسنٹریشن کیمپوں میں رکھے گئے اور وہاں کی صعوبتوں، ذلتوں، ناکافی غذا اور طبی سہولتوں کے نہ ہونے کے سبب ہلاک ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ ملک جہاں سب سے زیادہ فوجی اور شہری ہلاکتیں ہوئیں، ان میں سوویت یونین میں ہلاک ہونے والوں کی کل تعداد ۲ کروڑ ۵۵ لاکھ ۶۸ ہزار (فوجی ۸۶ لاکھ ۶۸ ہزار، شہری ایک کروڑ ۶۹ لاکھ)، چین میں ہلاک شدگان کی کل تعداد ایک کروڑ ۳۲ لاکھ ۲۴ ہزار (فوجی ہلاکتیں ۱۳/لاکھ ۲۴ ہزار جبکہ شہری ہلاکتیں ایک کروڑ)، جرمنی میں کل ہلاک شدگان کی تعداد ۷۰ لاکھ ۶۰ ہزار (فوجی ہلاکتیں ۳۲ لاکھ ۵۰ ہزار، شہری ہلاکتیں ۳۸ لاکھ ۱۰/ہزار)، جاپان میں کل ہلاک شدگان کی تعداد ۱۸/لاکھ ۶ ہزار (فوجی ہلاکتیں ۱۵/لاکھ ۶ ہزار، شہری ہلاکتیں ۳ لاکھ) کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

یہ دوسری جنگ عظیم تھی جس کے آخری ۱۰۰/دنوں کے درمیان ۱۲/اپریل ۱۹۴۵ء کو امریکی صدر روزویلٹ پر فالج کا جان لیوا حملہ ہوا اور وہ چشم زدن میں ختم ہوئے۔ نائب امریکی صدر ہیری ٹرومین نے صدارت کا حلف اٹھایا اور یہ ہیری ٹرومین تھے جنہوں نے ہارے ہوئے جاپان کے دو شہروں کی شہری آبادی پر ایٹم بم گرانے کا سفاکانہ تجربہ کیا اور یوں دنیا اپنے وجود میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ ایٹمی تباہ کاری کی زد میں آئی۔

غیر منقسم ہندوستان پر دوسری جنگ عظیم کے مہیب اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں مارے جانے والے ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد ۸۷ ہزار تھی۔ معذور ہوکر گھر واپس آنے والے اس کے علاوہ تھے۔ اس جنگ کے خلاف ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے آواز بلند کی لیکن اردو والے اس احتجاج میں پیش پیش تھے۔ ان دنوں جن لوگوں نے کھل کر برطانوی راج اور دوسری جنگ عظیم کے خلاف قلم اٹھایا ان میں جوش ملیح آبادی، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی سب سے آگے تھے۔ آج بھی جنگ کی مخالفت کی جاتی ہے تو علی سردار جعفری کا یہ بند بے اختیار یاد آتا ہے کہ:

پھر چلا جنگ کا دیوتا
سرخ شعلوں کے خنجر کو تانے ہوئے

خون کی پیاس سے
گوشت کی بھوک سے
چیختا اور چنگھاڑتا
آسمانوں پر عفریت کی طرح اڑتا ہوا
موت کی طرح دھرتی پر چلتا ہوا
فصلیں سہمی ہوئی
کھیت گھبرائے گھبرائے سے
جو فضائیں نئی کونپلوں کی مہک سے معطر تھیں وہ
گندی بارود کی بو سے سرشار ہیں
خون کے چھینٹے ہیں شبنم کے پیراہنوں پر
مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں کے دامنوں پر

سردار جعفری کی طرح نثر میں احمد ندیم قاسمی کے کئی افسانے خاص طور سے 'مامتا' اور 'ہیرو شیما سے ہیرو شیما تک' جنگ دشمن تحریروں میں یادگار رہیں گے۔ قاسمی صاحب کا انسانی نقطہ نظر ان دونوں افسانوں میں اوج کمال پر ہے۔ 'مامتا' کی ہیروئن دنیا کی وہ تمام بے بس اور لاچار مائیں ہیں جن کے بیٹے فاقوں سے گھبرا کر لام پر چلے گئے ہیں اور 'ہیرو شیما سے ہیرو شیما تک' میں وہ باپ ہے جو اپنے بیٹے کو بہ اصرار جنگ پر بھیج چکا ہے اور اپنی نئی نویلی بہو سے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز سے کہتا ہے کہ: 'دعا کر بیٹی۔ دلیر کی زندگی کے لیے دعائیں مانگ اور مجھ پر لعنتیں بھیج کہ میں نے قرض اتارنے کی لالچ میں اپنے اکلوتے لال کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ یہ نہ سوچا کہ میں اجڑ جاؤں گا۔ یہ نہ سوچا کہ شاداں میری اچھی بیٹی کا سہاگ ابھی نیا نویلا ہے۔'

قاسمی صاحب کے اس افسانے کا ایک کردار دادا شہباز ہے جو پہلی جنگ عظیم سے زندہ بچ آیا تھا اور جس نے 'دشمن' کے بہت سے سپاہی قتل کیے تھے اور ان انسانی جانوں کے عوض ۷ روپے پنشن پاتا تھا۔ وہ ایک روز بلک کر کہتا ہے 'میں نے ان تمام خونوں کے بدلے سات روپے پنشن پائی۔ یہ سات ٹھیکریاں، یہ سات لعنتیں' یہی دادا شہباز اپنی عذاب ناک یادوں کو دہراتے ہوئے کہتا ہے۔ 'میں نے ایک روز ایک لاش دیکھی، جرمن سپاہی تھا۔ اتنا خوبصورت تھا کہ مورت

چھاپ لینے کو جی چاہے۔ میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں تو اندر سے سنہری بالوں کا ایک گچھا نکلا۔ اور کسی پھول کی چند سوکھی پتیاں اور ایک مڑی تڑی تصویر لڑکی کی۔ جس کی آنکھیں اتنی گہری تھیں کہ جہان ڈوب جائے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ توپوں کی دھائیں، اور دھوئیں اور دھول کی اس دنیا میں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔' قاسمی صاحب نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے حوالے سے ایک دو نہیں کئی کہانیاں لکھیں۔ ان جنگوں سے بچ کر آنے والے ان کے کئی کردار یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ 'میں دنیا کا سب سے بڑا گنہگار ہوں'

کچھ دنوں سے ہمارے یہاں جدال و قتال کا جو سلسلہ جاری ہے اور جسے دنیا کے ہر کونے تک پھیلانے کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ اس کے سپاہیوں کے ذہنوں میں عام انسانوں کو ذبح کرتے ہوئے، کسی گواہی اور شہادت کے بغیر اپنے ہی ساتھیوں کو غداری کے شبہے میں بے دریغ گولیوں سے اڑاتے ہوئے، بچوں کو اغوا کر کے انہیں خود کش بمبار بناتے ہوئے، ان کے اندر کیا کبھی بھی پشیمانی کا کوئی لمحہ آتا ہے؟۔ یا جنگ ان کے لیے آخری لمحے تک روپہلے اور سنہرے غبار میں لپٹی ہوئی ایک وجد آفریں کیفیت ہوتی ہے۔؟ ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ ذبح کرنے والے دل نہیں جیت سکتے۔ محبت فاتحِ عالم ہے اور اس کا راستہ امن، سلامتی، تحفظ اور خوش حالی کی شاہراہ سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ سوال بہر حال اپنی جگہ موجود ہے کہ انسان کے اندر موجود خون کی پیاس ختم کیوں نہیں ہو رہی؟

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی
۲۶ راگست ۲۰۰۹ء

خوفو کا ہرم اور ابوالہول ہنستے ہیں

دریائے نیل اور قاہرہ کی قربت میں ۴۶۰۰ برس سے زیادہ کی عمر والے خوفو کے ہرم اور ابوالہول کے سامنے سے قبطی، ایرانی، یونانی، رومی، بت پرست، یہودی، عیسائی، مسلمان اور مسلمانوں میں اموی، عباسی، فاطمی، ایوبی، مملوک، عثمانی اور پھر فرانسیسی، برطانوی، جرمن، امریکی، آسٹریلوی، اطالوی سب ہی گذر چکے۔ خدائی کے دعویدار فراعنہ، تمام دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے نکلنے والا سکندر اعظم، جولیس سیزر، مارک اینٹنی، ہرم میں سرنگ بنوانے والا مامون الرشید، مسجد سلطان حسن پر گولہ باری کرانے والا نپولین بونا پارٹ، سلطنت کو شراب کے پیالے میں غرق کرنے والا شاہ فاروق، سب ہی گذر گئے اور جو آئیں گے وہ بھی گذر جائیں گے۔

جون کی اس گرم دوپہر خوفو کے ہرم اور ابوالہول نے سینکڑوں فٹ کی بلندی سے اس شخص کو دیکھنے کی کوشش کی جس کا اپنا قد چھ فٹ سے کچھ ہی زیادہ تھا انہیں اس نوجوان پر رحم آیا جس نے طوطنخ آمن کی شبیہہ دیکھ کر اعتراف کیا تھا کہ اس کی شکل اور رنگت ہزاروں برس پہلے گذر جانے والے اس دانش جُو فرعون سے ملتی جلتی ہے۔

۴۶۰۰ برس سے زیادہ کی عمر رکھنے والوں کو اس نوجوان پر ترس آیا جس کی کمر پر نائین الیون کا، ابوغریب اور گوانتاناموبے اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے سی آئی اے کے عقوبت خانوں کا ،افغانستان عراق اور پاکستان کے مقتولین، مجروحین اور لاکھوں پناہ گزینوں کی نفرت کا پشتارہ تھا۔ اس کے لباس پر بیسیویں اور اکیسیویں صدی کے بے گناہوں کے خون کے چھینٹے تھے جو اس سے پہلے گزرنے والے امریکی حکمرانوں کی ہوس ملک گیری کا شکار ہوئے، یہ بدھ، شنٹو اور تاؤ مت کے ماننے والے تھے، یہودی، عیسائی اور مسلمان تھے اور اس کے گھٹنے گناہوں کی اس دلدل

میں دھنسے ہوئے تھے جن کا ارتکاب فلپائین، جاپان، کوریا، ویتنام، نکاراگوا، فلسطین، عراق، افغانستان اور پاکستان میں کیا گیا تھا، کیا جارہا تھا۔

ہزاروں برس سے انسانی تماشا دیکھنے والے خوفو کے ہرم اور ابوالہول نے اسے دیکھا جو بڑے اعتماد سے ان کی سرزمین پر اترا تھا اور وہاں کی ایک دانش گاہ میں حکمران اشرافیہ، دانشوروں، استادوں، صحافیوں اور ادیبوں سے خطاب کیا تھا جن میں سے بیشتر ریڑھ کی ہڈی سے محروم تھے، جن کے چہروں پر آمریت کی تابعداری کا غازہ تھا اور جنہیں شرکت کے دعوت نامے 'مخبرت' کے افسران نے نہایت چھان بین کے بعد جاری کیے تھے۔

قاہرہ جیسا قدیم شہر، نجیب محفوظ، طٰہٰ حسین اور مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کا بے باک اور گستاخ قاہرہ اس روز فرماں برداری کی تصویر تھا۔ ہر طرف 'مخبرت' کا راج تھا۔ 'مخبرت' جو فراعنہ کے زمانوں سے آج اکیسویں صدی تک مصر پر راج کرتی ہے جبکہ غریب مصری انصاف اور امن کے دو گھونٹ کے لیے ترستے ہیں۔ اس شہر کی اشرافیہ کے سامنے صدر امریکا نے جمہوریت کا ذکر کیا، اس جمہوریت کا جو حسنی مبارک کے دور میں لوگوں پر حرام ہے۔

صدر امریکا مسلمانوں کا دل جیتنے کے لیے قاہرہ گئے تھے، اُن کی تقریر دنیا کے تمام مسلمان ملکوں میں براہِ راست نشر ہو رہی تھی، لوگ ان کے لبوں سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہے تھے ان کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ رہے تھے اور مصر کی اشرافیہ کی تالیوں کی گونج سن رہے تھے جو ہر مناسب جملے اور موزوں موقعے پر ان کی ہتھیلیوں سے آبشار کی طرح پھوٹتی تھی۔

اس روز صدر امریکا نے دنیا کو یہ بتایا کہ ان کے ملک کے بانیوں میں سے تھامس جیفرسن کی ذاتی لائبریری میں قرآن کا نسخہ موجود تھا۔ انہوں نے یہ بتایا کہ امریکا میں اس وقت ۱۲۰۰ سے زیادہ مسجدیں ہیں اور یہ بھی بتایا کہ ان کے ملک میں ۷۰ لاکھ سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں۔ وہ سرکاری ملازمتوں میں ہیں، تجارت کرتے ہیں، فوج میں امریکیوں کے شانہ بشانہ لڑتے ہیں، امریکا کی سب سے بلند عمارت ایک مسلمان کے تخیل اور تعمیراتی مہارت کا شاہکار ہے، وہ اولمپک مشعل روشن کرنے کے ساتھ ہی کھیلوں میں اپنے اختیار کردہ ملک کا نام روشن کرتے ہیں۔ شہری آزادیوں کے لیے کام کرتے اور یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں اور ان کی مذہبی آزادی پر کوئی

آنچ نہیں آتی۔ یہ ایک اچھی بات ہے کہ قاہرہ یونیورسٹی میں صدر امریکا کو ایک مسلمان ملک مراکش کا وہ احسان یاد آیا جو اس نے ۱۷۷٦ء میں نو آزاد ریاست ہائے متحدہ کو تسلیم کر کے کیا تھا اور طرابلس میں ایک معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے امریکی صدر جون ایڈمز نے لکھا تھا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کو مسلمانوں کے مذہب، قوانین اور طرزِ زندگی سے کسی قسم کی دشمنی نہیں۔

انہوں نے اپنی تقریر میں قرآن کی آیتوں کے ساتھ یہودیوں کی توریت اور عیسایوں کی بائبل کا حوالہ بھی دیا اور ان تینوں ابراہیمی مذاہب کی روایات کو امن کے حوالے سے اجاگر کیا۔ جو ہری طاقت کے پُرامن استعمال کے ایرانی حق کو تسلیم کیا، انہوں نے یہ بات بھی بہ اصرار کہی کہ کوئی بھی نظامِ حکومت نہ کسی ملک اور اس کے لوگوں پر مسلط کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے مسلط کیا جانا چاہیے ۔ان کے اس جملے نے مسلمان عوام کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ شاید دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمان آمروں، بادشاہ اور مطلق العنان حکمرانوں کی پشت پر تھپکی دے رہے ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے ملک کا نظم و نسق چلائیں، ان سے اس بات پر اصرار نہیں کیا جائے گا کہ وہ جمہوری طرزِ حکومت کو اپنے عوام پر 'مسلط' کریں۔ان کے جملے کا یہ مخفی مفہوم مسلمان عوام کو ناگوار گذرا، وہ طویل مدت سے اپنے آمروں اور بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں سے نجات چاہتے ہیں لیکن صدرِ امریکا کی مجبوری تھی کہ وہ قاہرہ میں کھڑے تھے۔ایک آمر و جابر اگر آپ کا میزبان ہو ،اگر اس نے اپنے ملک کو آپ کا طفیلی بنا رکھا ہو تو اس سے زیادہ بد مذاقی کیا ہوگی کہ آپ وہاں کھڑے ہو کر جمہوریت کا ذکر کریں۔

اس تقریر میں فلسطینیوں کے لیے بہت کم تھا، اس کے باوجود اسرائیلی حکومت اور وہاں کے انتہا پسندوں کو 'صدمہ' پہنچا جس کا ان لوگوں نے فوری اظہار کیا۔صدر امریکا نے کہا کہ 'اس قضیے کا واحد حل دونوں کے لیے دو علیحدہ مملکتوں کا قیام ہے جہاں وہ امن چین کے ساتھ رہ سکیں۔ یہ اسرائیل، فلسطین، امریکا اور ساری دنیا کے حق میں بہتر ہوگا۔ میں ذاتی طور پر اس معاملے کو صبر و تحمل سے آگے بڑھاؤں گا۔'

فلسطینیوں اور ان کے ہمدردوں کو گہری تاریکی میں یہ جملہ روشنی کی ایک کرن محسوس ہوا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مغربی کنارے پر اسرائیلی قبضے کا خاتمہ، علاقے کو تقسیم کرتی ہوئی دیوار کا انہدام اور فلسطینیوں کی نئے سرے سے آبادکاری کیسے ممکن ہو سکے گی؟ انتہا پسند یہودی صدر امریکا سے

بہت ناراض ہیں لیکن اسرائیل کی لیبر پارٹی کی رکن یولی تامیر نے اس تقریر کی جی کھول کر تعریف کی اور کہا کہ 'یہ اہم ترین تقریر ہے جو کبھی کی گئی، یہ مشرق وسطیٰ کے ماحول کو بدل سکتی ہے۔ اسرائیل نے اگر اس کے نکات کو نظر انداز کیا تو اس سے بڑی غلطی نہیں ہوگی۔'

تجزیہ کاروں کے لئے یہ بات حیران کن تھی کہ بعض انتہا پسند اسلامی تنظیموں نے اس تقریر کا خیر مقدم کیا اور ہیلری کلنٹن اور صدر امریکا نے مسجد سلطان حسن میں جس احترام کا مظاہرہ کیا اس نے انہیں متاثر کیا جبکہ کچھ خیال تھا کہ بارک اوباما ایک دانا دشمن ہیں اور یہ ایک منافقانہ تقریر تھی۔ ان کی کہی ہوئی باتوں کے بارے میں مسلم دنیا کے اخبارات کی رائے بڑی حد تک مثبت تھی جبکہ برطانوی اور امریکی تجزیہ کاروں نے اسے 'ناکافی' قرار دیا اور اس پر کھل کر تنقید کی۔ پال کریگ رابرٹس نے کہا کہ معاملے کو اس تناظر میں دیکھنا چاہیے کہ مسلم انتہا پسندی، مغربی نوآبادیاتی تسلط کا شاخسانہ ہے۔ رابرٹ فسک کا کہنا تھا کہ امریکی صدر نے ایران پر نرمی سے سہی تنقید کی جبکہ اسرائیل کے ۲۶۴ جوہری بموں کا ذکر تک نہیں کیا۔ فلسطینیوں کو سرزنش کی کہ وہ اسرائیلی شہروں پر راکٹ نہ برسائیں لیکن اسرائیل نے غزہ پر وحشیانہ بمباری کا جو سلسلہ جاری رکھا ہے، اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ رابرٹ فسک نے لکھا کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کا تعلق ملبہ صاف کرنے والی کسی کمپنی سے ہے جو مسلم دنیا میں پہنچ کر سینکڑوں جھاڑ فانوسوں کا ٹوٹا ہوا مانوس کانچ اور بدن کی دھجیاں سمیٹ رہی ہو۔ اس تقریر میں سرسری ذکر افغانستان اور پاکستان کا بھی ہوا۔

خوفو کے ہرم اور ابوالہول کے کانوں تک یہ تبصرے تو نہیں پہنچے لیکن طوطخ آمن سے مشابہہ شخص کی تقریر کا یہ جملہ انہوں نے ضرور سنا کہ دہائیوں کی غلطیوں کو ایک تقریر سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے یہ جملہ سنا اور ہنسے۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان نے فراعنہ کے زمانے سے اب تک تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا تو پھر ۶۰۰۰ لفظوں پر مشتمل ایک تقریر کی کیا حیثیت ہے۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی

۱۰/جون ۲۰۰۹ء

جب بات ایٹمی جنگ تک پہنچی

چند دنوں پہلے ایک امریکی مورخ اوراہم صحافی برانچ ٹیلر کی لگ بھگ ۷۰۰ صفحوں پر مشتمل کتاب The Clinton Tapes شائع ہوئی ہے۔ ٹیلر کا نام ہمارے لیے ناموس ہے لیکن امریکا اور یورپ میں برانچ نامور ہے۔ ٹیلر کو اصل شہرت تین حصوں پر مشتمل اس کتاب سے ملی جو ۵۰ء کی دہائی میں شائع ہوئی اور جسے امریکی ادب اور تاریخ کا سب سے بڑا انعام پلٹزر پرائز دیا گیا۔ ستمبر کے آخری ہفتے میں جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو بہت سے لوگوں کے لیے یہ چشم کشا تھی۔ یہ کتاب سابق امریکی صدر بل کلنٹن کے ان خصوصی انٹرویوز پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنے آٹھ سالہ دور حکومت کے بارے میں برانچ کو دیئے ان کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا اور یہ ان ۷۹ آڈیو کیسٹس پر مشتمل ہے جس کا ایک سیٹ بل کلنٹن کے پاس بھی تھا اور وہ اسے اپنے موزوں کی دراز میں چھپا کر رکھتے تھے۔ وہائٹ ہاؤس چھوڑتے ہوئے موزوں کی یہ دراز انہوں نے اپنے ہاتھ سے خالی کی اور تمام کیسٹ اپنے ساتھ لے گئے۔ ٹیلر برانچ کی بل کلنٹن سے قربت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کلنٹن، ہیلری اور برانچ تینوں نوعمری سے گہرے دوست تھے اور ابتداء سے ہی ڈیموکریٹک پارٹی کے سرگرم کارکن تھے۔ یہ تینوں ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ساتھ رہتے تھے اور زندگی کے اچھے برے دنوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہے۔ برانچ کی

یہ کتاب یوں تو بہت سے رازوں کا خزانہ ہے لیکن ہمارے لیے اس کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ اس میں برصغیر کے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں اور مسائل بھی وہ جنہیں حل کرنے کے لیے دونوں ملکوں کے انتہا پسندوں کے خیال میں ایک ہی راستہ ہے۔ وہ راستہ جس پر ہم اگر چل پڑیں تو انجام مکمل تباہی کے سوا کچھ اور نہیں ہوگا۔

بل کلنٹن نے برانچ کو جو انٹرویو دیئے۔ ان میں ہمارے برصغیر کے حوالے سے یہ بات واضح طور پر بیان ہوئی ہے کہ پاکستان کے جنرل پرویز مشرف نے جو کارگل ایڈونچر کیا تھا اس کے نتیجے میں صرف یہی نہیں ہوا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے بلکہ بات ایٹمی جنگ تک جا پہنچی تھی۔ پاکستان جانتا تھا کہ روایتی جنگ میں ہندوستان کو شکست دینا ممکن نہیں، اس لیے اس نے اپنے سب سے مہلک ہتھیاروں کو سب سے پہلے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور ہندوستان پر ایٹمی حملے کی تیاریاں مکمل تھیں۔ بل کلنٹن نے کہا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے نہایت ذمہ دار افراد کے ان بیانات سے دہشت زدہ ہو گئے تھے جن میں ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی بات کی جا رہی تھی۔ کوئی بچہ اگر اپنی کاپی میں غلط جواب لکھ دے تو پنسل سے لکھے ہوئے اس جواب کو ربڑ سے مٹا کر درست کر سکتا ہے لیکن بات جب انسانوں اور شہروں کو نیست و نابود کرنے کی ہو تو کسی غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایٹمی ہتھیاروں سے اپنے حریف کے ان گنت شہروں کو نیوکلیائی راکھ کا ڈھیر بنا دینا اور اس راکھ پر اپنی فتح کا پرچم لہرانا، دیوانوں کا خواب تو ہو سکتا ہے، ذمہ دار اور عاقل و بالغ انسانوں سے یہ قدم اٹھانے کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

ان انٹرویوز کے دوران بل کلنٹن نے بتایا کہ ہندوستانی حکام نے انہیں آگاہ کیا کہ پاکستان نے اگر اپنے ایٹمی ہتھیار استعمال کیے تو ۳۰ سے ۵۰ کروڑ ہندوستانی ہلاک ہوں گے۔ جبکہ ہماری جوابی کارروائی کے نتیجے میں پاکستان کے ۱۲ کروڑ شہری بھاپ بن کر اڑ جائیں گے۔ دوسری جانب پاکستان کے ذمہ دار افراد کا اصرار تھا کہ ہمیں جغرافیائی اعتبار سے پہاڑوں کی قدرتی فصیل میسر ہے اس لیے ہمارے نسبتاً کم شہری ہلاک ہوں گے جبکہ ہندوستان یہاں سے وہاں تک ایک وسیع میدان کی طرح ہے چنانچہ ہم ان کے زیادہ لوگ ہلاک کر سکیں گے۔ بل کلنٹن کا کہنا تھا کہ یہ سب لوگ ایسی ناقابل یقین باتیں کرتے تھے جنہیں سن کر دہشت ہوتی تھی۔ کارگل جس کے بارے میں ہم پاکستانیوں کو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ذاتی تشہیر، خودنمائی اور مہم جوئی کے شوقین اس وقت کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل پرویز مشرف نے موسم سرما کے دوران اپنے لوگوں سے لائن آف کنٹرول پار کرائی جنہوں نے ان پختہ خندقوں (بنکرز) پر قبضہ کر لیا جو ہر سال برف باری شروع ہونے سے پہلے ہندوستانی فوجیں خالی کر دیتی تھیں اور جس کے بارے میں دونوں

طرف کے لوگ جانتے تھے لیکن دونوں طرف سے کبھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔

کارگل مہم جوئی جب نمٹ گئی تو ہندوستان میں کئی فوجی افسروں کا اس بناء پر کورٹ مارشل ہوا کہ انکا انٹیلی جنس نیٹ ورک اتنی بڑی فوجی نقل وحرکت سے ناواقف کیسے رہا۔ ہمارے یہاں اس وقت کے وزیراعظم میاں نواز شریف نے ایک تحقیقاتی کمیشن بنانے کا ارادہ کیا تو یہ مہم جوئی کرنے والا اس سے کہیں بڑی مہم جوئی کرگزرا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے وزیراعظم ہاؤس پر قبضہ کیا، منتخب وزیراعظم کو معزول کیا اور خود صدر بن بیٹھا۔ میاں صاحب پر ایک جعلی اور جھوٹا مقدمہ چلا اور انہیں سزا دلوائی گئی۔ پھانسی کا پھندا ذوالفقار علی بھٹو کی طرح میاں صاحب کے لیے بھی تیار تھا لیکن انہوں نے اپنے بااثر بین الاقوامی دوستوں کے سمجھانے پر حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے دنیا سے جانے کی بجائے ملک سے چلے جانے کو ترجیح دی۔ برانچ کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس کتاب میں بل کلنٹن میں یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ یہ میرے دورِ صدارت کا خطرناک ترین وقت تھا۔ اس وقت یہ عالم تھا کہ اگر کوئی مجھ سے یہ کہتا کہ میرے برصغیر جانے سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والی ممکنہ ایٹمی جنگ رک سکتی ہے تو میں لمحے بھر کی دیر نہ لگاتا، لپک کر طیارے میں بیٹھتا اور برصغیر چلا جاتا۔

ہم اگر اس زمانے کی خبروں اور تجزیوں کو ایک بار اپنے ذہن میں تازہ کریں تو ہمیں امریکا یا یورپ کے بااثر حلقوں سے اس بات کی کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ ہمیں 'غیر ذمہ دار' کیوں سمجھتے ہیں ۵۰ کروڑ، ۳۰ کروڑ یا بارہ، پندرہ کروڑ انسانوں کو چند منٹ کے اندر بھاپ بنا کر اڑا دینے کا دعویٰ کرتے ہوئے خوشی محسوس کرنا کسی ذہنی بیمار کا ہی کام ہوسکتا ہے۔

ان دنوں کیری لوگر بل میں عائد کردہ شرائط کے حوالے سے جو کہرام بپا ہے وہ یقیناً حبِ وطن کا تقاضا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ شرائط ہم پر کہیں اس لیے تو عائد نہیں کی جارہی ہیں کہ ہم دنیا میں اپنی ساکھ کھو چکے ہیں اور ہمارے حکمران اپنے غیر ذمہ دارانہ رویوں اور بیانات کی وجہ سے دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ (ر) جنرل پرویز مشرف اپنے بیان میں فخریہ کہتے ہیں کہ میں امریکا کو ڈبل کراس کررہا تھا۔ یہ بھی وہی تھے جنہوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے ٹیلی ویژن پر وہ 'اعترافی بیان' پڑھوایا جس میں ایٹمی پھیلاؤ کا 'اعتراف' کیا گیا تھا۔ انٹیلی جنس اداروں کے ہمارے سابق اعلیٰ اہلکاروں کے سنسنی خیز 'اعترافات' روزانہ ٹیلی ویژن

چینلوں اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ ہمارے آمروز رائے اعظم کو قتل کرنے، پھانسی دینے، جلاوطن کرنے اور آئین کو پامال کرنے کا بدترین ریکارڈ رکھتے ہیں۔ وہ ابتدائی دنوں سے اپنے عوام کو کچلتے رہے۔ وہ مشرقی بنگال جس کے ووٹوں کے بغیر پاکستان وجود میں نہیں آسکتا تھا اپنی اسی اکثریتی آبادی پر فوج کشی میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔ کبھی ایک جرنیل نے فاتح کارگل کہلانے کے شوق میں ہزاروں نوجوان جانوں کو ہلاکت سے دوچار کیا۔ ان کے خاندانوں کو بے آسراء کیا۔ وہ ملک جو قدرتی وسائل اور افرادی قوت کا خزانہ رکھتا ہے۔ اسی ملک کے شہری فاقوں سے مرتے ہیں۔ اپنے بچوں سمیت خودکشی کرتے ہیں، مائیں بھوک سے نڈھال بچوں کو بیچنے کے لیے سڑک پر بیٹھ جاتی ہیں۔ بدحالی کے ایسے المناک زمانے میں بھی ہمارے مقتدرین کی شاہ خرچیوں کے نظارے انہیں قرض اور امداد دینے والے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں......ایک ایسے ملک کو امداد تو پھر ایسی ہی شرطوں پر مل سکتی ہے۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی
۴/اکتوبر ۲۰۰۹ء

ضمیر کو جاگنے میں ۴۰ برس کیوں لگتے ہیں؟ ۔ ا

۱۹؍اگست ۲۰۰۹ء کی شام امریکی ریاست جارجیا کے ایک چھوٹے سے شہر میں ۶۶ برس کا ایک بوڑھا تقریر کرنے کھڑا ہوا تو کلب کے اراکین کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کس موضوع پر بات کرنے والا ہے۔ تقریر شروع ہوئی اور چند ابتدائی جملوں کے بعد ہی ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگوں کے سانس لینے کی آواز بھی مشکل سے آ رہی تھی۔ تقریر ختم ہوئی تو وہاں موجود ایک صحافی تیر کی طرح ہال سے باہر نکلا۔ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی 'خبر' ملی تھی اور وہ یہ صدمہ سہنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ کوئی دوسرا شخص یہ خبر دنیا کو سنانے میں اس سے بازی لے جائے۔

۱۹؍اگست ۲۰۰۹ء کی رات وہ خبر امریکیوں اور پھر ساری دنیا کو حیران کر گئی لیکن اس خبر کی تفصیل میں جانے سے پہلے ہمیں ماضی میں جانا ہوگا جب ۲۰۰۹ء کی اس خبر کی ابتدا ہوئی تھی۔

مارچ کا مہینہ آغازِ بہار کی نوید لاتا ہے۔ نئی کونپلیں زمین سے پھوٹتی ہیں اور انکی خوشبو فضا میں پھیل جاتی ہے لیکن کبھی یہ کونپلیں بوٹوں تلے روندی جاتی ہیں اور ان کی خوشبو پر بارود کی بو اور خون کی بساند غالب آ جاتی ہے۔ وہ ۱۶؍مارچ ۱۹۶۸ء تھی۔ جنوبی ویتنام کے گاؤں مائی لائی پر صبح ابھی طلوع ہوئی تھی۔ عورتوں نے چولہوں پر چاول کی ہانڈیاں چڑھائی تھیں۔ مرد منہ اندھیرے اپنے اپنے کاموں سے جا چکے تھے۔ بچے کچھ جاگ اور کچھ سو رہے تھے۔ جاگنے والوں کے معدوں میں بھوک کا بسیرا تھا اور سونے والے چاول کے گرم دلیے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ بوڑھے اکڑوں بیٹھے آنے والے بہتر دنوں کی آرزو کر رہے تھے۔ اچانک فضا میں ہیلی کاپٹر کی آواز ابھری اور سب دہل گئے۔ ماؤں اور بڑی بہنوں نے چھوٹے بچوں کو گھسیٹ کر گود میں اٹھایا اور خندقوں میں چھپنے کے لیے بھاگیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ آج بھاگنا اور چھپنا لاحاصل ہے۔ آنے والی 'چارلی

'کمپنی' کے لیفٹیننٹ کیلی کو اس کے افسر اعلیٰ کیپٹن مڈینا نے روانہ ہونے سے پہلے یہ حکم دیا تھا کہ 'مائی لائی ویت کانگ گوریلوں کا مرکز ہے۔ وہاں موجود ہر ذی روح کو ختم کر دو'

چارلی کمپنی کے فوجی مائی لائی کی گلیوں میں پھیل گئے اور نہتے شہریوں کا شکار شروع کر دیا۔ شکار ہونے والوں میں ایک برس کا دودھ پیتا بچہ اور ۸۲ برس کی بڑھیا سب ہی شامل تھے۔ حد تو یہ ہے کہ باڑے میں ڈکراتی ہوئی گائے اور ادھر ادھر بھاگتی ہوئی مرغیاں بھی نہیں چھوڑی گئیں۔

لیفٹیننٹ کیلی نے کھلے میدان میں ۷۰ سے کچھ زیادہ دیہاتیوں کو اکٹھا کیا، پھر اس نے اور اس کے چند ماتحتوں نے ان لوگوں کو گولیاں ماریں۔ سنگینوں سے کچھ لاشوں کے سینے پر 'سی کمپنی' کا لفظ لکھا۔ ۳۰ برس بعد ۲۰ جولائی ۱۹۹۸ء کو بی بی سی نے 'جنگ کے نام پر غارت گری' کے عنوان سے مائی لائی پر ایک خصوصی پروگرام نشر کیا جس میں کہا گیا کہ 'وہ نہتے لوگ جو خندقوں سے ہاتھ اٹھائے باہر آئے انہیں بھی گولیوں سے بھون دیا گیا۔ عورتوں کے ساتھ اجتماعی زنا بالجبر کیا گیا۔ دوپہر سے ذرا پہلے اعلیٰ حکام کو 'کام' ختم ہونے کی خبر دی گئی جہاں سے واپس آنے کا حکم ملا۔ اس وقت مائی لائی کے گاؤں میں ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں'۔

اگلے دو دنوں میں مائی لائی اور آس پاس کی بستیوں میں بچے کھچے لوگوں کو قتل کرنے اور ہر چیز کو تباہ و برباد کرنے اور آگ لگا کر بھسم کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ چارلی کمپنی کے تمام فوجیوں نے قتل یا آگ لگانے میں حصہ نہیں لیا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے نہتے اور غیر فوجی دیہاتیوں کے قتل عام کو روکنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اس سلسلے میں ایچ سی تھامپسن کا بیان بہت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایرو اسکاؤٹ ٹیم میں ہیلی کاپٹر پائلٹ تھا اور اپنے معمول کے گشت پر تھا جب اس نے مائی لائی پر سے پرواز کرتے ہوئے ہر طرف بکھری ہوئی لاشیں دیکھیں۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں شیر خوار بچے، عورتیں اور بوڑھے مرد تھے اور ان میں سے کسی کے پاس ہتھیار نہیں تھا۔ تھامپسن اور اس کے ساتھ موجود عملے نے کیپٹن مڈینا کو اپنی آنکھوں سے ایک غیر مسلح عورت کو ٹھوکریں لگاتے ہوئے اور پھر قریب سے گولی مارتے ہوئے دیکھا۔ تھامپسن اور اس کے عملے نے قریبی فوجی کیمپ سے فوری مدد کی درخواست کی کیونکہ انہیں فضا سے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ کچھ لوگ زخمی حالت میں ہیں اور انہیں شاید بچایا جا سکے۔ تھامپسن کو جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے اپنا ہیلی کاپٹر اتار دیا۔ سب سے پہلے اس کی نظر ایک خندق پر پڑی

جس میں پندرہ سولہ بوڑھے، بچے اور عورتیں تھیں اور امریکی فوجی ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تھامپسن اس طرف دوڑا اور اس نے اپنے عملے سے کہا کہ وہ ان لوگوں کو خندق سے نکالنے جارہا ہے۔ اگر کوئی بھی امریکی سپاہی ان لوگوں پر گولی چلانے کی کوشش کرے تو وہ اسے بے دریغ گولی مار دیں۔

تھامپسن کی گواہی کا تفصیلی بیان المناک ہے کہ اس نے اور اس کے عملے نے کس طرح زخمی اور ہراساں ویتنامیوں کو اپنے ہی ساتھی فوجیوں سے بچایا۔ اس نے مائی لائی کے کئی چکر لگائے اور زخمیوں کو فیلڈ ہاسپٹل پہنچایا جبکہ اس کے چند ساتھی بچ جانے والوں پر پہرا دیتے رہے تا کہ چارلی کمپنی کے بے قابو اور وحشی فوجی انہیں موقع ملتے ہی ہلاک نہ کر دیں۔ اس روز چارلی کمپنی کے کیپٹن مڈینا اور لیفٹیننٹ کیلی نے افسرانِ بالا کو رپورٹ دی کہ 'ایک جان لیوا دست بہ دست جنگ میں انہوں نے ۱۲۸/ویت کانگ گوریلوں کو ہلاک کیا جبکہ ان جھڑپوں میں ۲۲ شہری بھی کراس فائرنگ کی وجہ سے مارے گئے۔' جنرل ولیم ویسٹ مورلینڈ نے اس 'شاندار کارکردگی' پر یونٹ کو مبارکباد دی اور امریکی فوج کے جریدے 'اسٹارز اینڈ اسٹرائپز' میں خبر شائع ہوئی کہ 'امریکی فوجیوں نے دن بھر کی شدید لڑائی کے بعد ۱۲۸/کمیونسٹ مار دیے۔'

چھ مہینوں تک امریکی فوجیوں کی اس 'شاندار فتح' کے ترانے گائے جاتے رہے۔ اسی دوران ۲۱ سالہ نوجوان ٹام گلن کا ایک خط جنرل ابرامز کو موصول ہوا جس نے مائی لائی کے واقعے اور ویتنامی شہریوں کے ساتھ امریکی فوجیوں کے وحشیانہ سلوک اور قتل کے واقعات تفصیل سے بیان کیے تھے۔ جنرل ابرامز اور بعض دوسرے اعلیٰ افسروں تک پہلے بھی اس نوعیت کی شکایات پہنچ چکی تھیں۔ یہ خط ۳۱ سالہ میجر کولن پاول کے حوالے کیا گیا تا کہ ان الزامات کی تحقیق کی جائے۔ یہ وہی میجر کولن پاول ہیں جو بعد ازاں اعلیٰ عہدوں سے گزرتے ہوئے وزیر دفاع کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس وقت کے میجر کولن پاول نے اس خط کو محض 'الزامات کا پلندا' قرار دیا اور کہا کہ 'اس کے برعکس امریکی فوجیوں اور ویتنامی شہریوں کے درمیان بہترین اور دوستانہ تعلقات قائم ہیں۔'

دھان کے کھیتوں میں کھڑے ہوئے سرخ پانی، نہر میں بہتی ہوئی بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کی لاشوں، بانس اور چٹائی سے بنے ہوئے جھونپڑوں کے فرش پر مٹی کے ٹوٹے ہوئے پیالوں، زمین پر بکھرے ہوئے چاولوں اور جانوروں کے باڑے میں کھونٹے سے بندھی ہوئی

گالیوں کی بے نور آنکھوں کی فریاد رائیگاں چلی جاتی اگر بات صرف میجر کولن پاول کی تحقیقات تک محدود رہتی۔ ٹام گلن کے خط میں مائی لائی کے قتل عام کا ذکر تو تھا لیکن چونکہ وہ چارلی کمپنی کے فوجیوں میں سے نہ تھا اس لیے اس سانحے کی تفصیلات بیان نہیں کر سکا تھا۔ لیکن ایک نوجوان جس کا نام رون رائیڈن آور تھا۔ اس نے چارلی کمپنی کے کئی نوجوانوں سے اس قتل عام کو اتنی تفصیل سے سنا تھا کہ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ ہر ستم اس نے اپنی آنکھوں سے ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ نہتے اور بے گناہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی چیخیں اسے رات کو سونے نہیں دیتی تھیں اور دن میں ان کے سائے اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتے رہتے۔ آخر کار رون نے ایک فیصلہ کیا۔ اسے اس قتل عام کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا اس کی ایک ایک تفصیل لکھی اور اس خط کو صدر امریکا رچرڈ نکسن، وزارت دفاع، وزارت داخلہ، جوائنٹ چیف آف اسٹاف اور کانگریس کے متعدد اراکین کو ارسال کر دیا۔ یہ خط جب ان لوگوں کو بھیجا گیا اس وقت مائی لائی کا قتل عام ایک برس پہلے کی بھولی بسری کہانی بن چکا تھا۔ کسی نے رون کے خط پر توجہ نہیں دی لیکن امریکی کانگریس کے ایک رکن موریس اوڈال کو جب یہ خط ملا تو اس کی تفصیلات پڑھ کر لرز گیا۔ وہ ایک بااثر سیاسی شخصیت تھا اور یہ اسی کا اثر و رسوخ اور دباؤ تھا جس کی بناء پر ۱۹۶۹ء میں لیفٹیننٹ کیلی اور چارلی کمپنی کے ۲۵ دوسرے افسروں اور نوجوانوں کے خلاف کارروائی شروع ہوئی۔ لیکن 'قومی مفاد' اور 'حب وطن' یہاں بھی آڑے آیا اور اس بارے میں تمام تحقیقات 'راز' ہی رہیں۔ اس کے بعد کی کہانی اگلے کالم میں۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی

۲۵/اکتوبر ۲۰۰۹ء

ضمیر کو جاگنے میں ۴۰ برس کیوں لگتے ہیں؟ ۔۲

مائی لائی کے نہتے بچوں، عورتوں اور بوڑھے مردوں کے قتل عام کی تحقیقات امریکی فوج کا 'اندرونی معاملہ' ضرور تھیں لیکن آزادی صحافت پر یقین رکھنے والے اور سچ کی تلاش کرنے والے امریکا سے ناپید نہیں ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ امریکا سے ہزاروں میل کی دوری پر ویتنام میں اگر ان گنت ویتنامی مارے جا رہے تھے، معذور ہو رہے تھے، تو بارودی سرنگوں کا شکار ہونے والے نوجوان امریکی فوجی اپنا بازو، اپنے پیر یا اپنی بینائی گنوا کر واپس آ رہے تھے اور بہت سوں کے تابوت آ رہے تھے۔ ہر گزرتا ہوا دن غم زدہ امریکی خاندانوں کی تعداد میں اضافہ کر رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے یہ سوال کرنے لگے تھے کہ ہزاروں میل دور ہمارے نوجوان کیوں مارے جا رہے ہیں؟ شمالی اور جنوبی ویتنام کی جنگ ہماری کیسے ہوسکتی ہے۔؟ اس جنگ کے خلاف اپنی حکومت سے احتجاج کرنے والوں کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔

یہی وہ دن تھے جب ۳۱ سالہ امریکی نژاد یہودی صحافی سیمور ہرش نے 'چارلی کمپنی' کے وطن واپس آنے والے نوجوانوں سے ملاقاتیں شروع کیں۔ ان میں سے کچھ نشے میں ڈینگیں مارتے اور کچھ اس المناک واقعے کے بارے میں اپنی شرمندگی کا اظہار کرتے تھے۔ اس وقت تک کیپٹن کیلی اپنے 'فرائض' انجام دے کر واپس امریکا آ چکا تھا۔ ہرش نے اس سے ملاقات کی اور اس کے 'کارنامے' سننے کی خواہش ظاہر کی۔ کیپٹن کیلی بھی ہرش کو ایک ایسا شخص سمجھا جو ویتنام میں امریکی فوجی کارروائیوں کو جمہوریت کے لیے لڑی جانے والی جنگ سمجھتا ہو۔ کیلی اور ہرش کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ کبھی کافی کی پیالی اور کبھی شراب کے پیالے پر۔ ہرش کو یہ معلوم تھا کہ امریکی فوج کا محکمۂ اطلاعات اپنی ہر مہم پر ایک فوٹوگرافر بھی ساتھ بھیجتا ہے اور یہ فوٹوگرافر فوج کا حصہ ہوتے

ہیں۔ ہرش کے لیے رونالڈ ہائی بیرل کا کھوج لگانا کچھ مشکل نہ تھا جو اس وقت چارلی کمپنی کے ساتھ تھا۔ رونالڈ اپنے سرکاری کیمرے سے جو بلیک اینڈ وائٹ تصویریں کھینچتا تھا وہ 'فوجی' اور 'سرکاری' نقطۂ نظر سے اتاری جاتی تھیں۔ لیکن وہ اپنے ساتھ ایک دوسرا کیمرہ بھی رکھتا تھا جس سے وہ رنگین تصویریں بناتا تھا۔ ہرش نے چھوٹی چھوٹی تفصیلات اکٹھا کیں اور جب ۱۲/نومبر ۱۹۶۹ء کو پہلی مرتبہ امریکی عوام کے سامنے ہرش کی رپورٹ آئی تو ایک تہلکہ مچ گیا، لوگوں کو ان مظالم کے بارے میں معلوم ہوا جنہیں جمہوریت کے نام پر امریکی فوج ویتنام میں کر رہی تھی۔ ۲۰ نومبر ۱۹۶۹ء کو امریکا کے تمام اہم اور مؤقر اخبار، ہفت روزہ اور ٹیلی وژن اسٹیشن مائی لائی کے قتل عام کے بارے میں خبریں اور مارے جانے والوں کی تصویریں شائع کر رہے تھے۔ یاد رہے کہ یہ وہی سیمور ہرش ہے جس نے عراق کی 'ابوغریب' جیل میں امریکی فوجیوں کے مظالم سے دنیا کو ۲۰۰۴ء میں آگاہ کیا اور ایک بار پھر امریکی عوام کے سامنے آئینہ رکھ دیا۔

وہ المناک واقعہ جسے میجر کولن پاول اور دوسرے بااثر فوجیوں اور حکام نے 'الزام' اور 'بہتان' کہہ کر مسترد کر دیا تھا کسی بم کی طرح امریکی قوم پر گرا۔ ہر وہ گھر جہاں ٹیلی ویژن تھا، ریڈیو تھا، جہاں اخبار آتا تھا، وہاں لوگ ششدر تھے۔ ان خبروں اور تصویروں کی اشاعت کے بعد بات امریکی فوج کے ہاتھ سے نکل گئی اور متعدد افسروں اور جوانوں کا کورٹ مارشل شروع ہوا۔ یہ کارروائی چار مہینے تک جاری رہی۔ لیفٹیننٹ کیلی کو عمر قید کی سزا سنائی گئی لیکن ابھی یہ سزا سنائے ہوئے صرف دو دن گزرے تھے کہ اس وقت کے امریکی صدر نکسن نے کیلی کی عمر قید ختم کرتے ہوئے اسے جیل سے رہا کرنے کا حکم دیا جو فوری طور پر متنازعہ بن گیا، آخر کار کیلی کو ایک فوجی جیل میں صرف ساڑھے چار مہینے گزارنے پڑے۔ ادھر کیپٹن مڈینا اس بات سے صاف مکر گیا کہ اس نے اپنے ماتحت فوجیوں کو نہتے ویتنامیوں کے قتل عام کا حکم دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کیلی اور دوسرے فوجی اپنا جرم اس کے سر ڈال رہے ہیں، اس کا یہ بیان درست مان لیا گیا اور وہ تمام الزامات سے 'باعزت' بری ہوا۔

اور صرف وہی نہیں وہ ۲۶ جوان جن پر مقدمہ چلا تھا ان میں سے صرف کیلی کو سزا ہوئی باقی سب کو باعزت بری کر دیا گیا۔ یوں ان قوانین کی نفی کی گئی جو تحت دوسری جنگ عظیم کے بعد نیورمبرگ اور ٹوکیو میں قائم ہونے والے جنگی جرائم کے ٹریبونل کے لیے طے کیے گئے تھے اور جن کے

تحت جرمن اور جاپانی افسروں کو سزائیں سنائی گئی تھیں۔ یہ قوانین افسروں اور جوانوں کے درمیان حکم دینے اور حکم بجالانے کے حوالے سے بنائے گئے تھے۔ ان قوانین کے تحت کوئی بھی فوجی اپنے غیر قانونی اور غیر انسانی اقدامات کو افسر بالا کے حکم کی آڑ لے کر جنگی جرائم کی پردہ پوشی کے لیے استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ وزارت دفاع پر یہ الزام لگا کہ اس نے فوجی جوانوں کی غلط کاریوں کو ڈیڑھ برس تک 'راز' رکھنے اور حقائق کو چھپانے کا جرم کیا۔ اس سانحے سے متعلق ہر شخص نے اس فوجی قانون کا سہارا لیا کہ 'مجھے میرے افسر اعلیٰ نے حکم دیا تھا'۔ جنگ مخالف تنظیموں نے مائی لائی کے قتل عام کو ایک مثال بنا کر امریکی عوام کے سامنے پیش کیا اور یہ سوال اٹھایا کہ افسر اعلیٰ کا حکم کہاں ختم ہوتا ہے اور موقع پر موجود فرد کی ذمہ داری کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

وہ چند امریکی فوجی جنہوں نے مائی لائی کے قتل عام میں ویتنامیوں کو بچایا تھا اور نہتے لوگوں پر گولی چلانے سے انکار کیا تھا، انہیں اپنے ہم وطنوں کی نفرت کا سامنا کرنا پڑا۔ انسانیت کا مظاہرہ کرنے والوں کو نفرت پر مبنی خطوط ملتے تھے جن میں انہیں 'غدار' قرار دیا جاتا تھا اور کئی ایسے بھی تھے جنہیں اپنا آبائی شہر یا قصبہ چھوڑ کر دور دراز علاقوں میں منتقل ہونا پڑا۔ ہیلی کاپٹر پائلٹ تھامپسن جس کے فیصلے نے مائی لائی میں موت کا سامنا کرنے والے درجنوں ویتنامیوں کی جان بچائی تھی اور اس کے جن دو ماتحتوں نے اس کا ساتھ دیا تھا، انہیں ۳۰ برس بعد 'سولجرز میڈل' دیا گیا اور اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ انہوں نے اپنے ضمیر کے مطابق نہتے انسانوں کو بچانے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ درست اور لائق تحسین تھا۔ تھامپسن کے لیے یہ بات ذاتی صدمے کی تھی کہ اس کے دو ماتحتوں میں سے ایک مائی لائی کے سانحے کے کچھ ہی دنوں بعد ویتنام میں ایک جھڑپ کے دوران ہلاک ہوا تھا اور ۳۰ برس بعد جب امریکی فوج نے اس کی خدمات کا بعد از مرگ اعتراف کیا تو اس کی قبر بھی کہیں موجود نہیں تھی۔

مائی لائی کے اس واقعے کے بعد ہی یہ بحث امریکا کے شہری اور فوجی حلقوں میں زور شور سے چلی کہ یہ فوجیوں کی ذاتی ذمہ داری ہے کہ وہ میدان جنگ میں دشمن کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے افسر بالا کے احکامات پر اپنے ضمیر کی آواز کو ترجیح دیں۔ یہ سوال بھی کیا جانے لگا کہ انسانی ضمیر کے فیصلے کو پس پشت ڈالنے کی بات کرنے والے درست کیسے ہوسکتے ہیں؟ اس تحریر کا آغاز ۱۹/اگست ۲۰۰۹ء کی شام امریکی ریاست جارجیا کے ایک چھوٹے سے شہر میں ۶۶ برس کے ایک

بوڑھے کی تقریر سے شروع ہوا تھا جس نے ایک بار پھر امریکیوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ یہ بوڑھا سابق لیفٹیننٹ کیلی تھا جسے مائی لائی میں ۲۲ نہتے ویتنامیوں کے قتل عام کے جرم میں عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی لیکن سزا سنائے جانے کے صرف ۲ دن بعد صدر نکسن نے یہ سزا معاف کر دی تھی اور کیلی ایک فوجی جیل میں چند مہینے گزار کر آزاد ہو گیا تھا۔ وہی کیلی مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر یہ اعتراف کر رہا تھا کہ 'کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب مجھے مائی لائی کے سانحے پر شرمساری اور پچھتاوا نہ ہوتا ہو'۔ افسوس کہ کیلی کا ضمیر ۴۰ برس بعد جاگا تھا۔

کیلی کا اعتراف گناہ صرف امریکیوں کو ہی نہیں تمام دنیا کے فوجیوں کو یہ سوچنے کی دعوت دیتا ہے کہ اپنے عہدوں، تنخواہوں اور مراعات کی خاطر وہ اپنے ضمیر کا گلا نہ گھونٹیں۔ ضمیر جاگتا رہے تو ۴۰ برس بعد اظہار ندامت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میدان جنگ میں قید ہو جانے والے، ہتھیار ڈال دینے والے دشمن اور اس دشمن کے خاندانوں کے بھی انسانی حقوق ہوتے ہیں اور ان حقوق کا احترام سب پر لازم ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ضمیر کو جاگنے میں ۴۰ برس کیوں لگتے ہیں اور ایسا کیوں ہے کہ ویتنام جیسی عظیم پسپائی سے بھی امریکی حکمرنوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا اور اس کے بعد بھی وہ دنیا بھر میں اپنے جنگجویانہ رویوں سے کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو تہہ بالا کرتے رہے۔ ویتنام کے بعد امریکی حکمرانوں نے کتنے ہی کمزور اور غریب ملکوں کی دست گیری کی بجائے انہیں پسماندگی کی دلدل میں دھکیل دیا اور ان کا تازہ ترین شاہکار 'دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ' ہے جس کے بہانے انہوں نے افغانستان اور عراق کو تہس نہس کر دیا۔ وہ آج بھی ان ملکوں پر قابض ہیں اور اب پاکستان ان کے حصار میں ہے۔

روزنامہ 'ایکسپریس'، کراچی

۲۹/اکتوبر ۲۰۰۹ء

بود و نبود کا آشوب

اگلے صفحات میں میری ایک کہانی 'بود و نبود کا آشوب' اور فیض صاحب نے اس کا جو ترجمہ کیا تھا وہ پیش کیا جارہا ہے۔ میرے لئے یہ بات بہت اعزاز کی ہے کہ فیض صاحب نے اس کہانی کو منتخب کیا اور اِس لائق سمجھا کہ وہ خود اسکا ترجمہ کریں۔ فیض صاحب نے یہ زحمت کرتے ہوئے اِس ترجمے کو بیروت سے اپنے زیرِ ادارت نکلنے والے پرچے *Lotus* میں شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن ترجمہ کرنے کے چند دن بعد ہی انہوں نے اس دنیا سے رختِ سفر باندھا۔ بعد ازاں، کراچی سے مسز زہرہ کریم کی ادارت میں شائع ہونے والے انگریزی جریدے *She Magazine* نے اسے شائع کیا۔ ایلس فیض اِس رسالے کے لیے لکھتی تھیں اور ان ہی کی وساطت سے یہ ترجمہ پہلی بار وہاں شائع ہوا۔ (زاہدہ حنا)

اندھیرا پیڑوں پر بچھ گیا تھا' خوشبو بن کر رات کی رانی میں اتر گیا تھا' خنکی بن کر ہوا میں گھل گیا تھا۔

میں دھوئیں سے بھرے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ تھکن میری پنڈلیوں اور تلوؤں میں رچ گئی تھی۔ میں اپنے شوہر اور اس کے دوستوں سے معذرت کر کے باہر نکلی اور برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگی۔

ڈرائنگ روم کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور روشنی کے قتلے برآمدے کے فرش پر بچھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے بچپن کا ایک کھیل یاد آ گیا جب ہم اپنے گھر کے آنگن میں روشنی کے ایسے ہی بڑے اور چھوٹے قتلوں کو پھلانگتے جاتے اور کسی کا پیر غلطی سے روشنی کے کسی قتلے پر پڑ جاتا تو سزا کے طور پر اسے چور بنا دیا جاتا، پھر ہم سب کچھ بھول کر، بھرّا مار کر دوڑتے اور چور بننے والا لنگڑی ٹانگ سے ہمارے پیچھے لپکتا۔ اس وقت روشنی کے قتلے ہمارے پیروں تلے روندے

جاتے اور اندھیرے کے تمام گوشے ہماری چیخوں سے بھر جاتے۔

اس رات جب میں برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ٹہل رہی تھی تو یوں ہوا کہ ڈرائنگ روم کی کھلی کھڑکیوں نے سب کچھ اگل دیا، سب کچھ نگل لیا۔

میں اپنی جگہ ٹھٹھک کررہ گئی۔ میری نظر اپنے شوہر پر پڑی، وہ ہاتھ بڑھا کر اسٹیریو کا سوئچ آن کررہا تھا۔ Boney M کی چیختی ہوئی آواز اٹھی...... Ra Ra Rasputin...... میں نے چونک کر ان سب کو دیکھا، اندر چار دوست تھے شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے اور سامنے کتابوں کی الماری پر ایک تصویر تھی...... تصویر میں سفید پتھروں والی ایک چٹیل پہاڑی تھی۔ اس پہاڑی کے ایک مختصر حصے کو تراش کر ہموار دیوار کی شکل دے دی گئی تھی اور دیوار میں سلاخ دار دروازہ لگا تھا جس میں آہنی قفل تھا۔ اس دروازے سے پرے ایک غار تھا اور محراب تھی، محراب سے پرے ایک تنگ و تاریک غار تھا اور اس غار سے پرے ابد تھا اور لانہایت نیند تھی جو زندوں اور مردوں کے درمیان عدل کرتی ہے۔

میں بھی اس تصویر میں تھی، دروازے کی ایک سلاخ تھامے اور غار کے اندر جھانکتی ہوئی۔ چہرہ غار کی سمت اور پشت کیمرے کا سامنا کرتی ہوئی اور اسی تصویر کے برابر کانسی کا ایک مجسمہ تھا۔ غار کے قیدی کا یہ مجسمہ میں نے اسی شہر سے خریدا تھا۔

جب میں نے یہ تصویر کھنچوائی تھی اور جس لمحے میں نے یہ مجسمہ خریدا تھا اس لمحے میں نہیں جانتی تھی کہ ایک رات ایسی بھی آئے گی جب میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ایک شخص اس تصویر اور مجسمے کو دیکھ کر ایک جملہ کہے گا اور پھر اندھیرا روشنی کے تمام قلعوں کو نگل لے گا۔

میری نگاہیں بھٹکیں اور کتابوں کی الماری کے مقابل رنگین ٹیلی وژن پر جم گئیں، ٹیلی وژن کیبنٹ پر سیاہ فریم میں جڑا ہوا ایک فوجی اعزاز سجا تھا۔ چند ہفتوں پہلے یہ میرے شوہر کو اعلیٰ پیشہ ورانہ خدمات کے صلے میں عطا ہوا تھا۔

کچھ دیر پہلے کا وہ لمحہ میرے اندر ازل کی طرح منجمد تھا جب ڈرائنگ روم کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے میرے شوہر کے عزیز ترین دوست کی آواز آئی تھی اور اس آواز نے پوچھا تھا 'یار یہ سلاخ دار دروازے کی تصویر کیسی ہے؟'

تب میرے شوہر نے بتایا کہ یہ اس بوڑھے فلسفی کا قید خانہ ہے جس نے زہر کے پیالے کے

انتظار میں یہاں تیس دن اور تیس راتیں گزاری تھیں۔

یہ سن کر میرے شوہر کے اسی عزیز ترین دوست نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا 'بھابھی نے اس کمرے میں خوب تضاد اکٹھا کیا ہے۔ ایک طرف صدیوں پہلے زہر پینے والے بوڑھے کے قید خانے کی تصویر اور اس کا مجسمہ ہے اور دوسری طرف تمہیں ملنے والا اعزاز سجا ہے۔'

'ذرا آہستہ بولو۔ تمہاری بھابھی نے سن لیا تو قیامت آ جائے گی۔' میرے شوہر کی آواز مریخ سے آ رہی تھی۔'

'کیا اسے واقعی کچھ معلوم نہیں؟'

'لیکن وہ تو اس تقریب میں شریک تھی جس میں تمہیں یہ اعزاز ملا تھا۔'

'ہاں وہ شریک تو تھی لیکن اسے نہ اس اعزاز کا پس منظر معلوم ہے اور نہ میری سرکاری مصروفیات کے بارے میں کچھ علم ہے۔' یہ اس شخص کی آواز تھی جو مجھے جان سے عزیز تھا۔

وہ باتیں کر رہے تھے، میرے شوہر کو داد دے رہے تھے۔ وہ تنظیم جسے میں بہت عزیز رکھتی تھی اس کے کچل دیے جانے کا سہرا میرے شوہر کے سر باندھ رہے تھے۔ سیاہ فریم میں جڑا ہوا اعزاز میری نگاہوں کے سامنے تھا اور اس شخص کا چہرہ بھی جسے یہ اعزاز عطا ہوا تھا۔ کیا یہ وہی شخص تھا جس سے میں نے گھنٹوں ادب اور تاریخ کے معاملات پر باتیں کی تھیں، جو فنون کا دلدادہ تھا، کتابوں کا شیدائی تھا، فلسفہ اور تاریخ جس کا محبوب موضوع تھا؟

میری ٹانگوں میں دم نہیں رہا تھا، میں وہیں بیٹھ گئی، آوازیں مجھ تک آتی رہیں۔ یہ انسانوں کی آوازیں تھیں یا بھیڑیوں کی غراہٹیں؟ وہ ان لوگوں کے نام لے رہے تھے، ان کی باتیں کر رہے تھے جن کو میں نام بہ نام جانتی تھی۔ ان سے میں نے ادبی نشستوں اور نجی محفلوں میں گھنٹوں گفتگو کی تھی، ان کے ساتھ میں نے کئی پسماندہ بستیوں کا سفر کیا تھا۔ وہ علاقے اور ان میں بسنے والے محروم ترین انسان جن کی زندگیوں کی پستیوں کا شہر میں رہنے والے تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ پسماندہ بستیوں میں رہنے والوں کے ساتھ انہی کی طرح رہتے تھے۔

پھر انہی دنوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر چلی گئی۔ جب میرا تعلیمی سفر ختم ہو رہا تھا تو میری ملاقات اس شخص سے ہوئی، جو اب میرا شوہر ہے اور ان دنوں کسی ٹریننگ کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ بھیا کو جب معلوم ہوا کہ میں اس سے شادی کی خواہشمند ہوں تو انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا

کہ کیا میں ایک فوجی کے ساتھ زندگی گزارنے کی استطاعت بھی رکھتی ہوں؟ وہ میری افتادِ طبع سے بخوبی واقف تھے۔ میرے سیاسی نظریات سے آگہی رکھتے تھے اور اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو گئے تھے۔

مجھے ان پر ہنسی آئی۔ آخر سقراط نے بھی تو یونان کی ریاست کے کسی عام سپاہی کی طرح حلف اٹھایا تھا اور عہد کیا تھا کہ 'میں اپنے ہتھیاروں کی بے حرمتی نہیں کروں گا اور میدان جنگ میں اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا اور دیوتاؤں اور انسانوں کی چیزوں کے لیے جنگ کروں گا۔'

میں نے کتابوں سے سیکھا تھا کہ پیشے انسانوں کی افتادِ طبع نہیں بدل سکتے۔ یہ تمام باتیں میں نے بھیا سے کہی تھیں اور وہ چپ ہو گئے تھے۔ یوں بھی عشق کے سامنے دلیلیں ہار جاتی ہیں سو وہ بھی ہار گئے۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ہم دونوں وطن واپس آ گئے تھے۔ میں پانچ برس ملک سے باہر رہی تھی اور جب واپس آئی تو خواہش کے باوجود پرانے دوستوں سے رشتہ استوار نہ ہو سکا۔ جبر کی فضا میں اضافہ ہوا تھا، لوگ بکھر سے گئے تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ کچھ لوگوں نے مجھ پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں ان کے خیال میں Trojan Horse تھی، وہ مجھے قلبِ لشکر میں کس طرح لے کر جاتے۔

یہ اتنی قیامت کی اذیت تھی جس کا اظہار بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں اپنے اندر سہم کر، ٹھٹھر کر رہ گئی۔ وہ بھی حق بجانب تھے اور شاید میں بھی درست تھی کہ عشق کی بیمار تھی۔

اس وقت یہ لوگ جن کے نام لے رہے تھے، ان کی گرفتاری کی خبر ہماری واپسی کے چند ہفتوں بعد ہی چھپی تھی۔ پھر خبر آئی کہ ان کا معاملہ ایک فوجی ٹریبونل کے سپرد کر دیا گیا۔ میں نے اپنے شوہر سے اس معاملے پر بات کرنی چاہی تھی لیکن وہ ٹال گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ان میں سے کئی میرے ذاتی دوست ہیں۔ وہ تفصیلات بتا کر مجھے اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک شخص تشدد کی تاب نہ لا کر ختم ہو گیا اور اس کی لاش لاوارثوں کی طرح ایک چھوٹے سے شہر کے قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ اس کی قبر پر کوئی کتبہ نہ تھا۔ وہ گمنام سپاہی کی قبر تھی۔ اس کی بیوہ اور اس کی ضعیف ماں باپ کی آہ و زاری کی ایک کالمی

خبریں آئیں اور پھر سب کچھ یوں بھلا دیا گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کی موت کی خبر نے مجھے کئی روز تک رُلایا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ روشن دماغ اور روشن ضمیر انسان مر بھی سکتا ہے۔ وہ زبان جو دانائی کے موتی رولتے نہ تھکتی تھی، وہ گویائی سے محروم بھی ہو سکتی تھی۔ وہ ہاتھ جنہوں نے ہمیشہ سچ لکھا تھا، وہ پیوند زمین بھی ہو سکتے ہیں۔ میں نے بے یقینی کی ریتیلی دیوار کو تھام کر یقین کی پتھریلی سرزمین تک پہنچنا چاہا لیکن ریتیلی دیوار کا قامت کم ہو رہا تھا، میری انگلیوں کے درمیان سے ریت پھسل رہی تھی، گر رہی تھی۔

آوازوں کا پگھلتا ہوا، دہکتا ہوا سیسہ، بہتا ہوا میری سماعت تک آ رہا تھا۔ یہ لوگ بار بار اس شخص کا نام لے رہے تھے جو موجود انسانوں میں میرے لیے بہت محترم تھا۔

وہ ہنس رہے تھے ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ انہوں نے اسے کس کس طرح کی اذیتیں دیں، اس کی انگلیوں کے ناخن کس طرح کھینچے گئے، اسے کتنے گھنٹے برف کی سل پر لٹایا گیا اور کتنی مرتبہ بجلی کے جھٹکے دیے گئے۔

تب میں نے جانا کہ وہ ہلاک ہونے سے ہفتوں پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اسے چوپایوں کی طرح چلنے پر مجبور کیا گیا، اسے برہنہ کر کے غلاظت کے تالاب میں غوطے دیے گئے، پیروں میں وزن باندھ کر کلائیوں کو آہنی حلقوں میں جکڑ کر چھت سے لٹکایا گیا۔

اذیت، ہر وہ اذیت جو صرف ایک انسانی ذہن ہی سوچ سکتا ہے اسے اور اس کے ساتھیوں کو دی گئی۔ صرف اس لیے کہ وہ ان حکمرانوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ جنہوں نے انسانوں پر جینا حرام کر رکھا تھا۔ یہ حکمران جن کا خیال تھا کہ وہ زمین پر خدا کے نائب ہیں اور خدا کے نائبین سے زیادہ بھلا اور کون عدل کر سکتا ہے، سو انہوں نے عدل کیا۔

سزاؤں کا نگرانِ اعلیٰ اندر بیٹھا تھا اور ہنس رہا تھا۔ جب اس کی نگرانی میں ان سب لوگوں کو سزائیں دی جا رہی تھیں، جب ان پر دنیا کی ہر راحت حرام تھی اور جب ان پر عقوبت کا ہر در کھلا تھا، انہی دنوں میں نے اس عقوبت کے نگراں کا ہر شام بے تابی سے انتظار کیا تھا اور ہر شب، شب بسری کی تھی۔

کتابیں، کتابچے، رپورٹیں میری نگاہوں میں تھے۔ International Protection of Human Rights...... ایمنسٹی کی رپورٹ آن ٹارچر...... اقوام متحدہ کا Universal

Declaration of Human Rights جس پر میرے شوہر کے سابق و موجودہ حکمرانوں کے دستخط تھے جس کی پہلی شق یہ تھی کہ تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وہ یکساں حقوق اور مساوی رتبے کے حقدار ہیں جس کی نویں شق یہ تھی کہ......

لیکن صرف پہلی اور نویں شق کا ہی ذکر کیوں؟ اس دستاویز کی تمیں شقیں تھیں اور نہ جانے کتنی ذیلی شقیں، تو کیا اس دستاویز پر دستخط کرنے والوں کے اندر کبھی کسی سوال نے سر نہیں اٹھایا تھا۔؟

ایسے سوال اور ان کے جواب ضمیر کی کھیتی میں اکھوے کی طرح پھوٹتے ہیں اور ضمیر کی کھیتی سفید محل میں رہنے والے ان دیوتاؤں کے ہاتھ گروی رکھ دی گئی تھی جن کی آنکھیں نیلی تھیں اور جن کے بدن تانبے کے رنگ کے تھے۔

میرے چاروں طرف آوازیں تھیں، آگ تھی اور دھواں تھا، خون کی اور سڑتے ہوئے گوشت کی بساند تھی۔ مجھے ابکائی آئی اور جو کچھ میرے اندر تھا باہر آ گیا۔ یہ سڑا ہوا رزق اس اذیت دہی کے عوض ملنے والے روپوں سے خریدا گیا تھا۔ میں اس سڑے ہوئے رزق کے پاس بیٹھی رہی۔

میں جانے کتنی دیر تک بیٹھی رہی، پھر میں ہمت کر کے اٹھی اور اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ میں نے پانی سے اس سڑے ہوئے رزق کو دھویا لیکن ابھی تو بہت کچھ میرے اندر تھا۔ ابھی تو میرے اندر ایک عزیز از جان رشتے کی مسخ شدہ لاش تھی۔

میں نے اپنے ہونٹوں پر سے لپ اسٹک صاف کی اور آئینے میں مجھے اپنا ہاتھ نظر آیا۔ یہ ہاتھ جو مر جانے والے، موجود اور پیدا ہونے والے، دوسرے تمام انسانوں کے ہاتھوں کی طرح کھال، چربی دار خلیوں، نسیجوں، پٹھوں، عضلات، ہڈیوں اور جوڑوں سے بنا تھا۔ یہ ہاتھ جس کا اختتام تمام دوسرے انسانوں کی طرح انگلیوں پر ہوا تھا۔

میں نے آئینے میں اپنی انگلیوں کو دیکھا سبک اور سجل انگلیاں، مخروطی ناخن اور ان پر دمکتی ہوئی ہلکی گلابی نیل پالش، سورج کی انگلی پر سفید اوپل تھا اور اس کی دودھیا سفیدی میں قوس قزح کے سات رنگ جھلکتے تھے۔

پھر وہ انگلیاں میری نگاہوں میں کھنچ گئیں جنہیں میں نے کئی برس پہلے دیکھا تھا۔ توانا اور

مردانہ انگلیاں، صاف اور ترشے ہوئے ناخنوں کے نیچے سے خون کی سرخی جھلکتی ہوئی، مشتری اور زحل کی انگلیوں کی پہلی پوروں کے کنارے سگریٹ کے دھوئیں سے زرد۔

وہ انگلیاں ایک مضمون کے صفحے الٹ رہی تھیں اور وہ ہونٹ ان صفحات پر لکھے ہوئے الفاظ کی ادائیگی میں مصروف تھے۔

وہ آخری موقع تھا جب میں نے ان انگلیوں کو متحرک دیکھا اور ان ہونٹوں کو بولتے ہوئے سنا۔ مجھے آج معلوم ہوا تھا کہ سیاہ لوں سے ڈھکے ہوئے وہ توانا ہاتھ جب رخصت ہوئے تو محض کھچیاں رہ گئے تھے، ان ستھری اور حساس انگلیوں اور صحت مند گلابی ناخنوں کی جگہ ٹھٹھری ہوئی، کچلی ہوئی بے ناخن انگلیاں تھیں، وہ انگلیاں جو شعر لکھتی تھیں، جنہوں نے تاریخ کی جدلیاتی تعبیر پر کتاب لکھی تھی، اپنے عہد کی بدی کے خدوخال اجاگر کیے تھے وہ انگلیاں خاک کا رزق ہوئیں۔

ڈرائنگ روم سے ایک بار پھر Boney M کی آواز آئی ...... He was Steppe,s Wolf ...... میں کسی معمول کی طرح اٹھی۔ میری نگاہوں میں اس بھیڑیے کا توانا بدن کھنچ گیا جسے میں نے لذتوں کا راتب کھلایا تھا۔

اب میں ڈرائنگ روم کی نیم تاریک محراب کے نیچے سایہ سی کھڑی ہوں۔ ان لوگوں نے میری موجودگی کو محسوس نہیں کیا ہے لیکن جب یہ میری موجودگی کو محسوس کرلیں گے تو یہ جھپٹ کر اپنے بھیڑیا چہروں پر بکروں کے ماسک چڑھالیں گے، ان کی غزاہٹیں گھٹی گھٹی ممیاتی آوازوں سے بدل جائیں گی۔

کہا جاتا ہے کہ نہ جاننا سب سے بڑی نعمت ہے۔ سب کچھ جان لینے کی کھیتی میں نے کچھ اس طور کاٹی ہے کہ آج میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔

انہوں نے میرے قدموں کی چاپ سن لی ہے اور وہ جلدی جلدی بکروں کے ماسک پہن رہے ہیں۔ میں اپنے شوہر کے چہرے کو دیکھتی ہوں' اس شخص کا پرانا ماسک کہاں ہے؟ آواز تکرار کرتی ہے۔ He was Steeppe,s Wolf ...... میں ایمفی تھیٹر کے وسط میں کھڑی ہوں' تمام روشنیاں مجھ پر مرتکز ہیں اور میرے تمام کردہ و ناکردہ گناہ منہ پھاڑے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔

The Torture of To Be or Not To Be

Zaheda Hina
Translated by Faiz Ahmed Faiz

Darkness had spread itself over the trees, descended into the scent of 'lady of the night', mingled with the cold of the air.

I was feeling tired-out sitting in the smoke filled room. My shins down to the soles of my feet were saturated with fatigue. This is why I apologize to my husband and his friends and walked barefoot on the cool verandah floor.

All the windows of the drawing-room were open and shreds of light were scattered on the verandah floor. This reminded me of a childhood game when we would frolic, jumping over these bright spots and any of us who stepped on one was declared the fool and had to hop on one leg to catch his scampering companions. In the melee all the shreds of light were over and our shrieks filled all the dark corners.

That night when I was walking barefoot in the verandah it felt as if the drawing-room windows had swallowed everything up and then spewed it out.

I stood rooted to the spot. I caught sight of my husband turning on the stereo switch. The screaming voice of 'Boney M' rose into the air..Ra Ra Rasputin. I stared into the room in fear. There were four of them inside, blind drunk, laughing uproariously. On the bookshelf facing me there was a photograph of a hillock with base white stones. One side of the hillock had been sliced to look like a wall. In the wall there was a gate with iron bars, heavily locked. Beyond the gate was an arched tunnel, leading to a narrow dark cave, and beyond it

was eternity and an unending sleep that distinguished between the living and the dead.

I was also in this picture, holding on to one of the bars, peering into the tunnel, facing the cave with my back to the camera. And next to this picture was a bronze statue, the statue of the prisoner in the cave. This statue I had bought from the same city. When I had this photograph taken and bought this statue I had never imagined that a night would come when for a moment a man would look at this photograph and say something as I heard it, darkness would swallow up all the fragments of light. My gaze wandered and came to rest on a colour TV set opposite the book case. On the TV cabinet stood a military decoration in a black frame, only a few weeks earlier my husband had been given this award for meritorious services.

This moment was now congealed inside me like an eternity. And what gave rise to it was the voice of my husbands friend. 'This photo with the steel bars, what does it stand for?' 'And my husband replied' This is the prison cell of the old philosopher who spent thirty days and thirty nights here waiting for his cup of poison' My husband's friend guffawed 'What a contradiction of symbols your darling wife has brought together, the old philosopher's statue and prison cell on the one hand and your military decoration on the other!'

'Hush!' said my husband 'if my wife comes to hear about it there will be hell to pay.' His voice seemed to be coming from another planet.

'Are you trying to tell me that your dear wife doesn't know anything about your job?' The drunken voice said.

'No. She doesn't know a thing'.

'But she was present at the award-giving ceremony'.

'Yes she was but she knows nothing about the background of this award or the nature of my duties'.

And the man who said it was dearer to me than life itself. They kept on talking and complimented my husband for crushing a movement I had been attached to since

adolescence. The black framed decoration was in front of my eyes and so was the face of a man with whom I had discussed problems of history and literature for hours together, who loved the arts, and was an ardent student of the philosophy of history. Were they talking about the same man?

Suddenly my legs gave way and I sat down where I stood. Were these human voices or the growling of snarling wolves. They mentioned names many of whom I knew, with whom I had often talked of literature and politics, visited with them slums of the poor and the destitute whose bleak lives. the affluent of the town could not even imagine, whom these men I was hearing about had come to live with and share their suffering.

An then I went abroad for higher education and that is where I met this man who had also gone there for some training course. I fell in love. When I mentioned the subject to my brother who knew my political views, he expressed grave doubts about my picture as the wife of an army officer. His misgiving amused me. Hadn't Socrates also taken the oath of a Greek soldier and sworn that 'I shall never betray my weapons, nor leave the battlefield while another soldier stands by my side, and I shall fight faithfully for God and men'.

I had read that a man's profession did not change his nature or his frame of mind. I said all this to my brother and at last he fell silent. Love can defeat all arguments and my brother was defeated.

And so, shortly afterwards we were married and returned home. I had been away for five years and in spite of my wishes I wasn't able to restore the same relations with my erstwhile friends. Political oppression had increased, old political ties had broken up and above all old friends would not trust me any more. They now regarded me as a Trojan horse who could not be admitted into the front line ranks. This brought me such intense suffering that I could not even express it. And I retreated within myself. I realized that my friends were justified but perhaps so was I because I was

afflicted with love.

The names being mentioned in the drawing-room were arrested one by one and the news appeared in the press a few weeks after our return. Then it was given out that their case had been handed over to a military tribunal. I tried to talk about it to my husband but he avoided the subject. He knew that I had friends among the accused and he didn't wish to hurt me with details.

Later I heard that one of my companion had died under torture and had been buried in some obscure graveyard. His grave carried no inscription. It was a grave of an unknown soldier. Some brief single column notice of his lamenting young widow and aged mother appeared in some newspapers and was soon forgotten as if nothing had happened. I wept over the news for many days.

How could some one like him die so young, I kept wondering to myself. Some one so brilliant of mind, so noble of soul. A tongue rolling in gems of wisdom, how could it be deprived of speech. Those hands that always upheld truth, how could they be buried in the dust.

The molten lava of their voices was slowly penetrating my hearing. These men kept repeating a name I admired so much. They were jovially telling each other how they tortured him, how his finger nails were pulled out, for how many hours he was stretched out on ice, how many electric shocks convulsed his body. Then I heard that he had been finished long before his death, he was made to crawl like a beast, immersed in excrement, hung up with heavy weights tied to his feet and wrists. Torture, he and his companions were subjected to, every conceivable torture, merely because they differed with the rulers who had reduced the lives of their people to hell on earth, the rulers who regarded themselves as vice-regents of God and were dealing out divine justice. And the overseer of these torture was sitting there and laughing. When he was ordering these tortures I had waited for him impatiently every evening and spent every night in his arms.

How many books, pamphlets, reports and documents I had in mind. Amnesty reports on torture, Universal Declaration on Human Rights which carried the signatures of my past and present rulers and the assent of my husband. The first article said that all men were born equal and were entitled to equal rights, article nine said, but why talk of first or ninth, or twentieth article. It carried so many articles, did non of them ever trouble the minds of those who signed them?

These questions and their answers sprouted so many seeds in the field of conscience but this field had long been mortgaged to an inhuman race with stone-coloured eyes and bodies of copper line.

These war voices all around me, and fire and smoke and the stink of rotten bodies. Suddenly I felt sick and vomitted what was inside me, all that had been purchased from the proceeds of these tortures and I kept sitting by this mess. I sat there I am not sure for how long. Then I got up, went to my bedroom and cleaned up this mess. But inside me there was still the dead foetus of my dearest relationship.

I wiped the lipstick from my lips and looked at my hand, at my hand ending like every other hand in my fingers, beautiful fingers with their pink polish and an opal ring on the index finger sparkling with all the colours of the rainbow.

Then I remembered the fingers I had seen years before, strong masculine finger with clean manicured nails pulsating with the pink blood underneath with nicotine stains on the second and third fingers. I had seen those fingers turning over the pages of an article and those lips repeating some of the words on those pages.

That was the last time I saw those fingers and heard a voice from those lips. Today I came to know for the first time that when those strong hands bid farewell they had been reduced to wooden splinters and these sensitive fingers and pink finger nail had been crushed into nail-less pulp.

Those hands that write poetry, and authored a book on the dialectic interpretation of history and the social evils of our

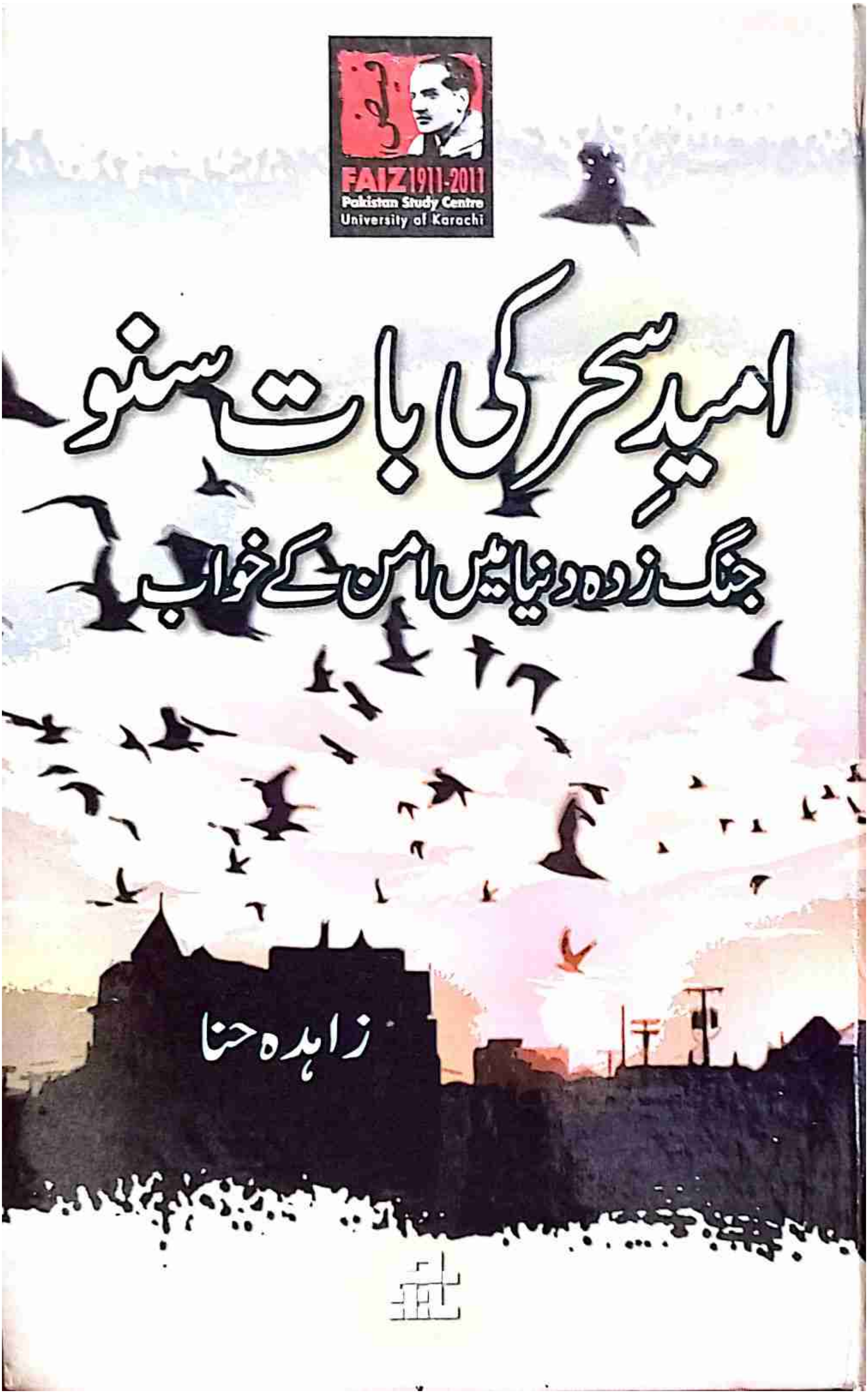
times had been swallowed up by dust.

Once again the sound of the song of 'Boney M' rose... 'He was steppe's wolf'. I stood up again as I was in trance and my eyes pictured the strong body of the wolf whom, I had fed on the pleasures of my body.

I stand in the semi-dark arch of the drawing-room door. The persons are not yet aware of my presence. The moment they are they will change their masks from wolves to sheep and their growling will change into piteous bleating.

They say that ignorance is a bliss. Today I have reaped from the field of ignorance the crop of nothingness.

They have heard my footsteps and they are hurrying to change their masks. I look at the face of my husband. Perhaps he has forgotten to put on his mask. I stand alone in the arena with all lights turned on me and all my sins, committed and uncommitted appear to be crowding in on me with their bloody jaws gaping.


FAIZ 1911-2011
Pakistan Study Centre
University of Karachi
امیدِ سحر کی بات سنو
جنگ زدہ دنیا میں امن کے خواب
زاہدہ حنا

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی ایک تدریسی و تحقیقی ادارہ ہے جو قومی پارلیمان کے ۱۹۷۶ء کے ایک ایکٹ کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے کی تشکیل کا مقصد یہ ہے کہ ایم۔ اے کی سطح پر 'مطالعہ پاکستان' کی تدریس بحیثیت ایک باقاعدہ مضمون کی جائے۔ اس کے علاوہ ایم۔ فِل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے پروگراموں، نیز دیگر علمی منصوبوں کے ذریعے پاکستانی معاشرے، اس کی تاریخ، تہذیب، مذہب، ادب، سماجی نظام، معیشت و سیاست اور جغرافیہ وغیرہ کے بارے میں تحقیقی کام کیے جائیں جن سے ایک جانب قومی زندگی کے دلکش تنوعات نمایاں ہو کر سامنے آسکیں اور دوسری طرف اس کی مشترکہ اقدار اُجاگر ہو سکیں تاکہ ایک ایسے ہم آہنگ قومی وجود کے نقوش اُبھر سکیں جو قیامِ پاکستان کا منطقی مطالبہ ہے اور جس کا حصول استحکامِ پاکستان کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی اپنے قیام سے اب تک انہی اہداف کے حصول میں منہمک ہے۔ چنانچہ گزشتہ برسوں میں معمول کی تدریسی سرگرمیوں (جو بجائے خود اس لحاظ سے مثبت، نتیجہ خیز اور قابلِ فخر ثابت ہوئی ہیں کہ سینٹر سے فارغ التحصیل سابق طلبہ و طالبات اس وقت ملک کے طول و عرض میں کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں کی سطح پر تدریس میں مصروف ہیں) کے ساتھ ساتھ سینٹر نے قومی زندگی کے اہم موضوعات پر قابلِ قدر تحقیقی کام بھی کیا ہے۔ سینٹر کی انگریزی اور اردو مطبوعات میں مستقل نوعیت کی تصانیف کے علاوہ *Pakistan Perspectives* کے نام سے ایک جرنل اور علمی و تحقیقاتی مضامین پر مشتمل اردو کتابی سلسلہ 'پاکستانیات' شامل ہیں۔ سینٹر کی اِن مطبوعات کو علمی حلقوں کی جانب سے جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے وہ سینٹر کے لیے سرمایۂ افتخار کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہماری اردو مطبوعات

پاکستانی معاشرہ اور ادب	مرتبین: ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری، احمد سلیم	۱۰۰/روپے
اقبال: فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید (دوسرا ایڈیشن)	مرتب: ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری	۳۰۰ روپے
پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال	شہزاد منظر	۲۵۰روپے
پاکستانیات جلد نمبر۱	مرتبین: ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری، محمد علی صدیقی	۱۰۰/روپے
پاکستانیات جلد نمبر۲	مرتب: ڈاکٹر سید جعفر احمد	۲۰۰روپے
کراچی کے ادبی رسائل	عظمیٰ فرخ	۱۵۰/روپے
جمیل الدین عالی کی تحریروں میں پاکستانیت	مہرالنساء عزیز	۱۵۰/روپے
فیض احمد فیض کی صحافت	سیدہ برجیس بانو	۱۵۰/روپے
پروفیسر آفاق صدیقی اور سندھی ادب	مرتبین: حبیب الرحمٰن، مہرالنساء عزیز	۱۵۰/روپے
حسرت کی سیاست	تحقیق و تالیف: احمد سلیم	۳۰۰روپے
تلاشِ اقبال	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۲۰۰روپے
صحافت پابندِ سلاسل	ضمیر نیازی	۲۰۰روپے
جنوں میں جتنی بھی گزری۔۔۔ (معروف صحافی اور شاعر حسن عابدی کی یادداشتیں)	ترتیب و تدوین: ڈاکٹر سید جعفر احمد	۲۵۰روپے
فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت: تحریریں اور تقریریں	مرتب: شیما مجید	۲۰۰روپے
نقیبِ انقلاب: مولانا برکت اللہ بھوپالی	شفقت رضوی	۲۵۰روپے
برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات	مرتب: ڈاکٹر مبارک علی	۲۰۰روپے
جہاتِ حسرت	مرتب: ڈاکٹر سید جعفر احمد	۳۰۰روپے
تہذیب و تخلیق	ڈاکٹر محمد رضا کاظمی	۳۵۰روپے
مہر اور اُن کا عہد: مولانا غلام رسول مہر کی سیاسی و صحافتی خدمات	محمد حمزہ فاروقی	۳۰۰روپے
رسمیاتِ مقالہ نگاری	ڈاکٹر معین الدین عقیل	۵۰ روپے
ڈاکٹر فیروز احمد کے مضامین	مرتب: ڈاکٹر سید جعفر احمد	۸۰۰روپے